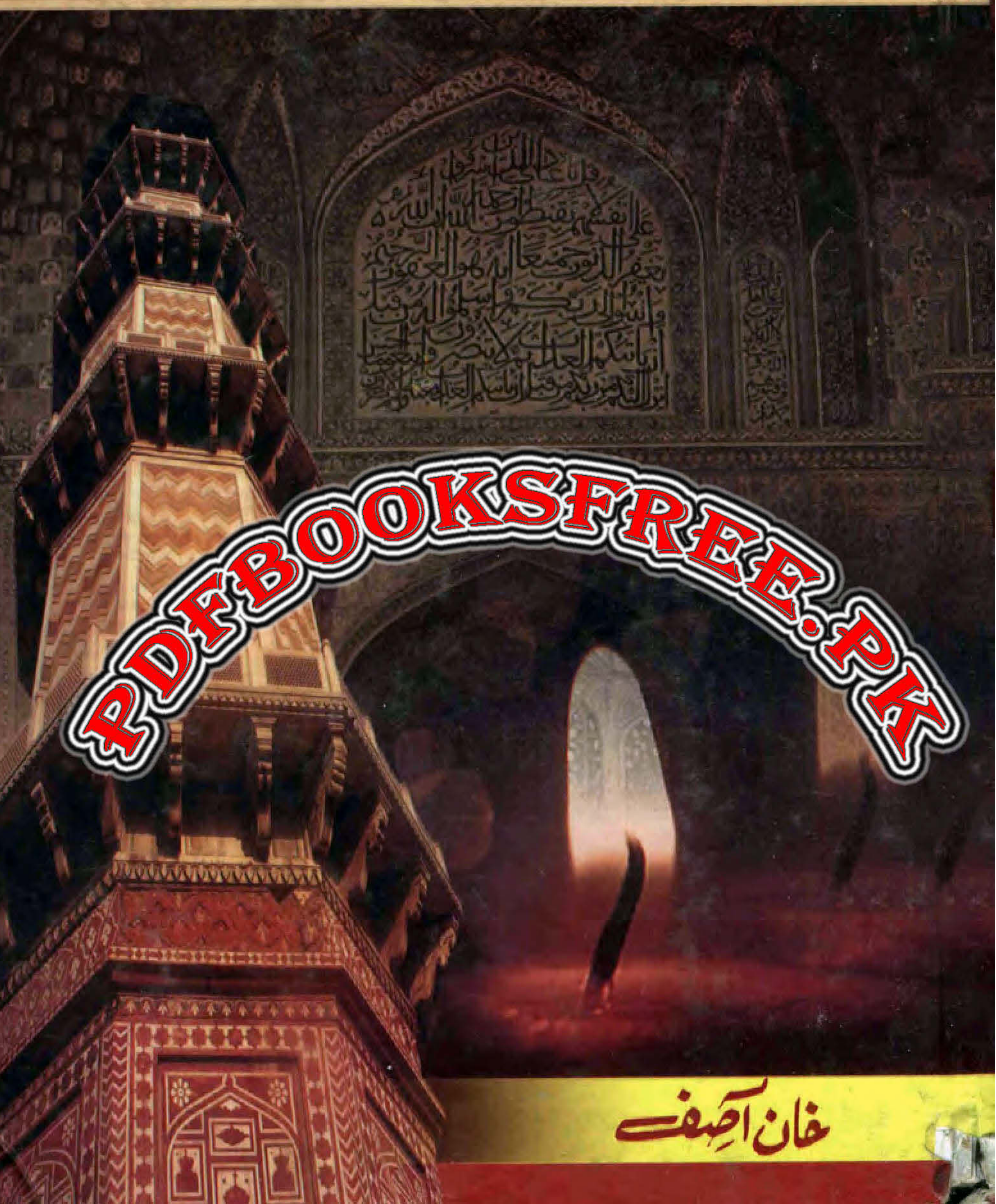
اللہ کے سفیر



خان آصف

پیش لفظ

اللہ کے سفیر، ان برگزیدہ بندوں کے واقعات ہیں جن کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ فتنوں سے بھری دنیا میں اولیائے کرام، اللہ کی روشن نشانیاں ہیں۔ یہ اللہ کے دوست ہیں۔ صوفیائے کرام نے اپنی بے پناہ ریاضت سے اسلام کی عملی تشریح پیش کی۔ پابندی کر کے دکھائی۔ لوگوں کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ڈالی اور یہ سب اولیائے کرام نے اپنے عمل سے کیا۔ یہ بوریا نشین اپنی فطرت میں عجز وانکسار کا پیکر تھے۔ یہ انہی اللہ کے جاں نثاروں کی تاریخ ہے جو انسانی نظروں سے روپوش ہونے کے باوجود صدیوں سے ہزارہا انجمنوں اور لاکھوں دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ اس کتاب میں جن اللہ کے سفیروں کا تذکرہ شامل ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ۔

اس کتاب کو خان آصف نے بڑی کاوش اور عرق ریزی سے مکمل کیا ہے۔

(محمد علی قریشی)

فہرست

حضرت جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش .... نامعلوم (اختلافی)

تاریخ وفات 302ھ

مزار مبارک .... بغداد شریف

خاندانی نام جنید بن محمد۔ کنیت ابوالقاسم۔ آپؒ نے فقہ کی تعلیم حضرت ابوثورؒ سے حاصل کی۔ تصوف کے رموز و نکات حضرت حارث محاسبیؒ سے سیکھے اور خرقۂ خلافت مشہور صوفی بزرگ حضرت سری سقطیؒ سے حاصل کیا جو آپؒ کے حقیقی ماموں بھی تھے۔

جذب و کیف کی انتہائی منزلیں طے کرنے کے باوجود حضرت جنید بغدادیؒ ہمیشہ احتیاط اور ہوش کی حالت میں رہے۔ آپؒ کی عارفانہ عظمتوں پر تمام اولیائے کرام متفق ہیں۔ اسی لئے آج بھی آپؒ کو سید الطائفہ (صوفیوں کے سردار) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ شہر بغداد کا واقعہ ہے جو اپنے وقت میں متمدن دنیا کا سب سے بڑا علمی اور تہذیبی مرکز تھا۔ اور اسی شہر کے ایک گوشے میں ایک مردِ خدا، بندگانِ خدا کے دلوں کی کثافت دھونے کے مشکل ترین کام میں مصروف تھا۔

ایک دن ایک شخص درویش کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ درویش نے حسبِ معمول مہمان کی تواضع کی اور پھر پوچھا۔ ''میرے بھائی! تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

جواب میں اس شخص نے کہا۔ ''میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ شیخ کی روحانی برکات سے فیض یاب ہو سکوں۔''

''جو شخص اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو چکا ہو، اسے ایک انسان کے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟'' درویش نے اپنے عقیدت مند کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''جو ذاتِ اقدس اپنے ایک ایک بندے کی کفیل ہو، اس نے تمہیں بھی محروم نہیں رکھا ہوگا۔''

اس شخص نے درویش کی بات سنی مگر اپنی ضد پر قائم رہا۔ ''شیخ! مجھے آپ کا فیضِ صحبت درکار ہے۔ میں بڑی توقعات لے کر حاضر ہوا ہوں۔ برائے خدا آپ مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔''

درویش نے کچھ دیر کے لئے سکوت اختیار کیا۔ پھر اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جب سے تم حج کے لئے گھر سے نکلے ہو، کیا تم نے گناہوں سے بھی اجتناب کیا ہے؟''

اس شخص نے نفی میں جواب دیا۔

درویش نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم سفر میں نہیں تھے۔'' پھر اس شخص سے پوچھا۔ ''سفر کے دوران جب تم رات گزارنے کے لئے سرائے میں ٹھہرے تو کیا تم نے کوئی مقامِ قرب طے کیا؟''

اس شخص نے بڑی حیرت سے درویش کی طرف دیکھا اور نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔

درویش نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے منزل بہ منزل سفر طے نہیں کیا۔'' اس کے بعد درویش نے اس شخص سے ایک اور سوال کیا۔ ''پھر جب تم نے احرام باندھا تو اپنے سابقہ لباس کے ساتھ ساتھ انسانی کمزوریوں مثلاً خود بینی، بغض، حسد اور حرص و طمع کو بھی اپنے آپ سے دور کیا یا نہیں؟''

درویش کے سوالات سن کر اس شخص کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ''میں اپنی ایسی کسی کمزوری پر قابو نہیں پا سکا۔''

درویش نے کہا۔ ''پھر تم نے احرام ہی نہیں باندھا۔'' اس کے بعد اس شخص سے پوچھا۔ ''جب تم نے عرفات کے میدان میں وقوف کیا تو مراقبہ ذاتِ باری کیا؟'' جب اس شخص نے نفی میں جواب دیا تو درویش نے کہا۔ ''پھر تو تم نے وقوف ہی نہیں کیا۔''

اسی طرح درویش نے اس شخص سے مسلسل سوالات کئے۔

''جب تم مزدلفہ پہنچے تو تمام نفسانی خواہشات سے قطع تعلق کیا؟''

''جب تم نے خانۂ کعبہ کا طواف کیا تو جمالِ ذاتِ باری کا مشاہدہ کیا؟''

''جب تم نے ''صفا اور مروہ'' کے درمیان سعی کی تو مقامِ صفا حاصل کیا یا نہیں؟''

''پھر جب تم ''منیٰ'' میں آئے تو تم نے اپنی نفسانی خواہشات کو قربان کیا؟''

''پھر جب تم نے رمی جمار کی تو اپنی حیوانی حسرتوں اور آرزوؤں کو بھی دل سے نکال کر دور پھینکا یا نہیں؟''

وہ شخص ہر سوال کا جواب نفی میں دیتا رہا تو درویش نے کسی تکلف کے بغیر کہا۔ ''میرے بھائی! تم نے سرے سے حج ہی نہیں کیا۔ واپس جاؤ اور دوبارہ اس طرح حج کرو جیسے میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ تم مقامِ ابراہیمی تک پہنچنے کی سعادت حاصل کر سکو۔''

یہ درویش مشہور صوفی بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ تھے۔ قارئین اسی ایک واقعے سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ کی عارفانہ شان کیا تھی؟

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

آپؒ کا خاندانی نام جنید تھا۔ والد محترم کا نام محمد اور دادا کا نام جنید قواریری تھا۔ دادا کے نام پر آپ کا نام رکھا گیا۔ ابوالقاسم آپ کی کنیت تھی۔ حضرت جنید بغدادیؒ کی تاریخ پیدائش میں شدید اختلاف ہے۔ اکثر مؤرخین نے آپ کا سن پیدائش تحریر ہی نہیں کیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے نہایت محتاط انداز میں 215ھ کو حضرت جنیدؒ کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ آپؒ کے آبا و اجداد ''نہاوند'' کے باشندے تھے۔ آلِ سامان کے دورِ حکومت میں اس قدیم شہر کو تاریخی اہمیت حاصل تھی۔ دولتِ ایران اور مملکتِ عثمانیہ کے درمیان میں جو متنازع کوہستانی علاقہ ہے، ان دنوں علاقہ جبل کے نام سے مشہور تھا۔ دولت عباسیہ کے آخری زمانے تک پہاڑی علاقے کا صدر مقام بھی شہر ''نہاوند'' تھا۔ حضرت جنیدؒ کی ولادت سے پہلے آپؒ کے والد جناب محمد نے ترکِ وطن کر کے بغداد کی سکونت اختیار کر لی تھی۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے والد محترم آئینہ سازی اور شیشہ گری کے آلات کی تجارت کیا کرتے تھے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ جناب محمد نے اپنی تجارت کو فروغ دینے

کے لئے کوہستانی علاقہ چھوڑا اور بغداد منتقل ہو گئے..... مگر جب ہم اس دور کے حوالے سے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک اذیت ناک صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے 214 ھ میں علی بن ہشام نامی ایک شخص کو علاقہ جبل کا عادل (گورنر) مقرر کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی قم، اصفہان اور آذر بائیجان وغیرہ کے علاقے بھی اس کی تحویل میں دے دیئے تھے۔ علی بن ہشام فطرتاً ایک سنگ دل انسان تھا۔ اس نے حکومت کا رعب و جلال قائم کرنے کے لئے مخلوقِ خدا پر بے شمار مظالم ڈھائے۔ ہزاروں انسانوں کا مال و اسباب لوٹا اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں۔ بہت سے لوگوں کو سرِ مقتل لے جا کر ذبح کر ڈالا۔ نتیجتاً پورے علاقے میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ مجبور و بے کس انسان آسمان کی طرف منہ کر کے فریاد کرتے تھے۔

''اے خدا! تُو نے علی بن ہشام کو ہمارے کون سے گناہوں کی پاداش میں ہم پر نازل کیا ہے؟''

اسی گریہ و زاری کے دوران وہ ستم رسیدہ لوگ غائبانہ طور پر عباسی خلیفہ مامون الرشید کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے۔ ''امیر المومنین! آپ کو خبر بھی ہے کہ آپ نے کس ظالم و جابر حاکم کو ہم پر مسلط کیا ہے؟ کیا یہی آپ کا نظامِ مملکت ہے؟''

جب علی بن ہشام کی ایذا رسانیوں کی خبریں خلیفہ مامون الرشید تک پہنچیں تو وہ شدتِ غضب سے بدحواس ہو گیا۔ پھر اس نے فوری طور پر عجیف نامی ایک شخص کو سرِ دربار طلب کیا جو شجاعت و استقامت میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔

''عجیف! جب سے ہم نے علی بن ہشام کے مظالم کی داستانیں سنی ہیں، میں بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔'' عباسی خلیفہ مامون الرشید نے عجیف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تُو مجھے میری کھوئی ہوئی نیندیں لوٹا سکتا ہے؟''

''امیر المومنین! میں کوئی طبیب نہیں ہوں۔'' عجیب نے عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔

''اگر میری وجہ سے خلیفۃ المسلمین کی کھوئی ہوئی نیندیں واپس آ سکتی ہیں تو غلام حاضر ہے۔ عجیف اپنی جان دے کر بھی آپ کے خوابوں کو پُرسکون بنا سکتا ہے۔''

''میری آنکھیں بس ایک ہی منظر دیکھنا چاہتی ہیں کہ تُو علی بن ہشام کو زنجیریں پہنا دے اور پھر اسے میرے قدموں میں لا کر ڈال دے۔'' مامون الرشید بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ ''پھر میں اس ستمگر و نافرمان کا سر اپنے پیروں سے کچل ڈالوں۔''

''اگر میری زندگی نے وفا کی تو ایسا ہی ہو گا امیر المومنین!'' عجیف نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔

پھر مامون الرشید کے حکم پر عجیف اپنا لشکر لے کر علاقہ جبل کی طرف بڑھا۔ جب علی بن ہشام نے یہ خبر سنی تو اس نے سرکشی اختیار کی اور حکومت کے دوسرے باغی بابک سے مل کر علمِ بغاوت بلند کرنا چاہا مگر عجیف نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ کسی بلائے ناگہانی کی طرح علی بن ہشام کے سر پر پہنچ گیا اور پھر 217 ھ میں اس جابر و سفاک انسان کو گرفتار کر کے عباسی خلیفہ مامون الرشید کے سامنے پیش کر دیا۔

علی بن ہشام کو دیکھ کر مامون الرشید اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس نے علاقہ جبل کے حاکم کا عدالتی احتساب کرنے کی بجائے اسی وقت علی بن ہشام اور اس کے بھائی حبیب کے قتل کے احکام جاری کر دیئے۔ پھر جب دونوں بھائیوں کے جسم خون میں نہا کر ساکت ہو گئے تو مامون الرشید نے نیا حکم جاری کیا۔

''علی بن ہشام کا سر نیزے پر بلند کرو اور اسے عراق، خراسان، شام اور مصر کے گلی کوچوں میں پھراؤ۔ جب تمام لوگ یہ عبرت نام تماشا دیکھ چکیں تو پھر اس ظالم و نافرمان کے سر کو سمندر میں پھینک دو۔''

علی بن ہشام کا دورِ جفا کاری چار سالوں پر محیط تھا۔ اس نے 214 ھ سے 217 ھ تک مخلوقِ خدا پر وہ مظالم ڈھائے کہ جنہیں دیکھ کر سخت دل انسان بھی کانپ اٹھتے تھے۔ یہی وہ پُرآشوب زمانہ تھا جب حضرت جنید بغدادیؒ کے والد محترم جناب محمد نے نم ناک آنکھوں کے ساتھ اپنے آباؤ وطن ''نہاوند'' کو سلامِ آخر کہا اور ہجرت کر کے بغداد پہنچے۔ اور اسی تاریخی شہر میں حضرت جنیدؒ جیسا نابغۂ روزگار صوفی پیدا ہوا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جس کا بظاہر علم و فضل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر زہد و تقویٰ کو بنیاد بنایا جائے تو اس خاندان میں ایسا کوئی پرہیزگار شخص بھی پیدا نہیں ہوا جس کے حوالے سے اس گھرانے کو شہرت یا فضیلت حاصل ہو۔ البتہ حضرت جنید بغدادیؒ کی نانہال کو ایک محترم علمی خانوادے سے نسبت تھی۔ آپؒ کے حقیقی ماموں حضرت سری سقطیؒ نہ صرف اپنے عہد کے مشہور صوفی بزرگ تھے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی آپؒ کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

بغداد منتقل ہونے کے بعد بھی جناب محمد نے اپنا وہی کاروبار جاری رکھا۔ جب حضرت جنیدؒ پانچ چھ سال کے ہوئے تو والد کے حکم سے شیشے کی دکان پر جا کر بیٹھنے لگے۔ اس واقعے سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپؒ کے والد محترم کسی قسم کا علمی ذوق نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ذہنی معراج یہ تھی کہ وہ کسی طرح اپنے بیٹے کو ایک کامیاب دکاندار بنا

دیں، جناب محمد اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے مگر قدرت حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں کچھ اور فیصلہ کر چکی تھی۔ اہلِ دنیا ظاہر کی آنکھوں سے بس اتنا ہی دیکھ سکتے تھے کہ ایک پانچ چھ سالہ بچہ شیشے کی دکان پر بیٹھتا ہے اور آنے والے خریداروں کے ساتھ بڑی شائستگی اور ذہانت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے مگر کسی کو یہ راز معلوم نہیں تھا کہ اس بچے کا دل آئینے سے بھی زیادہ صاف ہے...... اور یہی بچہ جوان ہو کر سینکڑوں آئینے تراشے گا، ایسے آئینے کہ جن کی آب و تاب قیامت تک باقی رہے گی۔

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ اپنے والد محترم کے ساتھ دکان پر بیٹھے تھے کہ آپؒ کے ماموں حضرت سری سقطیؒ تشریف لائے اور اپنے بہنوئی جناب محمد کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''یہ بچہ دکانداری اور تجارت کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔''

''پھر آپ ہی بتائیں یہ بچہ کس کام کے لئے دنیا میں آیا ہے؟'' جناب محمد، حضرت سری سقطیؒ جیسے عارف کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے، اس لئے سرسری لہجے میں بولے۔ ''یہ دکاندار کا بیٹا ہے، دکاندار ہی بنے گا۔''

''یہ کوئی کلیہ نہیں۔'' حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا۔ ''اللہ اپنی قدرتِ بے مثال کو جس طرح چاہے ظاہر کرے۔ انشاء اللہ یہ بچہ وہی بنے گا جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔''

جناب محمد نے اپنے برادرِ نسبتی سے بہت حجت کی مگر حضرت سری سقطیؒ نے ان کا کوئی عذر تسلیم نہیں کیا اور بھانجے کو اپنے گھر لے آئے۔ اب حضرت جنید بغدادیؒ ایک عارفِ وقت کی محبت کے سائے میں پرورش پا رہے تھے۔ حضرت سری سقطیؒ نے حضرت جنیدؒ کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ ابھی صرف ایک ہی سال گزرا تھا کہ حضرت سری سقطیؒ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس مقدس سفر میں حضرت جنید بغدادیؒ بھی ماموں کے ہمراہ تھے اور آپؒ کی عمر مبارک محض سات سال تھی۔

اس سفر کے بارے میں خود حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ ''مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد ایک دن ایک مجلس خاص میں حضرت سری سقطیؒ تشریف فرما تھے اور آپؒ کے گرد عارفوں کا ہجوم تھا اور میں ان بزرگوں کے قریب ہی کھیل رہا تھا۔ باتوں باتوں میں یہ مسئلہ چھڑا کہ شکر کیا ہے؟ تمام بزرگوں نے مختلف انداز میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں حضرت سری سقطیؒ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

''بیٹا جنید! تم بھی بتاؤ کہ شکر کسے کہتے ہیں؟''

میں نے جھجکتے ہوئے تمام بزرگوں کی طرف دیکھا اور پھر عرض کیا۔ ''اللہ کی نعمتوں کو پا کر اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ میرے نزدیک اسی کا نام شکر ہے۔''

ایک سات سالہ بچے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر تمام بزرگ جھوم اٹھے اور بہت دیر تک حضرت جنید بغدادیؒ کی ذہانت کی تعریف کرتے رہے۔ پھر جب تمام درویش خاموش ہو گئے تو حضرت سری سقطیؒ نے بھانجے کی طرف دیکھ کر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہیں حق تعالیٰ سے جو فیض پہنچے گا وہ تمہاری زبان کے ساتھ مخصوص ہو گا۔''

حضرت سری سقطیؒ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جب حضرت جنید بغدادیؒ جوان ہوئے تو ساری دنیا آپؒ کے اعجازِ کلام کی قائل تھی۔ جب بھی تقریر فرماتے تو پوری مجلس آپؒ کے الفاظ کی تاثیر سے بے حال ہو جاتی۔

روایت ہے کہ جب حضرت سری سقطیؒ نے آپؒ کے بارے میں یہ پیش گوئی کی تھی، حضرت جنید بغدادیؒ اس وقت کو یاد کر کے اکثر رو دیا کرتے تھے۔ جب کوئی شخص رونے کا سبب پوچھتا تو آپؒ نہایت رقت آمیز لہجے میں فرماتے۔

''پیر و مرشد نے فرمایا تھا کہ میری زبان سے فیض جاری ہو گا۔ کاش! حضرت شیخ میرے دل کے بارے میں یہی ارشاد فرما دیتے۔''

یہ حضرت جنید بغدادیؒ کا انکسار تھا ورنہ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کے قلب اور زبان دونوں سے اپنا فیض جاری کیا۔

❁ ...... ✪ ✪ ...... ❁

کچھ دن بعد ایک اور موقع پر حضرت سری سقطیؒ نے جنید بغدادیؒ سے پوچھا تھا۔

''فرزند! مجھے بتاؤ کہ اللہ کا شکر کس طرح ادا کیا جائے؟''

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا تھا۔

''اللہ کی نعمتوں سے اس طرح فائدہ اٹھانا کہ معصیت (گناہ) کے کسی کام میں ان سے مدد نہ لی جائے۔ اسی کا نام شکر ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کا جواب سن کر حضرت سری سقطیؒ بے اختیار ہو گئے تھے اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا تھا۔

''فرزند! تمہیں یہ باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے جذبۂ عقیدت سے سرشار ہو کر عرض کیا۔ ''آپ کی صحبت سے۔''

یہ سن کر حضرت سری سقطیؒ نے بھانجے کو گلے سے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے فرمایا۔

''اے اللہ! میں جنید کے لئے تجھ سے تیری نعمتوں کا سوال کرتا ہوں۔ تُو اس کے علم میں اضافہ فرما۔''

الغرض شفیق و مہربان ماموں کی توجہ اور مداخلت سے حضرت جنید بغدادیؒ نے باپ کی شیشے کی دکان چھوڑ دی اور مکتب جانا شروع کر دیا۔ مکتب سے واپس آنے کے بعد آپ حضرت سری سقطیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس عارفِ وقت کے وعظ و نصیحت کو بہت غور سے سنتے۔ حضرت سری سقطیؒ کا اندازِ تعلیم اور طریقۂ تربیت نہایت مؤثر اور دلکش تھا۔ ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ ماموں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا۔

''آؤ بیٹا جنید! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

انتہائی نوعمری کے باوجود حضرت جنید بغدادیؒ نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ! میں حاضر ہوں۔ حکم دیجئے۔''

بھانجے کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر حضرت سری سقطیؒ کے چہرۂ مبارک پر ایک عجیب سا رنگ اُبھر آیا۔ پھر نہایت والہانہ انداز میں فرمایا۔ ''میرا ایک کام کر دو۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ خانقاہ سے اٹھے اور وہ کام کر کے واپس آ گئے۔

حضرت سری سقطیؒ نے اپنے پیرہن مبارک کی جیب سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا اور بھانجے کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ ''جنید! تم نے میرا کام بہت مہارت اور تیزی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اس لئے یہ تمہارا انعام ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے وہ کاغذ لے لیا اور اسے کھول کر پڑھنے لگے۔ کاغذ پر تحریر تھا۔

''میں نے صحرا میں ایک شتربان کو دیکھا جو نہایت پُرسوز آواز میں یہ اشعار گا رہا تھا۔

''میں روتا ہوں اور جانتے بھی ہو کہ میں کیوں روتا ہوں۔

اس خوف سے روتا ہوں کہ کہیں تُو مجھے فراق میں مبتلا نہ کر دے۔

اور میری اُمیدیں قطع کر کے مجھے تنہا نہ چھوڑ دے۔'' (ترجمہ)

یہ نصیحت کا عجیب انداز تھا جس سے متاثر ہو کر حضرت جنید بغدادیؒ بھی رونے لگے اور پھر اپنے محترم ماموں سے لپٹ کر عرض کرنے لگے۔ ''اگر یہ کلام میرے لئے ہے تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ میں اس در کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟''

بھانجے کا جواب سن کر حضرت سری سقطیؒ کے چہرۂ مبارک پر مسرت و شادمانی کا غیر

معمولی رنگ اُبھر آیا۔ آپؒ حضرت جنیدؒ کے دل کو آزمانا چاہتے تھے اور اس دل میں محبت و ایفائے عہد کی پوری صلاحیت موجود تھی۔

حضرت جنیدؒ کی اسی فرماں برداری نے آپ کو ماموں کی نظر میں اس قدر محبوب بنا دیا کہ حضرت سری سقطیؒ ساری دنیا کی بات ٹال سکتے تھے مگر جب حضرت جنیدؒ کسی خواہش کا اظہار کرتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان کا سوال رد کر دیا جاتا۔ یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ جب حضرت جنید بغدادیؒ مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک دن مدرسے سے گھر آئے تو اپنے والد محترم جناب محمد کو انتہائی غمزدہ حالت میں دیکھا۔ حساس دل رکھتے تھے، اس لئے باپ کو ملول دیکھ کر خود بھی مضطرب ہو گئے۔

''بابا محترم! کیا بات ہے کہ آج میں آپ کے چہرے پر رنج و اضطراب کی شدید کیفیات نمایاں پاتا ہوں۔''

جناب محمد نے روتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! میں نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی تھی اور خیال کیا تھا کہ تمہارے ماموں سری سقطیؒ سے زیادہ اس زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتے تو میری زکوٰۃ کی قبولیت کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوتی۔''

''کیا آپ نے ماموں جان کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کی تھی؟'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔

''میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا مگر انہوں نے سختی کے ساتھ زکوٰۃ لینے سے انکار کر دیا۔'' جناب محمد نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے زکوٰۃ کی یہ رقم خلوصِ نیت سے نکالی تھی مگر سری سقطیؒ کے انکار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم پاک باطن بزرگوں کے قابل نہیں۔''

والد محترم کو اس قدر مغموم دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ بے قرار ہو گئے اور عرض کرنے لگے۔ ''آپ یہ رقم مجھے دیجئے۔ میں خود جا کر ماموں جان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

''فرزند! یہ کیسے ممکن ہے؟'' جناب محمد کے لہجے سے شدید مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''جب انہوں نے میرے رشتے کا لحاظ نہیں کیا تو پھر وہ تمہاری بات کس طرح مانیں گے؟''

''مجھے یقین ہے کہ ماموں جان میری درخواست قبول فرما لیں گے۔'' یہ کہہ کر حضرت جنید بغدادیؒ نے والد محترم سے زکوٰۃ کی رقم لی اور اپنے ماموں حضرت سری سقطیؒ کے مکان پر پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔

دستک کی آواز سن کر حضرت سری سقطیؒ نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔ ''میں ہوں، آپ کا بھانجا، جنید۔''

''کیوں آئے ہو؟'' حضرت سری سقطیؒ نے دوسرا سوال کیا۔

''میں زکوٰۃ کی رقم لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔

حضرت سری سقطیؒ نے دروازہ کھول دیا۔ پھر حضرت جنیدؒ اندر داخل ہوئے تو آپ نے فرمایا۔ ''کیا تمہارے والد نے یہ نہیں بتایا کہ میں اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کر چکا ہوں؟''

''والد محترم نے بتایا تھا۔ جبھی تو میں حاضر ہوا ہوں۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔

''جنید! تمام صورتِ حال جاننے کے باوجود تم کس امید پر میرے پاس آئے ہو؟'' حضرت سری سقطیؒ نے اپنے کم سن بھانجے سے پوچھا۔

''صرف اللہ کی ذات کے بھروسے پر حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے مایوس نہیں فرمائیں گے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔

حضرت سری سقطیؒ نے بھانجے کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''جنید! تم اللہ تعالیٰ کو درمیان میں کیوں لائے ہو؟ یہاں بہت سے مستحق لوگ ہیں۔ تم یہ رقم کسی کے بھی حوالے کر سکتے ہو۔ زکوٰۃ دینے کی شرط پوری ہو جائے گی۔''

''مگر والد محترم کی خواہش ہے کہ اس رقم کو آپ قبول فرما لیں۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔ ''اس طرح انہیں زکوٰۃ کی قبولیت پر یقین آ جائے گا۔''

''ان کی یہ خواہش اپنی جگہ مگر میری خواہش بھی تو کوئی حیثیت رکھتی ہے۔'' حضرت سری سقطیؒ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''زکوٰۃ دینے والا مجھے مستحق سمجھتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ مستحق کوئی اور ہے۔ پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟ یہ رقم واپس لے جاؤ اور اللہ کے اس بندے کی خدمت میں پیش کر دو جو واقعتہً مستحق ہے۔''

ماموں کا مسلسل انکار سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔ ''آپ کو اس ذاتِ عزیز و جلیل کی قسم ہے جس نے آپ پر اپنا فضل فرمایا اور میرے والد کے ساتھ عدل کیا ہے۔ زکوٰۃ کی اس رقم کو قبول فرما لیجئے۔''

حضرت سری سقطیؒ اپنے کم سن بھانجے کی بات سن کر بہت حیران ہوئے۔ پھر آپ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ''تم کس طرح کہتے ہو کہ یہ اللہ کا فضل و عدل ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے نہایت پُراعتماد لہجے میں عرض کیا۔ ''آپ پر اللہ کا فضل یہ ہے کہ اس نے آپ کو درویشی عطا کی۔ اور والد محترم کے ساتھ اللہ کا عدل یہ ہے کہ اس نے انہیں دنیا کے کاموں میں لگا دیا۔ بے شک! آپ کو اختیار ہے کہ اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کر دیں لیکن میرے والد محترم پر زکوٰۃ نکالنا اور اسے اصلی حقدار تک پہنچانا فرض ہے۔''

حضرت سری سقطیؒ کو اپنے بھانجے کی یہ بات اس قدر پسند آئی کہ آپ نے اپنی عادت کے خلاف زکوٰۃ کی رقم قبول کر لی۔ یہ اس بے پناہ محبت کا اظہار ہے جو آپ حضرت جنید بغدادیؒ سے فرماتے تھے۔

پھر تقریباً آٹھ سال کی عمر میں اپنے ماموں کی ہدایت پر حضرت جنید بغدادیؒ، مشہور فقیہہ حضرت ابوثورؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاگردی کی درخواست کی۔ حضرت ابوثورؒ، حضرت امام شافعیؒ کے شاگردِ رشید تھے۔ اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلک کے اعتبار سے حضرت جنید بغدادیؒ ''فقہ شافعی'' کے پیروکار تھے۔ حضرت ابوثورؒ نے آٹھ سال کے مختصر سے عرصہ میں اپنا سارا علم حضرت جنید بغدادیؒ کو منتقل کر دیا۔ پھر اہلِ بغداد نے دیکھا کہ ایک بیس سالہ نوجوان بڑی ذہانت کے ساتھ فتوے دیا کرتا تھا۔ بڑے بڑے صاحبانِ علم جن مسائل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتے تھے، ان مسائل تک حضرت جنید بغدادیؒ کو رسائی حاصل تھی۔ یہ قدرت کا عطیہ بھی تھا اور استادِ گرامی کی صحبتوں کا فیض بھی۔

علم حدیث اور فقہ حاصل کرنے کے بعد خود حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ ''یہ بھی میرے ماموں کی محبت اور التفات کا نتیجہ ہے کہ میں ان علوم کی طرف متوجہ ہوا۔ اگر حضرت سری سقطیؒ میری رہنمائی نہ فرماتے تو میں حدیث اور فقہ سے نا آشنا رہ جاتا اور مروجہ تصوف کی پُر پیچ گلیوں میں ساری زندگی بھٹکتا رہتا۔ میں ایک دن حضرت سری سقطیؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اچانک ماموں مجھ سے مخاطب ہوئے اور نہایت جذب کے لہجے میں فرمایا۔

''جنید! میں حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں ایسا محدث بنائے جو علم تصوف سے بھی آگاہ ہو...... مگر ایسا صوفی نہ بنائے جو علم حدیث سے بھی آشنا ہو۔''

حضرت سری سقطیؒ کے اس قولِ مبارک کی وضاحت یہ ہے کہ آپ حدیث و فقہ کے علم کو اوّلیت دیتے تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ ''میں نے ساری زندگی اپنے محترم ماموں کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھا اور سب سے پہلے حدیث اور فقہ کا علم حاصل کیا۔ بعد میں حضرت ابو عبداللہ حارث محاسبیؒ کی صحبت اٹھائی اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔ علم تصوف کو قرآن اور سنت کے تابع رہنا چاہئے۔ جس شخص نے تصوف کے کوچے میں قدم رکھنے سے پہلے قرآن حفظ نہ کیا ہو اور حدیث میں سند حاصل نہ کی ہو، اسے دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں ہے۔''

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حدیث اور فقہ میں سند کا درجہ حاصل کرنے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت سری سقطیؒ سے عرض کیا۔ ''اب میرے لئے کیا حکم ہے؟''

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا۔ ''اب تم شیخ ابو عبداللہ حارث محاسبیؒ کی خدمت میں حاضری دو۔'' اس کے ساتھ ہی حضرت سری سقطیؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو یہ ہدایت بھی کی۔ ''تم شیخ حارث محاسبیؒ سے تصوف کی تعلیم حاصل کرو۔''

الغرض حضرت جنید بغدادی، حضرت شیخ حارث محاسبیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں یگانۂ روزگار تھے۔

حضرت شیخ ابو عبداللہ حارث محاسبیؒ کا آبائی وطن بصرہ تھا مگر آپ نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ حارث محاسبیؒ کی ولادت کے وقت حضرت امام حسن بصریؒ حیات تھے۔ اس طرح شیخ حارثؒ کو تب تابعین ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ''تب تابعین'' ان بزرگوں کو کہا جاتا ہے جنہیں ''تابعین'' کی صحبت کا اعزاز حاصل ہو۔ اور تابعین وہ بزرگ کہلاتے ہیں جن کی آنکھیں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دیدار سے منور ہوئی ہوں۔

حضرت شیخ حارث محاسبیؒ کے زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ان کے باپ ستر ہزار دینار چھوڑ کر مرے مگر آپ نے اتنے بڑے ترکے میں سے ایک دینار بھی قبول نہیں کیا۔ جب لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو شیخ حارثؒ نے فرمایا۔

''میرا باپ مجوسیوں کے ہم عقیدہ ہے، اس لئے میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''

''مگر بیٹا ہونے کی نصیحت سے ان کی وراثت کے تو آپ ہی حق دار ہیں۔'' رشتے داروں نے توجیہہ پیش کی۔

حضرت شیخ حارث محاسبیؒ نے فرمایا۔ ''میرے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ اس لئے

میں بھی اپنے باپ کے ترکے کا حقدار نہیں ہو سکتا۔''

حلال روزی کھانے میں حضرت شیخ حارثؒ کی احتیاط اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ اگر اتفاق سے کوئی حرام لقمہ آپؒ کے دستِ مبارک میں آجاتا تو اُنگلیوں کی ایک مخصوص رگ بے اختیار پھڑکنے لگتی اور آپؒ فوراً ہاتھ روک دیتے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو حضرت شیخ حارث محاسبیؒ سے اس قدر محبت تھی کہ آپؒ کو چچا کہہ کر پکارتے تھے۔

معتبر روایت ہے کہ ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے شیخ کو اپنے گھر کی طرف سے گزرتے دیکھا۔ حضرت حارث محاسبیؒ کے چہرے پر شدید نقاہت اور پژمردگی کے آثار نمایاں تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے یہ کیفیت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ شیخ فاقے سے ہیں۔ آپ نے کسی تامل کے بغیر عرض کیا۔

''چچا! گھر میں تشریف لائیے اور کچھ تناول فرمالیجئے۔''

حضرت شیخ ابو عبداللہ حارث محاسبیؒ نے ایک نظر اپنے شاگرد کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

''بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر آپ اپنے گھر تشریف لے آئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے شیخ کے سامنے دستر خوان بچھایا اور پُرتکلف کھانا رکھ دیا۔ اتفاق سے گزشتہ رات پڑوس میں شادی تھی اور یہ کھانا وہیں سے آیا تھا۔

حضرت شیخ حارث محاسبیؒ نے ایک لقمہ لیا اور اپنے منہ میں رکھ لیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے حیرت سے دیکھا کہ حضرت شیخ حارثؒ نے کئی بار اس لقمے کو منہ میں گھمایا اور پھر دفعتہً دستر خوان چھوڑ کر گھر سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ شیخ کے پیچھے پیچھے تھے۔ حضرت حارث محاسبیؒ نے دروازے سے نکل کر ایک گوشے میں وہ لقمہ اُگل دیا اور خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شیخ سے ان کے طرزِ عمل کے بارے میں کچھ دریافت کر سکیں۔

دو چار دن بعد جب خلوت میسر آئی، حضرت جنید بغدادیؒ نے استاد محترم کو اس روز کا واقعہ یاد دلایا۔

حضرت شیخ ابو عبداللہ حارث محاسبیؒ نے جواب میں فرمایا۔ ''اُس دن میں فاقے سے تھا۔ میں نے چاہا کہ کچھ کھا کر تمہارا دل خوش کر دوں مگر اللہ نے مجھ پر ایک خاص کرم فرمایا ہے کہ اگر غذا کے کسی لقمے میں کسی قسم کا شبہ ہو تو وہ میرے حلق سے نہیں اُترتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں تمہارا دیا ہوا کھانا نہیں کھا سکا۔'' اس کے بعد حضرت شیخ حارث محاسبیؒ نے اپنے شاگرد سے پوچھا۔ ''وہ کھانا کہاں سے آیا تھا؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے شرمسار انداز میں عرض کیا۔ ''دراصل وہ کھانا پڑوسی نے

بھیجا تھا۔"

حضرت شیخ حارثؒ نے فرمایا۔ "مجھے اسی وقت خیال آیا تھا کہ یہ کھانا تمہارے گھر کا نہیں ہوسکتا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے شیخ کو اپنی طرف متوجہ پا کر درخواست کی۔ "آپ اس روز بغیر کھانا کھائے تشریف لے آئے تھے۔ اگر آج مجھے سعادت بخشیں تو بڑی عنایت ہو گی۔" حضرت جنیدؒ نے محسوس کرلیا تھا کہ شیخ آج بھی فاقے سے ہیں۔ اسی لئے آپ نے حضرت حارث محاسبیؒ سے گھر چلنے کی التجا کی تھی۔

حضرت شیخؒ فوراً آمادہ ہو گئے۔ مگر اتفاق سے اس روز حضرت جنید بغدادیؒ کے یہاں سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آپ کو بہت خفت محسوس ہوئی لیکن شیخؒ کے بھوکے ہونے کے خیال سے آپ نے وہی خشک روٹی پیش کر دی۔ اس وقت حضرت جنید بغدادیؒ کے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب حضرت شیخ حارثؒ نے وہ سوکھی روٹی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کھائی اور پھر بڑے پُر جوش لہجے میں فرمایا۔

"جب کسی فقیر کی دعوت کرنا ہو تو ایسی ہی چیز پیش کیا کرو۔"

یہی وہ مردِ جلیل تھے جن کی صحبتوں سے حضرت جنید بغدادیؒ تین سال تک فیض یاب ہوئے۔ حضرت شیخ ابوعبداللہ حارث محاسبیؒ کا انتقال 234ھ میں ہوا۔ اس وقت حضرت جنید بغدادیؒ کی عمر مبارک اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ آپ اپنے استادِ گرامی کو یاد کر کے اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"افسوس! معرفت کا آفتاب غروب ہو گیا اور میں اپنے خانۂ دل کو اس کی ضیاء باریوں سے منور نہ کرسکا۔"

بے شک حضرت جنیدؒ کا جذبۂ طلب تسکین نہ پا سکا مگر حضرت شیخ حارث محاسبیؒ کی شکل میں آپ نے اس مردِ جسور و غیور کو دیکھ لیا تھا جس کی پیشانی نیاز اللہ کے سوا کسی کے آستانے پر خم نہیں ہوئی۔

حضرت سری سقطیؒ کا مقصد بھی یہی تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ دوسرے مشائخ کی صحبتوں سے فیض یاب ہو جائیں۔ پھر جب حضرت ابوثورؒ اور حضرت شیخ حارث محاسبیؒ جیسے بزرگ دنیا سے رخصت ہو گئے تو حضرت جنید بغدادیؒ اپنے حقیقی مرشد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور حضرت سری سقطیؒ کے دستِ حق پرست پر باقاعدہ بیعت کی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت سری سقطیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے سے پہلے حضرت جنید بغدادیؒ

اپنے والد محترم کی دکان پر بیٹھتے تھے۔ اس وقت جناب محمد کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت جنیدؒ نے شیشے کی آبائی تجارت چھوڑ کر ریشم کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آپؒ کو کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ کرنا پڑے۔ پھر یہ دکان بھی بند کر دی اور حضرت سری سقطیؒ کے مکان میں گوشہ نشیں ہو کر شدید مجاہدے کئے۔

حضرت سری سقطیؒ نے بڑے عجیب انداز سے آپ کی روحانی تربیت کی۔ ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا۔ "مجھے کوئی ایسا قصہ سنایئے جس سے عشق کی سچائی کا اظہار ہوتا ہو۔"

حضرت سری سقطیؒ نے ایک کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور کاغذ حضرت جنید بغدادیؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ "اسے پڑھ لینا۔ یہ تمہارے لئے سات سو قصوں سے بہتر ہے۔"

جب حضرت جنید بغدادیؒ نے تنہائی میں اس کاغذ کو کھول کر دیکھا تو عربی زبان کے تین اشعار درج تھے۔

"جب میں نے محبت کا دعویٰ کیا تو وہ بولی کہ تم جھوٹے ہو۔"

"اگر تمہیں محبت ہے تو تمہارے ہاتھ پاؤں اتنے درست کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"یاد رکھو کہ محبت اس وقت تک نہیں ہوتی کہ جب تک پیٹ کمر سے نہ لگ جائے۔"

"اور تم اتنے کمزور ہو جاؤ کہ کوئی تمہیں پکارے تو جواب نہ دے سکو۔"

"اور اس قدر گھل جاؤ کہ گوشۂ چشم کے سوا کچھ باقی نہ رہے جس سے تم آنسو بہاؤ اور عاجزی کرو۔"

یہ اشعار پڑھ کر حضرت جنید بغدادیؒ پر گریہ طاری ہو گیا اور آپ کے سینے میں آتشِ عشق اس طرح بھڑکی کہ حق تعالیٰ کی یاد کے سوا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔

حضرت سری سقطیؒ کے روحانی اسباق بہت سادہ نظر آتے ہیں مگر ان کی گہرائی کو سمجھ کر عمل پیرا ہونا بہت دشوار ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے پیر و مرشد کے درس کو بغور سنا اور اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا۔ یہاں تک کہ آپ پر معرفت کے عجیب عجیب اسرار منکشف ہونے لگے۔ آپ اپنے اسی روحانی انقلاب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"میں نے پیر و مرشد کو اکثر یہ کہتے سنا تھا کہ عشق میں بندہ ترقی کر کے اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ اگر کوئی اس کے چہرے پر تلوار بھی مارے تو اسے خبر نہ ہو۔ مجھے اس بات کے درست ہونے میں شک تھا کہ کیا انسان پر ایسی کیفیت بھی طاری ہو سکتی ہے؟ مگر جب میں خود اسی حالت سے گزرا تو مجھے پیر و مرشد کے قول مبارک پر یقین آیا کہ آپ سچ فرماتے تھے۔"

بچپن میں حضرت سری سقطیؒ نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ اللہ تیری زبان سے فیض جاری کرے گا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو اس بات کا بہت قلق تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ پیر و مرشد کا اشارہ تقریر و کلام کے ذریعے دنیاوی کامیابی حاصل کرنے کی طرف ہے۔ پھر جب آپ حضرت سری سقطیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تو اکثر پیر و مرشد کی اس پیش گوئی کو یاد کر کے اُداس ہو جاتے تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ سمجھتے تھے کہ آخرت کی کامیابی آپ کی قسمت میں نہیں ہے۔ وقت گزرتا رہا اور حضرت جنید بغدادیؒ ریاضت و مجاہدات کے ساتھ پیر و مرشد کی خدمت گزاری میں مصروف رہے۔ آخر ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کا سارا رنج و ملال دور کر دیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز میرے پاس چار درہم تھے۔ میں نے انہیں پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

"یہ آپ کی نذر ہیں، انہیں قبول فرمالیجئے۔"

حضرت سری سقطیؒ اپنے مرید خوش اعتقاد کے اس طرزِ عمل سے بہت خوش ہوئے اور کسی تامل کے بغیر وہ درہم قبول فرمائے۔ پھر حضرت جنید بغدادیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "نوجوان! تجھے فلاحِ آخروی حاصل ہونے کی بشارت ہو۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کو پیر و مرشد کے ارشادِ گرامی پر حیرت ہوئی۔ پھر نہایت پُرشوق لہجے میں عرض کرنے لگے۔ "آپ کس وجہ سے فرماتے ہیں؟"

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا۔ "مجھے اس وقت چار ہی درہم کی ضرورت تھی اور میں نے دعا مانگی تھی کہ الٰہی! یہ رقم مجھے اس شخص کے ہاتھ سے دلوا جو تیرے نزدیک فلاح پانے والا ہو۔"

علامہ یافعیؒ کا بیان ہے کہ اس خوشخبری کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ کا وہ ملال دور ہو گیا جو پیر و مرشد کی پہلی پیش گوئی سے آپ کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔

پھر حضرت جنیدؒ کی روحانیت اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ حضرت سری سقطیؒ بھی آپ کی گفتگو سن کر حیران رہ جاتے تھے۔ ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایک شخص خانقاہ میں بے ہوش پڑا تھا اور حضرت سری سقطیؒ اس کے قریب حیران و پریشان بیٹھے تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فکرمندانہ لہجے میں عرض کیا۔

"آخر اس شخص کو کیا ہوا ہے کہ یہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے؟"

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا۔ "میں نے اس کے سامنے قرآن حکیم کی ایک آیت

تلاوت کی جسے سنتے ہی یہ بے ہوش ہو گیا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔ "آپ وہی آیت دوبارہ تلاوت کیجئے۔ یہ شخص ہوش میں آ جائے گا۔"

حضرت سری سقطیؒ نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنے مرید اور بھانجے کی طرف دیکھا۔ پھر با آوازِ بلند وہی آیت مقدسہ تلاوت کی۔ چند لمحوں بعد وہ شخص ہوش میں آ گیا۔ حضرت سری سقطیؒ کو اس بات پر تعجب ہوا مگر آپ اجنبی کی موجودگی میں خاموش رہے۔ پھر جب وہ شخص چلا گیا تو آپ نے حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا۔

"تمہیں یہ تدبیر کس طرح معلوم ہوئی؟"

حضرت جنید بغدادیؒ نے بصد احترام عرض کیا۔ "حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن مبارک سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی چلی گئی تھی اور پھر اسی کُرتے سے آپ کی آنکھوں کی روشنی بحال ہو گئی تھی۔"

حضرت سری سقطیؒ کو حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ جواب بہت پسند آیا۔

دراصل یہ اس تاریخ ساز واقعے کی طرف اشارہ تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپؑ کو ایک کنوئیں میں پھینک دیا تھا اور آپؑ کے پیرہن مبارک کو کسی بھیڑ بکری کے خون سے رنگین کر کے حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

"یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا اُٹھا کر لے گیا اور یہ خون آلود پیرہن ان کی نشانی ہے۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے محبوب فرزند کے پیرہن کو آنکھوں سے لگائے دن رات روتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؑ آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو گئے۔ پھر جب کئی سال بعد حضرت یوسف علیہ السلام سخت ترین آزمائشوں سے گزر کر مصر کے بادشاہ بنے تو آپؑ کے تمام بھائیوں نے حاضر ہو کر اپنے گناہ کی معافی مانگی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو معاف کرنے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیٹے کے غم میں روتے روتے اپنی بینائی گنوا چکے ہیں۔ یہ جانگداز خبر سن کر حضرت یوسف علیہ السلام بہت آزردہ ہوئے۔ پھر اپنا پیرہن مبارک اتار کر بھائیوں کو دیا۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹے کا کُرتا آنکھوں سے لگایا تو گم شدہ بینائی لوٹ آئی۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اسی واقعے کی روشنی میں حضرت سری سقطیؒ کو مشورہ دیا تھا کہ جس آیت کے سننے کے بعد وہ شخص بے ہوش ہوا ہے، اسی آیت کو سن کر دوبارہ ہوش

میں آ جائے گا۔ یہ حضرت جنید بغدادیؒ کے کشف اور ذہانت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

اب حضرت جنید بغدادیؒ معرفت کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے کہ استاد گرامی حضرت سری سقطیؒ بھی بعض مسائل میں آپؒ سے مشورے لیا کرتے تھے اور شاگرد کی رائے کو اپنی رائے سے افضل قرار دیا کرتے تھے۔

ایک دن آپؒ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت سری سقطیؒ کو نہایت متفکر پایا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے سبب پوچھا تو پیر و مرشد نے فرمایا۔

"جنید! کچھ دیر پہلے ایک نوجوان میرے پاس آیا تھا۔" اس نے پوچھا۔ "شیخ! توبہ کے کیا معنی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "توبہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے گناہوں کو نہ بھولے۔"

نوجوان نے بے ساختہ کہا۔ "شیخ! آپ کا جواب غلط ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آخر تم یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

نوجوان بڑے پُر یقین لہجے میں بولا۔ "توبہ تو یہ ہے کہ انسان اپنے گناہوں کو یکسر فراموش کر دے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں اسی وقت سے پریشان ہوں کہ نوجوان کے اور میرے جواب میں نمایاں فرق ہے۔"

پیر و مرشد کی گفتگو سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔ "اس میں تشویش اور فکر کی کیا بات ہے؟ میرے نزدیک تو وہ نوجوان ہی سچ کہتا تھا۔"

حضرت سری سقطیؒ نے بڑی حیرت سے اپنے شاگرد کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"جنید! تم اس نوجوان کی تائید میں کوئی دلیل بھی رکھتے ہو؟"

حضرت جنید بغدادیؒ نے عرض کیا۔ "شیخ محترم! صفائی کے وقت غبار کا خیال رکھنا بھی غبار ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کا جواب اس قدر منطقی تھا کہ حضرت سری سقطیؒ نے بلا تامل اسے قبول کر لیا۔ یہی وہ موقع تھا جب پیر و مرشد نے اپنے ذہین اور نکتہ آفریں مرید سے کہا۔

"جنید! اب وقت آ گیا ہے کہ تم وعظ کرنا شروع کرو۔ قدرت نے بہت پہلے ان آنکھوں کو جو کچھ دکھایا تھا، اب اس منظر کے متشکل ہونے کی ساعت آ گئی ہے۔ مخلوقِ خدا کے درمیان اپنی زبان کھولو کہ حق تعالیٰ نے تمہیں اعجاز بیانی سے متصف کیا ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے پیر و مرشد کا ارشادِ گرامی سن کر سر جھکا لیا۔

حضرت سری سقطیؒ آپ کی قوتِ گفتار پر گواہی دے رہے تھے مگر حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ حال تھا کہ انسانی مجمع میں بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ گوشہ نشین ہو کر خانقاہ میں بیٹھتے تو سیر روحانی کرتے کرتے اس مقام تک جاتے جہاں اس زمانے کے بڑے بڑے مشائخ کا بھی گزر نہیں تھا لیکن جب کسی مجلس میں کوئی فقہی مسئلہ بیان کرنے کی کوشش کرتے تو جھجک آڑے آ جاتی۔ الغرض اسی کشمکش میں روز و شب گزرتے رہے۔

حضرت سری سقطیؒ وعظ کہنے کے لئے فرماتے اور حضرت جنید بغدادیؒ پیر و مرشد کے احترام میں خاموشی اختیار کر لیتے۔

کبھی کبھی تنہائی میں خود کو مخاطب کر کے فرماتے۔ "جنید! تُو لوگوں سے کیا کہے گا اور تیری بات کون سنے گا؟"

آخر ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرما رہے تھے۔ "جنید! اللہ نے تمہیں ایک نعمت خاص بخشی ہے۔ اس کا شکر ادا کرنے کے لئے وعظ کہا کرو۔"

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حکم سنتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ کی ذہنی گرہ کھل گئی۔

روایت ہے کہ اسی رات پچھلے پہر جب یہ مبارک ترین خواب دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ بیدار ہوئے تو حضرت سری سقطیؒ تشریف لائے اور آپؒ کے دروازے پر دستک دی۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے دروازہ کھولا تو پیر و مرشد کو موجود پایا۔

"جنید! ہم تو کب سے کہہ رہے تھے کہ وعظ کہا کرو مگر تم نے ہماری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔" حضرت سری سقطیؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "لیکن اب تو تمہیں رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دربارِ اقدس سے بھی اجازت مل گئی ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے حیرت و ادب کے ساتھ سر جھکا لیا۔ پھر نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

"میرا خیال تھا کہ میں فصاحت زبان اور بلاغت بیان سے محروم ہوں۔ اسی لئے ڈرتا تھا کہ کہیں لوگ میری بات سننے سے انکار نہ کر دیں۔"

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا۔ "تمہاری جھجک اور ڈر اپنی جگہ مگر اب تو تمہیں بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سند حاصل ہو گئی ہے۔ بندگانِ خدا کا ہجوم تمہارا منتظر ہے۔ خلوت سے مجلس کی طرف آؤ۔"

دوسرے دن حضرت جنیدؒ جامع مسجد میں حاضر ہوئے۔ نماز ادا کرنے کے بعد حاضرینِ مسجد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اہلِ ایمان! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''جنید! ہم تو برسوں سے گوش بر آواز ہیں مگر آپ کچھ کہتے ہی نہیں۔'' حاضرینِ مجلس میں سے چند معمر افراد نے بغداد کے ایک نوجوان فقیر کی بات سن کر کہا۔ ''ہمیں یقین ہے کہ آپ بڑی پُرتاثیر گفتگو کریں گے اور لوگوں کے سوئے ہوئے ذہنوں کو جگائیں گے اور مُردہ دلوں میں نئی روح پھونکیں گے۔''

لوگوں کا یہ اندازِ پذیرائی دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ حیران رہ گئے۔ دراصل یہ بھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روحانی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے وعظ بیان کرنے سے پہلے ہی سامعین کو حضرت جنیدؒ کی طرف متوجہ فرما دیا تھا۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے رب کی کبریائی بیان کی۔ پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں جذباتِ عقیدت کا اس طرح اظہار کیا کہ حاضرین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر آپؒ نے فقر کے موضوع پر تقریر شروع کی تو سننے والے وارفتہ ہو گئے۔ بعض لوگوں پر آپ کے پُرسوز لہجے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر مسجد کے فرش پر تڑپنے لگے۔

اپنی پہلی تقریر کے سلسلے میں خود حضرت جنید بغدادیؒ کا بیان ہے کہ ہونٹوں کو جنبش دینے سے پہلے مجھے اپنے عجزِ بیان کا شدید احساس تھا مگر جب میں نے سامعین کو حد سے زیادہ پُرجوش دیکھا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ مسجد کے منبر سے جنید بول رہا ہے اور لوگ اس کے کلام کی تاثیر سے بے خود ہوئے جا رہے ہیں۔

آپؒ کی پہلی تقریر کے بعد بغداد کے گلی کوچوں میں ایک ہی بات کا شور تھا کہ اس شہر میں حضرت جنیدؒ جیسا فصیح البیان کوئی دوسرا نہیں۔ کعبی کا شمار فرقہ مقتدلہ کے معتبر ائمہ میں ہوتا ہے۔ ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ کے چند شاگرد کعبی کی مجلس میں پہنچے۔ اس وقت کعبی بڑے زور و شور کے ساتھ کسی موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ پھر جب تقریر ختم ہوئی تو حاضرینِ مجلس نے ان کی تعریف کی۔ کعبی نے حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگردوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے بغداد میں ان کے شیخ کو دیکھا ہے جن کا نام جنیدؒ ہے۔ ادیب ان کے پاس الفاظ کی بندش سیکھنے آتے ہیں۔ فلسفی اس لئے حاضر ہوتے ہیں کہ جنیدؒ سے فلسفے کی موشگافیوں کو سمجھ سکیں اور شعراء اس لئے آتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت کا عروج دیکھ سکیں۔''

اگرچہ کعبی مختلف نظریات کے حامل تھے مگر حضرت جنید بغدادیؒ کے فضل و کمال کو خراجِ تحسین پیش کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ لوگ جو صوفیاء پر کم علمی اور بے خبری کا الزام عائد کرتے ہیں، انہیں کعبی کی گواہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

پھر جب حضرت جنید بغدادیؒ کے وعظ کی شہرت عام ہوئی تو ایک دن ایک عیسائی نوجوان آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔ ''لوگ آپ کو شیخِ زمانہ کہتے ہیں۔''

''یہ لوگوں کا حُسنِ ظن ہے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عیسائی نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر تم یہی بات کہنے کے لئے میرے پاس آئے ہو تو اپنا وقت برباد نہ کرو۔ میں اللہ کا ایک بندہ ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ مقامِ شیخ بہت بلند ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔''

''دراصل میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی زبان سے پیغمبر اسلام کے اس قول کی تشریح سن سکوں۔'' یہ کہہ کر عیسائی نوجوان نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث پاک سنائی۔ ''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

عیسائی نوجوان کا سوال سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے سر جھکا لیا۔ حاضرینِ مجلس نے محسوس کیا جیسے حضرت شیخؒ کسی خاص نکتے پر غور فرما رہے ہیں۔ چند لمحوں بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے سر اٹھایا اور عیسائی نوجوان کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اب تم مسلمان ہو جاؤ۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشادِ گرامی سنتے ہی عیسائی نوجوان آپؒ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آیا اور اس نے برسرِ مجلس با آواز بلند اللہ کی وحدانیت اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر گواہی دی۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی مجلس میں اس وقت جو لوگ موجود تھے، ان میں سے بعض افراد نے عیسائی نوجوان سے پوچھا۔ ''تمہارا سوال کچھ اور تھا اور حضرت شیخؒ نے جواب کچھ اور دیا۔''

''حضرت شیخؒ نے میرے سوال کا صحیح جواب دیا۔'' عیسائی نوجوان کہنے لگا۔ ''میں بہت دنوں سے ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ مذہب اسلام اختیار کروں یا نہ کروں؟ میرا دل اسلام کی حقانیت کی طرف کھنچتا تھا مگر میرے پیروں میں آبا و اجداد کے عقائد کی زنجیر تھی۔ اسی دوران میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث مبارک

سنی اور اس کی تشریح کے لئے حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخؒ کے کشفِ باطنہ کا یہ حال ہے کہ میری ذہنی کشمکش سے آگاہ ہو گئے۔ پھر مجھے یقین آ گیا کہ واقعتہً مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔“

ابھی حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ روحانی سفر بلندیوں کی طرف جاری تھا کہ آپؒ کو اپنی زندگی کے دوسرے جانگداز صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلا صدمہ آپؒ کے استادِ گرامی حضرت شیخ ابوعبداللہ حارث محاسبیؒ کی جدائی کا تھا۔ یہ المناک واقعہ 243ھ میں پیش آیا تھا۔ آٹھ سال بعد یعنی 251ھ میں حضرت شیخ سری سقطیؒ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اگرچہ حضرت جنید بغدادیؒ کے والدِ محترم جناب محمد بھی پہلے سال وفات پا چکے تھے لیکن اس موقع پر آپؒ نے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

”مجھے والدِ محترم کی جدائی کا شاق ہے لیکن میں ابھی یتیم نہیں ہوا ہوں۔“

لوگوں نے پوچھا۔ ”شیخ! یہ بات آپ کس طرح کہہ رہے ہیں؟“

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ”ابھی میرے شیخ حضرت سری سقطیؒ حیات ہیں۔“

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ سات سال کی عمر سے حضرت سری سقطیؒ کے ساتھ اس طرح وابستہ تھے کہ وہی آپؒ کے باپ تھے اور وہی ماں کا درجہ رکھتے تھے۔

حضرت سری سقطیؒ کو بغداد کے اس خطے میں دفن کیا گیا جسے ”شونیزیہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اہلِ دل کی نظر میں اس خطۂ اراضی کی بہت اہمیت ہے۔ یہی وہ مبارک مقام ہے جہاں بڑے بڑے مشائخ محوِ خواب ہیں۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

اگرچہ اب حضرت جنید بغدادیؒ کو تصوف کے سلسلے میں کسی رہنما کی ضرورت نہیں تھی لیکن سوزِ عشق آپؒ کو ہمہ وقت مضطرب رکھتا تھا۔ پھر اسی اضطراب نے حضرت جنید بغدادیؒ سے مطالبہ کیا کہ آپ حضرت شیخ ابوحفص عمر حدادؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دل اور روح کی تشنگی مٹائیں۔ حضرت، حدادؒ کا شمار اس زمانے کے جلیل القدر اولیاء میں ہوتا ہے۔ حضرت حدادؒ کے سامنے جب بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا تو آپؒ کا چہرۂ مبارک اس قدر متغیر ہو جاتا کہ حاضرینِ مجلس بھی آپؒ کی اس کیفیت کو محسوس کر لیتے۔ حضرت حدادؒ نہایت سختی کے ساتھ شریعت پر عمل کرتے تھے۔ اس خارزار میں کبھی کسی نے آپؒ کے قدموں کو لڑکھڑاتے نہیں دیکھا۔

حضرت ابوحفص حدادؒ کا مشہور قول ہے۔

”جو شخص ہر وقت اپنے اعمال اور حالات کا اندازہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

نہیں کرتا اور اپنے دل کے جذبات کو ملزم نہیں ٹھہراتا، اُس کا نام مَردوں کی فہرست میں نہیں ہے۔“

ابھی حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت ابوحفص حدادؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ خوبئ تقدیر سے حضرت حدادؒ اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کے ساتھ خود ہی بغداد میں جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو اطلاع ملی تو آپؒ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دوسرے دن ہی حضرت حدادؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ جب خانقاہ کے اندر داخل ہوئے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ حضرت ابوحفص حدادؒ کے تمام مرید اور خدام سر جھکائے، دست بستہ پیر و مرشد کے سامنے کھڑے تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو یوں محسوس ہوا جیسے حضرت حدادؒ کوئی شہنشاہ ہیں، دربار آراستہ ہے اور غلام گردنیں خم کئے کھڑے ہیں۔

ایک روحانی درس گاہ میں دربارِ سلطانی کی شان دیکھ کر، حضرت جنید بغدادیؒ آگے بڑھے اور حضرت ابوحفص حدادؒ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”شیخ! آپ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو دربارِ شاہی کے آداب و اطوار سکھاتے ہیں؟“

حضرت ابوحفص حدادؒ نے فرمایا۔ ”ابوالقاسم! جو کچھ تم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، دراصل ایسا نہیں ہے۔ میں شاہی رعب و جلال کی حاجت نہیں رکھتا۔ مگر تم یہ بات ذہن نشین کر لو کہ ظاہری حسنِ ادب، باطنی حسنِ ادب کا عنوان ہوتا ہے۔ جس شخص کو اس ظاہری دنیا میں آداب کی تعلیم نہیں ملی، وہ دوسری دنیا میں بھی آداب کے لوازم کو بجا نہ لا سکے گا۔“

حضرت ابوحفص حدادؒ کا جواب سن کر حضرت جنید بغدادیؒ خاموش ہو گئے۔ واضح رہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ اس قدر محتاط صوفی تھے کہ زندگی بھر خرقہ نہیں پہنا۔ آپؒ کی درس گاہ کے آداب دوسری تمام خانقاہوں کے آداب سے مختلف تھے اور اسی وجہ سے آپؒ نے حضرت ابوحفص حدادؒ کی روش پر اعتراض کیا تھا مگر حضرت حدادؒ نے اپنے اس عمل کی وضاحت اس طرح کی کہ حضرت جنید بغدادیؒ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت شیخ حدادؒ کو انتہائی عقیدت کے ساتھ مہمان بنایا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نہایت سادہ غذا استعمال فرماتے تھے مگر اپنے محترم مہمان اور ان کے خدمت گاروں کے لئے لذیذ اور پُرتکلف کھانے پکواتے۔

حضرت ابوحفص عمر حدادؒ کچھ دن تک اس رسمِ میزبانی کو بغور دیکھتے رہے مگر جب حضرت جنید بغدادیؒ کی طرف سے مسلسل پُرتکلف دعوتوں کا اہتمام ہوتا رہا تو ایک دن

حضرت حدادؒ نے فرمایا۔

''جنید! میرے ساتھیوں کو یہ نعمتیں کھلا کھلا کر ان کے نفس کو سرکش نہ بناؤ۔ فقیر کے نزدیک سچی مہمان نوازی یہ ہے کہ تکلف چھوڑ دو اور جو کچھ حاضر ہے اسے لاکر پیش کرو۔ اکثر ایسے تکلفات کا انجام یہی ہوتا ہے کہ میزبان اور مہمان میں مفارقت ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس بے تکلفی میں مہمان کا جانا اور قیام کرنا یکساں معلوم ہوتا ہے۔''

حضرت ابوحفص حدادؒ کا انتقال 260 ھ میں ہوا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نو سال تک اس مردِ جلیل کی روحانی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔

آپؒ کے دیگر اساتذہ میں حضرت شیخ محمد بن علیؒ اور حضرت محمد بن مسروق طوسیؒ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ حضرت شیخ محمد بن علیؒ کا انتقال 276 ھ میں ہوا۔ حضرت محمد بن مسروق طوسیؒ 298 ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسی سال حضرت جنید بغدادیؒ نے انتقال فرمایا۔ ان تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن مسروق طوسیؒ وہ بزرگ تھے جن سے حضرت جنید بغدادیؒ نے آخر عمر تک استفادہ کیا۔

علامہ ابنِ جوزی نے حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک اور استاد حضرت یعقوب زیاتؒ کا بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت یعقوب زیاتؒ کی عارفانہ شان کے بارے میں خود حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔

''میں پہلی بار اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت شیخ یعقوبؒ کے دروازے پر بہت سے طالبانِ دیدار کھڑے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ حضرت شیخؒ ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دیں گے۔ مگر یکایک خانقاہ کے دروازے پر ایک خدمت گار نمودار ہوا اور اس نے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شیخ نے فرمایا ہے کہ کیا تم لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا مشغلہ کافی نہیں جو اس کا ذکر چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو؟''

حضرت شیخ یعقوب زیاتؒ کا ارشادِ گرامی سن کر دوسرے درویش تو کچھ نہیں بولے مگر میں نے آپؒ کے خادم سے عرض کیا۔

''جب حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی اسی کے شغل میں داخل ہے تو پھر ہم لوگ کیوں حاضر نہ ہوں؟''

جب حضرت شیخ یعقوب زیاتؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کی بات سنی تو آپؒ کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ حضرت جنید بغدادیؒ نہایت ادب اور عقیدت کے ساتھ حضرت شیخ یعقوبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور توکل کے موضوع پر بحث

چھیڑ دی۔

اتفاق سے اس وقت حضرت شیخ یعقوبؒ کے پاس ایک درہم موجود تھا۔ آپؒ نے فوراً اپنے ایک خدمت گار کو طلب کیا اور وہ درہم اُس کے حوالے کر دیا پھر اس کے بعد ''توکل'' کے موضوع پر نہایت عالمانہ تقریر کی جسے سن کر حضرت جنید بغدادیؒ بہت متاثر ہوئے۔ پھر جب تقریر ختم ہوگئی تو آپؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''مجھے اس بات سے شرم آئی کہ توکل پر گفتگو کروں اور خود میرے پاس کچھ رقم موجود ہو۔''

اس واقعے سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت شیخ یعقوب زیاتؒ کس شان کے صوفی تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ ''میں نے دو سو اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔''

مگر یہ اہلِ طلب کی کم نصیبی ہے کہ وہ حضرت جنید بغدادیؒ کے چند ہی استادوں کے حالات اور نام سے باخبر ہو سکے۔ باقی بزرگوں کے اسمائے گرامی اور حالاتِ زندگی پر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تاہم جن اساتذہ کے نام اور علمی کارنامے تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نابغۂ روزگار انسان تھے اور ان ہی کے بے داغ ہاتھوں نے اس لالۂ صحرائی کی حنابندی کی تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

عام طور پر اولیائے کرام نے طلبِ علم اور جذبۂ عشق کی پیاس بجھانے کے لئے انتہائی طویل اور دشوار گزار سفر اختیار کئے۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کو دیکھئے کہ بجستان (ایران) میں پیدا ہوئے۔ پھر اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ساتھ مسلسل چودہ سال تک سفر میں رہے۔ پھر ملتان تشریف لائے جو اس وقت کفر و باطل کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے بعد اجمیر تشریف لائے اور اس سنگلاخ علاقے میں ہمیشہ کے لئے سکونت پذیر ہو گئے جہاں کے دیوتا بھی پتھر کے بنے ہوئے تھے اور زمین بھی پتھر کی تھی اور اس پر بسنے والے انسان بھی پتھر کے دل و دماغ رکھتے تھے۔ اگر آپ تاریخِ تصوف کا مطالعہ کریں گے تو ایسے بہت سے نام نظر آ جائیں گے۔ مگر شاید جنید بغدادیؒ وہ تنہا صوفی ہیں جو بغداد میں پیدا ہوئے، اسی شہر میں تعلیم حاصل کی اور اسی خطۂ ارض میں آسودۂ خاک ہوئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنی زندگی میں صرف دو بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل

کی۔ ایک بار حضرت سری سقطیؒ سات سال کی عمر میں اپنے ہمراہ حجازِ مقدس لے گئے تھے۔ پھر دوسری مرتبہ عہدِ جوانی میں آپؒ مکہ معظمہ حاضر ہوئے۔ ارکانِ حج ادا کرنے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ مشائخ کی ایک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ عشقِ الٰہی کا مسئلہ چھیڑا ہوا تھا۔ ہر بزرگ اپنے اپنے تجربے اور مشاہدے کے اعتبار سے عشق کے رموز و نکات بیان کر رہا تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ پورے انہماک کے ساتھ مشائخ کی تقریریں سن رہے تھے۔ آخر بہت دیر بعد ایک بزرگ آپؒ سے مخاطب ہوئے۔

''شیخ بغدادی! آپ بھی تو کچھ فرمائیے کہ عشقِ الٰہی کیا ہے؟''

مشائخ کی فریاد سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے سر جھکا لیا اور کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ پھر آپؒ نے سر اٹھایا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اے رہروانِ کوچۂ عشق! میں تم سے کیا کہوں کہ عشقِ الٰہی کیا ہے؟ جو بندہ اپنے نفس سے گزر جائے وہ اللہ کے قریب ہے۔ ظاہر کی آنکھ ہو یا دل کی، وہ ہر حال میں اسی کا جمال دیکھ رہا ہے۔ ایسے بندے کا دل اگر تجلیاتِ حق سے جل جائے تو کیا تعجب ہے؟ اور اگر وہ مست و بے خود ہو جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قادرِ مطلق اس پر غیب کے پردے اُٹھا دیتا ہے۔ پھر وہ کلام کرتا ہے تو اللہ کا۔ اس کی زبان اللہ کے سوا کسی لفظ سے آشنا نہیں ہوتی۔ وہ حرکت کرتا ہے تو اللہ کے حکم سے اور اگر ٹھہرتا ہے تو اللہ کی مرضی سے مختصر یہ کہ وہ اللہ کے لئے ہے اور اللہ ہی کے ساتھ ہے۔''

ابھی حضرت جنید بغدادیؒ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ تمام مشائخ بے چین ہو کر رونے لگے۔ پھر سب نے بیک زبان کہا۔

''اے تاج العارفین! اس سے بڑھ کر عشق کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اللہ آپ کے کمالات میں مزید ترقی عطا فرمائے۔''

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

اسی سفرِ حج کا واقعہ ہے کہ ایک رات حضرت جنید بغدادیؒ تن تنہا طوافِ کعبہ کے لئے حاضر ہوئے تو ایک عورت بھی خانۂ خدا کا طواف کر رہی تھی۔ اچانک عورت کی پُرسوز آواز اُبھری۔ وہ طواف کے ساتھ کچھ عاشقانہ اشعار بھی پڑھتی جاتی تھی۔ حضرت جنید بغدادیؒ عورت کے اس عمل کو کچھ دیر تک برداشت کرتے رہے۔ پھر جب اس خاتون کی آواز طواف میں خلل انداز ہونے لگی تو آپؒ اس کے قریب پہنچے اور نہایت پُرجلال لہجے میں فرمانے لگے۔

''اے بے خبر! تجھے اس مقدس و محترم مقام پر اپنی ناپاک آرزوئیں بیان کرتے

ہوئے شرم نہیں آتی؟''

عورت نے معذرت کرنے کی بجائے اسی قسم کے چند اور عاشقانہ اشعار پڑھ دیئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ وہ عورت آپؒ سے پوچھنے لگی۔

''میں کیا کر رہی ہوں، اسے چھوڑو...... تم یہ بتاؤ کہ خدا کا طواف کرتے ہو یا خانۂ خدا کا؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے کسی تامل کے بغیر فرمایا۔ ''ہم اہلِ ایمان خانۂ خدا کا طواف کرتے ہیں۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کا جواب سن کر عورت بے قرار ہو گئی اور اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔

''سبحان اللہ! تیری مخلوق میں ایسے لوگ بھی ہیں جو پتھر کی طرح بے حس ہیں اور پتھر کے گرد طواف کرتے ہیں۔ انہیں بتا کہ تیری مرضی کیا ہے اور تُو ان سے کیا چاہتا ہے؟''

عورت کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ پر وجد کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ پھر جب ہوش آیا تو وہ عورت غائب تھی جس نے آپؒ کو بڑے مؤثر اور منفرد انداز میں توحید پرستی کا سبق دیا تھا۔

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

حضرت جنید بغدادیؒ مکہ معظمہ میں قیام فرما تھے کہ عجمیوں کی ایک جماعت آئی اور آپؒ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئی۔ (عجمی دنیا کے ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو عرب سے تعلق نہیں رکھتا) یہ عجمی لوگ حضرت جنید بغدادیؒ سے مذہبی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک ایک شخص آیا اور حلقہ توڑ کر آگے بڑھا۔ پھر وہ حضرت جنید بغدادیؒ کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک تھیلی آپؒ کے سامنے رکھ دی۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے حیرت سے تھیلی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''اس میں پانچ سو دینار ہیں۔'' اجنبی شخص نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کیا۔ ''میری شدید خواہش ہے کہ آپ انہیں اپنے مبارک ہاتھوں سے فقراء میں تقسیم فرما دیں۔''

''یہ کام تو تم خود بھی انجام دے سکتے ہو۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''دراصل میں نہیں جانتا کہ مستحق لوگ کون ہیں؟'' اجنبی شخص نے عرض کیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک نظر اس شخص کی طرف دیکھا پھر فرمایا۔ ''اس کے علاوہ تمہارے پاس کچھ اور رقم بھی ہے؟''

''جی ہاں! اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔'' اس شخص نے اپنی آسودہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اپنے موجودہ سرمائے کے علاوہ مزید دولت بھی کمانا چاہتے ہو؟'' حضرت جنید بغدادیؒ نے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟'' اجنبی شخص نے کہا۔ ''یہی رسمِ دنیا ہے کہ انسان اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے دن رات کوششیں کرتا ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے دیناروں سے بھری ہوئی تھیلی اٹھائی اور اس شخص کو لوٹاتے ہوئے فرمایا۔

''پھر تو تم ہی اس رقم کے زیادہ مستحق ہو۔ اسے واپس لے جا کر اپنے خزانے میں جمع کر دو۔''

❀ ..... ✿ ✿ ..... ❀

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ قدرت نے عجیب عجیب انداز سے میری دستگیری کی اور عبرت کے لئے عجیب عجیب مناظر دکھائے۔ ایک بار میں سفرِ حج کے دوران ریگستان سے گزر رہا تھا کہ اک شخص ببول کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ ایک نوجوان تھا جو حق کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔

''لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں مگر تم ایک ہی جگہ بیٹھے ہو۔'' میں نے نوجوان سے دریافت کیا۔ ''آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

نوجوان نے بڑی اُداس نظروں سے میری طرف دیکھا اور کفِ افسوس ملتے ہوئے بولا۔ ''مجھ پر ایک کیفیت طاری تھی مگر جب یہاں پہنچا تو وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ میں اسی کی تلاش میں بیٹھا ہوں۔''

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس نوجوان کی بات سنی اور اپنا سفر جاری رکھا۔

پھر جب میں ارکانِ حج ادا کرنے کے بعد واپس آیا تو اسی نوجوان کو دیکھا۔ وہ اس جگہ سے ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر بیٹھا تھا مگر اس بار اس کے چہرے پر افسردگی کی بجائے خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

میں قریب پہنچا اور اس نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ''اب یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''مجھے میری کھوئی ہوئی چیز اسی جگہ ملی ہے۔'' نوجوان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اسی لئے میں اس مقام پر پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہوں۔''

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات زیادہ اچھی تھی۔ کھوئی چیز کی تلاش میں بیٹھنا یا اس جگہ بیٹھ رہنا جہاں گوہرِ مراد ہاتھ آیا ہو۔''

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ کو غیب سے قدم قدم پر ہدایت دی جاتی تھی اور عجیب عجیب انداز سے معرفت کے رموز و نکات سمجھائے جاتے تھے۔

❀ ..... ✿ ✿ ..... ❀

حضرت جنید بغدادیؒ کبھی تنہا سفر کرتے تھے اور کبھی اربابِ ذوق کے ساتھ۔ ایک بار آپؒ بہت سے مشائخ اور خدام کے ہمراہ جا رہے تھے۔ راستے میں جبل سینا (کوہ طور) پر سے آپ کا گزر ہوا۔ وہاں عیسائی راہبوں کی ایک خانقاہ تھی جس کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ اسی چشمے کے کنارے قیام فرمایا۔

اس سفر میں ایک قوال بھی آپؒ کے ہمراہ تھا۔ کچھ دیر بعد مجلس سماع گرم ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام صوفیاء اور مشائخ بے خود ہو گئے اور بے تابانہ رقص کرنے لگے۔ سماع کے دوران حضرت جنید بغدادیؒ پر بھی وجد کی انتہائی کیفیت طاری ہو جاتی تھی مگر آپؒ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے تھے۔ راہب اور ان کا پیشوا بڑی حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ خانقاہ سے نکل کر نیچے آیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے تمام ساتھی حالتِ جذب میں تھے۔ راہبوں کے پیشوا نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''تمہیں تمہارے خدا کی قسم! میری بات سنو! تم لوگ یہ کیا شغل کر رہے ہو؟''

راہبوں کا پیشوا حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک ایک ساتھی کو پکڑ کے یہ الفاظ دہراتا مگر وہ مست و بے خود لوگ ذرا بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

آخر بہت دیر بعد جب محفلِ سماع ختم ہوئی اور تمام بزرگ اپنی اپنی نشستوں پر قرینے کے ساتھ بیٹھ گئے تو راہبوں کے پیشوا نے مشائخ سے پوچھا۔

''میں آپ حضرات کو بار بار اپنی طرف بلاتا تھا مگر آپ لوگ میری بات سنتے ہی نہیں تھے۔''

''تمہارا ہمیں اس حالت میں پکارنا ایک کارِ بے سود تھا۔'' ایک بزرگ نے راہبوں کے پیشوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

راہب نے مسلمان بزرگ کی بات بڑی حیرت سے سنی۔ ''مگر اب تو تم لوگ میری بات سن رہے ہو۔ اُس وقت تمہاری کیا حالت ہو گئی تھی؟''

''ہم نہیں بتا سکتے کہ سماع کے وقت ہماری کیا کیفیت ہوتی ہے؟'' دوسرے بزرگ نے کہا۔ ''بس ہم اپنے اللہ کے تصور میں گم رہتے ہیں اور ماسوا سے ہمارا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔''

راہبوں کے پیشوا کو بڑی حیرت تھی کہ آخر انسان پر جذب کی یہ کیفیت کس طرح طاری ہوتی ہے؟ پھر اس نے حضرت جنید بغدادیؒ کے ساتھیوں سے پوچھا۔ ''تمہارا شیخ کون ہے؟''

تمام لوگوں نے حضرت جنید بغدادیؒ کی طرف اشارہ کر دیا۔

راہبوں کا پیشوا اپنی جگہ سے اٹھا اور حضرت جنید بغدادیؒ کے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔

''شیخ! میں نے کچھ دیر پہلے آپ لوگوں کو ایک عجیب کھیل میں مشغول پایا۔ آپ کے تمام ساتھی اس طرح مست و بے خود تھے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہیں تھی۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''جسے تم کھیل سمجھ رہے ہو، یہ دنیا داروں کا نہیں، اہلِ دل کا مشغلہ ہے۔ جب ہم لوگ یہ شغل کرتے ہیں تو پھر اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔''

''کیا تم لوگوں کو اس کھیل میں کوئی خاص لذت حاصل ہوتی ہے؟'' راہبوں کے پیشوا نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔

''تم اس لذت کو نہیں سمجھو گے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''کیا تم نے ایسی کوئی لذت دیکھی ہے کہ جسے پا کر انسان دیگر تمام لذتوں کو فراموش کر دے۔ یہ ہمارا روحانی کھیل ہے جسے سماع کہتے ہیں۔''

''کیا سماع دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے؟'' راہبوں کے پیشوا نے ایک اور سوال کیا۔

''نہیں۔ سماع صرف ہمارے ساتھ ہی مخصوص ہے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''مگر ہمارے نزدیک سماع کی ایک شرط ہے کہ اس عمل سے شریعت کے کاموں میں کوئی خلل نہ پڑے اور انسان کا زہد و تقویٰ متاثر نہ ہو۔''

''میں اور میرے ساتھی بھی برسوں سے سخت ترین ریاضتیں کر رہے ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو یہ کیفیت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔'' عیسائی پیشوا نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے دل اور دماغ شب و روز ایک عجیب سے اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں۔ آج تم لوگوں کو دیکھا تو اپنی محرومیوں کا احساس ہوا۔''

یہ کہہ کر عیسائی پیشوا حضرت جنید بغدادیؒ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آیا۔ پھر اس کے دوسرے ساتھی راہب بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ آپؒ کی محفلِ سماع کی ایک ادنیٰ کرامت تھی کہ جسے دیکھتے ہی راہبوں نے اپنا آبائی مذہب بدل ڈالا۔

✽ ✽ ✽

حضرت جنید بغدادیؒ اپنی زندگی کا ایک عجیب واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ایک دن میرا گزر کوفے کی طرف ہوا۔ وہاں میں نے ایک عالیشان مکان دیکھا جو کسی بڑے رئیس کی ملکیت معلوم ہوتا تھا۔ مکان کے چاروں طرف بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ قدم قدم پر دولت کے کرشمے نمایاں تھے۔ اس مکان کے کئی دروازے تھے اور ہر دروازے پر نوکروں اور غلاموں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں دل ہی دل میں ان لوگوں کی بدمستی اور بے خبری پر افسوس کر رہا تھا کہ اچانک ایک خوش گلو عورت کی آواز سنائی دی۔ میں نے غور سے سنا۔ وہ عورت نہایت دلکش آواز میں یہ اشعار گا رہی تھی۔

''اے مکان! تیری چار دیواری کے اندر کبھی کوئی غم نہ آئے۔''

''اور تیرے رہنے والوں کے ساتھ یہ ظالم زمانہ کبھی مذاق نہ کرے۔'' (جیسے کہ اس کی عادت ہے کہ وہ بڑے بڑے محلات کو آن کی آن میں ویران کر دیتا ہے)

''جب کوئی مہمان بے گھر ہو تو ایسے مہمان کے لئے تُو کیسا اچھا گھر ہے۔'' (ترجمہ)

حضرت جنید بغدادیؒ نے عورت کے اشعار سنے تو یہ فرماتے ہوئے آگے تشریف لے گئے۔ ''ان لوگوں کی حالت بہت نازک اور سنگین ہے۔ یہ دنیا اور اس کی رنگینیوں میں مکمل طور پر غرق ہو چکے ہیں۔''

پھر ایک مدت کے بعد اتفاق سے حضرت جنید بغدادیؒ کا گزر اسی محل نما مکان کی طرف سے ہوا۔ آپؒ نے حیران ہو کر اس عشرت کدے پر نظر ڈالی۔ کوئی نوکر اور غلام وہاں موجود نہیں تھا۔ در و دیوار انتہائی خستہ ہو چکے تھے اور جگہ جگہ سے اینٹیں گر رہی تھیں۔ ریشمی پردے دھجیوں میں تبدیل ہو کر پیوند خاک ہو چکے تھے۔ دروازے تباہ ہو گئے تھے۔ اب نہ صاحب جائیداد تھا، نہ دربان۔ فانوسوں اور قمقموں کی جگہ چمگادڑوں نے اپنے مسکن بنا لئے تھے۔ جن کمروں میں شہر کے بڑے بڑے امراء جمع ہو کر دادِ عیش دیا کرتے تھے، اب وہاں آوارہ کتوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ ہر طرف ذلت و نحوست برس رہی تھی اور ہاتفِ غیب یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔

''اس کی ساری خوبیاں جاتی رہیں اور رنج و الم نمایاں ہو گئے۔ زمانے کا یہی مزاج ہے کہ وہ ایسے کسی مکان کو صحیح و سالم نہیں چھوڑے گا۔''

"لہٰذا اس مکان کے اندر جو اُنس (محبت) پایا جاتا تھا، اسے وحشت میں بدل دیا گیا اور کیف و سرود کی جگہ شورِ ماتم برپا کر دیا گیا۔"

مکان کی یہ حالت دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ کو بہت افسوس ہوا۔ پھر آپؒ نے ایک پڑوسی سے پوچھا۔

"اس عشرت کدے کے مکین کہاں چلے گئے؟"

پڑوسی نے بتایا۔ "مالک مکان مر گیا اور اس کے مرتے ہی مکان کی ساری رونقیں بھی رخصت ہو گئیں۔"

"اب اس مکان میں کوئی بھی نہیں رہتا؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

"ایک بوڑھی عورت کسی کمرے میں پڑی رہتی ہے۔" پڑوسی نے بتایا۔ "محلے والے ترس کھا کر اسے کھانا کھلا دیتے ہیں۔ ورنہ وہ عورت مکان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی۔"

حضرت جنید بغدادیؒ اضطراب کے عالم میں کمرے تک پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔

اندر سے ایک غم زدہ عورت کی آواز اُبھری۔ "کون ہے؟"

"میں اللہ کا ایک بندہ ہوں۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"واپس چلے جاؤ!" عورت نے انتہائی افسردہ لہجے میں کہا۔ "اب میرے سوا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ وہ زمانے رخصت ہوئے۔ مجھ غریب کو پریشان نہ کرو۔"

"دروازہ کھولو!" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

عورت نے دروازہ کھول دیا اور حضرت جنید بغدادیؒ کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

"اس مکان کی وہ آب و تاب، وہ چاند سورج (پری چہرہ لوگ) وہ کنیزیں اور غلام اور وہ عیش و عشرت کے دلدادہ لوگ کہاں چلے گئے؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے اس عورت سے پوچھا۔

یہ سن کر وہ عورت زار و قطار رونے لگی۔ "آسائش کی وہ چیزیں کسی اور کی تھیں۔ اس مکان کے رہنے والے غلطی سے انہیں اپنا سمجھ بیٹھے تھے۔ سارا ساز و سامان کرائے کا تھا۔ جہاں سے آیا تھا، وہیں چلا گیا۔"

"کئی سال پہلے جب میں ادھر سے گزرا تھا تو میں نے ایک عورت کو یہ اشعار پڑھتے سنا تھا۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے وہی اشعار دہرا دیئے۔

اس عورت نے ایک سرد آہ کھینچی اور نہایت رقت آمیز لہجے میں بولی۔ "خدا کی قسم! میں وہی عورت تھی جس کی زبان سے آپ نے یہ اشعار سنے تھے۔"

"پھر یہ عالیشان مکان اور اس کے مکین اس حال کو کیسے پہنچے؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے پوچھا۔

"انسان جس دنیا پر غرور کرتا ہے، وہ دنیا باقی نہیں رہتی۔ بس اس کے حال پر ماتم اور عبرت کرنے والے باقی رہ جاتے ہیں۔" عورت کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"پھر تم اس ویرانے میں اکیلی کیوں پڑی ہو؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے اس شکستہ حال عورت سے پوچھا۔

"آپ بھی کیسا ظلم کرتے ہیں کہ مجھ سے اس مکان کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے کے لئے کہتے ہیں؟" اس عورت نے نہایت غم زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "کیا یہ مکان میرے دوستوں اور پیاروں کا مسکن نہیں تھا؟ کیا یہ ان اگلی محبتوں کا یادگار نہیں ہے؟ پھر میں اسے چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں؟ کہنے والے کیا کہیں گے کہ میں صرف رونقوں اور خوشیوں کی ہم نشیں تھی، بدحالی اور ویرانی کی شریک نہیں۔ یہ تو بڑی بدعہدی ہو گی۔ لوگ میرے عمل کو بدترین بے وفائی سے تعبیر کریں گے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی، جب تک میرا جسم اس عمارت کے ملبے میں دفن نہیں ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر اس عورت نے ایک اور شعر پڑھا جو محبت کی خلش اور سوز و گداز سے لبریز تھا۔

"میرا دل مقاماتِ محبت کی تعظیم کرتا ہے۔ اگرچہ ان کے کمرے نعمت و مال سے محروم ہو چکے ہیں۔" (ترجمہ)

یہ شعر سنتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ "سچ کہا تم نے۔" حضرت جنیدؒ پر کیف و جذب کی عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر آپ اسی عالم میں بغداد تشریف لے آئے۔

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے۔

"آج بھی مجھے اس عورت کے خلوص اور استقلال پر حیرت ہوتی ہے۔ دراصل عشق صادق اسی کو کہتے ہیں کہ انسان ایک در کا پابند ہو جائے۔ پھر چاہے موجِ خوں سر سے گزرے یا قیامت نازل ہو جائے مگر عاشق اسی آستانے پر پڑا رہے۔ بے شک! وہ عورت اپنے عشق میں سچی تھی اور اسی کے ذریعے معلم غیب نے مجھے یہ سبق دیا کہ عشق کیا ہے اور وفاداری کسے کہتے ہیں۔"

جو بے خبر لوگ صوفیائے کرام کو گوشہ نشیں، کم ہمت اور تن آسان سمجھتے ہیں انہیں جان لینا چاہئے کہ صوفی سے زیادہ اولوالعزم کوئی دوسرا انسان نہیں ہوتا۔ صوفیاء زندگی بھر اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے ہیں جو دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ صوفی کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں تسبیح بھی ہوتی ہے اور شمشیر بھی......... وہ حالتِ جمال میں اپنے نفس پر ''لا الٰہ الا اللہ'' کی ضرب لگاتا ہے اور جلال کے عالم میں کفار کی شہ رگ پر ضربِ نوکِ سناں........ وہ برسرِ منبر فصاحت و بلاغت کے دریا بھی بہاتا ہے اور سرِ مقتل اپنے خون میں بھی نہاتا ہے۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ اور حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ معرکۂ حق و باطل میں اس طرح شہید ہوئے کہ ان کی شمشیریں کفار کے خون سے رنگین تھیں۔

اسی رسمِ ایمانی کو تازہ کرنے کے لئے ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کے دل میں بھی شوقِ جہاد پیدا ہوا۔ نتیجتاً آپؒ ہتھیاروں سے لیس ہو کر گھر سے نکلے اور لشکرِ اسلام میں شامل ہو گئے۔ ابھی یہ سفر جاری تھا کہ ایک دن آپؒ پر امیر لشکر کی نظر پڑی۔ حضرت جنید بغدادیؒ اپنے ظاہری لباس سے پریشان حال نظر آ رہے تھے۔ امیر لشکر نے مفلس و نادار سمجھ کر آپؒ کے لئے کچھ رقم بھیجی اور ہدایت کی کہ اس سے اپنے سفر کا خرچ پورا کریں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے وہ رقم قبول کر لی اور پھر ان نمازیوں میں تقسیم کر دی جو بظاہر آپؒ سے بھی زیادہ محتاج نظر آ رہے تھے۔

اسلامی لشکر ایک مقام پر خیمہ زن ہوا اور لوگ ظہر کی نماز میں مشغول ہو گئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے بھی نماز ادا کی اور سوچنے لگے کہ مجھے وہ رقم قبول نہیں کرنی چاہئے تھی اور اگر قبول کر لی تھی تو اسے نمازیوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ جو بات مجھے پسند نہیں، وہ بات میں نے اپنے بھائیوں کے لئے کیوں پسند کی؟ ابھی حضرت جنید بغدادیؒ اسی غور و فکر میں تھے کہ آنکھ لگ گئی۔ آپؒ نے دیکھا کہ نظروں کے سامنے بہت سے عالیشان محل جگمگا رہے تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے حیران ہو کر کہا۔ ''اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ محلاتِ زرنگار کس کے لئے ہیں؟''

جواب میں ایک مردِ غیب کی صدا سنائی دی۔ ''یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جنہیں تم نے وہ رقم دی تھی۔''

''میرے لئے بھی کچھ ہے؟'' بے اختیار حضرت جنید بغدادیؒ کی زبان سے یہ بات

نکل گئی۔

''وہ سب سے اونچا اور دلکش محل تمہارا ہے۔'' مردِ غیب نے کہا۔

''مجھے فضیلت کیوں دی گئی؟'' حضرت جنید بغدادیؒ نے پوچھا۔

جواب میں مردِ غیب نے کہا۔

''وہ لوگ اس لئے ثواب کے حق دار ٹھہرے کہ انہوں نے مال خرچ کر دیا......اور تم اس لئے انعام کے مستحق قرار پائے کہ اپنے سے زیادہ ضرورت مند لوگوں میں مال تقسیم کر دیا۔ پھر بھی تمہیں اپنے اس عمل پر ندامت تھی۔ آخر یہی ندامت بارگاہِ ذوالجلال میں مقبول ہوئی اور تمہارا ثواب دوگنا کر دیا گیا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ اس جہاد میں شریک ہوئے مگر جنگ شروع ہونے سے پہلے جب امیر لشکر کو معلوم ہوا کہ آپ کون ہیں تو اس نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ! آپ واپس تشریف لے جائیں۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے حیران ہو کر امیر لشکر کی طرف دیکھا۔

امیر لشکر آپؒ کی استفہامیہ نظروں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ اس نے بصد احترام عرض کیا۔

''آپ خانقاہ کے گوشے میں بیٹھ کر بھی انسانی معاشرے کی برائیوں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ یہ کام ہمارے لئے چھوڑ دیجئے۔''

اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ اپنی خانقاہ میں واپس لوٹ آئے اور آخری سانس تک اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے احباب میں ایک بزرگ حضرت جعفر بن نصیرؒ بھی شامل تھے۔ وہ آپؒ کی نفس کشی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میں ایک دن جنیدؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اچانک آپ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''جعفر! آج میرا دل انجیر کھانے کو چاہ رہا ہے۔''

میں نے عرض کیا۔ ''شیخ! میں ابھی بازار جا کر انجیر لے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''اس طرح نہیں۔ پہلے پیسے لیتے جاؤ۔''

میں نے عرض کیا۔ ''شیخ! مجھے بھی تو اپنی خدمت کا موقع دیجئے۔''

''میرے پاس اتنے پیسے تو ہیں۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ پھر ایک درہم نکال کر مجھے دیا اور ہدایت کی۔ ''انجیر وزیری لے کر آنا۔'' (''وزیری'' انجیروں کی ایک مخصوص اور اعلیٰ قسم ہے)

حضرت جعفر بن نصیرؒ بازار گئے اور انجیر لا کر حضرت شیخؒ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

پھر جب افطار کا وقت آیا تو حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک انجیر اٹھا کر منہ میں رکھا اور دوسرے ہی لمحے اسے نکال کر پھینک دیا۔ پھر حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''انہیں میرے سامنے سے اُٹھا کر لے جاؤ اور خواہش مندوں کی تواضع کرو۔''

حضرت جعفر بن نصیرؒ نے جھجکتے ہوئے عرض کیا۔ ''شیخ! آپ نے اس قدر شوق سے انجیر منگوائے۔ پھر انہیں کھانے سے انکار کر دیا۔ آخر اس کا کوئی خاص سبب؟''

اپنے دوست کی بات سن کر حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمانے لگے۔ ''جب میں نے انجیر منہ میں رکھا تو ایک صدائے غیب سنائی دی۔

''جنید! تجھے شرم نہیں آتی۔ تُو نے جس خواہش نفس کو میرے لئے چھوڑا، اس کے دام میں پھر گرفتار ہوا جاتا ہے۔''

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک موقع پر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''چالیس سال تک زہد و تقویٰ کی زندگی گزارنے کے بعد ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ اب میں اپنے مقصود میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اس خیال سے مجھ پر سرشاری کی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔

پھر دوسرے ہی لمحے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے غور سے سنا۔ یہ آواز میرے ہی دل سے اُبھر رہی تھی۔ ''جنید! اب وقت آ گیا ہے کہ تجھے تیرے زنار کا سرا دکھا دیا جائے۔''

(زنار اس ڈوری کو کہتے ہیں جسے ہندو کمر اور گردن کے گرد اپنے مذہب کی نشانی کے طور پر ڈالتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے جو آواز سنی تھی اس کا مفہوم یہ تھا کہ اے اپنی عبادت پر ناز کرنے والے تجھے معلوم ہے کہ تُو کتنا گمراہ ہے؟ تجھے اپنی توحید پرستی پر غرور ہے لیکن درحقیقت تُو اپنے گلے میں بت پرستوں کی طرح زنار ڈالے ہوئے ہیں)

یہ آواز سنتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں آپؒ کی زبان سے نکلا۔

''خداوندا! تیرے بندے جنید سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے؟''

غیب سے آواز سنائی دی۔ ''اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو گا کہ تُو ابھی تک موجود ہے؟''

(یہاں موجود ہونے سے مراد یہ ہے کہ بندے نے ابھی تک اپنی ذات کی نفی نہیں کی اور خواہشاتِ نفسانی کی پرستش میں لگا ہوا ہے)

یہ آواز سن کر حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپؒ نے سر جھکا لیا اور انتہائی ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

''جو وصل کے قابل نہیں ہے، اس کی تمام نیکیاں گناہ ہیں۔''

آپؒ مریدوں کی تربیت کے لئے اکثر یہ واقعہ سناتے ہوئے اپنے الفاظ دہرایا کرتے تھے۔

''انسان کی معراجِ طلب یہ ہے کہ اسے وصال کی نعمت حاصل ہو........اور اگر اسے محبوب کی قربت حاصل نہ ہو تو اس کی ساری کوششیں رائیگاں ہیں۔''

اُردو کے مشہور شاعر فانی بدایونی نے بھی معرفت کے اس نکتے کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے رہتے ہیں
جو تری بزم میں شامل نہیں ہونے پاتے

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ کی حیاتِ مبارک میں پیش آنے والا ہر واقعہ درسِ عبرت تھا یا قدرت کی طرف سے دیا جانے والا ایک ناقابل فراموش سبق۔ ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ ''مسجد شونیزیہ'' میں تشریف فرما تھے اور کسی جنازے کے منتظر تھے۔ اسی دوران مسجد میں ایک فقیر داخل ہوا اور اس نے لوگوں سے مانگنا شروع کر دیا۔

فقیر کا یہ رنگ دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ نے دل میں سوچا۔ ''کاش یہ شخص کسی ایک کے سامنے اپنی حاجت بیان کرتا اور اس طرح تمام لوگوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتا۔''

ابھی آپؒ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ میدان میں ایک جنازہ لایا گیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے نمازِ جنازہ ادا کی اور گھر تشریف لے آئے۔ پھر جب آپؒ رات کو سوئے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ ایک کمرے میں تشریف فرما ہیں۔ اچانک ایک گوشے سے کچھ لوگ برآمد ہوئے۔ وہ ایک لاش کو اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر وہ لاش حضرت جنید بغدادیؒ کے سامنے رکھی گئی۔ آپؒ بڑی حیرت اور خاموشی سے اجنبی انسانوں کا یہ عمل دیکھ رہے تھے۔

''جنید! اس کا گوشت کھاؤ۔'' اجنبی لوگوں نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں مُردہ خور نہیں ہوں۔ پھر اس مُردے کا گوشت کس طرح کھاؤں؟'' حضرت

جنید بغدادیؒ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''کل جس طرح مسجد میں بیٹھ کر کھایا تھا، اسی طرح کھاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ اجنبی لوگ چلے گئے مگر لاش وہیں رکھی رہی۔

حضرت جنید بغدادیؒ فوراً سمجھ گئے کہ انہیں اس طرح تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ آپؒ نے غور سے لاش کی طرف دیکھا۔ یہ اسی فقیر کی لاش تھی جو مسجد میں بھیک مانگ رہا تھا اور جسے دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ نے دل میں سوچا تھا کہ کاش یہ شخص کسی ایک کے سامنے اپنا دستِ طلب دراز کرتا۔ یہ ایک قسم کی غیبت تھی اور غیبت کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی انسان کی غیبت کی، گویا اُس نے اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھایا۔ اجنبی لوگوں نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''یہ تو غیبت کی سزا ہے۔ بے شک! اس فقیر کی طرف سے میرے دل میں برا خیال گزرا تھا مگر میرے دل کی بات زبان پر نہیں آئی تھی۔''

فوراً ہی ایک صدائے غیب سنائی دی۔ ''جنید! تم جس مرتبے کے انسان ہو، اس کے دل میں اس قسم کا خیال گزرنا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا کہ کسی دوسرے انسان سے عملی طور پر سرزد ہو۔''

یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ پر رقت طاری ہو گئی اور آپؒ نے نہایت عاجزی کے ساتھ توبہ کی........''اے اللہ! میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اگر تُو نے مجھے معاف نہیں فرمایا اور میرے حال پر رحم نہیں کیا تو میں خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جاؤں گا۔''

جیسے ہی حضرت جنید بغدادیؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، وہ لاش غائب ہو گئی۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد سو گئے۔ آپؒ نے خواب میں ایک برہنہ شخص کو دیکھا جو بڑی بے حیائی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ آپؒ نے اس سے پوچھا۔

''اے بے حیاء شخص! تُو کون ہے؟''

وہ بڑی بے شرمی کے ساتھ مسکرایا۔ ''جنید! مجھے نہیں پہچانتے؟ میں وہی ہوں جو روزِ ازل راندۂ درگاہ قرار پایا تھا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''تجھے لوگوں سے شرم نہیں آتی جو اس طرح بے

لباس ہو کر مارا مارا پھر رہا ہے۔''

''یہ لوگ انسان کب ہیں۔ پھر میں ان سے کیوں شرم کروں؟'' شیطان نے کہا۔

''تیرے خیال میں اللہ کی زمین انسانوں سے خالی ہو گئی ہے؟'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''مجھے یہی تو غم ہے کہ میں اپنی کوششوں میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔'' شیطان نے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی اس زمین پر کچھ انسان باقی ہیں جو مسجد ''شونیزیہ'' میں بیٹھے ہیں۔ ان ہی لوگوں نے میرے جسم کو زخموں سے بھر دیا ہے اور میرے دل کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔''

یہ کہہ کر ابلیس غائب ہو گیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھ کھلی تو آپؒ نے فوری طور پر لاحول پڑھی اور وضو کیا۔ اس وقت آدھی رات کا وقت تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ گھر سے نکلے اور تیز رفتاری کے ساتھ ''مسجد شونیزیہ'' کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر آپؒ نے چند لوگوں کو دیکھا جو استغراق کے عالم میں اپنے زانوؤں پر سر رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب حضرت جنید بغدادیؒ ان درویشوں کے قریب تشریف لے گئے تو انہوں نے سر اٹھا کر کہا۔

''جنید! اس خبیث نے جو کچھ کہا تم نے سن لیا مگر اس مردود کی باتوں میں نہ آنا۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ ان درویشوں کی بات سن کر حیران رہ گئے۔ اس روز آپؒ کو اندازہ ہوا کہ اللہ کی زمین پر کیسے کیسے برگزیدہ بندے موجود ہیں جنہیں کوئی جانتا تک نہیں۔

چند سال بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے اسی انداز کا خواب دیکھا کہ شیطان بازار میں برہنہ پھر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا ہے جسے وہ خوشی خوشی کھا رہا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے ابلیس کو اس حالت میں دیکھ کر کہا۔

''تجھے انسانوں کے مجمع عام میں اس طرح برہنہ پھرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

''ابوالقاسم! کیا اب بھی زمین پر ایسا کوئی شخص رہ گیا ہے جس سے مجھے شرم آئے؟''

ابلیس نے بڑے بے باکانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے جن لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی، وہ سب زمین میں دفن ہو گئے اور مٹی انہیں کھا گئی۔''

اسی قسم کے سارے خواب حضرت جنید بغدادیؒ کی رہنمائی کے لئے تھے۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے خواب میں دیکھا کہ آپؒ وعظ کر رہے ہیں۔ یکایک ایک فرشتہ آسمان سے اُترا اور آپؒ کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ پھر اس فرشتے نے حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا۔

''جن کاموں کے ذریعے اللہ کے بندے قربت الٰہی حاصل کرتے ہیں، ان کاموں میں سب سے افضل کام کون سا ہے؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''وہ کام جو میزان میں بھی مخفی ہے اور کہنے میں بھی۔''

فرشتے نے حضرت جنید بغدادیؒ کا جواب سنا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ ''خدا کی قسم! یہ وہ کلام ہے جو توفیق الٰہی کے بغیر زبان سے ادا نہیں ہوتا۔''

اسی طرح ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ نے خواب میں دو فرشتوں کو دیکھا جو آسمان سے اُتر کر زمین پر آئے۔ ایک فرشتے نے آگے بڑھ کر آپؒ سے پوچھا۔

''صدق کیا ہے؟''

جواب میں آپؒ نے فرمایا۔ ''عہد کو پورا کرنا ہی صدق ہے۔''

''سچ ہے۔'' دونوں فرشتوں نے کہا اور آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔

اپنے ایک اور خواب کے بارے میں حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔

''میں نے ایک بار ایک دربارِ نورانی دیکھا جس میں ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ بس ہر طرف نور ہی نور تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں بارگاہِ صمدیت میں حاضر ہوں۔ یکایک پردۂ نور سے ایک انتہائی پُرجلال آواز اُبھری جسے سن کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''ابوالقاسم! یہ باتیں جو تم کہا کرتے ہو، تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟'' مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں نے عرض کیا۔ ''میں تو صرف وہی بیان کرتا ہوں جو سچ ہوتا ہے۔''

پردۂ غیب سے ارشاد ہوا۔ ''ابوالقاسم! سچ کہتے ہو۔''

الہامی خوابوں کا یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ یہ ایک منفرد انداز کی روحانی تربیت تھی۔ پھر اسی روحانی تربیت نے حضرت جنید بغدادیؒ کو ''سیّد الطائفہ'' بنا دیا۔ یہ آپؒ کا لقب تھا جس کا مفہوم ہے۔ ''اپنے زمانے کے سرداروں کا سردار۔''

ایک رات حضرت جنید بغدادیؒ نمازِ تہجد ادا کرنے کے لئے اُٹھے۔ پھر جب آپؒ نے نیت باندھنے کا ارادہ کیا تو ایک ناقابلِ بیان اضطراب طاری ہو گیا۔ حضرت جنید

بغدادیؒ کمرے میں ٹہلنے لگے مگر بے قراری کی وہ کیفیت ختم نہیں ہوئی۔ آخر آپؒ بستر پر جا کر لیٹ گئے اور غور کرنے لگے کہ اس بے چینی کا سبب کیا ہے؟

''خداوند! میں نہیں جانتا کہ آج یہ بے سکونی کیوں ہے اور مجھے یکسوئی کیوں میسر نہیں ہے؟''

یہ سوچتے سوچتے بہت دیر گزر گئی مگر حضرت جنید بغدادیؒ کو کسی کروٹ چین نہیں آتا تھا۔ پھر یہ اضطراب وحشت میں تبدیل ہو گیا اور حضرت جنید بغدادیؒ گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے اور کھلی فضا میں ٹہلنے لگے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ آپؒ نے ایک شخص کو دیکھا جو بیچ راستے میں چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے جو رات کے پچھلے پہر اس طرح سرِ راہ سو رہا ہے۔ آپؒ آہستہ قدموں سے آگے بڑھے تاکہ سونے والے کی نیند میں خلل واقع نہ ہو۔ حضرت جنید بغدادیؒ دبے پاؤں گزر جانا چاہتے تھے مگر جب آپؒ اس شخص کے قریب پہنچے تو وہ یکایک اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو اس شخص کے اس طرح بیدار ہو جانے پر بڑی حیرت ہوئی۔

پھر وہ آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''ابوالقاسم! آپ نے آنے میں اتنی دیر کی؟''

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کی بات سن کر مجھ پر رعب سا طاری ہو گیا۔ پھر میں نے ذرا سنبھل کر اسے جواب دیا۔

''مجھے کیا خبر تھی کہ آپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر یہ کہ آپ سے کوئی وعدہ تو نہیں تھا کہ جس کی پابندی مجھ پر فرض ہوتی؟''

اس شخص نے کہا۔

''ابوالقاسم! آپ سچ فرماتے ہیں۔ مگر میں نے خداوند ذوالجلال سے جو دلوں کو حرکت دیتا ہے اور مقلب القلوب ہے، یہ دعا کی تھی کہ آپ کے دل کو حرکت دے کر میری جانب مائل کر دے۔''

''بے شک! حق تعالیٰ نے میرے دل کو آپ کی طرف مائل کر دیا۔ مگر یہ تو بتائیے کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

اس شخص نے کہا۔ ''ابوالقاسم! میں ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ یہ سوال مجھے کئی دنوں سے پریشان کر رہا ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ بہت غور سے اس شخص کا سوال سنتے رہے۔ سوال یہ تھا کہ مرضِ نفس کب نفس دوا بن جاتا ہے؟''

جب وہ شخص اپنی بات مکمل کر چکا تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔
''جب انسان اپنی خواہشات کی مخالفت کرتا ہے تو اس حالت میں نفس کا مرض ہی دوا بن جاتا ہے۔''
حضرت جنید بغدادیؒ کا جواب سنتے ہی اس شخص نے اپنے دل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''میں نے تجھے سات بار یہی جواب دیا مگر تُو نے میری بات نہیں مانی۔ ہر مرتبہ یہی کہتا رہا کہ جب تک جنید نہیں کہیں گے اس وقت تک نہیں مانوں گا۔ اب تو تُو نے سن لیا کہ جنید کیا کہتے ہیں؟''
یہ کہہ کر وہ شخص تیز رفتاری کے ساتھ چلا گیا۔
حضرت جنید بغدادیؒ کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑے سوچتے رہے کہ وہ شخص کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ نے ارادتاً کبھی کسی کرامت کا اظہار نہیں کیا مگر بڑے بڑے مشائخ آپؒ کے روحانی تصرف کے قائل تھے۔ شیخ خیر نساجؒ، حضرت سری سقطیؒ کے مرید تھے اور حضرت جنید بغدادیؒ کے پیر بھائی۔ ان کا بیان ہے کہ وہ ایک دن اپنے گھر میں آرام کر رہے تھے۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ حضرت جنید بغدادیؒ ان کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ حضرت شیخ خیر نساجؒ نے دل میں کہا کہ یہ کوئی واہمہ ہوگا۔ اس وقت شیخ جنیدؒ یہاں کہاں؟ تھوڑی دیر بعد ان کے دل میں پھر وہی خیال آیا کہ شیخ جنید دروازے پر کھڑے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت خیر نساجؒ نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیا اور کسی کام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی خیال اُبھرا۔ آخر اپنی خیالی رو سے پریشان ہو کر حضرت خیر نساجؒ نے دروازہ کھولا تو حضرت جنید بغدادیؒ کھڑے تھے۔ شیخ نساجؒ کو دیکھتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔
''جب پہلی بار آپ کے ذہن میں خیال آیا تھا تو اسی وقت باہر کیوں نہیں آئے؟''
حضرت شیخ نساجؒ حضرت جنید بغدادیؒ کی اس قوتِ کشف پر حیران رہ گئے۔ اکثر اپنی مجلس میں کہا کرتے تھے۔
''دوسرے بزرگوں کو بھی روحانی تصرف حاصل ہے مگر شیخ جنیدؒ کی روحانیت کا عجیب عالم ہے۔''
مولانا جامی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''نفحات الانس'' میں یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ

مشہور بزرگ کہمش بن حسینؒ ہمدان میں رہتے تھے اور ابومحمدؒ کے لقب سے مشہور تھے۔ ایک دن رات کے وقت کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ ابومحمدؒ کہتے ہیں کہ دستک کی آواز سنتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ شیخ جنیدؒ آئے ہوں گے۔ حالانکہ حضرت جنیدؒ اس وقت ہمدان سے بہت دُور بغداد میں قیام فرما تھے۔ پھر جیسے ہی ابومحمدؒ گھر سے باہر آئے، حضرت جنید بغدادیؒ کو دروازے پر اپنا منتظر پایا۔
''ابومحمدؒ! میں خاص طور پر تم ہی سے ملنے کے لئے بغداد سے یہاں آیا ہوں۔''
حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے۔ پھر کچھ دیر تک گفتگو کرتے رہے اور اس کے بعد تشریف لے گئے۔
دوسرے دن ابومحمدؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو بہت تلاش کیا مگر آپؒ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ قافلے والوں سے جا کر پوچھا تو ان لوگوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

مشہور بزرگ ابوعبداللہ عفیفؒ کہتے ہیں کہ میں حج کے لئے جا رہا تھا۔ روانگی سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ شیخ جنیدؒ کی خدمت میں حاضری دوں گا مگر جب بازار پہنچا تو اپنی صوفیت اور درویشی کا غرور آڑے آ گیا۔ میں تقریباً چالیس دن تک بغداد میں رہا مگر شیخ جنیدؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ اس دوران میرا معمول تھا کہ جب اپنے اوراد و وظائف سے فارغ ہو جاتا تو شہر کے باہر جا کر کسی پاک و صاف چشمے سے پینے کے لئے پانی لے آتا۔ ایک دن میں پانی لینے کی غرض سے جنگل میں چلا جا رہا تھا کہ ایک ہرن کو دیکھا جو کنوئیں میں منہ ڈال کر پانی پی رہا تھا۔ پھر جب میں قریب پہنچا تو ہرن بھاگ گیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو پانی بہت گہرائی میں تھا۔ میں نے ڈول ڈالا مگر رسّی چھوٹی ہونے کی وجہ سے پانی تک نہ پہنچ سکی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر وہ ہرن کس طرح اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ یہ میری آنکھوں کا دھوکا تھا یا پھر ہرن کے لئے کنوئیں کا پانی چھلک اُٹھا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر پانی کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ اب میرا سفر جاری تھا کہ یکایک ایک صدائے غیبی سنائی دی۔
''وہ تیری آنکھوں کا دھوکا نہیں تھا۔ ہماری قدرت سے پانی نے یہاں تک جوش مارا کہ ہرن کے ہونٹوں تک پہنچ گیا۔''
صدائے غیب سن کر میں نے عرض کیا۔ ''خداوند! کیا میرا مرتبہ اس ہرن سے بھی کم ہے؟''
میری شکایت کے جواب میں ہاتف غیب نے کہا۔ ''ہم نے تجھے آزمایا مگر تُو آزمائش

میں پورا نہیں اُترا۔"

ابوعبداللہ عفیفؒ کہتے ہیں کہ میں ندامت وشرمساری کے عالم میں آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "خیر! وہ وقت تو گزر گیا۔ دوبارہ کنوئیں پر جاؤ۔ تمہیں پانی مل جائے گا۔"

میں تیز قدموں کے ساتھ واپس آیا تو واقعتہً کنواں چھلک رہا تھا۔ میں اپنا ڈول بھر کر واپس آ گیا۔ پھر جب کھانے کے بعد میں نے پانی پینا چاہا تو وہی صدائے غیب گونجنے لگی۔

"تُو نے ابھی تک اس راز کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ تجھے اپنی درویشی پر بڑا ناز ہے۔"

یہ آواز سن کر میں لرز گیا۔ "خداوندا! میں بہت عاجز وکمزور ہوں۔ مجھ پر رحم فرما۔"

میری گریہ وزاری کے جواب میں ہاتف غیب نے کہا۔ "ہرن بغیر ڈول کے آیا تھا اور تُو ساز وسامان کے ساتھ کنوئیں تک پہنچا تھا۔ اس لئے ہم نے دونوں کے ساتھ مختلف سلوک کیا۔"

ابوعبداللہ عفیفؒ کہتے ہیں کہ اس پانی میں خاص بات یہ تھی کہ میں جب تک بغداد میں مقیم رہا، وہ پانی ختم نہیں ہوا۔ جس قدر پیتا تھا اسی قدر برتن میں موجود پاتا تھا۔

پھر کچھ دن بعد حضرت ابوعبداللہ عفیفؒ حج کے لئے چلے گئے۔ پھر واپسی میں دوبارہ بغداد آئے مگر حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ ایک روز نماز حج ادا کرنے کے لئے جامع مسجد پہنچے تو اتفاقاً حضرت جنید بغدادیؒ سے ملاقات ہو گئی۔ ابو عبداللہ عفیفؒ کو دیکھتے ہی آپؒ نے فرمایا۔

"ابوعبداللہ! اگر تم صبر کرتے تو خود تمہارے پاؤں کے نیچے چشمہ جاری ہو جاتا۔ کاش! تم نے ایک گھڑی صبر سے کام لیا ہوتا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کی قوتِ کشف پر ابوعبداللہؒ حیران رہ گئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ کی عارفانہ شان یہ تھی کہ آپؒ بڑے بڑے مشائخ کے لئے مرکزِ قلب ونظر تھے۔ ایک دن آپؒ جامع مسجد بغداد میں حاضر تھے کہ ایک اجنبی شخص آیا اور وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرنے لگا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے اس پر ایک نظر ڈالی اور ذکر میں مشغول ہو گئے۔ پھر وہ شخص نماز پڑھ کے مسجد کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ اتفاق سے حضرت جنیدؒ کی نظر اس طرف اُٹھی تو آپؒ نے دیکھا کہ وہ شخص اشارے سے بلا رہا

ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کسی تامل کے بغیر اس کے پاس چلے گئے۔ اس دوران وہ شخص مسجد کے فرش پر لیٹ چکا تھا۔ جب حضرت جنیدؒ اُس کے قریب آئے تو وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

"ابوالقاسم! معاف کرنا! میں آپ کے احترام میں اُٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا۔ مجبوری ہے۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنا کام بتائیے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے جواباً فرمایا۔

"اللہ جل شانہٗ سے ملاقات کا وقت آ گیا ہے۔" اس شخص نے نہایت پُرشوق لہجے میں کہا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کو بہت حیرت ہوئی۔ اس کے چہرے سے بیماری تو کجا نقاہت کے بھی آثار نمایاں نہیں تھے۔ پھر بھی وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا وقت قریب آ گیا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے اجنبی شخص کی بات سن کر سکوت اختیار کیا۔ شاید اس لئے کہ کسی انسان کو اپنی موت کا وقت معلوم نہیں ہو گا۔

"ابوالقاسم! جب میں دنیا سے چلا جاؤں اور میری تجہیز وتکفین مکمل ہو جائے تو میرا یہ خرقہ، چادر اور مشکیزہ ایک شخص کے حوالے کر دینا۔" اجنبی نے کہا۔

"وہ شخص کون ہو گا؟ اور میں اسے کیسے پہچانوں گا؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"اس سلسلے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود تمہیں پہچان لے گا۔" اس شخص نے کہا۔ "وہ ایک نوجوان مغنی (گانے والا) ہے۔ میری یہ امانت اس کے سپرد کر دینا۔"

"تمہارا خرقہ مغنی کے حوالے کر دوں؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے حیران ہو کر پوچھا۔ آپؒ کو اس بات پر حیرت تھی کہ نغمہ وموسیقی سے تعلق رکھنے والا شخص خلافت کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے؟

"ابوالقاسم! آپ کو حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ حق تعالیٰ ہمارے اندازوں سے زیادہ بے نیاز اور رحیم وکریم ہے۔ اسی نے اس مغنی کو یہ رُتبہ عطا فرمایا ہے۔"

ابھی حضرت جنید بغدادیؒ قدرت کے رازوں پر حیران ہو ہی رہے تھے کہ اس شخص نے با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھا اور ہوا کے تیز جھونکے کی طرح دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اجنبی شخص کی تدفین کی۔ پھر

اس کام سے فارغ ہو کر دوبارہ مسجد میں تشریف لائے اور اس شخص کا انتظار کرنے لگے جو مرنے والے کی امانت کا حق دار تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک نوجوان مسجد میں داخل ہوا اور حضرت جنید بغدادیؒ کو سلام کر کے کہنے لگا۔

"ابوالقاسم! میری امانت میرے حوالے کیجئے۔" واضح رہے کہ "ابوالقاسم" حضرت جنید بغدادیؒ کی کنیت تھی۔

"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟" حضرت جنید بغدادیؒ کو ایک بار پھر حیرت ہوئی۔

"یہ بھی کوئی مشکل بات ہے؟" نوجوان مغنی نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا۔ "میں لاکھوں انسانوں کے ہجوم میں پہچان سکتا ہوں کہ شیخ جنید کون ہیں؟ آپ کا چہرہ مبارک ہی آپؒ کی پہچان ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نوجوان مغنی کے طرزِ کلام سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر آپؒ نے فرمایا۔ "نوجوان! تمہیں کیوں کر خبر ہوئی کہ تمہاری امانت میرے پاس ہے۔"

نوجوان مغنی نے عرض کیا۔ "میں چند درویشوں کی صحبت میں بیٹھا تھا کہ اچانک ہاتفِ غیب نے صدا دی۔ شیخ جنید کے پاس جاؤ اور اپنی امانت لے لو۔ اس شخص کی جگہ تم ابدال مقرر کئے گئے ہو۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے مرنے والے کی تمام چیزیں نوجوان کے سپرد کر دیں۔ مغنی نے اسی وقت غسل کیا، خرقہ پہنا، حضرت جنید بغدادیؒ کا شکریہ ادا کیا اور ارضِ شام کی طرف چلا گیا۔

نوجوان مغنی کے جانے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "اے ذاتِ بے نیاز! تُو ہی مالکِ کُل ہے اور سارے خزانے تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں۔ تُو مختار ہے، جسے جس طرح چاہے سرفراز کر دے اور جسے جس طرح چاہے ذلیل و رسوا کر دے۔ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔"

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں مردِ مومن کی شان اس طرح بیان کی ہے کہ ہم اس کے کان بن جاتے ہیں، اس کی آنکھ بن جاتے ہیں اور اس کی زبان بن جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے ایک شعر میں کم و بیش اسی مضمون کو بیان کیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز

بندگی کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ جب بندہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو کارساز عالم اس کی دعا قبول فرما لے۔ ایسے ہی بندے کو "مستجاب الدعوات" کہا جاتا ہے۔ یہی کرامت ہے اور اسی کا نام تصرف روحانی ہے۔ یہی کشفِ باطن ہے اور یہی روشن ضمیری ہے۔ اللہ کے وحدۂ لاشریک ہونے پر غیر متزلزل یقین....... سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی مکمل پیروی....... خدمتِ خلق اور ریاضت و مجاہدات....... یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد بندہ "محبوبیت" کے درجے تک پہنچتا ہے اور پھر عالمِ اسباب میں اسے بحکمِ خدا تصرفِ روحانی حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کو آشوبِ چشم کا مرض لاحق ہوا۔ ابتداء میں آپؒ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی مگر جب تکلیف نے شدت اختیار کی تو خدمت گاروں نے عرض کیا۔

"بغداد میں ایک عیسائی ماہر امراض چشم ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس سے رجوع کیا جائے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔"

دوسرے دن عیسائی طبیب حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے بہت دیر تک آپؒ کی آنکھوں کا معائنہ کیا۔ پھر نسخہ تجویز کرتے ہوئے کہا۔ "شیخ! آپ کی آنکھوں کا ایک ہی علاج ہے کہ انہیں پانی سے بچایا جائے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے عیسائی طبیب کا مشورہ سننے کے بعد فرمایا۔ "میں پانچ وقت وضو کرنے کا عادی ہوں۔ اس صورت میں آنکھوں کو پانی سے کس طرح بچایا جا سکتا ہے؟"

عیسائی طبیب نے جواباً عرض کیا۔ "شیخ! اگر آپ کو اپنی آنکھوں کی سلامتی منظور ہے تو ہر حال میں پانی سے اجتناب کرنا ہوگا۔"

"اگر کسی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکوں؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"تو پھر آپ بہت جلد بینائی سے محروم ہو جائیں گے۔" عیسائی حکیم نے اپنے طبی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا۔

عیسائی طبیب مایوسی کا اظہار کرتا ہوا چلا گیا۔ جاتے جاتے حضرت جنید بغدادیؒ کے مریدوں اور خدمت گاروں کو آخری ہدایت بھی کر گیا۔ "اگر تم اپنے شیخ کی آنکھیں صحیح سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو انہیں وضو نہ کرنے کا مشورہ دو۔"

عیسائی طبیب کے جانے کے بعد مریدین اور خدمت گار حاضر ہو کر عرض کرنے

لگے۔ ''سیّدی! شریعت میں تیمّم کی رعایت اور گنجائش موجود ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے نہایت تحمّل کے ساتھ فرمایا۔ اس کے بعد آپؒ نے مکمل وضو کیا اور نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد تکیے پر سر رکھ کر سو گئے۔ پھر اسی طرح آپؒ نے تہجد کی نماز ادا کی۔

نمازِ فجر کے بعد دن کی روشنی میں تمام مریدوں اور خدمت گاروں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تک نہیں تھی۔ آپؒ آشوبِ چشم کے مرض سے مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے تھے۔

دوسرے دن عیسائی طبیب پھر حاضرِ خدمت ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ یا تو شیخ جنیدؒ نے اس کے مشورے پر عمل کیا ہوگا اور مرض میں کمی آ گئی ہوگی یا پھر دوسری صورت میں بیماری شدت اختیار کر گئی ہوگی۔

''شیخ! آپ کیسے ہیں؟'' عیسائی طبیب نے حضرت جنید بغدادیؒ کی مزاج پُرسی کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ نے مجھے اس عارضے سے نجات دے دی۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''یقیناً آپ نے میری ہدایت پر عمل کیا ہوگا۔'' عیسائی طبیب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''میں نے تمہاری ہدایت کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی تھی۔ مگر یہ مسیحائے حقیقی کی شانِ کریمانہ ہے کہ تمہارے نزدیک جو پانی آنکھوں کے لئے انتہائی مضر تھا وہی پانی اکسیر بن گیا۔''

عیسائی طبیب نے دوبارہ حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور حیران رہ گیا۔ مرض کا دھندلا سا نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ پھر وہ بے ساختہ پکار اُٹھا۔

''یہ مخلوق کا نہیں، خالق کا علاج ہے۔'' اس کے ساتھ ہی عیسائی طبیب نے حضرت جنید بغدادیؒ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔''

❁ ...... ✪ ✪ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ کا مشہور قول ہے کہ ''جس کسی نے اپنے نفس پر اچھی نیت کا دروازہ کھولا، اللہ اس پر توفیق کے ستر دروازے کھول دیتا ہے۔ اسی طرح جس نے اپنے نفس پر بری نیت کا دروازہ کھولا، اللہ اس پر ذلت کے ستر دروازے اس طرف سے کھول دیتا ہے جدھر کی اُسے خبر بھی نہیں ہوتی۔''

ایک بار ایک چور حضرت جنید بغدادیؒ کے مکان میں داخل ہوا۔ اسے اندازہ نہیں تھا

کہ یہ کسی درویشِ بے سروسامان کا ٹھکانا ہے۔ نتیجتاً اس نے ایک ایک گوشہ چھان مارا مگر وہاں ضرورت کے معمولی سامان کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر چیز موجود نہیں تھی۔ بس حضرت جنیدؒ کا ایک پیرہن تھا۔ چور اسی کو لے کر فرار ہو گیا۔

دوسرے دن حضرت جنید بغدادیؒ بازار سے گزر رہے تھے کہ آپؒ کی نظر دو افراد پر پڑی۔ ایک کے ہاتھ میں حضرت جنیدؒ کا پیرہن تھا اور دوسرا اس کے قریب کھڑا تھا۔ اتنے میں ایک خریدار آیا اور پیرہن کو دیکھنے لگا۔ حضرت جنید بغدادیؒ بھی ٹھہر کر اس منظر کو دیکھتے رہے۔ آخر خریدار نے اس پیرہن کو پسند کر لیا اور فروخت کرنے والے شخص سے کہا۔

''میں یہ عبا خریدنے کو تیار ہوں مگر اس سلسلے میں ایک گواہی ضروری ہے۔''

''کیسی گواہی؟'' پیرہن فروخت کرنے والے شخص نے کہا جو دراصل دلال تھا۔ اور اس کے قریب وہ شخص موجود تھا جس نے حضرت جنید بغدادیؒ کا لباس چرایا تھا۔

''اس بات کی گواہی کہ یہ مال تمہارا ہے۔'' خریدار نے کہا۔

''میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ پیرہن اس کی ملکیت ہے۔'' دلال نے چور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک دلال کی گواہی کو نہیں مانتا۔'' خریدار نے کہا اور جانے لگا۔

''سنو میرے عزیز!'' حضرت جنید بغدادیؒ نے تیزی سے آگے بڑھ کر خریدار کو مخاطب کیا۔

خریدار پلٹا اور حضرت جنید بغدادیؒ کو سامنے پا کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

''میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ یہ مال اسی شخص کا ہے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے چور کی پردہ پوشی کرتے ہوئے فرمایا۔

''آپ جیسے بزرگ کی گواہی سب گواہوں سے بڑھ کر ہے۔'' خریدار نے کہا اور پیرہن لے کر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ بھی تشریف لے گئے اور چور کو یہ احساس تک نہیں ہو سکا کہ اس کی ملکیت پر گواہی دینے والا کون تھا؟

❁ ...... ✪ ✪ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''میں نے دس برس تک دل کے دروازے پر بیٹھ کر دل کی حفاظت کی۔ پھر دس برس تک میرا دل میری نگرانی کرتا رہا۔ اب بیس برس ہو گئے کہ نہ میں دل کی خبر رکھتا ہوں اور نہ دل میری خبر رکھتا ہے۔ اس حالت کو تیس سال

ہو گئے کہ ہر طرف حق تعالیٰ کو دیکھتا ہوں۔ اس کے سوا کچھ باقی نہیں........ مگر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔"

جب بندے کے عشق اور محویت کا یہ عالم ہو تو پھر اس میں کیا شک کہ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ۔

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ "مسجد شونیزیہ" میں تشریف لے گئے۔ وہاں بہت سے درویشوں کا اجتماع تھا اور آیاتِ قرآنی پر بحث ہو رہی تھی۔ پھر اسی دوران مردِ مومن کی طاقت کا ذکر چھڑ گیا۔ تمام درویش اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں ایک درویش نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مردِ مومن کی روحانی طاقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں کہ اگر وہ مسجد کے اس ستون سے کہہ دے کہ آدھا سونے کا ہو جا اور آدھا چاندی کا، تو اسی وقت ہو جائے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس درویش کا دعویٰ سن کر مسجد کے ستون کی طرف دیکھا۔ واقعتہً وہ آدھا سونے کا اور آدھا چاندی کا۔

دراصل یہ حضرت جنید بغدادیؒ کی نظرِ کیمیا گر کا اثر تھا کہ پتھر کی ظاہری حالت تبدیل ہو گئی۔ درویش نے تو کسی شخص کے بارے میں محض دعویٰ کیا تھا مگر قدرت نے حضرت جنید بغدادیؒ پر یہ راز ظاہر کر دیا کہ خود ان کی ایک نگاہ "ستونِ سنگ" کی ماہیت کو بدل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مردِ مومن کی اسی شانِ جلالی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت جنید بغدادیؒ اپنے حلقے میں بیٹھنے والے درویشوں کی بھی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان پر اعتراض کرتا تو آپؒ درویشوں کی عزتِ نفس بچانے کے لئے اپنے ساتھیوں کا دفاع کرتے اور دلائل سے ثابت کر دیتے کہ آپؒ کی صحبت میں بیٹھنے والے لوگ دنیا داری کی رسموں سے بہت دور ہیں۔ ایک بار کسی شخص نے آپؒ کی خانقاہ میں رہنے والے درویشوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھا گیا ہے کہ جب آپ کے رفقاء کسی دعوت میں شریک ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کھاتے ہیں۔"

"اس لئے کہ وہ بہت بھوکے رہتے ہیں۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "یہ فطری بات ہے کہ جب کوئی شخص چار چار دن بھوکا رہے گا تو کھانا ملنے پر اپنے اللہ کی

نعمتوں کا زیادہ شکر ادا کرے گا۔"

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ "ان لوگوں پر شہوانی قوتوں کا غلبہ کیوں نہیں ہوتا؟"

حضرت جنید بغدادیؒ نے جواباً فرمایا۔

"بات یہ ہے کہ میرے ساتھی صرف لقمۂ حلال کھاتے ہیں۔ اس لئے وہ حیوانیت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔"

آخر سوال کرنے والا عاجز آ گیا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ حضرت جنید بغدادیؒ کے حلقے میں بیٹھنے والے درویش عام دنیا دار لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔

ایک اور موقع پر کسی شخص نے کہا۔ "قرآن کریم سن کر آپ کے ساتھیوں پر وجد کی حالت طاری نہیں ہوتی؟"

حضرت جنید بغدادیؒ نے جواباً فرمایا۔ "قرآن کریم میں حال لانے والی چیز ہی کون سی ہے؟ وہ حق ہے اور اس ذاتِ برحق کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کے لئے مخلوق کی کوئی صفت شایان نہیں۔"

اعتراض کرنے والے نے کہا۔ "مگر شعروں پر تو آپ کے ساتھیوں کو بہت حال آتا ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "اس لئے کہ یہ خود ان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اور محبت کرنے والوں کا کلام ہے۔"

آخر میں اس شخص نے درویشوں کی ظاہری حالت کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ساتھی تو اللہ کے بہت قریب ہیں۔ پھر انہیں وہ چیزیں کیوں میسر نہیں جو اہلِ دنیا کے پاس ہیں؟"

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کہ جو چیزیں عام بندوں کے پاس ہوں وہی چیزیں اس کے خاص بندے بھی رکھتے ہوں۔"

ایک عارفِ وقت کے جوابات سن کر وہ شخص حیران رہ گیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "سامانِ دنیا سے محرومی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس کے خاص بندے خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف متوجہ ہو جائیں۔"

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

ایک دن نمازِ جمعہ کے بعد ایک شخص حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

"شیخ! مجھ پر آپ کا بڑا کرم ہوگا اگر اپنے حلقے کے فقراء میں سے کسی ایک درویش کو میرے ہمراہ کر دیں۔"

"آخر اس بات سے تمہارا مقصد کیا ہے؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے اس شخص سے پوچھا۔

"میں آپ کے اس درویش کو کھانا کھلا کر اس کی عارفانہ صحبت سے فیض یاب ہونا چاہتا ہوں۔" اس شخص نے بڑے پُراثر لہجے میں کہا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اس شخص کی درخواست سن کر اپنے چاروں طرف نظر کی۔ آپؒ کے قریب ہی ایک ایسا شخص موجود تھا جس کے چہرے سے بھوک اور فاقہ کشی کے آثار نمایاں تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے اس درویش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آپ ان صاحب کے گھر چلے جایئے اور انہیں اپنی صحبت سے فیض یاب کیجئے۔"

وہ درویش خاموشی سے اٹھا اور میزبان کے ساتھ چلا گیا۔ جس شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ سے درخواست کی تھی، بغداد میں اس کے زہد وتقویٰ کا بہت چرچا تھا۔

وہ درویش تھوڑی دیر میں واپس آ گیا اور خاموشی کے ساتھ خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میزبان بھی آیا اور حضرت جنید بغدادیؒ سے عرض کرنے لگا۔

"شیخ! آپ نے جس درویش کو میرے ساتھ بھیجا تھا، اس نے صرف ایک لقمہ کھایا اور کچھ کہے بغیر واپس چلا آیا۔"

"یقیناً تم نے کوئی ناگوار بات اپنی زبان سے ادا کی ہوگی ورنہ وہ درویش ایسا نہیں ہے کہ اپنے میزبان کی دل شکنی کرے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"شیخ! میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جو اس درویش کے مزاج پر گراں گزرے۔" میزبان نے عرض کیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے چاروں طرف نظر کی۔ وہ درویش خانقاہ کے ایک گوشے میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ آپؒ نے اُسے اپنے قریب بلایا اور کچھ کھائے پیئے بغیر واپس آنے کا سبب پوچھا۔

"شیخ! میں ایک فاقہ کش اور مفلوک الحال انسان ہوں۔" اس درویش نے عرض کیا۔ "کوفہ میرا وطن ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اسی لئے حاضر ہوا تھا کہ اپنی حالتِ زار بیان کروں مگر ہر بار غیرت نے میری زبان کھلنے نہ دی۔ پھر جب آپ نے خود ہی میری بھوک کی شدت کا اندازہ کر لیا اور مجھے میزبان کے ساتھ جانے کا حکم دیا تو میں دل ہی

دل میں بہت خوش ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شخص نے بڑے اہتمام کے ساتھ میرے سامنے دسترخوان بچھایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر دیتے ہوئے بولا۔

"یہ لقمہ مجھے دس ہزار درہم سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ میرا میزبان ایک دنیا دار انسان ہے اور نمود ونمائش کا بہت دلدادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کھانا چھوڑ کر چلا آیا۔"

درویش کی بات سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے میزبان سے فرمایا۔ "میں نہیں کہتا تھا کہ تم نے کوئی نہ کوئی بے ادبی کی ہوگی۔"

میزبان نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اگر کسی درویش کو کھانا کھلانے کی استطاعت رکھتے ہو تو میزبانی کے آداب بھی سیکھو۔"

اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے اسی درویش کو دوبارہ میزبان کے گھر جانے کے لئے آمادہ کر لیا۔

اس واقعے کے بعد اہلِ بغداد کو اندازہ ہوگیا کہ حضرت جنیدؒ خود بھی ایک مردِ غیور ہیں اور آپؒ کے حلقے میں بیٹھنے والے درویش بھی۔ اگر کبھی کوئی صاحبِ ثروت انسان آپ کے کسی ساتھی کی تحقیر کرنے کی کوشش کرتا تو آپؒ نہایت سختی کے ساتھ اس کی گرفت کرتے اور بغداد کے سرمایہ داروں کو واضح الفاظ میں سمجھا دیتے کہ یہ ناقابلِ فروخت ہیں۔

✽ ...... ✽ ✽ ...... ✽

حضرت جنید بغدادیؒ اپنے مریدوں سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ ان کی روحانی ضرورتوں کے ساتھ مادی تقاضوں کا بھی اس طرح خیال رکھتے جیسے کوئی باپ اپنی اولاد کا نگراں ہوتا ہے۔

ابوعمر زجاجیؒ ایک بزرگ تھے جو حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ ابوعمرؒ کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ حج بیت اللہ کی سعادت سے شرف یاب ہوں مگر ان کے مالی وسائل اس سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آخر ایک سال حج کا زمانہ آیا تو ابوعمر زجاجیؒ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ہر حال میں مکہ معظمہ روانہ ہو جائیں گے۔ پھر جب حجاج کا قافلہ چلنے کے لئے تیار ہوا تو ابوعمر زجاجیؒ حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت طلب کی۔

"ابوعمر! اللہ تمہیں بامراد کرے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے خدمت گار کو

دعائیں دیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے پیرہن مبارک کی جیب سے ایک درہم نکال کر دیا۔ ''اسے اپنے پاس رکھ لو۔ سفر میں تمہارے کام آئے گا۔''

ابوعمر زجاجیؒ نے پیر و مرشد کا عطا کردہ درہم سنبھال کر رکھ لیا اور سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔

یہ بظاہر ایک درہم تھا جو اتنے طویل سفر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر جاننے والے جانتے تھے کہ یہ ایک سکہ بڑے بڑے خزانوں پر بھاری تھا۔ اس درہم کو حضرت جنید بغدادیؒ نے محنت و مزدوری کر کے حاصل کیا تھا۔

ابوعمر زجاجیؒ فرماتے تھے۔ ''اس سے پہلے بھی میں نے چھوٹے بڑے کئی سفر اختیار کئے تھے مگر مکہ معظمہ کے سفر کی کیفیت ہی جداگانہ تھی۔ جہاں جاتا تھا، لوگ مہمانِ خصوصی کا درجہ دیتے تھے اور مجھے اپنے سر پر بٹھاتے تھے۔ بڑی عقیدت کے ساتھ نذریں اور تحائف دیتے تھے اور اس قدر خاطر مدارات کرتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔ الغرض میں حج کر کے واپس آ گیا اور حضرت شیخؒ کا عطا کردہ درہم میرے پاس موجود رہا کیونکہ اس کے خرچ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پھر جب میں پیر و مرشد کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا تو آپؒ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''ابوعمر! تمہیں حج مبارک ہو۔ لاؤ! میرا درہم مجھے واپس کر دو۔''

ابوعمر زجاجیؒ اس درہم کی برکات پر پہلے ہی حیران ہو رہے تھے۔ پیر و مرشد کی یہ قوتِ کشف دیکھی تو ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

❁ ...... ✪ ✪ ...... ❁

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ وعظ فرما رہے تھے۔ ''انسان کے لئے تنہائی زہر ہے۔ اُسے چاہئے کہ وہ خلوت (تنہائی) کے بجائے جلوت (محفل) میں رہے۔''

ایک مرید نے آپؒ کا یہ قول مبارک سنا مگر اس کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ پیر و مرشد خود تو تنہائی اختیار کرتے ہیں اور مریدوں کو منع کرتے ہیں۔ آخر اس کے نفس نے اسے دھوکا دیا اور وہ اپنے گھر میں خلوت گزیں ہو گیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے دوسرے خدمت گاروں نے اس کا سبب پوچھا تو وہ متکبرانہ انداز میں بولا۔

''میں کامل ہو گیا ہوں۔ اب میرے لئے خلوت ہی بہتر ہے۔''

کچھ دن بعد اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ وہ ہر رات فرشتوں کو خواب میں دیکھتا۔ فرشتے اس کے لئے اونٹ لاتے اور کہتے۔ ''اس پر سوار ہو جاؤ۔ ہم تجھے بہشت میں

لے جائیں گے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کا مرید خوشی خوشی اونٹ پر سوار ہو جاتا اور فرشتے اسے ایسے مقامات پر لے جاتے جہاں ہر طرف دلکش سبزہ زار ہوتے تھے اور صاف و شفاف پانی کی نہریں بہتی تھیں۔ پھر اسے ایک جگہ ٹھہرایا جاتا اور حسین و جمیل لوگ اس کی خدمت میں نفیس و لذیذ کھانے پیش کرتے۔ پھر وہ رات بھر جنت میں رہتا اور صبح کے وقت فرشتے اسے اس کے گھر چھوڑ جاتے۔

پھر یہ واقعات اس قدر تواتر کے ساتھ پیش آنے لگے کہ وہ شخص بدحواس ہو گیا اور لوگوں سے کہنے لگا۔ ''میری کیا پوچھتے ہو۔ میں تو روز جنت میں جاتا ہوں۔''

بغداد کے بعض سادہ لوح افراد اس کے قریب جمع ہو گئے تھے اور وہ ان معصوم و بے خبر لوگوں کو جنت کی سیر کے افسانے سناتا تھا۔ آخر یہ خبر حضرت جنید بغدادیؒ تک بھی پہنچی جسے سن کر آپؒ کے چہرۂ مبارک پر اذیت و کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ پھر آپؒ نے اپنے ایک خدمت گار سے فرمایا۔

''اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ اللہ اس کے حال پر رحم کرے۔''

جب حضرت جنید بغدادیؒ کے خادم نے اسے پیر و مرشد کا پیغام دیا تو وہ پُرغرور لہجے میں کہنے لگا۔

''میں خود پیر کامل ہوں۔ مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ جسے آنا ہو وہ خود چلا آئے۔ میں اسے بھی جنت کی سیر کرا دوں گا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے مرید کا جواب سنا۔ پھر نہایت دردمندانہ لہجے میں فرمایا۔ ''اگر وہ نہیں آتا تو ہم خود چلے جاتے ہیں۔ اس نادان کو کیا معلوم کہ پیر کی ذمے داریاں کیا ہوتی ہیں؟ اور جب کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا جاتا ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟''

اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ اپنے مرید کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چند معتقد تخت کے نیچے جمع تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کو دیکھ کر مرید نے کسی خاص ادب و احترام کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنی حرکات و سکنات سے یہی تاثر دیتا رہا کہ وہ خود ولایت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہے۔

حضرت شیخؒ نے اپنے مرید کے اس گستاخانہ روّیے کو نہایت خوش دلی کے ساتھ برداشت کیا۔ پھر اس کے شب و روز کا حال پوچھا تو وہ اسی انداز میں لاف زنی کرنے

لگا۔ ''میں رات بھر جنت کی سیر کرتا ہوں۔ فرشتے میزبان ہوتے ہیں اور اللہ کی نعمتیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔''

''اُس رات بھی تم جنت کی سیر کو جاؤ گے؟'' مرید کی گفتگو سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے پوچھا۔

''یقیناً!'' مرید کی نخوت کا وہی عالم تھا۔ اُسے یہ احساس تک نہیں رہا تھا کہ پیر و مرشد اس کے سامنے موجود ہیں۔

''پھر ہماری خاطر ایسا کرنا کہ جب فرشتے تمہیں بہشت میں لے جائیں اور تمہارے سامنے اللہ کی نعمتیں پیش کر دیں تو تم صرف ایک بار ''لاحول'' پڑھ دینا۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''مجھے اس کی کیا ضرورت ہے؟'' مرید نے حیران ہو کر کہا۔

''تمہیں شاید اس کی ضرورت نہ ہو مگر میری درخواست ضرور ہے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مرید کے متکبرانہ طرزِ عمل کو نظرانداز کرتے ہوئے فرمایا اور واپس تشریف لے آئے۔

آج رات بھی حسب معمول فرشتے خواب میں آئے اور اسے اونٹ پر سوار کر کے بہشت میں لے گئے۔ مختلف مقامات کی سیر کرانے کے بعد نفیس و لذیذ کھانے پیش کئے۔ اگرچہ اس شخص نے پیر و مرشد کی نصیحت کو دل سے قبول نہیں کیا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی زبان سے کلمہ مقدس ادا ہو گیا۔ ابھی فضا میں ''لاحول ولاقوۃ'' کی گونج باقی تھی کہ تمام فرشتے چیختے ہوئے بھاگ گئے۔ اب وہ شخص اپنی جنت میں تنہا تھا اور اس کے سامنے بہشتی کھانوں کی بجائے مُردہ انسانوں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ پُرہول منظر دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ کے نافرمان مرید کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا جسم خوف و دہشت سے لرز رہا تھا اور وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔

''فرشتے کیا ہوئے؟ اور میری وہ دلفریب جنت کہاں گئی؟''

پھر جب شیطان کا طلسم چاک ہو گیا تو وہ شخص روتا ہوا پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت جنید بغدادیؒ کے قدموں سے لپٹ کر عرض کرنے لگا۔ ''اگر آپ میری رہنمائی نہ فرماتے تو شیطان مجھے اس وادیٔ ظلمات میں لے جا کر ہلاک کر ڈالتا۔ بے شک! مرید کے لئے تنہائی زہر ہے۔''

ایک بار آپؒ مجلس میں وعظ فرما رہے تھے۔ یکایک ایک مرید نے بے قرار ہو کر نعرۂ

مستانہ بلند کیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے وعظ بند کر دیا اور مرید کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''جو اس طرح نعرہ زنی کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر آپؒ نے مرید کو اپنی مجلس سے نکال دیا۔ بعد میں اس مرید نے کئی دن تک معافی مانگی، تب کہیں جا کر اسے دوبارہ مجلس میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی۔

واضح رہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ اس طرح ذکر کرتے تھے کہ اسمِ الٰہی آپؒ کی سانسوں میں جاری ہوتا تھا۔ آپؒ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ اپنے خالق کو باآواز بلند پکارا جائے۔ خود قرآن کریم میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب بندہ دعا کے وقت اپنے مالک کو پکارے تو اس طرح کہ جیسے وہ سرگوشیاں کر رہا ہو۔ حضرت جنید بغدادیؒ کی احتیاط تو سرگوشی سے بھی بڑھ کر تھی کہ آپؒ دل کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کو پکارا کرتے تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا مشہور قول ہے کہ جو قرآن حکیم کا پیرو نہ ہو اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقلد نہ ہو، اس کی تقلید ہرگز نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔''

ایک اور موقع پر آپؒ نے فرمایا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کے سوا تمام راستے مخلوق پر بند ہیں۔ آپؒ کے اس قولِ مبارک کی تشریح یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ چھوڑ کر انسان جس راستے پر چلے گا، گمراہی اُس کا مقدر بن جائے گی۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے اس قول کو مشہور فارسی شاعر حضرت شیخ سعدیؒ نے اپنے ایک شعر میں اس طرح نظم کیا ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

(جس نے بھی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف راستہ اختیار کیا، وہ منزل تک نہیں پہنچ سکا)

حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک مجلس میں اسرارِ معرفت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''حق تعالیٰ اور بندے کے درمیان چار دریا ہیں۔ جب تک بندہ ان چاروں دریاؤں کو عبور نہ کرے اس وقت تک اسے حق تعالیٰ کی قربت میسر نہیں آسکتی۔''

ایک دریا دنیا کا دریا ہے جو زہد (پرہیزگاری) کی کشتی کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا آدمیوں کا دریا ہے۔ اس دریا کو پار کرنے کے لئے آدمیوں سے دور رہنا چاہئے۔

تیسرا دریا شیطان ہے۔ شیطان کی مخالفت کرنا ہی اس دریا کی کشتی ہے۔

اپنے اس قول مبارک کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''اپنے نفس کی مخالفت کرنا ہی دراصل ابلیس کی مخالفت ہے۔ انسانی نفس اور شیطان کے وسوسوں میں فرق یہ ہے کہ نفس جس چیز کی خواہش کرتا ہے، جب تک اسے حاصل نہیں کر لیتا، اس وقت تک اسے سکون نہیں ملتا۔ چاہے اسے کتنا ہی روکا جائے۔ بالفرض اگر اس وقت باز بھی آ جائے تو پھر کسی دوسرے موقع کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے نفس کی خواہش پر عمل کر کے قرار پا جاتا ہے۔

شیطان کے وسوسے کا ایک ہی علاج ہے کہ لاحول پڑھنے سے یہ مرض دور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپؒ کے مرید نے لاحول پڑھی تو شیطانی طلسم پارہ پارہ ہو گیا اور وہ خیالی جنت ایک خوف ناک ویرانے میں تبدیل ہو گئی۔

ایک روز آپؒ وعظ فرما رہے تھے کہ ایک مرید کھڑا ہوا اور اس نے گستاخانہ لہجے میں سوالات شروع کر دیئے۔ حاضرینِ مجلس مرید کی اس بے ادبی پر سخت برہم ہوئے مگر حضرت جنید بغدادیؒ نے سکوت اختیار کیا۔ پھر وہ بے ادب مرید اس قدر شرمندہ ہوا کہ آپؒ کی مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا اور مسجد ''شونیزیہ'' میں گوشہ نشیں ہو گیا۔ یہ وہی مشہور مسجد ہے جہاں بغداد کے بہت سے درویش ہمہ وقت جمع رہتے تھے۔

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ مسجد شونیزیہ تشریف لے گئے۔ اتفاق سے وہ گستاخ مرید سامنے آ گیا۔ نظر ملتے ہی اس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ فرش پر گر پڑا اور اس کے سر سے خون جاری ہو گیا۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ خون کا جو قطرہ مسجد کے فرش پر گرتا تھا، اس سے لا الٰہ الا اللہ کی تصویر بن جاتی تھی۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے یہ منظر دیکھا تو نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''کیا تُو مجھے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ تیرا درجہ اس قدر بلند ہو گیا ہے؟ یاد رکھ کہ اس درجے تک تو ذکر کرنے والے بچے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ مرد تو وہ ہے جو اپنے مقصود تک پہنچے۔''

آپؒ کی گفتگو کا مرید پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ تڑپنے لگا اور پھر اس نے اسی حالت میں جان دے دی۔

مرنے کے کچھ دن بعد کسی بزرگ نے اسے خواب میں دیکھ کر پوچھا۔

''تیرا کیا حال ہے؟''

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید نے کہا۔

''میں نے برسوں اس راستے میں دوڑ دھوپ کی مگر یہاں آ کر یہ راز کھلا کہ درویشی

کی منزل بہت دور ہے۔ میرے سارے قیاس و گمان باطل تھے جو مجھے عمر بھر فریب دیتے رہے۔''

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معرفت کیا ہے اور مردِ مومن کی منزل کہاں ہے؟

❁ ...... ✡ ✡ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ کے اخلاقِ کریمانہ کا یہ حال تھا کہ دوست اور دشمن، مسلم اور غیر مسلم، جاہل اور عالم، غرض ہر طبقے کے لوگ آپؒ کی بلند کرداری کے قائل تھے۔ آپؒ کی اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم تھا کہ جس شخص نے اذیت پہنچائی، آپؒ نے اُسے اپنی دعاؤں سے سرفراز کیا۔ جس نے راستے میں کانٹے بچھائے آپؒ نے اسے محبتوں کے گلاب بخشے۔ اس کے برعکس حضرت جنید بغدادیؒ اپنے مریدوں کی تربیت کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

''کسی کو مرید کرنا بہت آسان ہے مگر اس کی نگرانی کرنا انتہائی مشکل۔''

یہی وجہ ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ ہر کس و ناکس کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار ایک مالدار شخص آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست گزار ہوا کہ اسے بیعت سے سرفراز کیا جائے۔

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''یہ راستہ بہت مشکل ہے۔''

اس شخص نے عرض کیا۔ ''اب اس راستے کے سوا مجھے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''تیرا دعویٰ عمل کی دلیل چاہتا ہے۔''

وہ شخص خاموش ہو گیا اور آپؒ کی خانقاہ کے ایک گوشے میں کسی گداگر کی طرح جا پڑا۔

کچھ دن بعد حضرل جنید بغدادیؒ نے اس شخص سے پوچھا۔ ''یہ درویشی کی منزل ہے۔ یہاں اہل زر کا گزر ممکن نہیں۔''

وہ شخص اٹھا اور اپنا سارا مال و متاع لے کر حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ ''یہ سب کچھ آپ کی نذر ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ''میں دولت کی نفی کرتا ہوں اور مجھے سیم و زر کے دام میں اُلجھاتا ہے۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' شدتِ جذبات میں وہ شخص رونے لگا۔ ''مجھے بہر حال آپ کی قربت و محبت درکار ہے۔''

"سونے چاندی کے ان سکوں کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

اس شخص نے خوشی خوشی اپنی تمام دولت غریب لوگوں میں بانٹ دی۔

کچھ دن بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے اس شخص سے پوچھا۔ "اب تیری ملکیت میں کیا باقی رہ گیا ہے؟"

جب اس شخص نے اعتراف کیا کہ ابھی اس کا ایک گھر باقی ہے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "اسے بھی فرخت کر دے اور ساری رقم میرے پاس لے آ!"

اس شخص نے اپنا گھر فروخت کر کے حاصل شدہ رقم حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں پیش کر دی اور حکمِ شیخ کا انتظار کرنے لگا۔

"اس ساری دولت کو دریائے دجلہ میں ڈال دے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

دولت کو دریا میں ڈال دینا ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی شخص اپنے سرمائے کو اپنے ہاتھ سے آگ لگا دے۔ وہ شخص کہہ سکتا تھا کہ شیخ! اس طرح تو یہ ساری رقم رائیگاں جائے گی۔ اگر آپ حکم دیں تو اسے بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں مگر اس شخص نے ایک لمحے کے لئے بھی نہ ایسا سوچا اور نہ پیر و مرشد سے مزید کوئی سوال کیا۔ سیدھا خانقاہ سے اُٹھا اور تمام رقم لے جا کر دریائے دجلہ میں پھینک دی۔

اس کے بعد حاضر خدمت ہو کر عرض کرنے لگا۔ "شیخ! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"اب تمہارے پاس لٹانے کو کچھ نہیں ہے۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "اس لئے تم واپس جاؤ۔"

حاضرین مجلس کا خیال تھا کہ پیر و مرشد کی بات سن کر وہ شخص بدحواس ہو جائے گا اور شکایت آمیز لہجے میں کہے گا کہ اب اس کا گھر ہے نہ در، پھر ایسے میں وہ کہاں جائے؟ مگر خلاف توقع اس کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا عکس تک نہیں اُبھرا بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ کہنے لگا۔

"ابھی تو میرے پاس لٹانے کے لئے میری جان کا سرمایہ موجود ہے۔ جب اسے لُٹا دوں گا تو پھر کہیں اور جانے کے بارے میں سوچوں گا۔"

پھر وہ شخص ہمہ وقت حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ حضرت شیخؒ ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے مگر وہ آپؒ کے قدموں میں پڑا رہتا۔ کئی بار آپؒ نے اسے

خانقاہ سے نکال دیا تو وہ دروازے پر پتھر کے ستون کی طرح جم گیا۔

مختصر یہ کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے کئی سال تک اس شخص کو آزمایا مگر وہ اپنی طلب میں سچا تھا۔ آخر ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے اُسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا اور فرمایا۔

"ایسی ہی طلب رکھنے والے منزلِ عشق کے مسافر ہوتے ہیں۔ تم اپنے جذبوں کی شیطان سے حفاظت کرنا۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک مرید کئی برسوں سے آپؒ کی خدمت میں مصروف تھا۔ ایک دن آپؒ اپنے اس مرید کے ساتھ جنگل میں جا رہے تھے۔ اتفاق سے اس روز سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ جب کچھ دیر تک مسلسل دھوپ میں سفر جاری رہا تو مرید کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"آج کی گرمی تو ناقابل برداشت ہے۔"

یہ سنتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ ٹھہر گئے اور نہایت پُرجلال لہجے میں اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تُو نے اتنے دنوں کی صحبت میں صرف شکایت ہی کرنا سیکھا ہے؟"

مرید اپنے پیر و مرشد کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا اور دوبارہ موسم کی سختیوں کی شکایت کرنے لگا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے غیظ و جلال میں اضافہ ہو گیا۔ "اپنی دنیا کی طرف واپس لوٹ جا! تُو ہماری صحبت کے قابل نہیں ہے۔"

مختصر کہ اس مرید کو خانقاہ سے نکال دیا گیا۔ دوسرے خدمت گاروں نے ڈرتے ڈرتے سبب پوچھا تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "موسم کیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں حکمِ خداوندی ہے۔ ماہ و نجوم اپنی مرضی سے طلوع و غروب نہیں ہوتے سورج میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے ارادے سے آگ برسانے لگے۔ جب کوئی بندہ سردی یا گرمی کی شکایت کرتا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ اپنے خالق کے فیصلوں پر راضی بہ رضا نہیں ہے۔ اس لئے ہم بھی ایسے شخص کو عزیز نہیں رکھتے اور وہ ہماری صحبت کے قابل نہیں ہے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

ایک طرف حضرت جنید بغدادیؒ کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف

مریدوں کے ساتھ محبت کی یہ کیفیت تھی کہ آپؒ ایک لمحے کے لئے بھی ان کے حالات سے بے خبر نہیں رہتے تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک مرید بصرہ میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک دن اس کے دل میں کسی گناہ کا خیال گزرا۔ شیطانی وسوسہ اس قدر شدید تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ کا مرید کسی طرح اس خیالِ فاسد پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ آخر اسی کشمکش میں پوری رات گزر گئی۔ صبح اُٹھا تو اسے اپنے اندر ایک ناگوار سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ پھر اسی ذہنی کشمکش میں اس نے آئینہ اٹھا کر دیکھا تو خوف و دہشت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔

''خداوندا! لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ اپنی بگڑی ہوئی صورت لے کر ان کے سامنے کیسے جاؤں گا؟ ساری دنیا میں میری پارسائی کے قصے مشہور ہیں۔ بصرہ کے لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو یقیناً کہیں گے کہ میں چھپ چھپ کر گناہ کرتا تھا اور مجھے ان ہی گناہوں کی سزا دی گئی ہے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ کا مرید زار و قطار روتا رہا مگر اس کا مسخ شدہ چہرہ اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں آیا۔

بصرہ کے بہت سے لوگ اس کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔ پھر جب دوپہر کا وقت گزر گیا تو حسب معمول لوگ آنا شروع ہو گئے۔ اس شخص نے شرم و رسوائی کے سبب دروازہ بند کر لیا۔ اگر کوئی عقیدت مند دروازہ کھولنے کے لئے کہتا تو وہ شخص غضب ناک لہجے میں جواب دیا۔

''میری طبیعت خراب ہے۔ آج میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔''

''شیخ! اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو ہم شہر بصرہ کے بڑے سے بڑے طبیب کو آپ کے پاس لے آتے ہیں۔'' عقیدت مند درخواست کرتے۔

مگر وہ شخص کسی کو کیا بتاتا کہ اسے کس قسم کا مرض لاحق ہے۔ نتیجتاً اپنے عقیدت مندوں کو جھڑک دیتا۔ ''مجھے تنگ نہ کرو۔ میری بیماری ایسی ہے کہ اس پر کسی طبیب کی دوا کارگر نہیں ہو سکتی۔''

آخر لوگ مختلف انداز میں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید کا پورا دن شدید بے چینی اور اضطراب میں گزرا۔ رات بھر توبہ و استغفار کرتا رہا۔ دوسرے دن آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو سیاہی کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ مرید کو خوشی کا ہلکا سا احساس ہوا مگر ابھی وہ انسانی مجمع میں جانے کے قابل نہیں تھا۔

عقیدت مند دوسرے روز بھی آئے مگر اس شخص نے ایک ہی جواب دیا۔ ''ابھی میں

تم لوگوں سے ملاقات نہیں کر سکتا، میری بیماری بدستور ہے۔ دعا کرو کہ مجھے اس مرض سے نجات حاصل ہو جائے۔''

عقیدت مند تو خود شیخ کی دعاؤں کے محتاج تھے، شیخ کی صحت کے بارے میں کیا دعا کرتے؟ ذہن میں ہزاروں اندیشے لئے ہوئے واپس چلے گئے۔

دوسرے دن چہرے کی سیاہی کچھ اور کم ہو گئی۔ پھر تیسرے روز اس شخص کا چہرہ اصلی حالت پر لوٹ آیا اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ بار بار آئینہ دیکھتا تھا اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا تھا۔ ''خداوندا! تُو نے مجھے اپنے بندوں کے درمیان رسوا ہونے سے بچا لیا۔''

چوتھے دن وہ اپنے عقیدت مندوں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی شخص کو اپنے سامنے موجود پایا۔

''میں بغداد سے تمہارے نام حضرت شیخ کا خط لے کر آیا ہوں۔'' اجنبی شخص نے کہا۔

پیر و مرشد کا نام سن کر وارفتہ ہو گیا۔ اس نے اجنبی کے ہاتھ سے حضرت جنید بغدادیؒ کا خط لے لیا اور اسے بار بار بوسہ دینے لگا۔ پھر جب اس کی یہ اضطرابی کیفیت کم ہوئی تو اس نے اجنبی سے بیٹھنے کے لئے کہا۔

''مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ اس لئے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔'' یہ کہہ کر اجنبی چلا گیا۔

اجنبی کے جاتے ہی مرید نے پیر و مرشد کا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔ جب وہ آخری لفظ تک پہنچا تو اس پر رقت طاری ہو گئی۔ پھر وہ اس قدر رویا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مرشد کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔

''میرے عزیز! تم نے مجھے یہ کس کام پر لگا دیا؟ میں تین دن سے دھوبی کا کام کر رہا ہوں اور مسلسل تمہارے چہرے کی سیاہی دھو رہا ہوں۔ یاد رکھو کہ اہل اللہ کا محاسبہ بہت سخت ہوتا ہے۔ ان کے دل میں گناہ کا خیال گزرنا ایسا ہی ہے جیسے وہ گناہ کے مرتکب ہو گئے ہیں۔''

اس واقعے سے ان لوگوں کو سبق حاصل کر لینا چاہئے جو پیری اور مریدی کے کاموں میں مصروف ہیں مگر اس رشتے کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ حقیقی پیر وہ ہے کہ مشرق میں رہتے

ہے۔ اگر یہ روحانی سلسلہ اس طرح قائم نہیں رہتا تو پھر "مرید اور پیر" کے اس رشتے کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک موقع پر علامہ اقبالؒ نے حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

حضرت جنید بغدادیؒ کا مشہور قول ہے کہ عالموں کا سارا کام دو کلمات پر منحصر ہے۔ ایک ملت کی اصلاح اور دوسرے مخلوق کی خدمت۔

ایک بار آپؒ نے انسانی زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"جو انسان حق تعالیٰ سے بے خبر ہے، اس کی زندگی سانس کی موجودگی تک ہے۔ سانس ختم ہوئی اور زندگی بھی فنا ہوگئی۔ مگر جس شخص کی زندگی حق تعالیٰ پر ہے وہ حیاتِ طبعی سے حیاتِ اصلی کی طرف رجوع کرتا ہے اور حقیقی زندگی یہی ہے۔"

ایک اور موقع پر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "جو آنکھ حق تعالیٰ کی صفت کو عبرت سے نہ دیکھے اس کا اندھا ہونا ہی بہتر ہے...... اور جو زبان حق تعالیٰ کا ذکر نہ کرے، اس کا قوتِ گویائی سے محروم ہونا ہی اچھا ہے...... اور وہ کان جو حق تعالیٰ کا کلام سننے کے منتظر نہ ہوں ان کا بہرا ہو جانا ہی مناسب ہے...... اور جو جسم اس کی خدمت نہ کرے، اس کا مُردہ ہونا ہی بہتر ہے۔"

ابھی آپؒ کا وعظ جاری تھا کہ ایک سیّد صاحب حاضر خدمت ہوئے۔ ایران کے رہنے والے تھے اور ناصری کے نام سے مشہور تھے۔ سیّد صاحب حج بیت اللہ کے لئے جا رہے تھے۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے نیت کی تھی کہ بغداد پہنچ کر سب سے پہلے حضرت شیخ جنیدؒ کے دیدار کی سعادت حاصل کروں گا۔ اپنی اسی نیت کی تکمیل کے لئے سیّد صاحب حضرت شیخؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تھے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" سیّد صاحب کو دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ نے پوچھا۔

سیّد ناصریؒ نے عرض کیا۔ "گیلان کا رہنے والا ہوں مگر شیخ کے دیدار کی حسرت رکھتا ہوں۔"

"چلیں آپ کی یہ خواہش تو پوری ہوگئی۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "مگر یہ تو بتائیں کہ میرے محترم مہمان کا کس خاندان سے تعلق ہے؟"

سیّد ناصریؒ نے عرض کیا۔ "میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرزندوں کی اولاد

سے ہوں۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"سیّد صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے دادا محترم بیک وقت دو تلواریں چلایا کرتے تھے؟"

سیّد ناصریؒ نے حیرت سے حضرت جنید بغدادیؒ کی طرف دیکھا۔ سیّد صاحب آپؒ کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مہمان کو حیران پا کر فرمایا۔ "امیر المومنین! حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ایک تلوار گردنِ کفار پر چلاتے تھے اور دوسری اپنے نفس پر۔ سیّد صاحب! آپ کون سی تلوار چلاتے ہیں؟"

سیّد ناصری اس کلام کے متحمل نہ ہو سکے اور فرش پر گر کر تڑپنے لگے۔ "شیخ! میں خدا کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا؟ پہلے مجھے اس قابل تو بنا دیجئے کہ اپنے رب کے سامنے حاضر ہو سکوں۔" سیّد ناصریؒ زار و قطار رو رہے تھے اور تڑپ رہے تھے۔ "شیخ! اللہ کی طرف میری رہنمائی فرمائیے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "تمہارا سینہ حق تعالیٰ کا خاص حرم ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس میں کسی نامحرم کو جگہ نہ دو۔"

جیسے ہی حضرت جنید بغدادیؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، سیّد ناصریؒ نے ایک چیخ ماری اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپؒ کی مجلس وعظ کی عجیب شان تھی۔ تقریر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ حاضرین کی اکثریت مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتی تھی۔ بعض سامعین پر اس قدر وجد طاری ہوتا کہ اپنی جانوں سے گزر جاتے تھے اور جو ہوش میں رہتے تھے، ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار جاری ہو جاتے تھے۔

شکستہ دلوں، خستہ حالوں، محتاجوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں پر حضرت جنید بغدادیؒ کا آستانۂ کرم ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس کے برعکس آپؒ کی ذاتی محفلوں کا یہ حال تھا کہ وہاں اہلِ ذوق کے سوا کسی کا گزر ممکن نہیں تھا۔ ایک دن آپؒ کے کسی ہم مذاق دوست نے دعوت کی۔ حضرت جنید بغدادیؒ خوشی خوشی تشریف لے گئے۔ ابھی کھانا شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک شخص مکان میں داخل ہوا۔ حضرت جنیدؒ اس شخص سے واقف تھے۔ وہ ایک کم علم اور بے ذوق انسان تھا۔ محفل میں آنے والا شخص ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا

کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اپنی چادر اُتار کر دیتے ہوئے فرمایا۔

"اسے لے جا کر رہن رکھ دو اور جتنی رقم ملے اس کی شکر لے آؤ۔"

پھر جیسے ہی وہ شخص چادر لے کر گھر سے باہر نکلا، حضرت جنید بغدادیؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور دروازہ بند کر دیا۔ تمام دوست بڑی حیرت سے آپؒ کے اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے با آواز بلند اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"سنو میرے عزیز! یہ چادر میں نے تمہیں دے دی مگر خدا کے لئے آج کی رات ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

احباب نے حیران ہو کر اس کا سبب پوچھا تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "ایک بے خبر اور بے ذوق انسان ہماری مجلس میں چلا آیا تھا۔ میں نے اپنی چادر دے کر اس سے فراغت حاصل کر لی اور آج رات کی صحبت کو غیروں سے بچا لیا۔"

یہ واقعہ حضرت جنید بغدادیؒ کی نفاست اور اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتا ہے ورنہ آپؒ کی تواضع اور انکسار کا تو یہ عالم تھا کہ آپؒ کے شاگرد رشید حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ حج کو تشریف لے گئے۔ پھر جب آپؒ حج ادا کرنے کے بعد واپس لوٹے اور بغداد کی حدود میں داخل ہوئے تو اہلِ خانہ کے ساتھ عزیزوں اور دوستوں کو اپنا منتظر پایا۔ تمام لوگوں نے حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ کا والہانہ استقبال کیا اور گھر چلنے کے لئے کہا۔

جواب میں حضرت شیخ ابو محمدؒ نے فرمایا۔

"جب تک میں ایک شخص کی زیارت نہ کر لوں اس وقت تک نہ میں گھر جاؤں گا اور نہ کوئی دوسرا کام کروں گا۔"

دوستوں اور رشتے داروں نے پوچھا۔ "ابو محمد! وہ شخص کون ہے؟"

حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ "کیا تم اس شخص کو نہیں جانتے؟ وہ مرد بزرگ میرے استاد گرامی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟"

اہلِ خانہ اور احباب نے گھر چلنے کے لئے بہت زور دیا مگر شیخ ابو محمدؒ نے ان کی ایک نہ مانی اور طویل سفر کی تھکن کے باوجود حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ اپنے شاگرد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دعاؤں سے سرفراز فرمایا۔

دوسرے دن شیخ ابو محمد جریریؒ کے مکان پر دستک دی۔ آپؒ باہر نکلے تو دیکھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ دروازے پر جلوہ افروز ہیں۔ شیخ ابو محمدؒ نے حیرت سے استاد گرامی کی طرف دیکھا اور نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔

"سیّدی! آپ نے کیوں زحمت کی؟ میں اسی لئے تو پہلے خود حاضر ہو گیا تھا کہ آپ زحمت سے بچ جائیں۔"

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"ابو محمد! میرے گھر آنے میں سبقت کرنا تمہارا فعل تھا۔ اس سے تمہاری شرافتِ نفس کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر میرا آنا اپنی جگہ ہے۔ تمہارے حُسنِ اخلاق کا حق ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ اگر تم پہلے چلے آئے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہارا حق مجھ پر سے ساقط ہو گیا۔"

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ تواضع اور انکسار کے کس درجے پر فائز تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ وعظ کی عام مجلسوں میں صرف ان ہی امور پر گفتگو کرتے جن تک عام انسانی ذہن کی رسائی ہوتی۔ آپؒ کی تقریروں کا موضوع اخلاقیات ہوتا تاکہ عوام الناس کے کردار کی تعمیر ہو سکے۔ آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"یہی سیدھی سادی باتیں خلقِ خدا کے لئے مفید ہیں۔ اسرارِ الٰہی کا ذکر کر کے ان کے ذہنوں کو اُلجھنوں کا شکار نہ بنایا جائے۔"

اس کے برعکس حضرت جنید بغدادیؒ کی نجی مجلسوں کا یہ حال تھا کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بیس افراد شریک ہوتے تھے۔ شیخ ابو طالب مکیؒ کے بیان کے مطابق حضرت جنید بغدادیؒ آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے۔

"اب لوگوں میں توحید کے حقائق و معارف جاننے کا شوق بہت کم ہو گیا ہے۔"

جب آپؒ اپنے شاگردوں کو علمِ باطن کی تعلیم دیتے تو دروازہ بند کر کے اس میں قفل ڈال دیتے تھے۔

پھر جب آپؒ کے مرید خاص حضرت شیخ ابو بکر شبلیؒ نے اعلانیہ طور پر باطنی تعلیم دینا شروع کر دی تو آپؒ نے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔

"ہم اس علم کو تہہ خانوں اور گھروں میں چھپ کر بیان کرتے تھے مگر شبلیؒ نے اسے برسرِ منبر بیان کیا۔"

آپؒ شیخ ابو بکر شبلیؒ کو اس بے احتیاطی سے منع فرماتے۔ "حق تعالیٰ کے رازوں کو ان لوگوں پر ظاہر نہ کرو جن کے دماغوں اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نہیں چاہتے تھے کہ نا اہل لوگوں کی سماعتیں رموزِ باطنی سے آشنا ہوں۔ حضرت شیخ ابوبکر کسائیؒ اس دور کے مشہور بزرگ تھے جنہیں حضرت جنید بغدادیؒ کی رفاقت اور دوستی کا اعزاز حاصل تھا۔ حضرت شیخ ابوبکر کسائیؒ کی عارفانہ شان کے بارے میں حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے تھے۔

''اگر شیخ ابوبکر نہ ہوتے تو میں بھی بغداد میں نہ ہوتا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت شیخ ابوبکرؒ کو خط و کتابت کے ذریعے رموزِ باطنی سمجھایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ ابوبکرؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ سے ایک ہزار مسائل دریافت کئے تھے اور آپؒ نے ان عام مسائل کے تسلی بخش جوابات تحریر فرمائے تھے۔ حضرت شیخ ابوبکرؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کی زندگی میں ہی انتقال فرمایا۔ جب آپؒ کا آخری وقت آیا تو اپنے شاگردوں کو بلا کر کہا۔

''شیخ جنیدؒ کی تمام تحریروں کو پانی سے دھوڈالو''

حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت شیخ ابوبکر کسائیؒ کی تدفین میں شریک ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک دوست دوسرے دوست کی جدائی کے صدمے سے نڈھال تھا۔ پھر آپؒ نے حضرت شیخ ابوبکرؒ کے شاگردوں اور خدمت گاروں سے تعزیت کی اور بڑے حسرت زدہ لہجے میں فرمایا۔

''کاش شیخ ابوبکرؒ نے اپنی وفات سے پہلے میرے لکھے ہوئے مسائل کو بھلا دیا ہوتا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کی بات سن کر حضرت ابوبکر کسائیؒ کے شاگردوں نے عرض کیا۔

''شیخ نے انتقال سے قبل ان تمام تحریروں کو پانی سے دھلوا دیا تھا۔''

اس انکشاف کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ کے چہرۂ مبارک پر خوشی کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ پھر آپؒ نے انتہائی مسرت کے لہجے میں فرمایا۔

''مجھے شیخ سے یہی اُمید تھی۔''

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علم معرفت کے سلسلے میں حضرت جنید بغدادیؒ کس قدر محتاط رویہ رکھتے تھے۔ آپؒ نہیں چاہتے تھے کہ وہ تحریریں کسی کم علم کی نظر سے گزریں اور وہ اندیشوں کے عذاب میں مبتلا ہو جائے

❀ ..... ✿ ✿ ..... ❀

ایک بار کسی شخص نے آپؒ سے پوچھا۔ ''عارف کی تعریف کیا ہے؟''

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''عارف وہ ہے جو تیرا راز بتا دے اور

خاموش بیٹھا رہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''پانی اسی رنگ میں نظر آتا ہے جو اس کے برتن کا رنگ ہوتا ہے۔'' آپؒ کے اس قول مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جیسا زمانہ اور وقت ہوتا ہے ویسی ہی عارف کی شان ہوتی ہے۔

مشہور بزرگ حضرت ذوالنون مصریؒ نے عارف کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''ابھی یہاں تھا، ابھی چلا گیا۔''

جب حضرت جنید بغدادیؒ کے سامنے حضرت ذوالنون مصریؒ کے یہ الفاظ دہرائے گئے تو آپؒ نے فرمایا۔

''عارف کو کوئی حالت کسی حالت سے روک نہیں سکتی اور نہ کوئی مکان اسے دوسرے کے مقام پر جانے سے باز رکھ سکتا ہے لہٰذا وہ سب مکانوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتا ہے جو نسبت اسے اس مکان سے ہے جس میں وہ موجود ہے۔''

کسی شخص نے برسرِ مجلس پوچھا۔ ''شیخ! یہ تو بتائیے کہ خالص توحید کیا ہے؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''توحید یہ ہے کہ بندے کی آخری حالت، ابتدائی حالت کی طرف رجوع کرے اور وہ ویسا ہی ہو جائے جیسا کہ عالم وجود میں آنے سے پہلے تھا۔''

ایک اور موقع پر کسی شخص نے پوچھا۔ ''توحید کیا ہے؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''یقین ہی کا نام توحید ہے۔''

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور یقین کسے کہتے ہیں؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''تیرا یہ سمجھنا کہ خلقت کے تمام حرکات و سکنات خدائے وحدہٗ لاشریک کے حکم سے ہیں، جب تجھے یہ عرفان حاصل ہو جائے تو سمجھ لے کہ تُو موحد ہو گیا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''بیس سال ہوئے کہ علم توحید کی بساط تہہ کر کے رکھ دی گئی۔ اب تو لوگ صرف اس کے گرد و پیش اور آس پاس کی باتوں پر بحث کیا کرتے ہیں۔''

❀ ..... ✿ ✿ ..... ❀

ایک موقع پر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''اگر ایک سچا شخص ایک لاکھ برس تک حق تعالیٰ کی طرف توجہ رکھے اور پھر ایک لمحے کے لئے دوسری طرف متوجہ ہو جائے تو جو گھڑی اس نے کھو دی، وہ اس زمانے پر غالب

رہے گی جس میں اسے توجہ حاصل تھی۔"

ایک بار اہلِ شام نے آپ سے علم غیب کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "اللہ غیب کی چیزوں کے علم میں بے مثال ہے۔ یعنی اس کے سوا کسی کو علم غیب نہیں۔ لہٰذا جو کچھ ہوا اور جو ہوگا اس کا علم حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ مزید یہ کہ جو چیز نہیں ہونے والی ہے اور اگر ہوتی تو کیسی ہوتی، ان باتوں کا علم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔"

ایک بار آپؒ کے شاگرد خاص شیخ ابوبکر شبلیؒ نے برسر مجلس بلند آواز میں کہا۔

"اللہ جل جلالہٗ"

یہ سنتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"اگر اللہ غائب ہے تو غائب کا ذکر کرنا غیبت ہے........اور اگر حاضر ہے تو حاضر کے سامنے اس کا نام لینا بے ادبی ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کے اس قول مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے تو پھر اس کا ذکر بھی اتنی رازداری کے ساتھ کیا جائے کہ اللہ اور بندے کے سوا کسی تیسرے کو اس بات کی خبر نہ ہو۔ واضح رہے کہ ذکرِ الٰہی کے معاملے میں حضرت جنید بغدادیؒ جذب و جوش کے قائل نہیں تھے۔ آپؒ معرفت کے راستے میں ایک انتہائی محتاط اور ہوش مند انسان تھے اور آپؒ نے اپنی پوری زندگی اسی محتاط روی اور ہوش مندی کے ساتھ بسر کی۔

حضرت جنید بغدادیؒ بھی دوسرے صوفیاء کی طرح سماع سنا کرتے تھے مگر آپؒ کی مجلسِ سماع موجودہ سماع کی محفلوں سے بہت مختلف تھی۔ آپؒ کی مجلس میں مزامیر (سازوں) کا گزر نہیں تھا۔ آپؒ صرف اعلیٰ درجے کا عارفانہ کلام سنا کرتے تھے۔

سماع کے بارے میں حضرت جنید بغدادیؒ کا مشہور قول ہے۔ "تین مواقع ایسے ہوتے ہیں جب فقیروں پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

ایک سماعت کے وقت جب فقیر آوازِ حق کے سوا کچھ نہیں سنتا۔

دوسرے کھانا کھاتے وقت۔ اس لئے کہ فقیر اسی وقت کھانا کھاتے ہیں، جب وہ فاقہ کشی کی حالت سے گزر جاتے ہیں۔

تیسرے علم کا چشمۂ فیض جاری کرتے وقت۔ اس لئے کہ فقیر اس وقت اولیاء اللہ کی صفات کے سوا اور کچھ بیان نہیں کرتا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے مجلس سماع کے آداب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "سماع تین

چیزوں کا محتاج ہے۔ زمان، مکان اور اخوان کا۔" یعنی زمانہ اور جگہ بھی مناسب ہو اور اہلِ صحبت بھی اچھے ہوں۔

حضرت جنید بغدادیؒ سماع کے دوران جذب و مستی اور بے قراری کے مظاہرے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؒ کے حلقے میں ایک صاحبِ دل نوجوان تھا۔ جب سماع اپنے عروج کو پہنچ جاتا تو وہ نوجوان مضطرب ہو کر چیخنے لگتا۔ ایک دن محفلِ سماع جاری تھی کہ وہ نوجوان مضطرب ہو کر چیخا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ نوجوان اپنے ہوش میں نہیں تھا، اس لئے حضرت شیخؒ کے اشارے کو نہ دیکھ سکا۔ پڑھنے والے نے ایک اور کیف آور شعر پڑھا جسے سن کر نوجوان کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر دوبارہ چیخا۔

اب حضرت جنید بغدادیؒ خاموش نہ رہ سکے۔ آپؒ نے نہایت پُرجلال لہجے میں نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم ہماری صحبت کے قابل نہیں ہو، اس لئے ہماری مجلس سے چلے جاؤ۔"

یہ حضرت جنید بغدادیؒ کے الفاظ کا اثر تھا کہ نوجوان سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہم اپنی محفل میں بے صبر لوگوں کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کرتے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے نوجوان کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

نوجوان نے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی لغزش کی معافی مانگی اور مجلس کے احترام میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ سماع دوبارہ شروع ہو گیا۔

نوجوان کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ حضرت جنید بغدادیؒ جیسے بزرگ کی صحبت چھوڑ کر چلا جائے۔ نتیجتاً اُس نے طے کر لیا کہ وہ سماع کے دوران خاموش رہے گا۔ چاہے اس کوشش میں اس کا دم ہی نکل جائے۔ پھر ایسا ہوا کہ سماع کے شروع ہوتے ہی نوجوان کی حالت غیر ہو جاتی مگر وہ حضرت جنید بغدادیؒ کے حکم کے پیشِ نظر خاموش بیٹھا رہتا۔ پھر لحظہ بہ لحظہ اس کا اضطراب بڑھتا رہتا۔ یہاں تک کہ ضبطِ مسلسل کے سبب نوجوان کے پورے جسم سے پسینہ جاری ہو جاتا۔

پھر ایک دن نوجوان کا اضطراب حد سے بڑھ گیا۔ اُس نے ایک جگر شگاف چیخ ماری اور مر گیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے جانشین حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ آپ کی ایک مجلس سماع کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ایک دن حضرت ابنِ مسروقؒ اور دوسرے دوسرے بزرگ مجلس سماع میں موجود

تھے اور قوال بڑے جوش کے عالم میں ایک دلکش نغمہ گا رہے تھے۔ حضرت ابنِ مسروق جوشِ اضطراب میں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے مگر جنید بغدادیؒ اپنی نشست پر اس طرح بیٹھے رہے کہ آپؒ کے جسم کو معمولی سی حرکت بھی نہیں ہوتی تھی۔

پھر جب مجلس ختم ہو گئی تو شیخ ابو محمد جریریؒ نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ پر سماع کا کچھ اثر ہوا؟''

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''ابو محمد! تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو۔ کیا وہ بادلوں کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں؟''

بے شک! حضرت جنید بغدادیؒ استقامت میں ایک پہاڑ کے مانند تھے۔ انتہائی وجد کے عالم میں بھی نہایت پُرسکون رہتے۔ نہ خود بے قرار ہو کر کھڑے ہوتے اور نہ اپنے کسی شاگرد کے لئے اس عمل کو جائز سمجھتے۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے۔

''جب تم کسی صوفی کی یہ حالت دیکھو کہ وہ ظاہر داری کی باتوں کا زیادہ خیال رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ اس کا باطن خراب ہے۔''

تصوف ایک ایسا موضوع ہے جس پر صدیوں سے عجیب و غریب بحث جاری ہے مگر اس سلسلے میں حضرت جنید بغدادیؒ نے جو کچھ فرما دیا ہے اس پر کسی بھی زاویے سے اضافہ نہیں کیا جا سکا۔

ایک موقع پر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''تصوف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اور تیرے درمیان میں کوئی واسطہ باقی نہ رہے۔''

ایک بار فرمایا۔ ''تصوف تو ایک جنگ ہے جس میں صلح نہیں۔'' جنگ سے مراد نفس کے خلاف جنگ ہے اور نفس آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔ اس لئے نفس کے ساتھ صلح نہیں ہو سکتی۔

ایک دن فرمایا۔ ''تصوف اللہ کے ساتھ معاملات کے صاف ہونے کا نام ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ دنیا سے رُوگردانی کی جائے۔''

ایک دن وعظ کے دوران فرمایا۔ ''تصوف یہ ہے کہ اسی تصوف سے اللہ تیری خودی کو مٹا ڈالے اور پھر اسی تصوف سے تجھے زندہ کرے۔''

ایک اور موقع پر صوفی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ''صوفی وہ ہے جو زمین کے مانند ہو کہ دنیا بھر کی غلاظت اس پر ڈالی جاتی ہے مگر اس کے اندر سے سرسبز فصل پھوٹتی

ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے جو انبیائے پاک علیہم السلام کے ساتھ مخصوص تھیں۔

(1) سخاوت جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وصف خاص تھی۔ دوسری روایت میں ہے کہ صوفی کا دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح دنیا کی دوستی سے پاک ہو۔

(2) رضا جو حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لئے مخصوص تھی۔ دوسری روایت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی مثال دی گئی ہے۔

(3) صبر جس کا حق حضرت ابوایوب علیہ السلام نے ادا کیا۔

(4) اشارہ جو حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے مخصوص تھا۔

(5) اندوہ و غم جسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مختص کیا گیا تھا۔

(6) غریب الوطنی جو حضرت یحیٰ علیہ السلام کے لئے مخصوص تھی۔

(7) سیاحت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خصائص میں سے تھی۔

(8) فقر اور درویشی جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطورِ خاص بخشے گئے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق مناجات میں صوفی کا اخلاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہو۔

ان مثالوں سے کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ صوفی پیغمبرانہ صفات کا حامل ہوتا ہے۔ دراصل انبیائے کرام علیہم السلام سیرت و کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتے ہیں، اس لئے ان ہی کی تقلید کر کے انسان صوفیت اور ولایت کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

ایک بار کسی شخص نے برسرِ مجلس آپؒ سے پوچھا۔ ''مریدوں کو حکایتیں سنانے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے جواب میں فرمایا۔ ''حکایتیں تو اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس سے مریدوں کے دلوں کو تقویت پہنچتی ہے۔''

اسی شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت بھی ہے؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مقدس ہے۔

''ہم تم سے پیغمبروں کے تمام قصے بیان کریں گے جس سے تمہارے دل کو مضبوطی بخشیں گے۔'' (ترجمہ)

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے تھے۔

''اللہ جل شانہٗ نے مومنین کو ایمان سے شرف عطا کیا..... ایمان کو عقل سے نوازا......

اور عقل کو صبر سے آراستہ کیا۔ لہٰذا ایمان مومنین کا دین ہے..... عقل ایمان کا دین ہے اور صبر عقل کا دین ہے۔"

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ اخلاص کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ آپؒ نے اپنی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔

"میں نے اخلاص ایک حجام سے سیکھا۔ وہ اس وقت مکہ معظمہ میں کسی رئیس شخص کے بال بنا رہا تھا۔ میرے مالی حالات نہایت شکستہ تھے۔ میں نے حجام سے کہا۔

"میں اجرت کے طور پر تمہیں ایک پیسہ نہیں دے سکتا۔ بس تم خدا کے لئے میرے بال بنا دو۔"

میری بات سنتے ہی حجام نے اس رئیس کو چھوڑ دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم بیٹھ جاؤ۔"

مکے کے رئیس نے حجام کے طرزِ عمل پر اعتراض کیا تو وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔

"جب خدا کا نام اور واسطہ درمیان میں آجاتا ہے تو میں سارے کام چھوڑ دیتا ہوں۔"

حجام کا جواب سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ پھر اس نے قریب آکر میرے سر کو بوسہ دیا اور بال بنانے لگا۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد حجام نے مجھے ایک پڑیا دی جس میں کچھ رقم تھی۔ "اسے اپنے استعمال میں لائیے۔" حجام کے لہجے میں بڑا خلوص تھا۔

میں نے رقم قبول کر لی اور اس کے ساتھ ہی نیت کی کہ مجھے جو پہلی فتوح حاصل ہو گی، وہ حجام کی نذر کروں گا۔"

پھر چند روز بعد جب میرے پاس کچھ روپیہ آیا تو میں سیدھا اس حجام کے پاس پہنچا اور وہ رقم اسے پیش کر دی۔

"یہ کیا ہے؟" حجام نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں نے اس کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

میری نیت کا حال سن کر حجام کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ "اے شخص! تجھے شرم نہیں آتی؟ تُو نے اللہ کی راہ میں بال بنانے کو کہا تھا اور اب کہتا ہے کہ یہ اس کا معاوضہ ہے۔ تُو نے کسی بھی مسلمان کو دیکھا ہے کہ اللہ کی راہ میں کام کرے اور پھر اس کی مزدوری لے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ اکثر فرماتے تھے۔ "میں نے اخلاص کا مفہوم اسی حجام سے سیکھا ہے۔"

سیرت و کردار کی ایسی بلندی نے حضرت جنید بغدادیؒ کو اہلِ عراق کا محبوب بنا دیا۔ پھر آپؒ کی یہی محبوبیت بعض علماء کے لئے حسد کا سبب بن گئی۔ ایک دن عباسی خلیفہ مستقر باللہ کے دربار میں کہا گیا۔

"امیر المومنین! اس درویش کی خبر لیجئے جو اپنے مکان کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اہلِ ایمان کو گمراہ کر رہا ہے۔" علماء کا اشارہ حضرت جنید بغدادیؒ کی طرف تھا۔

خلیفہ نے بڑی حیرت سے فقہائے عراق کی بات سنی۔ "آخر وہ شخص کیا کرتا ہے؟"

"وہ سماع سنتا ہے۔ رقص کرتا ہے اور لوگوں کو صوفیت کی تعلیم دیتا ہے۔" حاسد علماء نے حضرت جنید بغدادیؒ کے خلاف فردِ جرم پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انسان کا اپنا فعل ہے کہ وہ مسجد میں کھلے عام اللہ کی عبادت کرے یا گوشہ نشیں ہو کر اپنے مالک کو یاد کرے۔" عباسی خلیفہ نے حاسد علماء کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"امیر المومنین! جنید دنیاداری کے کاموں میں مبتلا ہیں۔" علمائے عراق نے دلیل پیش کی۔ "لوگ ان کی مصنوعی درویشی اور ظاہری تقویٰ دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"کسی حجت کے بغیر جنید کو ان کے اعمال و اشغال سے نہیں روکا جا سکتا۔" عباسی خلیفہ نے حضرت جنید بغدادیؒ کے مخالفین کو واضح الفاظ میں جواب دے دیا۔

مگر فقہاء کا حاسد گروہ مسلسل خلیفہ کے کان بھرتا رہتا۔ آخر عباسی خلیفہ نے یہ کہہ کر جان چھڑائی۔

"پہلے میں جنید کو آزماتا ہوں۔ اگر وہ دنیا دار ہوئے تو اس آزمائش میں ناکام ہو جائیں گے۔ پھر انہیں شریعت کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

خلیفہ کی ایک کنیز تھی جسے اس نے تین ہزار درہم کے عوض خریدا تھا۔ کنیز کے خدوخال اس قدر دلکش تھے کہ وہ اپنے زمانے میں خوبصورتی کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ خلیفہ نے اپنی خدمت گار عورتوں کو حکم دیا کہ اس کنیز کو قیمتی لباس اور زر و جواہر سے آراستہ کیا جائے۔

پھر کنیز کو اپنی خلوت میں طلب کر کے عباسی خلیفہ نے کہا۔

"تجھے لازم ہے کہ تُو شیخ جنید کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرے کہ تجھے ان سے بے پناہ عقیدت ہے۔"

کنیز نے حیران ہو کر خلیفہ کی طرف دیکھا۔ "امیر المومنین! میں تو شیخ جنیدؒ کو جانتی تک نہیں۔"

"شیخ جنید، بغداد کے ایک پارسا انسان ہیں۔" عباسی خلیفہ نے اپنی کنیز کو سارا

منصوبہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تجھے ان کی پارسائی کو آزمانا ہے۔''

''اگر وہ نیک انسان ہیں تو پھر مجھے کس طرح قبول کریں گے؟'' کنیز کی حیرت برقرار تھی۔

''تجھے اپنی پُر زور تقریر کے ذریعے شیخ جنیدؒ پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ تُو ایک مالدار عورت ہے۔ مگر تیرا دل دنیا کی رنگینیوں سے اُکتا گیا ہے۔ اب تجھے صرف خدا کی تلاش ہے اور تُو شیخ جنیدؒ کی صحبت میں رہ کر حق تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہتی ہے۔''

الغرض وہ خوبصورت کنیز حضرت جنید بغدادیؒ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ خلیفہ نے اپنا ایک معتمد غلام بھی اس کے ساتھ روانہ کر دیا تاکہ وہ خانقاہ میں پیش آنے والے واقعات سے خلیفہ کو باخبر کرتا رہے۔

کنیز بڑے عاجزانہ انداز میں حضرت جنید بغدادیؒ کے سامنے حاضر ہوئی اور اس نے اپنے خوبصورت چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک نظر اس فتنہ ساماں عورت کو دیکھا اور فوراً ہی سر جھکا لیا۔

عباسی خلیفہ کے منصوبے کے مطابق کنیز التجا کرنے لگی۔

''شیخ! میری رہنمائی کیجئے۔ میں آپ کی صحبت میں رہ کر اپنی باقی زندگی یادِ الٰہی میں بسر کرنا چاہتی ہوں۔''

جیسے ہی کنیز کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت جنید بغدادیؒ نے سر اٹھا کر دوبارہ کنیز کی طرف دیکھا اور ایک سرد آہ بھری۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ رنگ جلال دیکھ کر کنیز اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ فرش پر گر کر تڑپنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔

غلام بدحواسی کے عالم میں قصرِ خلافت تک پہنچا اور خلیفہ کے رُوبرو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ مشہور تصنیف ''تذکرۃ الاولیاء'' میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی روایت ہے کہ جب عباسی خلیفہ کو کنیز کی موت کا علم ہوا تو وہ غضب ناک ہو کر کہنے لگا۔

''اب شیخ جنید وہ دیکھیں گے جو انہیں نہیں دیکھنا چاہئے۔''

پھر خلیفہ پورے جاہ و حشم کے ساتھ حضرت جنید بغدادیؒ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوا۔ خوشامدی مصاحبوں نے عباسی خلیفہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''امیر المومنین! آپ کا ایک عام انسان کے گھر جانا منصب خلافت کے منافی ہے۔ شیخ جنید کو اپنی خدمت میں طلب کر کے ان سے باز پُرس کیجئے۔''

خلیفہ نے اپنے مصاحبوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

''ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ شیخ جنید کون ہیں اور ان کی خانقاہ میں کیا ہوتا ہے؟''

پھر جب عباسی خلیفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے مکان کے قریب پہنچا تو پورے محلے میں امیر المومنین کی آمد کا شور مچ گیا۔ خدمت گاروں نے حضرت جنید بغدادیؒ کو بھی خبر دی مگر آپؒ نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا بلکہ پورے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔

پھر جب عباسی خلیفہ آپؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا تو حضرت شیخؒ نے ایک مسلمان کی طرح امیر المومنین کا استقبال کیا اور مزاج پُرسی کی۔

عباسی خلیفہ نے رسمی باتیں کرنے کی بجائے براہِ راست حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا۔ ''شیخ! یہ کیسی ادا ہے کہ آپ نے ایک محبوبۂ دلنواز کو مار ڈالا اور اسے جلا کر خاک کر دیا۔''

خلیفہ کی بات سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔ ''امیر المومنین! آپ کی یہ شفقت کیسی ہے کہ میری چالیس سالہ ریاضت، مجاہدات اور بے خوابی کو وہ کنیز ایک لمحے میں برباد کر ڈالتی اور لوگ تماشا دیکھتے رہ جاتے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کی اس قوتِ کشف پر عباسی خلیفہ سناٹے میں آ گیا۔

''امیر المومنین! ایک انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان کو مار ڈالے۔'' حضرت جنید بغدادیؒ نے عباسی خلیفہ کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں اس گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر جسے پکار رہا ہوں، وہ خود نہیں چاہتا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی غیر حائل ہو جائے۔''

عباسی خلیفہ چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر جب مخالفین نے دوبارہ حضرت جنید بغدادیؒ کی شکایت کی تو خلیفہ معتز سخت برہم ہو گیا۔ ''لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ جو شخص خود فتنے میں مبتلا نہیں ہوا، اسے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کے کردار پر عباسی خلیفہ کی گواہی ایک بڑی گواہی ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

پھر جب خلیفہ معتضد باللہ کا زمانہ آیا تو علمائے بغداد نے اجتماعی طور پر صوفیاء کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ ایک روایت کے مطابق اس ہنگامہ آرائی کا سبب ایک شخص غلام خلیل تھا۔ خلیل نے دربارِ خلافت میں عرضداشت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"عراق کے تمام صوفیاء زندیق اور بے دین ہیں۔ اس لئے امیر المومنین کا فرض ہے کہ وہ اسلام کو اس خوف ناک فتنے سے بچائیں۔"

غلام خلیل کی درخواست سن کر خلیفہ معتضد باللہ نے تمام صوفیائے عراق کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

دوسری روایت ہے کہ اس ہنگامہ آرائی کی ابتداء شیخ نوریؒ سے ہوئی جو نہایت بلند مرتبہ صوفی تھے۔ شیخ نوریؒ ایک دن بغداد کے کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ آپؒ نے چند لوگوں کو دیکھا جو شراب کے مٹکے اٹھائے ہوئے تھے۔ شیخ نوریؒ کی مذہبی غیرت اس منظر کو برداشت نہ کر سکی۔ آپؒ وارفتگی کی حالت میں آگے بڑھے اور شراب کے بہت سے مٹکے توڑ ڈالے۔ خم بردار تعداد میں زیادہ تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے حضرت شیخ نوریؒ کو پکڑ لیا اور عباسی خلیفہ کے دربار میں لے گئے۔ بعض مؤرخین نے معتضد باللہ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ وہ ایک زشت خو اور تند مزاج حکمران تھا۔ پہلے گالی دیتا تھا، بعد میں گفتگو کا آغاز کرتا تھا۔ خلیفہ نے حسب عادت شیخ نوریؒ کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"تُو شراب کے خم توڑنے والا کون ہوتا ہے اور تجھے محتسب کس نے بنایا ہے؟"

حضرت شیخ نوریؒ نے کسی تکلف اور رعایت کے بغیر فرمایا۔ "جس ذات پاک نے تجھے خلیفہ بنایا ہے، اسی نے مجھے محتسب کے منصب پر فائز کیا ہے۔"

خلیفہ معتضد باللہ حضرت شیخ نوریؒ کا یہ بے باکانہ جواب برداشت نہ کر سکا اور تمام صوفیائے عراق کے قتل کا حکم جاری کر دیا گیا۔ معتوب صوفیاء میں حضرت شیخ نوریؒ کے احباب بھی شامل تھے۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ عباسی خلیفہ معتضد باللہ ایک پابند شریعت اور محتاط حکمران تھا۔ وہ حضرت شیخ نوریؒ کے اس عمل سے اس قدر برہم نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تاریخی حقائق کی روشنی میں ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ عراق کے فقہا اور محدثین صوفیاء کے علم باطنی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ذکر اور سماع کی محفلوں کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس لئے وہ صوفیاء کے عشق جاں سوزی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اتفاق سے بعض صوفیاء بھی غیر محتاط زندگی بسر کرتے تھے۔ نتیجتاً ان پر سر عام جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ پھر یہی جذب و مستی صوفیاء کی دشمنی بن گئی اور اسی کو بنیاد بنا کر فقہائے عراق نے عباسی خلیفہ کے دربار میں صوفیاء کی بے راہ روی کی شکایت کی اور اس اندیشے کا اظہار کیا کہ اگر اس گروہ کو شرع کا پابند نہ بنایا گیا تو عام مسلمان گمراہی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کسی تاریخی روایت سے پتہ نہیں چلتا کہ اس سلسلے میں خلیفۂ وقت نے تحقیق

سے کام لیا یا صرف فقہائے عراق کی شکایت پر تمام صوفیاء کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ فقہاء کی طرف سے صوفیاء پر تین الزامات عائد کئے گئے تھے۔ زندقہ....... الحاد اور حلول۔ یہ تینوں صورتیں کفر کی کھلی ہوئی علامات ہیں۔ اسی بنیاد پر صوفیاء کو دائرۂ اسلام سے خارج کیا گیا اور وہ واجب القتل قرار پائے۔

صرف حضرت جنید بغدادیؒ کی حد تک پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلے میں کسی قدر تحقیق سے کام لیا گیا تھا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ ناخوشگوار واقعہ معتضد باللہ کی بجائے خلیفہ الموفق باللہ کے دورِ اقتدار میں پیش آیا تھا۔ مؤرخین کی اسی جماعت کے مطابق حضرت جنید بغدادیؒ کو الموفق کے دربار میں طلب کر کے پوچھا گیا تھا۔

"جنید! تمہارا مسلک کیا ہے؟"

جواب میں آپؒ نے فرمایا تھا۔

"میں محدث و فقیہہ ہوں اور شیخ ابوثورؒ کا شاگرد ہوں اور ان ہی کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں۔ میرا مسلک قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔"

اس باز پُرس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ کو چھوڑ دیا گیا مگر دوسرے صوفیاء حکومت کی نظر میں مجرم قرار پائے۔ پھر جب ان برگزیدہ ہستیوں کے قتل کے احکام جاری ہوئے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے نہایت آزردہ لہجے میں فرمایا۔

"میں اسی دن کے لئے منع کرتا تھا کہ صبر و ضبط سے کام لو اور لوگوں سے وہ باتیں نہ کرو جو ان کے فہم و ادراک سے بالاتر ہوں۔"

الغرض حضرت شیخ نوریؒ، شیخ شحامؒ، شیخ رقامؒ اور دوسرے مشہور صوفیاء گرفتار کر کے مقتل میں لائے گئے۔ جلاد برہنہ شمشیر لئے ہوئے حکومتی کارندے کے حکم کا منتظر تھا کہ یکایک حضرت شیخ نوریؒ تیزی سے آگے بڑھے اور قتل ہونے کے لئے اپنا سر جھکا دیا۔ جلاد نے پوری زندگی میں کسی انسان کو موت کا اتنا مشتاق نہیں پایا تھا۔ وہ حیران ہو کر بولا۔

"تمہیں خبر بھی ہے کہ تم یہاں کس لئے لائے گئے ہو؟"

"خوب جانتا ہوں کہ موت میری منتظر ہے۔" حضرت شیخ نوریؒ نے بے خوفی کے لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر اتنی جلدی کیوں ہے؟" جلاد کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میرے رفیقوں سے پہلے میری جان لی جائے تاکہ انہیں زندگی کے چند لمحے اور مل جائیں۔" حضرت شیخ نوریؒ نے بڑے والہانہ انداز میں جواب دیا۔

جلاد کچھ دیر تک شدید حیرت واستعجاب کے عالم میں حضرت شیخ نوریؒ کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی شمشیر نیام میں کی اور مقتل سے چلا گیا۔

عباسی خلیفہ کو اس واقعے کی خبر دی گئی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ پھر اس نے نیا حکم جاری کیا کہ تمام اسیروں کو قاضئ بغداد کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ ان لوگوں کے حالات وعقائد کی تفتیش کر سکے۔

پھر جب قاضئ بغداد نے حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ سے فقہ کے چند مسائل دریافت کیے تو آپؒ نے تمام سوالات کا صحیح جواب دیا۔

قاضئ بغداد نے حیران ہو کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ لوگ تم پر تہمت لگاتے ہیں۔''

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ ''قاضی صاحب! میری بات غور سے سنئے۔ حق تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں جو اللہ ہی کی ذات سے قائم ہیں اور جب زبان کھولتے ہیں تو صرف اسی کا ذکر کرتے ہیں۔'' پھر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے اس قدر موثر تقریر کی کہ قاضئ بغداد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس کے بعد قاضئ بغداد نے خلیفہ معتضد باللہ کے نام ایک خط لکھا جس میں واضح طور پر تحریر تھا۔ ''امیر المومنین! اگر یہ لوگ زندیق ہیں تو پھر میرے نزدیک روئے زمین پر کوئی مسلمان نہیں۔''

خلیفہ معتضد باللہ نے قاضئ بغداد کا خط پڑھا اور اپنا فرمان منسوخ کر دیا۔ تمام صوفیاء رہا ہو کر اپنی اپنی خانقاہوں میں واپس چلے گئے مگر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو خلیفہ معتضد باللہ کی طرف سے اس قدر اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ جب تک وہ 289 ھ میں انتقال نہیں کر گیا اس وقت تک آپؒ دارالخلافہ بغداد سے دور دور ہی رہے۔ واضح رہے کہ یہ موت کا خوف نہیں تھا۔ دراصل حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ دنیا کے ہنگاموں سے بچنا چاہتے تھے۔ اس لئے بغداد چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

ضروری ہے کہ یہاں اس مرد جانباز کے کچھ اہم واقعات بیان کئے جائیں جس نے دوستوں اور درویشوں کو زندگی کی چند سانسیں فراہم کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنا سر پیش کر دیا تھا۔

آپؒ کا پورا نام ابوالحسن احمد بن نوریؒ تھا۔ بزرگوں کا تعلق خراسان سے تھا مگر آپؒ بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ حضرت شیخ سری سقطیؒ کے مرید اور شاگرد تھے۔ اس رشتے سے آپؒ حضرت جنید بغدادی کے پیر بھائی بھی تھے اور دوست

بھی۔ بڑے بڑے مشائخ آپؒ کو ''امیر القلوب'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ اپنے مسلک کے اعتبار سے تصوف کو فقر پر ترجیح دیتے تھے۔ آپؒ کا مشہور قول ہے۔

''ایثار وقربانی کے بغیر صحبت شیخ جائز نہیں۔''

حضرت شیخ ابوالحسنؒ کو نوری کا خطاب اس لئے دیا گیا کہ آپؒ کے چہرۂ مبارک سے ایسا نور ظاہر ہوتا تھا جس سے پورا مکان منور ہو جاتا تھا۔ دوسری روایت ہے کہ شیخ نوریؒ جس جھونپڑی میں مشغولِ عبادت رہتے تھے، وہ آپؒ کی کرامت سے سیاہ رات میں بھی روشن رہتی تھی۔ آپؒ کے متعلق حضرت شیخ ابواحمد مغازیؒ کا یہ قول بہت شہرت رکھتا ہے۔

''میں نے شیخ نوریؒ سے بڑھ کر جنید بغدادیؒ کو بھی عبادت گزار نہیں پایا۔''

ریاضت کے ابتدائی دور میں حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ گھر سے کھانا لے کر نکلتے اور راستے میں خیرات کر کے اپنی دکان پر جا بیٹھتے۔ یہ سلسلہ بیس سال تک جاری رہا اور گھر والے یہی سمجھتے رہے کہ آپؒ نے کھانا کھا لیا ہوگا۔ حضرت شیخ نوریؒ فرمایا کرتے تھے۔

''میرے لئے برسوں کے مجاہدات، ریاضتیں اور خلوتیں سب بے سود ثابت ہوئے۔ اور جب میں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے قول کے مطابق یہ غور کرنا شروع کیا کہ شاید میری عبادت میں ریا کا عنصر شامل ہو گیا ہو تو پتہ چلا کہ میرے نفس نے قلب سے سازباز کر رکھی ہے۔ پھر جب میں نے اپنے نفس کی مخالفت شروع کی تو مجھ پر اسرارِ باطنی کا انکشاف ہونے لگا۔ آخر ایک دن میں نے اپنے نفس سے سوال کیا۔ ''اب تیری کیا کیفیت ہے؟'' نفس نے مجھے جواب دیا۔ ''میری کوئی مراد پوری نہ ہو سکی۔'' اس کے بعد میں دریائے دجلہ پہنچا اور پانی میں کانٹا ڈال کر باری تعالیٰ سے عرض کرنے لگا۔ ''جب تک مچھلی نہیں پھنسے گی، اس وقت تک میں اسی طرح کھڑا رہوں گا۔ پھر جیسے ہی میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، مچھلی پھنس گئی۔''

ایک دن حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ سے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپؒ نے فرمایا۔

''ابوالحسن! اگر تم مچھلی کی بجائے سانپ کا شکار کرتے تو یقیناً کرامت ہوتی۔ ابھی تم درمیانی منزل میں ہو اس لئے تمہارے واقعے کو کرامت نہیں بلکہ فریب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کا جواب سن کر شیخ نوریؒ نے فرمایا۔ ''ابوالقاسم! تم سچ کہتے ہو۔'' یہ آپؒ کے صبر وتحمل اور بلند حوصلگی کی دلیل تھی۔

ایک دن حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ آپؒ نے اپنے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''ابوالقاسم! تیس سال سے میں اس عجیب اُلجھن میں مبتلا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ ظاہر ہوتا ہے تو میں گم ہو جاتا ہوں اور جب میں ظاہر ہوتا ہوں تو اس کی ذات پاک مجھ سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔''

شیخ نوریؒ کی اس کشمکش کا ذکر سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''آپ اسی حالت پر قائم رہیں کہ ظاہر و باطن میں صرف وہی نظر آتا ہے اور آپ گم رہیں۔''

ایک دن کچھ لوگوں نے حضرت جنید بغدادیؒ کو بتایا کہ شیخ نوریؒ تین دن سے پتھر پر بیٹھے با آواز بلند ''اللہ، اللہ'' کر رہے ہیں اور کھانا پینا ترک کر دیا ہے مگر نماز اپنے صحیح وقت پر ادا کرتے ہیں۔

یہ واقعہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ کے کچھ مریدوں نے عرض کیا۔ ''شیخ! یہ تو فنا کی دلیل نہیں بلکہ ہوش کی علامت ہے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مریدوں کے خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ بات نہیں۔ دراصل شیخ نوریؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہے اور صاحب وجد حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ صحیح وقت پر نماز ادا کرتے ہیں۔''

اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ اس جگہ تشریف لے گئے اور حضرت ابوالحسن نوریؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''شیخ! اگر اللہ کو رضا پسند ہے تو پھر آپ شور و غوغا کیوں کرتے ہیں؟''

حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد گرامی سن کر شیخ نوریؒ خاموش ہو گئے۔ پھر مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد فرمایا۔ ''جنید! تم میرے بہترین استاد ہو۔''

ایک بار حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ غسل کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور آپؒ کے کپڑے چرا کر لے گیا۔ پھر جب حضرت شیخؒ غسل سے فارغ ہوئے اور لباس کو موجود نہ پایا تو بہت پریشان ہوئے بار بار فرماتے تھے۔ ''میرے بھائی! تم اتنے ضرورت مند تھے تو مجھ سے کہا ہوتا۔ کپڑے لے گئے اور یہ بھی نہ سوچا کہ صاحبِ لباس اس حالت میں حمام سے باہر کیسے نکلے گا؟'' حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ غائبانہ طور پر چور کو مخاطب کر کے یہ باتیں کہہ رہے تھے۔

چور حضرت شیخ نوریؒ کا پیرہن لے کر تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اسے اپنے دونوں ہاتھ ناکارہ محسوس ہوئے۔ جیسے وہ فالج کا شکار ہو گئے ہوں۔ چور خوف زدہ ہو گیا اور فوری طور

پر سمجھ گیا کہ یہ کپڑے چرانے کی سزا ہے۔ نتیجتاً وہ بدحواسی کے عالم میں واپس پلٹا اور حمام پہنچ کر حضرت شیخ نوریؒ کا پیرہن واپس کر دیا۔ کپڑے پہن کر آپؒ حمام سے باہر تشریف لائے۔ لباس چور مفلوج ہاتھوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑا تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس نے میرے کپڑے واپس کر دیئے۔ تُو بھی اس کے ہاتھوں کی توانائی لوٹا دے۔''

جیسے ہی حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، چور کے ہاتھوں کی سلب شدہ طاقت واپس آ گئی۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک بار آپؒ پر جذب کی سی کیفیت طاری تھی۔ سامنے آگ سے بھری ہوئی انگیٹھی رکھی تھی۔ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے ایک دہکتا ہوا انگارہ اٹھا کر اسے ہاتھ سے مسل ڈالا۔ کوئلہ تو بجھ گیا مگر آپؒ کا ہاتھ کالا ہو گیا۔ اسی دوران خادمہ کھانا لے کر آ گئی۔ حضرت شیخ نوریؒ نے ہاتھ دھوئے بغیر کھانا شروع کر دیا۔

آپؒ کے اس طریقے کو دیکھ کر ملازمہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ انتہائی بدتمیزی کی علامت ہے۔ حضرت شیخ نوریؒ اپنی خادمہ کی اس سوچ سے بے خبر خاموشی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چند سپاہی داخل ہوئے اور حضرت شیخ نوریؒ کی خادمہ کو پکڑ لیا۔

خادمہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''میرا قصور کیا ہے؟''

''تُو نے فلاں رئیس کے گھر سے قیمتی لباس چوری کیا ہے۔'' سپاہیوں نے جواب دیا اور خادمہ کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے یہ منظر دیکھا تو سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس خاتون کو چھوڑ دو۔ تمہاری کھوئی ہوئی چیز مل جائے گی۔''

ابھی سپاہی حضرت شیخ نوریؒ کی باتوں پر حیران ہو رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے ایک قیمتی لباس سپاہیوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری مطلوبہ چیز میرے پاس ہے۔ یہ لباس میں نے چرایا تھا۔''

سپاہیوں نے خادمہ کو چھوڑ دیا اور اس شخص کو کوتوالی لے کر چلے گئے۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آج میری

بدتمیزی ہی تیرے کام آ گئی۔"

خادمہ حضرت شیخؒ کی اس قوتِ کشف پر حیران رہ گئی اور رو رو کر معافی مانگنے لگی۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

ایک بار بغداد کے کسی محلے میں خوف ناک آگ لگی جس سے کئی افراد جل کر مر گئے۔ کسی رئیس کے دو غلام بھی اسی آگ کے شعلوں میں گھر گئے تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ جو شخص میرے غلاموں کو آگ سے نکال لائے گا، اسے ایک ہزار دینار انعام میں دیئے جائیں گے۔ اتفاقاً حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ بھی ادھر سے گزر رہے تھے۔ آپؒ نے یہ اعلان سنا تو رئیس بغداد سے فرمایا۔

"کیا واقعتہً تم اس شخص کو اتنا گرانقدر انعام دو گے جو تمہارے غلاموں کو بچائے گا؟"

"کسی کو میری بات پر شک نہیں ہونا چاہئے۔" رئیس بغداد نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "میں اپنے غلاموں کی زندگی کے عوض اسی وقت یہ رقم دینے کو تیار ہوں۔"

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھا اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد انسانی ہجوم نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ حضرت شیخ نوریؒ دونوں غلاموں کو لئے ہوئے آگ سے اس طرح باہر آ گئے کہ آپؒ کا جسم مبارک بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اثرات سے محفوظ رہا اور دونوں غلاموں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

رئیس بغداد نے حسب وعدہ ایک ہزار دینار آپؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے دولت کے اس ڈھیر کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "یہ تم اپنے پاس ہی رکھ لو۔ کیونکہ تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں دولت کی حرص سے آزاد ہوں اور میں نے دنیا کو آخرت سے تبدیل کر لیا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے مجھے یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے کہ آگ کے شعلے میرے جسم کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔"

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

ایک دن حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کسی مقام سے گزر رہے تھے۔ آپؒ نے دیکھا کہ ایک شخص راستے میں بیٹھا رو رہا ہے اور اس کے قریب ہی ایک گدھا مرا پڑا ہے۔ حضرت شیخ نوریؒ نے قریب پہنچ کر اس شخص سے پوچھا۔

"تجھے ایسی کون سی تکلیف پہنچی ہے جو سرِ عام لوگوں کے سامنے بیٹھا رو رہا ہے؟"

"میں ایک مسافر ہوں اور میرا گدھا مر گیا ہے۔" اس شخص نے مُردہ جانور کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس خیال سے رو رہا ہوں کہ اب اپنا اسباب و سامان کس پر لادوں گا اور یہ طویل راستہ کس طرح طے کروں گا؟"

"یہ تو نظامِ دنیا ہے۔" حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ "ایک چیز کھو جاتی ہے تو دوسری چیز خرید لی جاتی ہے۔"

"اپنی اسی مجبوری کا تو ماتم کر رہا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "میں اس قابل نہیں ہوں کہ دوسرا گدھا خرید سکوں۔"

یہ سن کر حضرت شیخ نوریؒ کو اس شخص پر ترس آیا۔ پھر آپؒ نے انتہائی جذب و کیف کے عالم میں فرمایا۔ "مگر وہ تو اس قابل ہے کہ جس طرح چاہے، تجھے تیرا گدھا لوٹا دے۔" یہ کہہ کر آپؒ نے گدھے کو ایک ٹھوکر ماری اور کہا۔ "اب اُٹھ جا! یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔"

ابھی فضا میں حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ گدھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مسافر نے آپؒ کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

"پاک ہے وہ ذات جو عجیب عجیب انداز سے اپنے بندوں کی دستگیری کرتی ہے۔"

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

اسی طرح ایک بار حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ راستے سے گزر رہے تھے کہ آپؒ نے چند سپاہیوں کو دیکھا جو ایک ضعیف و ناتواں انسان کو زدوکوب کرتے ہوئے لئے جا رہے تھے مگر وہ بوڑھا شخص انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ سپاہیوں کی مار کھا رہا تھا اور منہ سے اُف تک نہیں کرتا تھا۔ حضرت شیخ نوریؒ کو اس شخص کی قوتِ برداشت پر بہت حیرت ہوئی۔ آخر آپؒ نے سپاہیوں سے پوچھا۔

"تم اس شخص کو کہاں لئے جا رہے ہو؟"

"ہم اسے زندان کے حوالے کرنے جا رہے ہیں۔" سپاہیوں نے کہا اور دوبارہ اس بوڑھے شخص کو پیٹنا شروع کر دیا۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ خاموشی سے یہ تکلیف دہ منظر دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ ضعیف انسان اور سپاہی نظروں سے اوجھل ہو گئے مگر آپؒ نے آخر تک اس ضعیف انسان کے منہ سے کوئی چیخ یا شکایت نہیں سنی۔

وہ رات حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے بڑے اضطراب کے عالم میں گزار دی۔ بار بار آپؒ کو سپاہیوں کے تشدد اور اس بوڑھے شخص کی خاموشی کا خیال آتا تھا۔ آخر حضرت شیخ نوریؒ سے برداشت نہ ہو سکا تو آپؒ قید خانے پہنچ گئے اور اس ضعیف و ناتواں انسان

سے پوچھا۔

"اس قدر کمزوری اور نقاہت کے باوجود تم نے سپاہیوں کے تشدد پر کس طرح صبر کیا؟"

بوڑھے شخص نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "صبر کا تعلق جسمانی طاقت سے نہیں، انسانی ہمت و شجاعت سے ہے۔"

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو اس شخص کے جواب پر حیرت ہوئی۔ پھر آپؒ نے دوسرا سوال کیا۔ "تمہارے نزدیک صبر کا کیا مفہوم ہے؟"

ضعیف و ناتواں شخص نے کہا۔ "آفات و مصائب کو اسی طرح خوشی کے ساتھ برداشت کرنا چاہئے، جس طرح لوگ مصائب سے نجات پا کر مسرور و مطمئن ہوتے ہیں۔"

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

آپؒ کو حیران پا کر بوڑھے نے کہا۔ "آگ کے سات سمندر پار کرنے کے بعد انسان کو معرفت حاصل ہوتی ہے اور جب حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اسے اول و آخر کا علم بھی حاصل ہو جاتا ہے۔"

"بے شک! اس کے چاہنے والے ایسی عجیب عجیب حالتوں میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔" حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور قید خانے سے چلے گئے۔

دراصل یہ ایک مشاہدہ تھا جو حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو قدرت کی طرف سے کرایا گیا تھا۔

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید خاص حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو مراقبے کی حالت میں دیکھا۔ آپؒ اس قدر سکوت کے عالم میں آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے کہ بہت غور سے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ سانسوں کا عمل جاری ہے ورنہ کوئی عام انسان دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ حضرت شیخ نوریؒ دنیا سے گزر چکے ہیں۔

آپؒ کی اسی حالت کو دیکھ کر حضرت ابوبکر شبلیؒ نے پوچھا۔

"شیخ! آپ نے مراقبے کا یہ کمال کس سے سیکھا؟"

حضرت شیخ نوریؒ نے نہایت سادگی کے ساتھ جواب دیا۔ "بلی سے۔"

حضرت ابوبکر شبلیؒ یہ جواب سن کر حیران رہ گئے۔ "وہ کس طرح؟"

حضرت شیخ نوریؒ نے فرمایا۔ "ایک دن میں نے ایک بلی کو دیکھا۔ وہ چوہے کے بل کے سامنے مجھ سے بھی زیادہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اصفہان کے شاہی خاندان کے ایک نوجوان نے حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی شہرت سنی تو اسے آپؒ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق پیدا ہوا کہ وہ بغداد جانے کے لئے بے قرار رہنے لگا۔ شاہ اصفہان نے نوجوان کی یہ حالت دیکھ کر کہا۔ "تم شاہوں کی اولاد ہو، تمہیں فقیروں سے کیا نسبت؟"

"شیخ نوریؒ کی طرف میرا دل کھنچا جا رہا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت مجبور پاتا ہوں۔" نوجوان نے پُرشوق لہجے میں کہا۔

"اگر تم بغداد نہ جاؤ تو میں تمہارے لئے نیا محل آراستہ کئے دیتا ہوں۔" شاہ اصفہان نے نوجوان کو لالچ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ خوب صورت کنیزیں تمہاری دل بستگی کے اتنے اسباب فراہم کر دیں گی کہ تم بغداد کے اس فقیرِ بے سرو ساماں کو بھول جاؤ گے۔"

خاندانِ شاہی کے اس مضطرب نوجوان نے جواب دیا۔ "عیش و عشرت کے یہ سامان نہایت حقیر اور کم تر ہیں۔ میرے شوقِ دیدار کے مقابلے میں ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں۔"

الغرض وہ اصفہانی نوجوان برہنہ پا بغداد کی طرف روانہ ہو گیا

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ اچانک آپؒ نے اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "خانقاہ سے لے کر ایک میل تک زمین کو صاف و شفاف کر دو کیونکہ ہمارا ایک عاشق شوقِ ملاقات میں اصفہان سے ننگے پاؤں چلا آ رہا ہے۔"

پھر جب وہ شاہی خاندان کا نوجوان حضرت شیخ نوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے بڑے والہانہ انداز میں اسے خوش آمدید کہا۔ پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"ایک عاشق صادق کو محل اور کنیزیں تو کیا، تاج و تخت کا لالچ بھی نہیں روک سکتا۔"

اصفہانی نوجوان حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی اس قوتِ کشف پر حیران رہ گیا۔ پھر وہ بے تابانہ آگے بڑھا اور آپؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

حضرت شیخ نوریؒ نے اپنا دستِ مہربان اس کے سر پر رکھ دیا اور فرمایا۔

"اے جانِ بے قرار، سن! مرید کی شان یہ ہوتی ہے کہ اگر سارے جہان کی نعمتیں بھی اسے پیش کی جائیں تو انہیں ٹھوکر مار دے۔"

پھر اہلِ بغداد نے دیکھا کہ اصفہانی نوجوان نے اپنی پُرتعیش زندگی کو ٹھوکر مار دی اور حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے در کی گدائی پر رضامند ہو گیا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

ایک بار حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ بیمار ہوئے تو حضرت جنید بغدادیؒ عیادت کے لئے حاضر ہوئے اور آپؒ کی خدمت میں کچھ پھول اور پھل پیش کئے۔

اس واقعے کے چند سال بعد حضرت جنید بغدادیؒ بیمار ہو گئے۔ جب حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو خبر ملی تو آپؒ اپنے مریدوں کو لے کر مزاج پُرسی کے لئے حاضر ہوئے۔ کچھ دیر رسمی گفتگو کی، پھر اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"جنید میرے بھائی اور دوست ہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم سب ان کا مرض اپنے اوپر تقسیم کر لیں۔"

اس کے بعد با آواز دعا فرمائی۔ "اے مسیحائے حقیقی! ہم تیری بارگاہِ کرم میں جنید کی صحت کا سوال کرتے ہیں۔ تُو ان کی تکلیف ہمیں منتقل کر دے اور انہیں مکمل طور پر صحت عطا فرما دے۔"

جیسے ہی حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت جنید بغدادیؒ کو اپنے جسم میں ایک تغیر سا محسوس ہوا اور پھر تھوڑی دیر میں بیماری کے سارے اثرات زائل ہو گئے۔

جب حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ رخصت ہونے لگے تو آپؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ سے فرمایا۔ "شیخ! دوستوں کی عیادت اس طرح کرنا چاہئے۔"

یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر آپؒ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"شیخ! دوستوں کے لئے یہ جذبۂ جاں نثاری آپ ہی کی شان ہے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت شیخ ابوحمزہؒ اپنی مجلسِ وعظ میں "قرب" کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس مجلس میں حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ بھی موجود تھے۔ جب حضرت شیخ ابوحمزہؒ کی تقریر ختم ہو گئی تو حضرت شیخ نوریؒ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"جس قرب میں ہم لوگ ہیں، دراصل وہ بُعد در بُعد "دُوری در دُوری" ہے۔"

حضرت شیخ ابوحمزہؒ نے فرمایا۔ "شیخ! پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔

"جب بندہ اللہ کو پہچان لے اور اس میں وعظ گوئی کی صلاحیت موجود ہو تو اسے وعظ کہنا چاہئے۔ اگر اللہ کو پہچانے بغیر کوئی وعظ کہتا ہے تو اس کی تقریروں کی بلا (مصیبت) بندوں اور شہروں میں پھیل جاتی ہے۔"

پھر اسی مجلس میں حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ "وجد کی حقیقت کا اظہار اس لئے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ وجد ایک ایسا شعلہ ہے جو سر کے اندر بھڑکتا ہے اور شوق کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔"

ایک اور موقع پر حضرت شیخ نوریؒ نے فرمایا۔ "سنت کے اتباع کے بغیر اسلام کا راستہ نہیں ملتا۔ صوفی کی تعریف یہ ہے کہ نہ تو وہ کسی کی قید میں ہو اور نہ کوئی اس کی قید میں۔"

ایک اور موقع پر صوفیاء کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ "صوفیاء کی روحیں غلاظتِ بشری سے آزاد، کدورتِ نفسانی سے صاف اور خواہشات سے مبرا ہوتی ہیں۔ تصوف نہ تو رسم ہے اور نہ علم۔ اگر رسم ہوتا تو مجاہدات سے اور علم ہوتا تو تعلیمات سے حاصل ہو جاتا۔"

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کا مشہور قول ہے۔ "تصوف ایک اخلاقی شے ہے جو اللہ تعالیٰ کے اخلاق و عادات اختیار کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ "دنیا دشمنی" اور "خدا دوستی" کا نام تصوف ہے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ فرمایا کرتے تھے۔ "میں نے ایک بار طواف کے دوران یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے وہ مقام اور وصف عطا فرما دے جس میں کبھی کوئی تغیر نہ ہو۔"

حضرت شیخ نوریؒ کی اس دعا کے جواب میں ایک صدائے غیبی سنائی دی۔ "اے ابوالحسن! کیا تُو خالق کائنات کے مساوی ہونا چاہتا ہے؟ یہ وصف تو خاص اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس کی ذات پاک میں کبھی تغیر و تبدل رُونما نہیں ہوتا........ مگر بندوں میں یہ تغیر اس لئے رکھا گیا کہ وہ اس کی بندگی کا اظہار کرتے رہیں۔"

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے سیرت و کردار کی یہ خاص علامت تھی کہ آپؒ اللہ کی مخلوق سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے دکھوں اور غموں کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتے تھے اور بڑے سوز و گداز کے ساتھ عام مسلمانوں کی مغفرت کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ جعفر خدریؒ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے کانوں سے

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کو مناجات کرتے سنا۔

''اے اللہ! تُو نے اپنے بندوں کو پیدا کیا اور پھر ان ہی کو دوزخ کا عذاب دے گا لیکن تیرے اندر یہ قدرت بھی تو ہے کہ تُو ابوالحسن کے وجود سے جہنم کو بھر دے اور اس کے بدلے میں تمام دوزخیوں کو جنت میں داخل فرمادے۔''

حضرت شیخ جعفر خدریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی رات خواب دیکھا۔ کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا۔

''ابوالحسن کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ مخلوق کی محبت کے بدلے میں ہم نے اس کی مغفرت فرمادی۔''

یہی وہ جذبۂ جاں نثاری تھا کہ جس کے زیر اثر حضرت شیخ نوریؒ نے مقتل میں آگے بڑھ کر اپنی گردن تلوار کے نیچے رکھ دی تھی اور جب جلاد نے اس بے قراری اور عجلت کا سبب پوچھا تو آپؒ نے فرمایا تھا۔

''میں اس لئے پہلے قتل ہونا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھیوں کو زندگی کی چند سانسیں مل جائیں۔''

ایک دن آپؒ کے خدمت گاروں نے دیکھا کہ حضرت شیخ نوریؒ راستے میں بیٹھے رو رہے تھے اور آپؒ کے قریب ہی ایک اجنبی شخص بھی بیٹھا ہوا گریہ وزاری کر رہا تھا۔ پھر جب وہ شخص چلا گیا تو آپؒ نے اپنے مریدوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

''وہ ابلیس تھا۔ اس نے اپنی عبادت کو یاد کر کے اس قدر گریہ وزاری کی کہ مجھے بھی رونا آ گیا۔''

ایک دن ایک نابینا شخص حضرت شیخ نوریؒ کو راستے میں ملا۔ وہ با آواز بلند ''اللہ اللہ'' کا وِرد کر رہا تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسنؒ نے اس شخص کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''تُو کیا جانے کہ اللہ کون ہے؟ اگر جان لیتا تو ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔''

جیسے ہی حضرت شیخ نوریؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ آپؒ غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ پھر جب ہوش آیا تو شیخ نوریؒ ایک ایسے جنگل میں جا پہنچے جہاں بانس کی پھانسیں آپؒ کے پورے جسم میں چبھی ہوئی تھیں۔ پھر اسی حالت میں شیخ نوریؒ کو گھر لایا گیا۔ مریدوں، خدمت گاروں اور دوستوں نے آپؒ کو تلقین کی۔

''شیخ! لا الٰہ الا اللہ کہئے۔''

حضرت ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ ''تم لوگ جس کے ذکر کی تلقین کر رہے ہو، میں اسی کے پاس تو جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر آپ بادِ نسیم کے جھونکے کی طرح دنیا سے گزر گئے۔

ایک مجلس میں کسی شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ سے سوال کیا۔ ''معرفت میں حضرت ابوالحسنؒ کا کیا مقام تھا؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

''شیخ نوریؒ اپنے دور کے ایسے صدیقوں میں سے تھے کہ آپؒ کے بعد کسی عارف نے اتنی حقیقی اور سچی بات نہیں کہی۔''

یہ تھے حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ جن کی بے مثال جرأت اور جاں نثاری کے سبب خلیفہ معتضد باللہ نے صوفیائے عراق کی معافی کا فرمان جاری کیا۔ اگر خدانخواستہ صوفیوں کی یہ جماعت قتل ہو جاتی تو اللہ ہی جانتا ہے کہ تصوف کی تاریخ کیا ہوتی؟

بہرحال اس واقعے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ بہت زیادہ محتاط ہو گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے آپؒ نے کم علم لوگوں پر اپنی علمی مجلسوں کے دروازے بند کر دیئے تھے اور غالباً اسی باعث آخری عمر میں آپؒ کے مخاطبین کی تعداد بیس سے بھی کم رہ گئی تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار جب میں اپنے روزمرہ کے وظائف میں مشغول تھا تو مجھے نیند آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے اُترا۔ اُس نے اپنی روح میرے سینے کے اندر انڈیل دی اور مجھ سے کہنے لگا۔

''ابوالقاسم! اُٹھو اور لوگوں سے خطاب کر۔ اب تیرے اندر روح موجود ہے۔''

یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ زار و قطار رونے لگے۔

غالباً یہ اس خواب کے بعد کا واقعہ ہے جب سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؒ کو وعظ کہنے کا حکم دیا تھا۔ قارئین کو یہ راز سمجھ لینا چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو علم و حکمت سے سرفراز کرتا ہے تو فرشتوں کے ذریعے اس کے دل و دماغ کے دریچے کھول دیتا ہے۔

ایک بار کسی شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ سے صوفیاء کے کلام کے بارے میں سوال کیا تو آپؒ نے فرمایا۔ ''صوفیاء تو کلام ہی نہیں کرتے۔''

پھر جب اسی شخص نے مشہور بزرگ حضرت عبداللہ بن خفیفؒ سے حضرت جنید بغدادیؒ کا حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال کیا تو آپؒ نے فرمایا۔

''جو کچھ ابوالقاسم (جنید بغدادیؒ) نے کہا وہی درست ہے۔ صوفی کو اُن دیکھی دنیا کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں ہوتی۔ پھر جب اس کی زبان کھول دی جاتی ہے اور حق تعالیٰ اسے بولنے کی اجازت دیتا ہے تو وہ کلام کرتا ہے ورنہ خاموش ہی رہتا ہے۔

فصاحت و بلاغت تو ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس موضوع پر اصل کتابوں کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور انہیں زبانی یاد کر لیتے ہیں۔“

مشہور روایت ہے کہ اکثر و بیشتر حضرت جنید بغدادیؒ سے وعظ کے دوران یہ گزارش کی جاتی تھی کہ جو بات آپ نے ابھی کہی ہے، اسے پھر سے دہرا دیں۔ جواب میں حضرت شیخؒ فرماتے۔

”یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ وہ الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے میرے منہ میں ڈال دیئے تھے اور میری زبان کو گویائی عطا کر دی تھی۔ وہ الفاظ نہ کتابوں سے مجھے حاصل ہوئے اور نہ کسی تعلیم سے۔ بلکہ وہ تو محض عطیۂ خداوندی تھا۔“

ایک دوسرے موقع پر حضرت جنید بغدادیؒ سے درخواست کی گئی۔ ”شیخ! ابھی کچھ دیر پہلے جو تقریر آپ نے کی ہے، براہِ کرم اس کا اعادہ فرما دیں۔“

حضرت جنید بغدادیؒ نے جواب میں فرمایا۔ ”اگر وہ الفاظ میرے ہوتے تو میں تمہیں قلم بند کرا دیتا اور بار بار کی زحمت سے بچ جاتا۔“

اور یہی ایک حقیقی صوفی کی شان ہے کہ وہ الہام کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کی مجلسِ وعظ میں چالیس افراد موجود تھے۔ آپؒ کے بیان کی اثر انگیزی جب اپنی انتہا کو پہنچی تو حاضرین میں سے بائیس افراد بے ہوش ہو گئے۔ باقی افراد خاموش بیٹھے رہے مگر آتشِ معرفت سے ان کے سینے جلنے لگے۔ پھر یہی جلتا ہوا غبار ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ بے ہوش افراد میں سے کئی صاحبانِ دل کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنی جانوں سے گزر گئے۔ اپنی مجلسِ وعظ کا یہ حال دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ نے وعظ گوئی ترک کر دی۔

پھر جب اہلِ ذوق حضرات نے اصرار کیا تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ”میں اپنی ہی تقریروں کے ذریعے خود کو ہلاکت میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔“

حضرت جنید بغدادیؒ کے اس اعلان کے بعد صاحبانِ دل کی صفوں میں گہری اُداسی چھا گئی۔ پھر ایک دن اہلِ بغداد نے دیکھا کہ حضرت شیخ جنیدؒ دوبارہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپؒ نے ایسی اثر انگیز تقریر کی کہ لوگوں کے دل پگھلنے لگے اور آنکھیں دجلہ و فرات کا منظر پیش کرنے لگیں۔

تقریر ختم ہونے کے بعد کچھ قریبی دوستوں نے عرض کیا کہ اچانک اس تبدیلی کا

سبب کیا ہے؟

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

”میں نے اپنے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارک دیکھی ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مخلوق میں سے بدترین شخص مخلوق کا کفیل بن کر ہدایت کا راستہ دکھائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو بدترین مخلوق تصور کر لیا ہے اور اسی لئے دوبارہ وعظ گوئی شروع کر دی ہے۔“

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ مسلمان تقریر کے بجائے اپنے عمل سے اہلِ دنیا کو اسلام کی ترغیب دیتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا خود کو بدترین مخلوق قرار دینا، عجز و انکسار کی دلیل ہے اور اسی کا نام نفس کشی ہے۔

حضرت شیخ رویمؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے گہرے دوست تھے۔ ایک بار شیخ رویمؒ کہیں جا رہے تھے کہ انہیں ایک بڑھیا ملی۔ ضعیف خاتون نے شیخ رویمؒ کو روک کر کہا۔

”تم سے ایک ضروری کام ہے۔ اگر تم اسے تکمیل تک پہنچا سکو تو بیان کروں۔“

حضرت شیخ رویمؒ نے وعدہ کر لیا۔

پھر اس ضعیف خاتون نے کہا۔ ”اگر تم شیخ جنیدؒ کی مجلس میں جاؤ تو ان سے کہنا کہ تمہیں عوام کے سامنے ذکرِ الٰہی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“

جب شیخ رویمؒ نے بوڑھی عورت کے یہ الفاظ دہرائے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ”میں عوام کے سامنے حق تعالیٰ کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ دنیا میں کسی سے بھی اس کے ذکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔“

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ وعظ فرما رہے تھے۔ پھر جب آپؒ کی تقریر ختم ہو گئی تو ایک شخص اپنی نشست پر کھڑے ہو کر عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! آپ کی باتیں میرے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔“

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

”اپنی ستر سال کی عبادت قدموں کے نیچے رکھ کر سرنگوں ہو جا۔ پھر اگر میری باتیں تیری سمجھ میں نہ آئیں تو یقیناً میرا ہی قصور ہوگا۔“

ایک بار کسی شخص نے آپؒ کے وعظ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! آپ کی تقریر بے مثال ہے۔“

حضرت جنید بغدادیؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”دراصل یہ

شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت و صناعی کی تعریف کر رہا ہے کہ اسی ذات پاک نے جنید کے دل و دماغ کو کشادہ کیا ہے اور اسی نے یہ تاثیرِ زبان بخشی ہے۔''

دنیا بھر میں ایک عجیب شہرت رکھنے والے بزرگ حضرت منصور حلاجؒ بھی حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے۔ آپؒ پہلے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ پھر جب کیف و جذب کا غلبہ بڑھا تو حضرت منصور حلاجؒ اپنے پیر و مرشد سے دلبرداشتہ ہو کر حضرت جنید بغدادیؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

''میری دلبرداشتگی کا سبب یہ ہے کہ بندہ اپنی ہوشیاری و مستی کی وجہ سے ہمہ وقت صفاتِ الٰہی میں فنا نہیں رہ سکتا۔''

حضرت منصورؒ کی بات سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''حسین! تم نے ہوشیاری اور مستی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔''

اور پھر جب منصور حلاجؒ دار و رسن کے مرحلے سے گزرے تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول مبارک ہی درست تھا۔

آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار میرا قلب کہیں گم ہو گیا۔ میں نے خالقِ کائنات کے حضور دعا کی۔ ''اے قادرِ مطلق! مجھے میرا کھویا ہوا دل لوٹا دے۔''

کئی دن تک میں اسی طرح گریہ و زاری کرتا رہا۔ پھر ایک روز صدائے غیب سنائی دی۔ ''ہم نے تمہارا قلب اس لئے لیا ہے کہ تم ہماری معیت میں رہو........ مگر تم قلب کی واپسی چاہتے ہو کہ غیروں کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔''

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ کی مجلسِ عرفان آراستہ تھی۔ ایک شخص نے آپؒ کے شاگرد حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کا قول دہرایا۔

''اگر مجھے جنت اور دوزخ کے حصول پر اختیار دیا جائے تو میں جہنم کو اس لئے اختیار کروں گا کہ جنت میری پسندیدہ شے ہے اور دوزخ حق تعالیٰ کی۔ لہٰذا دوست کی پسندیدہ شے کو پسند نہ کرنے والا دوست نہیں ہو سکتا۔''

اپنے شاگرد کا یہ قول سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''میں تو بندہ ہونے کی حیثیت سے صاحب اختیار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ مجھے جہاں بھی بھیج دے گا، اس کا شکر ادا کروں گا۔''

ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کے پاؤں میں شدید درد اُٹھا۔ آپؒ بہت دیر تک اس درد کو برداشت کرتے رہے مگر جب تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تو حضرت جنید بغدادیؒ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر اپنے پاؤں پر دم کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درد غائب ہو گیا اور آپؒ

نے سکون کا سانس لیا۔

ناگہاں ایک صدائے غیب سنائی دی۔

''جنید! تجھے اس بات پر ندامت نہیں ہوئی کہ تُو نے اپنے نفس کی خاطر ہمارے کلام کو استعمال کیا۔''

یہ سنتے ہی حضرت جنید بغدادیؒ کا پورا جسم خوف سے لرزنے لگا اور آپؒ پر اس قدر ندامت طاری ہوئی کہ بہت دنوں تک اس واقعے کو یاد کر کے روتے رہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے رات کے ایک حصے میں سویا کرتے تھے۔ بعض بزرگ شب بیداری کو صوفیاء کی معراج سمجھتے تھے۔ اسی خیال کے پیش نظر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت سہل تستریؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا۔

''خوابِ غفلت سے بچو۔ اس لئے کہ سونے والا اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کے ذریعے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''جو ہماری محبت کا دعویدار ہو کر راتوں کو سوتا ہے، وہ جھوٹا ہے۔''

حضرت سہل تستریؒ کے اس خط کے جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے تحریر فرمایا۔

''میرے عزیز بھائی! یہ حکم خاص انبیائے کرام علیہم السلام کے لئے تو ہو سکتا ہے مگر ایک بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بیدار رہنا ہمارا ذاتی فعل ہے۔ اس کے برعکس ہمارے سونے کا تعلق اللہ کے فعل سے ہے........ اور اللہ کا فعل انسانوں کے فعل سے بدرجہا بہتر ہے جیسا کہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے اپنے کلام مقدس میں فرمایا ہے۔

''نیند ایک بخشش ہے اللہ کی جانب سے اپنے دوستوں پر۔''

ان ہی حضرت سہل تستریؒ سے کسی شخص نے پوچھا۔ ''آپ کے نزدیک حضرت جنید بغدادیؒ کا عارفانہ مقام کیا ہے؟''

''تذکرۃ الاولیاء'' میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی روایت کے مطابق حضرت سہل تستریؒ نے فرمایا۔

''صوفیاء میں جنیدؒ کا مرتبہ سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ آدم علیہ السلام کی طرح عبادت تو کرتے تھے مگر راہِ طریقت کی مشقت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔''

یہ روایت نقل کرتے ہوئے حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سہل تستریؒ کا یہ قول ایک ایسا راز ہے جو ہماری فہم سے بالاتر ہے۔

ہم بھی حضرت سہل تستریؒ کے اس قول پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے کہ خدا جانے ان کے

نزدیک مشقت کا کیا مفہوم تھا؟ اور جہاں تک حضرت جنید بغدادیؒ کی مشقت کا سوال ہے تو ایک دن کسی شخص نے آپؒ سے سوال کیا۔ ''شیخ! آپ کو یہ بلند درجات کس طرح حاصل ہوئے؟''

جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''میں چالیس سال تک اپنے پیر و مرشد کے دروازے پر کھڑا رہا ہوں، تب کہیں جا کر اس چشم کرم نے مجھے سرفراز کیا۔''

ایک دن برسرِ مجلس حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''مومنین ذاتِ واحد کی طرح ہیں۔ مسلمانوں کے گناہ دیکھ کر مجھے اس لئے اذیت پہنچتی ہے کہ میں لوگوں کو اپنے ہی اعضاء تصور کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔ ''جتنی اذیت مجھے پہنچی ہے، اتنی اذیت کسی دوسرے نبی یا رسول کو نہیں پہنچی۔''

اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''میں ایک عرصۂ دراز تک ان معصیت کاروں کی حالتِ زار پر نوحہ خواں رہا...... لیکن اب مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین و آسمان کی۔''

اپنے دکھ میں تو ہر آنکھ نم ہوتی ہے مگر دوسرے کے غم میں آنسو بہانا، دنیا کی سب سے بڑی مشقت اور سب سے مشکل کام ہے۔ تمام انبیائے کرام میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خاص شانِ کریمانہ تھی کہ آپؐ اپنی اُمت کے غم میں ہر وقت بے قرار و مضطرب رہتے تھے۔ اس لئے جو صوفی اپنے سینے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کا درد رکھتا ہے اور اس درد کی خلش سے ہر وقت بے چین رہتا ہے، وہی سب سے بڑا جانباز ہے...... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ اسلام کے جانبازوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ اپنی مناجات (دعاؤں) کا آغاز اس طرح کیا کرتے تھے۔

''اے اللہ! روزِ محشر مجھے اندھا کر کے اٹھانا کہ جسے تیرا دیدار نصیب نہ ہو اس کا نابینا رہنا ہی بہتر ہے۔''

آپؒ کے اس قولِ مبارک میں بڑی گہرائی ہے۔ ایک طرف اپنے گناہوں کا اعتراف بھی ہے اور دوسری طرف عشقِ خداوندی کی سرشاری بھی۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے۔

''جب میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ ''کلام وہ ہے جو دل سے ہو'' تو میں نے

تیس سال کی نمازیں دوبارہ پڑھیں۔ اس کے بعد تیس سال تک یہ التزام کیا کہ جس وقت بھی نماز میں دنیا کا خیال آ جاتا تو اس نماز کو دوبارہ ادا کرتا...... اور اگر آخرت کا تصور آ جاتا تو ''سجدۂ سہو'' کرتا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

پھر 298ھ میں اسلام کا یہ جانباز تھک کر بسترِ علالت پر دراز ہو گیا۔ خدمت گاروں اور مریدوں نے سمجھا کہ کوئی عام سی بیماری ہے، جلد ہی گزر جائے گی مگر وہ مرض الموت تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ سفرِ آخرت پر روانہ ہونے والے تھے۔ اس لئے ضعف و ناتوانی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن آپؒ کے شاگردِ خاص اور خلیفہ حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا۔

''سیّدی! آپ کچھ فرمانا چاہتے ہیں؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے مرید خاص کی طرف دیکھا اور نہایت پُرسکون لہجے میں فرمایا۔ ''بس اس قدر کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے غسل دے کر میری نماز جنازہ پڑھا دینا۔''

یہ پہلی اور آخری خواہش تھی جس کا آپؒ نے دنیا والوں کے سامنے اظہار کیا۔

پیر و مرشد کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر شیخ ابو محمد جریریؒ اور دوسرے خدمت گار جو قریب ہی کھڑے تھے، مضطرب ہو کر رونے لگے۔

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''رونے کا وقت نہیں ہے۔ ایک اور بات یاد آ گئی۔ غور سے سنو!''

شیخ ابو محمد جریریؒ نے بمشکل عرض کیا۔

''سیّدی! آپ کے خادم گوش بر آواز ہیں۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''میرے دوستوں کے لئے دعوتِ ولیمہ کا سامان تیار رکھنا تا کہ جیسے ہی لوگ مجھے دفن کر کے آئیں، انہیں کھانا کھلا دیا جائے۔'' اپنی موت کو شادی سے تعبیر کرنا، یہ حضرت جنید بغدادیؒ جیسے مرد جانباز ہی کا حوصلہ تھا۔

یہ سن کر حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ بہت دیر تک ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہ کر سکے۔ پھر بڑی دشواری کے ساتھ ہچکیوں کے دوران کہا۔

''خدا کی قسم! اگر یہ آنکھیں بند ہو گئیں تو پھر کبھی ہم دو آدمی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکیں گے۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مشائخ اور صوفیاء کی صحبتوں کا مرکز آپؒ ہی کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپؒ کے رخصت ہوتے ہی اہلِ ذوق کا ہجوم بکھر گیا۔ حضرت شیخ ابوجعفر فرغانیؒ کہا کرتے تھے۔

''اس ذاتِ لازوال کی قسم! ایسا ہی ہوا جیسا کہ جریریؒ نے کہا تھا۔ درویشوں کے مجمع میں ساری برکتیں شیخ جنیدؒ ہی کے دم سے تھیں۔''

آخری وقت میں حضرت شیخ ابن عطارؒ عیادت کے لئے حاضر ہوئے اور بستر کے قریب کھڑے ہو کر سلام عرض کیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ خاموش رہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ سے سلام کا جواب دیا اور معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔

''میری طرف سے اس تاخیر کو معاف کیجئے گا۔ میں ایک بہت ضروری کام میں مشغول تھا۔ اس سے فارغ ہوا تو آپ کی طرف توجہ کر سکا۔''

آخر ساعتِ فراق آ پہنچی۔ وہ جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ شیخ ابومحمد جریریؒ اور دوسرے خدمت گار جمع تھے۔ آپؒ نے ان حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میری تمام تحریریں اور سارا کلام میرے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جائے۔''

شیخ ابومحمد جریریؒ نے سبب پوچھا تو ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔

''جب دنیا میں میرے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم موجود ہے تو پھر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے بعد کوئی ایسی چیز چھوڑ جاؤں جو میری جانب منسوب ہو۔''

وصیت کے مطابق آپؒ کی بیشتر تحریریں دفن کر دی گئیں مگر کچھ مخطوطات باقی رہ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جن لوگوں تک آپ کی وصیت نہیں پہنچ سکی تھی، انہوں نے آپؒ کی تحریروں کو محفوظ رکھا ہو۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے وصال سے پہلے پورا قرآن پاک ختم کیا اور جب دوبارہ تلاوت شروع کی تو ابومحمد جریریؒ نے عرض کیا۔ ''سیّدی! ضعف و ناتوانی کا یہ عالم ہے اور آپ برابر تلاوت کئے جا رہے ہیں۔''

یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''ابومحمد! مجھ سے زیادہ تلاوت قرآن کا حق دار کون ہو سکتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ حق تعالیٰ میرے صحیفۂ عمر کو لپیٹ رہا ہے۔ اس عالم میں انسان جو کچھ کر سکے اسے کر لینا چاہئے۔''

جب سورۂ بقرہ کی 70 ویں آیت پر پہنچے تو ایک لمحے کے لئے ٹھہر گئے۔ پھر آپؒ نے کسی قدر بلند آواز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور شہبازِ معرفت کی روح آسمانوں کی طرف پرواز کر گئی۔

دریائے دجلہ کے مغرب میں واقع ''شونیزیہ'' کے قبرستان میں اپنے مرشد حضرت سری سقطیؒ کے قریب آسودۂ خاک ہوئے۔

آپؒ کے خلیفہ شیخ ابومحمد جریریؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے پڑوس میں ایک گھورا تھا جس پر ایک مجنون شخص پڑا رہتا تھا۔ جب آپؒ کا جنازہ اُٹھا تو وہ مجنون بھی قبرستان پہنچا اور اپنے ہاتھوں سے حضرت جنید بغدادیؒ کو مٹی دی۔ پھر جب لوگ واپس آنے لگے تو وہ مجنون ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''ابومحمد! کیا تمہارا خیال ہے کہ اپنے سردار کو کھو دینے کے بعد میں دوبارہ اس گھورے پر واپس جاؤں گا؟''

یہ کہہ کر اس مجنون نے بڑے پُرسوز لہجے میں مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

''ہائے افسوس! ان لوگوں کے فراق میں جو ہدایت کا چراغ تھے اور شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے قلعہ تھے۔''

''اور شہد تھے اور ابر تھے اور پہاڑ تھے اور نیکی تھے اور امن تھے اور سکون تھے۔''

''ہمارے لئے زمانے میں کوئی انقلاب نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ موت نے ان کی زندگی ختم کر دی۔''

''اب ساری چنگاریاں ہمارے دل میں ہیں اور تمام چشمے ہماری آنکھوں میں ہیں۔'' (ترجمہ)

یہ اشعار پڑھتے ہی وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر اس کے بعد کسی شخص نے اس مجنون کی صورت نہیں دیکھی۔

کسی بزرگ نے آپؒ کو خواب میں دیکھ کر پوچھا۔ ''جب منکر نکیر قبر میں آئے تو آپ نے کیا جواب دیا؟''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

''جب فرشتوں نے مجھ سے پوچھا کہ تیرا رب کون ہے؟ تو میں نے کہا۔ جب میں روزِ ازل میں شہنشاہ کے حضور میں عرض کر چکا ہوں کہ تُو ہی میرا رب ہے، تو پھر غلاموں کو کیا جواب دوں؟ میری بات سنتے ہی فرشتے یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ ابھی تک اس پر محبت کا نشہ طاری ہے۔''

حضرت شیخ ابومحمد جریریؒ نے خواب میں دیکھا تو عرض کیا۔ ''سیّدی! حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟''

''اللہ کی رحمت کے سوا کچھ کام نہیں آیا۔ ساری عبادتیں اور ریاضتیں رائیگاں گئیں۔''

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ''بس وہ دو رکعتیں شمار کی گئیں جو میں آدھی رات کو پڑھا کرتا تھا۔ باقی تمام معیارات اور قیاسات بے کار ثابت ہوئے۔''

ایک دن حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ پیر و مرشد کے مزار مبارک پر حاضر تھے۔ کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''اولیاء اللہ کی زندگی اور موت یکساں ہوتی ہے۔ میں مرنے کے بعد بھی پیر و مرشد سے اتنی ہی حیا رکھتا ہوں جتنی آپؒ کی زندگی میں تھی۔''

حضرت رابعہ بصریؒ

تاریخ ولادت	....	97ھ
تاریخ وفات	....	185ھ
آخری آرام گاہ	....	بصرہ (عراق)

تصوف میں پہلی خاتون جنہیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انتہائی غربت و افلاس کے باوجود آپؒ نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ روایت ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ نے قرآن کریم حفظ کیا تھا اور آپؒ کو احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ ایک بار بصرہ شہر میں شدید قحط پڑا، بھوک سے مجبور ہو کر رشتے داروں نے آپؒ کو عتیق نامی سوداگر کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ پھر دورِ غلامی میں آپؒ کی روحانیت کے اسرار کھلے........ مشہور ہے کہ حضرت امام حسن بصریؒ جیسے عظیم و جلیل بزرگ بھی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

انسان جلد باز بھی ہے، ناشکرا بھی اور ظالم بھی۔ بنی نوع آدم کی انہی کیفیات اور جذبات کو خالق کائنات نے بڑے عجیب پیرائے میں بیان کیا ہے......کبھی کہا گیا کہ جب ہم اسے رنج والم دیتے ہیں اور کسی آزمائش میں مبتلا کر دیتے ہیں تو بار بار آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور نہایت شکستہ وغم زدہ لہجے میں کہتا ہے کہ اس پر میرا کوئی اختیار نہیں، یہ سب تو آسمان کی طرف سے ہے..... پھر جب ہم اس کی گریہ وزاری سن کر اس کے سروں سے بلاؤں کو ٹال دیتے ہیں اور اسے اپنی نعمتوں سے سرفراز کر دیتے ہیں تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ...... ''یہ سب کچھ میرے زورِ بازو کا نتیجہ ہے'' انسان کے اسی منافقانہ جذبے کا نام ظلم ہے۔ ''شکست و ریخت'' کو اللہ کے فیصلوں سے تعبیر کرتا ہے...... اورفتوحات کو اپنی کوشش وتدبر کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

ناشکرا اس لئے ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی بے شمار نعمتوں کو بے دریغ اپنے استعمال میں لاتا ہے مگر دینے والے کی بے مثال فیاضیوں کا اعتراف نہیں کرتا۔ گردشِ روز و شب کو محض ایک اضطراری عمل سمجھتا ہے کہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، سو چلتی ہی رہیں گی..... بارش ہو رہی ہے، سو ہوتی ہی رہے گی..... مگر جب اچانک اس نظام میں خلل پڑتا ہے تو پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چیخنے لگتا ہے۔

''ہوائیں بند کیوں ہو گئیں...... اور بارشِ کرم رُک کیوں گئی؟ اے ہواؤں کے چلانے والے! ہواؤں کو چلا...... اور اے پانی کے برسانے والے! پانی برسا۔''

پھر جب مرطوب ہوائیں نہیں چلتیں اور زمین کو زندگی بخشنے والا پانی نہیں برستا تو یہی ناشکرے لوگ بزرگانِ دین کی خانقاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں نمازِ استسقاء پڑھتے ہیں۔ صدقات وخیرات بھی کرتے ہیں مگر بعض اوقات پانی پھر بھی نہیں برستا۔ گویا انسان کے گناہ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ رحمتِ باری جوش میں نہیں آتی۔ قدرت طے کرتی ہے کہ اب ناشکر گزاروں کی اس بستی کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑا جائے گا۔

یہ غالباً 105ھ واقعہ ہے کہ تاریخی شہر بصرہ بھی خوف ناک قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ بقول حضرت شیخ سعدیؒ ۔

یکے قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

(ایک بار دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق و عاشقی جیسی چیز کو بھی فراموش کر بیٹھے)

بصرہ میں بھی کچھ ایسا ہی قحط پڑا تھا کہ لوگ نہ صرف محبت کے لطیف و نازک جذبات کو بھول گئے تھے بلکہ ان کے سینے نفسانی خواہشوں کے ہجوم سے بھر گئے تھے۔ وہ اپنے شکم کی آگ بجھانے کے لئے اپنے ہم جنسوں کو ارزاں داموں پر فروخت کر رہے تھے۔ اولادیں، ماں باپ پر گراں تھیں اور اولادوں پر ماں باپ ایک بوجھ تھے۔ بیویاں شوہروں کے لئے باعثِ آزار تھیں......اور بہنیں بھائیوں کے لئے ایک مستقل عذاب بن گئی تھیں۔ خاندانی اور علاقائی رشتوں کا تو ذکر ہی کیا، خونی رشتے بھی بے اعتبار ٹھہرے تھے۔ عجیب نفسانفسی کا عالم تھا۔ ماں باپ اولادوں سے ہاتھ چھڑا رہے تھے...... بھائیوں نے بہنوں سے منہ پھیر لیا تھا اور دوست ایک دوسرے کو پہچاننے سے گریزاں تھے۔ بھوک کا عفریت اپنا خونی دہن کھولے کھڑا تھا...... اور تمام انسانی رشتے، احساسات وجذبات، عقائد ونظریات اس کی خوراک بنتے جا رہے تھے۔

اسی ہولناک فضا میں بصرہ کے ایک چھوٹے سے خاندان پر قیامت گزر گئی۔ یہاں چار بہنیں رہا کرتی تھیں جن کے ماں باپ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ بظاہر کوئی نگراں اور کفیل نہیں تھا۔ یہ سب بہنیں مل کر محنت مزدوری کیا کرتی تھیں۔ مگر جب شہر بصرہ قحط کی لپیٹ میں آیا تو سارے کاروبار دم توڑ گئے اور مزدوریاں ختم ہو گئیں۔ نوعمر لڑکیوں نے دو تین فاقے تو برداشت کر لئے مگر جب بھوک حد سے گزری تو کسی کو اپنا ہوش نہیں رہا۔ بھیک تک کی نوبت آ گئی مگر کوئی کیسے بھیک دیتا کہ دینے والے کے پاس خود کچھ نہیں تھا۔ یہ تمام بہنیں زرد چہروں اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ بصرہ کا مشہور تاجر عتیق ادھر سے گزرا۔ فاقہ زدہ بہنوں نے آسودہ حال شخص کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا۔

''خدا کے لئے ہمیں کچھ کھانے کو دو۔ ورنہ کچھ دیر بعد ہماری سانسوں کا رشتہ ہمارے جسموں سے منقطع ہو جائے گا۔''

تاجر عتیق نے سب سے چھوٹی بہن کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی تھی۔ ''لڑکی! تجھے بھوک نہیں ہے؟''

''بہت بھوک ہے۔'' سب سے چھوٹی بہن نے نقاہت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر کسی سے روٹی کیوں نہیں مانگتی؟'' تاجر نے سوال کیا۔

''جس سے مانگنا چاہئے اسی سے مانگ رہی ہوں۔'' لڑکی نے بڑا عجیب جواب دیا۔

''تو پھر تجھے ابھی تک روٹی کیوں نہیں ملی؟'' تاجر عتیق نے حیران ہو کر دوسرا سوال کیا۔

"جب وقت آئے گا تو وہ بھی مل جائے گی۔" لڑکی کا اندازِ گفتگو مبہم تھا مگر لہجے سے بڑی استقامت جھلک رہی تھی۔

تینوں بڑی بہنیں چھوٹی بہن کی بے سروپا باتوں سے بیزار تھیں، اس لئے جھنجلا کر بولیں۔ "یہ ہم سب کا وقت برباد کر رہی ہے۔ آپ اسے یہاں سے لے جائیں۔"

"یہ لڑکی بڑے کام کی ہے۔ میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔" تاجر عتیق نے تینوں بہنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ایک مخصوص رقم ان کے حوالے کر دی۔

"چلو لڑکی!" تاجر نے چھوٹی بہن سے کہا۔ "اب تم میری ملکیت ہو۔"

لڑکی نے اپنی بہنوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر ہونٹوں پر کوئی حرفِ شکایت نہیں تھا۔ وہ تاجر عتیق کے ساتھ چپ چاپ چلی گئی۔ اس نے کئی بار مڑ کر دیکھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بس ایک ہی سوال تھا۔

"کیا تم نے چند روٹیوں کے لئے چھوٹی بہن کو فروخت کر دیا ہے؟"

تینوں بہنوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہیں بھوک کے عفریت سے نجات مل گئی تھی اور تاجر کے دیئے ہوئے سکے گننے میں مصروف تھیں، پھر انہیں اپنی چھوٹی بہن کی آنکھوں میں لرزنے والی معصوم حسرتیں اور کانپتے ہوئے سوالات کس طرح نظر آتے؟ آخر لڑکی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ضرورت کے بے رحم ہاتھ نے خونی رشتوں کو جدا کر دیا۔

عام طور پر یہی روایت مشہور ہے کہ تینوں بڑی بہنوں نے مل کر چھوٹی بہن کو تاجر عتیق کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا...... مگر بعض روایات میں یہ بھی درج ہے کہ بھوک سے تنگ آ کر چاروں بہنیں گھر سے نکلیں۔ وہ بصرہ چھوڑ کر کسی ایسے شہر میں جانا چاہتی تھیں جہاں ضروریاتِ زندگی میسر آ سکیں۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھیں کہ اچانک کسی گوشے سے ایک قوی ہیکل شخص نمودار ہوا اور اس نے چھوٹی بہن کو پکڑ لیا۔ اجنبی مرد کے خوف سے تینوں بہنیں ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئیں اور پھر اس سفاک شخص نے سات آٹھ سالہ معصوم بچی کو بصرہ کے ایک مالدار تاجر عتیق کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس طرح ایک معصوم بچی اپنے کارواں سے بچھڑ کر ایک صاحبِ ثروت انسان کی کنیز بن گئی۔

نوعمر ہونے کے باوجود وہ لڑکی انتہائی مشقت اور ذمے داری کے ساتھ اپنا کام پورا کرتی اور مالک کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیتی۔ یہاں تک کہ اسی عالم میں کئی سال گزر گئے۔ اب اس لڑکی کی عمر بارہ تیرہ سال کے قریب تھی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جا رہی تھی، لڑکی کے ذوقِ عبادت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گھر کا کام کرنے کے بعد وہ رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتی۔ پھر صبح ہوتے ہی اپنے آقا کی خوشنودی حاصل

کرنے کے لئے گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔ آخر شدید محنت نے اس معصوم جان کو تھکا ڈالا۔

"کیا تُو بیمار ہے؟" لڑکی کے چہرے پر تھکن کے آثار دیکھ کر ایک دن مالک نے پوچھا۔

لڑکی نے نفی میں آقا کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی کوتاہی کی مرتکب ہو رہی ہوں؟"

مالک نے اس کے کام کی تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے۔

لڑکی نے آقا کا حکم سنا اور سر جھکا دیا مگر اس کے معمولات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اُجالے میں دنیاوی مالک کی خدمت انجام دیتی اور اندھیرے میں مالکِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی۔

ایک دن اتفاق سے نصف شب کے قریب آقا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ٹہلنے لگا۔ اچانک اس کی نظر کنیز کی کوٹھڑی پر پڑی۔ وہاں چراغ جل رہا تھا۔

"یہ کنیز ابھی تک جاگ رہی ہے؟" آقا نے بڑی حیرت کے ساتھ سوچا اور کنیز کے جاگنے کا سبب جاننے کے لئے کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مالک دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ کنیز سجدے کی حالت میں تھی اور دبی دبی سسکیاں اُبھر رہی تھیں۔ مالک کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ پھر اس نے کان لگا کر سنا۔ کنیز انتہائی رقت آمیز لہجے میں دعا مانگ رہی تھی۔

"اے اللہ! تُو میری مجبوریوں سے خوب واقف ہے۔ گھر کا کام کاج مجھے تیری طرف آنے سے روکتا ہے۔ تُو مجھے اپنی عبادت کے لئے پکارتا ہے مگر میں جب تک تیری بارگاہ میں حاضر ہوتی ہوں، نمازوں کا وقت گزر جاتا ہے۔ اس لئے میری معذرت قبول فرما لے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے۔"

مالک نے کنیز کی گریہ و زاری سنی تو خوفِ خدا سے لرزنے لگا۔ روایت ہے کہ اس واقعے سے پہلے تاجر عتیق ایک ظالم شخص تھا۔ اپنے غلاموں اور کنیزوں سے بے پناہ مشقت لیتا تھا اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں دیتا تھا۔ اُس رات ایک کنیز کو اس طرح سجدہ ریز دیکھا تو پتھر دل پگھل گیا اور اسے اپنے ماضی پر ندامت ہونے لگی۔ الٹے قدموں واپس چلا آیا اور رات کا باقی حصہ جاگ کر گزار دیا۔ پھر صبح ہوتے ہی کنیز کی

کوٹھری میں پہنچا اور کہنے لگا۔

''آج سے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو، چلی جاؤ۔''

''مگر میں تمہاری دی ہوئی قیمت ادا نہیں کرسکتی۔'' کنیز نے حیران ہو کر کہا۔

''میں تم سے کوئی قیمت نہیں مانگتا مگر ایک چیز کا سوال کرتا ہوں۔'' تاجر عتیق کے لہجے سے عاجزی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''میری طرف سے کی جانے والی تمام زیادتیوں کو اس ذات کے صدقے میں معاف کر دو جس کی عبادت تم راتوں کی تنہائی میں چھپ کر کرتی ہو۔''

''میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرا مالک تمہیں ہدایت دے۔'' یہ کہہ کر کنیز چلی گئی۔

یہ معصوم اور یتیم بچی اور شب بیدار کنیز مشہور عارفہ حضرت رابعہ بصریؒ تھیں۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

بصرہ میں ایک عابد و زاہد شخص اسمٰعیلؒ رہا کرتے تھے۔ ان کی مالی حالت انتہائی شکستہ تھی مگر اپنی فطری قناعت کے سبب کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ شیخ اسمٰعیل کی تین بیٹیاں تھیں۔ جس رات چوتھی بیٹی حضرت رابعہؒ پیدا ہوئیں، شیخ اسمٰعیل کی بے سر و سامانی کا یہ عالم تھا کہ چراغ جلانے کے لئے گھر میں تیل تک نہیں تھا۔ حضرت رابعہؒ کی والدہ نے شوہر سے کہا کہ وہ کسی پڑوسی سے کچھ پیسے قرض لے لیں۔ شیخ اسمٰعیلؒ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا مگر جب شریکِ حیات نے بار بار کہا تو آپؒ رات کی تاریکی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور پڑوسی کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ پڑوسی گہری نیند سویا ہوا تھا، اس لئے اس دستک کی آواز نہیں سنی۔ شیخ اسمٰعیلؒ کچھ دیر تک دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑے رہے مگر جب پڑوسی کے قدموں کی چاپ تک سنائی نہیں دی تو آپؒ خاموشی کے ساتھ لوٹ آئے۔

حضرت رابعہؒ کی والدہ نے شوہر کو خالی ہاتھ آتے دیکھا تو پریشان لہجے میں کہا۔ ''کیا پڑوسی نے مدد کرنے سے انکار کر دیا؟''

''کہاں کی مدد؟ اس نے تو دروازہ تک نہیں کھولا۔'' شیخ اسمٰعیلؒ نے افسردہ لہجے میں فرمایا۔

''بڑی حیرت کی بات ہے۔'' حضرت رابعہؒ کی والدہ نے اس طرح کہا جیسے انہیں شوہر کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

آپ کو حیرت کیوں ہے؟'' شیخ اسمٰعیل نے فرمایا۔ ''جو لوگ ایک دروازے کو چھوڑ کر دوسرے دروازے پر دستک دیتے ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپؒ اپنے

کمرے میں چلے گئے۔

شیخ اسمٰعیلؒ بہت دیر تک بستر پر لیٹے ہوئے کروٹیں بدلتے رہے۔ آپؒ کو پڑوسی کے اس رویے پر بہت دکھ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی نہایت قلق تھا کہ آپؒ اس کے دروازے پر کیوں گئے تھے؟ یہ ذہنی کشمکش بہت دیر تک جاری رہی اور پھر اسی عالم میں آپؒ کو نیند آ گئی۔

شیخ اسمٰعیلؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے:

''اسمٰعیل! اپنی بے سر و سامانی کا غم نہ کر۔ تیری یہ بچی اپنے وقت کی بہت بڑی عارفہ ہوگی اور اس کی دعاؤں سے میری اُمت کے بہت سے افراد بخشے جائیں گے۔ تجھے لازم ہے کہ حاکم بصرہ عیسیٰ زروان کے پاس جا اور اس سے کہہ دے کہ وہ مجھ پر ہر رات سو بار اور شب جمعہ میں چار سو مرتبہ درود بھیجتا تھا مگر گزشتہ جمعے کی رات اس نے میری بارگاہ میں درود کا تحفہ نہیں بھیجا۔ اس لئے اسے چاہئے کہ وہ کفارے کے طور پر میرے قاصد کو چار سو دینار ادا کر دے۔''

جب شیخ اسمٰعیلؒ کی آنکھ کھلی تو آپؒ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار کی لذت سے سرشار تھے۔ پھر صبح ہوتے ہی آپؒ نے اپنا پورا خواب ایک کاغذ پر تحریر کیا اور حاکم بصرہ کے دربان کو دے دیا۔

عیسیٰ زروان اس وقت اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب شیخ اسمٰعیلؒ کا خط دیکھا تو بے قرار ہو کر اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور دربان سے مخاطب ہو کر بولا۔

''وہ معزز و محترم شخص کہاں ہے؟''

''حاکم بصرہ کے جواب کے انتظار میں محل کے دروازے پر کھڑا ہے۔'' دربان نے عرض کیا۔

عیسیٰ زروان تیز قدموں کے ساتھ محل کے دروازے پر پہنچا اور شیخ اسمٰعیلؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہنے لگا۔

''آپ کے طفیل مجھے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یاد فرمایا اور میری غلطی کی معافی کا سبب پیدا ہوا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔'' یہ کہہ کر حاکم بصرہ نے خلوص و عقیدت کے ساتھ شیخ اسمٰعیلؒ کو چار سو دینار دے دیئے اور اسی خوشی میں اس نے دس ہزار دینار دوسرے فقراء میں تقسیم کئے۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

حضرت رابعہؒ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھیں، اس لئے آپؒ کا نام رابعہ رکھا گیا۔ عربی زبان میں ''رابعہ'' چوتھی کو کہتے ہیں۔ آپؒ کے سالِ پیدائش میں اختلاف ہے مگر اکثر مورخین 97ھ پر متفق ہیں۔ ابھی چار پانچ سال کی تھیں کہ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ کسی معتبر تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ ماں باپ کے انتقال کے بعد چاروں بہنوں کی گزر بسر کس طرح ہوئی؟ بس قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی عزیز یا رشتہ دار نے مالی معاونت کی ہوگی۔ پھر جب حضرت رابعہ بصریؒ کی عمر آٹھ، نو سال تھی تو وہ الم ناک واقعہ پیش آیا کہ پورا بصرہ خوفناک قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ بھوک سے بچنے کے لئے چاروں بہنیں اپنا آبائی شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ اسی سفر کے دوران ایک ظالم شخص نے حضرت رابعہؒ کو پکڑ کر بصرہ کے مالدار تاجر عتیق کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ پھر آپؒ چار پانچ سال تک ایک کنیز کی حیثیت سے تاجر عتیق کی خدمت انجام دیتی رہیں۔ باقی تینوں بہنوں کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں؟ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ معصوم بچیاں کسی حادثے کا شکار ہو کر مر گئیں۔

جب تاجر عتیق نے حضرت رابعہؒ کو آزاد کر دیا تو آپؒ علومِ ظاہری حاصل کرنے کے لئے بصرہ سے کوفہ تشریف لے گئیں جو اپنے وقت میں بہت بڑا علمی مرکز تھا اور جہاں نادرِ روزگار علماء ہر وقت موجود رہتے تھے۔

روایت ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ فطری طور پر نہایت ذہین خاتون تھیں۔ نتیجتاً آپؒ نے بہت کم مدت میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔

اکثر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ نے فقہ اور حدیث کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور پھر دونوں علوم میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ جب آپؒ وعظ فرماتی تھیں تو بڑے بڑے محدث اور فقیہہ حیران رہ جاتے تھے۔ کسی معتبر تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حدیث اور فقہ میں آپ کے اساتذہ کون تھے؟ پھر بھی یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ کی بارگاہِ معرفت میں بڑے بڑے علماء نیاز مندی کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان بزرگوں میں سرفہرست حضرت امام سفیان ثوریؒ ہیں جو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے معاصر تھے اور جنہیں امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور بزرگ حضرت مالک بن دینارؒ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت رابعہ بصریؒ سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے حضرت امام حسن بصریؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ میں علمی اور روحانی اعتبار سے ایک تعلق قائم کرنے کی کوشش

کی ہے جسے تاریخ کی روشنی میں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر حضرت رابعہ بصریؒ کے تمام سیرت نگاروں نے یہ واقعہ بڑے زور و شور کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

ایک بار حضرت امام حسن بصریؒ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ حضرت امامؒ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے آپؒ کو کسی کا انتظار ہو۔ ایک بے تکلف دوست نے عرض کیا۔

''امام! کیا کسی کا انتظار ہے؟''

حضرت امام حسن بصریؒ نے بے ساختہ فرمایا۔ ''ہاں! میں رابعہ کا انتظار کر رہا ہوں''

اسی دوست نے دوبارہ عرض کیا۔ ''امام! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب تک آپ کی مجلس میں رابعہ جیسی ضعیف عورت نہیں آتی، اس وقت تک آپ وعظ نہیں کہتے۔''

جواباً حضرت امام حسن بصریؒ نے پُرجوش لہجے میں فرمایا۔ ''ہاتھیوں کی غذا چیونٹیوں کو کس طرح مل سکتی ہے؟''

اس واقعے سے حضرت رابعہؒ کی عظمتِ روحانی کا تو پتہ چلتا ہے مگر جب ہم اس واقعے کی تاریخی حیثیت متعین کرنا چاہتے ہیں تو حیرت کے سوا کسی چیز کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ قارئین کو تعجب ہوگا یہ روایت مشہور صوفی بزرگ خواجہ فرید الدین عطارؒ سے منسوب ہے۔ حالانکہ خواجہ عطارؒ خوب جانتے تھے کہ حضرت رابعہ بصریؒ 97ھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ اور حضرت امام حسن بصری 110ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ امامؒ کے وصال کے وقت حضرت رابعہؒ کی عمر مبارک صرف تیرہ سال تھی......اور یہ وہ زمانہ تھا جب آپؒ تاجر عتیق کی کنیز کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت امام حسن بصریؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ کے علمی تعلق میں زیادہ سے زیادہ اتنی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے کہ حضرت رابعہؒ ایک آدھ مرتبہ حضرت امامؒ کی مجلسِ درس میں حاضر ہوئی ہوں اور عقیدت مندوں نے اتنی چھوٹی سی بات کو ایک مستقل افسانہ بنا دیا ہو......ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت رابعہؒ دورِ غلامی سے نجات پا کر تحصیلِ علم کی طرف متوجہ ہوئیں تو حضرت امام حسن بصریؒ اس عالم فانی سے بہت دور جا چکے تھے۔

اس کے علاوہ اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت امام حسن بصریؒ بھی حضرت رابعہ بصریؒ کی مجلس روحانی میں بصد شوق حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس روایت کو تسلیم کرنے میں بھی وہی سن و سال کا فرق مانع ہے۔ مختصر یہ کہ تاریخ کے تناظر میں حضرت امام حسن بصریؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ کے درمیان کسی ایک

ملاقات کو بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت رابعہؒ نے بچپن سے جوانی تک رنج والم اور آفات و مصائب کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ چار پانچ سال کی ہوں گی کہ نہایت پرہیز گار محبت کرنے والے ماں باپ سے بچھڑ گئیں۔ آٹھ نو سال کی عمر کو پہنچیں تو شفیق بہنوں کو اس طرح کھو دیا کہ زندگی بھر ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک کم سن بچی کے دل و دماغ نے ان جان لیوا حادثات کا کیا تاثر قبول کیا ہوگا؟ پھر جب اپنے کاروانِ محبت سے بچھڑی ہوئی وہ بچی ہوش کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی تھی تو ایک بے رحم ہاتھ نے اسے غلامی کی زنجیریں پہنا دیں۔ باپ سے ضدیں اور فرمائشیں کرنے کے دن...... بہنوں کے ساتھ کھیلنے اور شرارتیں کرنے کے دن...... اور ان سب سے بڑھ کر ماں کی آغوشِ محبت میں سونے کی راتیں...... ایک بچے کا یہی تو سرمایہ ہوتا ہے مگر وقت نے حضرت رابعہؒ سے ان کی ہر خوشی اور ہر خواب چھین لیا تھا۔ گرمی کے تپتے ہوئے دنوں میں حضرت رابعہؒ اپنے مالک کے لئے دریا سے پانی بھر کر لاتی تھیں اور آپؒ کا جسم مبارک پانی سے شرابور ہوتا تھا...... پھر جب سردیوں کی طویل راتیں آتیں تو حضرت رابعہؒ یخ بستہ موسم میں اپنے آقا کے سامنے دست بستہ کھڑی رہتیں۔ اولیائے کرام نے جو ریاضتیں جوانی کے عالم میں اپنی خوشی اور رغبت سے کی ہیں وہی ریاضتیں حضرت رابعہ بصریؒ نے اپنے عالمِ طفلی میں جبر و ستم کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود کی ہیں۔ فطری بات ہے کہ محنت و مشقت سے چُور ہونے کے بعد ایک کم سن لڑکی آرام دہ بستر تلاش کرے گی...... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت رابعہ بصریؒ نصف شب کے سناٹے میں اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز ہوتی تھیں اور بارگاہِ ذوالجلال میں عذر پیش کرتی تھیں کہ دنیا والے میرے راستے کی رکاوٹ ہیں، اس لئے میں تیرے حضور میں بہت دیر سے پہنچتی ہوں۔ یہی وہ ریاضت ہے جو تصوف کی بنیاد ہوتی ہے...... اور یہی محبت صوفیاء کی پہچان ہوتی ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ کو کثرتِ رنج و الم اور حزن و ملال نے دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے بیگانہ کر دیا تھا۔ پھر اسی جذبۂ بیگانگی نے بے نیازی کی شکل اختیار کر لی اور حضرت رابعہ بصریؒ نے دنیا اور اہلِ دنیا کی نفی کر دی۔ دنیا کی نفی کے بعد ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو دنیا بنانے والے کی یادوں میں گم کر دے۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب سارے رشتے ناپائیدار ثابت ہوئے تو آپؒ نے خالقِ

کائنات سے رشتہ جوڑ لیا۔ یہ رشتہ تو ازل سے ہوتا ہے اور ابد تک رہتا ہے۔ ایک منکر اپنے خالق کے وجود سے انکار کر سکتا ہے مگر اس کی بندگی کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا۔ فرعون نے لاکھ کہا کہ ''انا ربکم الاعلیٰ'' (میں تمہارا بڑا رب ہوں) مگر حقیقتاً وہ ربِ کائنات ہی کا بندہ تھا۔ مسئلہ صرف اقرار کا ہے۔ اقرار کے بعد انسان کی بندگی مستند اور معتبر ہو جاتی ہے۔ انکار کی صورت میں بھی وہ اللہ ہی کا بندہ رہتا ہے مگر اپنی سرکشی اور بے راہ روی کے باعث ''راندۂ درگاہ'' کہلاتا ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ بھی روزِ اوّل سے اپنے خالق کی وحدانیت اور کبریائی کا اقرار کر رہی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ وہ شدید اور طویل آزمائشوں کے وقت اپنا راستہ بھول جاتیں مگر حق تعالیٰ نے ہر قدم پر ان کی رہنمائی کی۔ پھر جب وہ آفات و مصائب کے دریا کو پار کر کے ساحلِ مراد تک پہنچیں تو انہوں نے بے اختیار خاک پر سر رکھ کر کہا۔

''بس! تُو ہی ہے اور تیرے سوا کوئی نہیں۔''

حضرت رابعہ بصریؒ کے مسلک کی بنیاد ''عشق الٰہی'' پر ہے۔ اس سلسلے میں ایک محقق عبدالرزاق پاشا کہتے ہیں۔

''حضرت رابعہ بصریؒ کی حیاتِ مبارکہ میں حزن و الم کے جو گہرے نقوش پائے جاتے ہیں، اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ یہ تمام تر اسی محبت کا نتیجہ ہے جو حضرت رابعہ بصریؒ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے تھی۔''

آگے چل کر عبدالرزاق پاشا تحریر کرتے ہیں۔ ''تصوف اسلامی کے ہیکل میں جس ہستی نے سب سے بڑھ کر ''حب الٰہی'' کو ایک مستقل اور محکم مسلک کی صورت میں پیش کیا، وہ صرف حضرت رابعہ بصریؒ ہیں۔ انہوں نے ایسے آثار و نقوش چھوڑے ہیں جو حزن و الم اور محبت الٰہی کی صحیح تعبیر اور تفسیر کا کام دیتے ہیں۔''

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

یہ اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ حضرت رابعہ بصریؒ ہر وقت مغموم اور ملول رہا کرتی تھیں۔ شاذ و نادر ہی ان کی آنکھوں کو کسی نے خشک دیکھا ہوگا، ورنہ کسی آبشار کی طرح بہتی ہی رہتی تھیں۔ جب مجلس میں کوئی دوزخ کا ذکر چھیڑ دیتا تو حضرت رابعہ بصریؒ اُس کی دہشت سے بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد مسلسل توبہ کرتی رہتی تھیں۔ روایت ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ کی سجدہ گاہ ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی تھی۔

حضرت رابعہ بصریؒ بہت کم گفتگو کیا کرتی تھیں۔ آپؒ کا بیشتر وقت نماز پڑھنے میں گزرتا تھا۔ اگر کبھی کسی سے کوئی بات کرنی ہوتی تو آیاتِ قرآنی کا سہارا لے کر اپنا

مطلب بیان کرتیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ جواب میں حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔

''انسان جو کچھ بولتا رہتا ہے، فرشتے اسے لکھتے رہتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ قرآن کی آیتوں کے سوا کچھ نہ بولوں۔ یہ احتیاط اس لئے ہے کہ کہیں میرے منہ سے غلط بات نکل جائے اور فرشتے اسے تحریر کرلیں۔''

''اللہ نے انسان کو ہنسنے کے لئے منع تو نہیں کیا ہے۔''

حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ ''بے شک! اس نے منع تو نہیں فرمایا...... مگر مجھے اس کام کے لئے فرصت نہیں ہے۔''

لوگوں نے تعجب سے کہا۔ ''کیا ہنسنے کے لئے بھی فرصت درکار ہوتی ہے؟''

حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔

''ہاں! دنیا میں وہی شخص ہنستا ہے جسے اطمینانِ قلب حاصل ہو۔ اور میں ابھی اس نعمت سے محروم ہوں۔''

حاضرینِ مجلس نے آپؒ کے اس قولِ مبارک کی وضاحت چاہی تو حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔

''میں نے محبت کے لئے صرف ایک ہی ہستی کا انتخاب کیا ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات پاک۔ میں اس خوف سے روتی رہتی ہوں کہ کہیں میری زندگی بھر کی محنت اکارت نہ ہو جائے اور مرتے وقت مجھ سے کہا جائے کہ تُو ہمارے لائق نہیں ہے۔''

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت رابعہ بصریؒ کے یہاں پانچ درویش حاضر ہوئے۔ اتفاق سے وہ کھانے کا وقت تھا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے اپنی خادمہ کو الگ بلا کر پوچھا۔

''مہمانوں کی تواضع کے لئے گھر میں کچھ کھانے کو ہے؟''

خادمہ نے بتایا کہ صرف ایک روٹی موجود ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا کہ ایک روٹی سے کیا ہوگا؟ مہمانوں کے حصے میں ایک ایک ٹکڑا ہی آئے گا۔ یہ کہہ کر آپؒ مہمان درویشوں کے پاس تشریف لے آئیں۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک سوالی نے در پر صدا دی۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا کہ وہ روٹی اس ضرورت مند کو دے دو جو دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ خادمہ نے آپؒ کے حکم کی تعمیل کی اور حضرت رابعہ بصریؒ مہمانوں کے ساتھ مصروف گفتگو ہوگئیں۔

کچھ دیر بعد خادمہ حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ ''ایک شخص کھانا لے کر آیا ہے۔''

''کتنی روٹیاں ہیں؟'' حضرت رابعہ بصریؒ نے خادمہ سے پوچھا۔

جب خادمہ نے بتایا کہ دو روٹیاں ہیں تو آپؒ نے فرمایا۔ ''اسے واپس کر دو۔ وہ شخص غلطی سے ہمارے گھر آ گیا ہے اور وہ کھانا ہمارا نہیں ہے۔''

خادمہ نے روٹیاں واپس کر دیں۔

تھوڑی دیر بعد خادمہ نے اطلاع دی کہ ایک اور شخص کھانا لے کر آیا ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے روٹیوں کی تعداد پوچھی تو آپؒ کو بتایا گیا کہ پانچ روٹیاں ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے جواباً فرمایا۔ ''اس بار بھی کھانا لانے والے سے غلطی ہوگئی۔ اس سے کہہ دو کہ وہ کھانا ہمارا نہیں۔''

تیسری بار ایک اور شخص کھانا لے کر آیا۔ پھر جب خادمہ نے آپؒ کو بتایا کہ گیارہ روٹیاں ہیں تو حضرت رابعہ بصریؒ نے مسرت کے لہجے میں فرمایا۔ ''ہاں! یہ کھانا ہمارا ہے۔ اسے قبول کرلو۔''

خادمہ نے کھانا لا کر درویش مہمانوں کے سامنے سجا دیا۔ پھر جب درویش کھانا کھا چکے تو ایک مہمان نے عرض کیا کہ تین مختلف اشخاص کھانا لے کر آئے۔ دو افراد کو آپ نے واپس کر دیا مگر تیسرے شخص کے لائے ہوئے کھانے کو قبول فرما لیا۔ آخر یہ کیا راز ہے؟

حضرت رابعہ بصریؒ نے درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''حق تعالیٰ فرمایا ہے کہ دنیا میں ایک کے بدلے دس اور آخر میں ستر دوں گا۔ بس اسی حساب کتاب کی بنیاد پر میں نے دو آدمیوں کو واپس لوٹا دیا اور ایک شخص کا کھانا قبول کرلیا۔ میں نے اللہ کی راہ میں سوالی کو ایک روٹی دی تھی اور رازقِ عالم سے سودا کیا تھا۔ پھر جب ایک شخص دو روٹیاں اور دوسرا پانچ روٹیاں لے کر آیا تو میں نے جان لیا کہ یہ حساب درست نہیں ہے۔ تیسرا شخص گیارہ روٹیاں لے کر آیا تو میں نے کسی تردّد کے بغیر انہیں قبول کرلیا کہ یہ عین حساب کے مطابق تھیں اور دینے والے کی شانِ رزاقی کو ظاہر کر رہی تھیں۔ دس روٹیاں میری ایک روٹی کے بدلے میں تھیں اور جو روٹی میں نے سوالی کو دی تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ بھی واپس کر دی تھی۔''

حضرت رابعہ بصریؒ کا صبر و قناعت اور توکل کی شان دیکھ کر تمام درویش حیرت زدہ رہ گئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

ایک بار آپؒ نے سات دن تک صرف پانی سے روزہ کھولا۔ گھر میں کھانے کے لئے

روٹی کا ایک لقمہ بھی نہیں تھا۔ افطار کا وقت بہت قریب تھا کہ حضرت رابعہ بصریؒ پر بھوک کا غلبہ ہوا۔ نفس نے آپؒ سے فریاد کی۔

''رابعہ! آخر تُو کب تک مجھے بھوکا رکھے گی؟''

ابھی آپؒ کے دل میں یہ خیال گزر رہا تھا کہ کسی شخص نے دروازے پر دستک دی۔ آپؒ باہر تشریف لائیں تو ایک نیاز مند کھانا لئے کھڑا تھا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے کھانا قبول کرلیا اور نفس سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ ''میں نے تیری فریاد سن لی ہے۔ کوشش کروں گی کہ تجھے مزید اذیت نہ پہنچے۔''

یہ کہہ کر آپؒ نے کھانا فرش پر رکھ دیا اور خود چراغ جلانے اندر چلی گئیں۔ واپس آئیں تو دیکھا کہ ایک بلی نے کھانے کے برتن الٹ دیئے تھے اور زمین پر گرا ہوا کھانا کھا رہی تھی۔ حضرت رابعہ بصریؒ بلی کو دیکھ کر مسکرائیں۔ ''شاید یہ تیرے ہی لئے بھیجا گیا تھا۔ اطمینان سے کھالے۔''

افطار کا وقت قریب ہو چکا تھا۔ حضرت رابعہؒ نے چاہا کہ پانی ہی سے افطار کرلیں۔ اتنے میں تیز ہوا کا جھونکا چلا اور چراغ بجھ گیا۔ حضرت رابعہؒ اندھیرے میں آگے بڑھیں۔ اتفاق سے پانی کا برتن بھی ٹوٹ گیا اور سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ بے اختیار آپؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''الٰہی! یہ کیا راز ہے؟ میں گناہگار نہیں جانتی کہ تیری رضا کیا ہے؟''

جواب میں ایک صدائے غیب سنائی دی۔ ''اے میری محبت کا دم بھرنے والی! اگر تُو چاہتی ہے کہ تیرے لئے دنیا کی نعمتیں وقف کردوں تو پھر میں تیرے دل سے اپنا غم واپس لے لوں گا...... کیونکہ میرا غم اور دنیا کی نعمتیں ایک ہی دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اے رابعہ! تیری بھی ایک مراد ہے اور میری بھی ایک مراد ہے۔ تُو ہی بتا کہ دونوں مرادیں ایک جگہ کیسے رہ سکتی ہیں؟''

حضرت رابعہ بصریؒ فرماتی ہیں کہ جب میں نے یہ آواز سنی تو دنیا سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا اور ساری اُمیدیں ترک کردیں۔ اس کے بعد میں نے ہر نماز کو آخری نماز سمجھا۔

ایک بار حضرت سفیان ثوریؒ، حضرت رابعہ بصریؒ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور فرمانے لگے۔ ''رابعہ! آج تم مجھے وہ باتیں بتاؤ جو تم نے کسی کتاب یا عالم کے ذریعے حاصل نہ کی ہوں بلکہ وہ براہِ راست تم تک پہنچی ہوں۔'

حضرت رابعہ بصریؒ کچھ دیر تک غور کرتی رہیں۔ پھر آپؒ نے امامِ وقت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ایک بار میں نے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے ہاتھ سے بٹی ہوئی چند رسیاں فروخت کیں۔ خریدار نے مجھے دو درہم دیئے تو میں نے ایک درہم ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرا دوسرے ہاتھ میں۔ مجھے ڈر تھا کہ ایک ہی ہاتھ میں دونوں درہم لینے سے کہیں میں گمراہ نہ ہو جاؤں۔'' اس بات سے حضرت رابعہ بصریؒ کا اشارہ کثرتِ مال کی طرف تھا۔

ایک بار آپؒ نے کسی شخص کو چند سکے دے کر فرمایا۔ ''میرے لئے بازار سے جا کر کمبل خرید لاؤ۔''

اس شخص نے عرض کیا۔ ''مخدومہ! آپ کو سفید کمبل درکار ہے یا سیاہ؟''

حضرت رابعہ بصریؒ نے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ''پیسے واپس دے دو۔ ابھی کمبل خریدا نہیں اور سیاہ وسفید کا جھگڑا شروع ہوگیا۔'' پھر اس شخص سے پیسے واپس لے کر اپنی خادمہ کو دے دیئے اور فرمایا کہ انہیں جا کر دریا میں پھینک آؤ۔

ان تمام واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ دنیا اور اہلِ دنیا سے کس قدر بے نیازانہ تعلق رکھتی تھیں۔

ایک بار کسی شخص نے برسرِ مجلس آپؒ سے سوال کیا۔ ''آپ کہاں سے آئی ہیں؟''

حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ ''اُس جہان سے۔''

''اور کہاں جائیں گی؟'' اسی شخص نے دوسرا سوال کیا۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ ''اُسی جہان میں۔''

پھر جب آپؒ سے پوچھا گیا کہ اِس جہان میں کیا کرتی ہیں تو فرمانے لگیں۔ ''میں افسوس کے سوا کچھ نہیں کرتی۔''

پوچھنے والے نے پوچھا۔ ''آپ کس بات پر افسوس کرتی ہیں؟''

حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ ''اِس جہان کی روٹی کھا کر اُس جہان کا کام کرتی ہوں۔''

پھر حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص نے کہا۔ ''آپ کی زبان میں عجیب مٹھاس ہے۔ اس لئے آپ مسافر خانے کی محافظت کے لائق ہیں۔''

اس شخص کی بات سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ ''میں یہی کام تو کر رہی ہوں۔ جو کچھ میرے اندر ہے اسے باہر کرتی ہوں اور جو باہر ہے اسے اندر آنے نہیں دیتی۔ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں دل کو محفوظ رکھتی ہوں نہ کہ

مٹی (جسم) کو۔"

حضرت رابعہ بصریؒ عشق الٰہی میں اس قدر غرق رہتی تھیں کہ خوشی اور غم اپنی حیثیت کھو بیٹھتے تھے۔ عبادت کے بارے میں آپؒ کا طرزِ فکر بڑا عجیب تھا۔ آپؒ خوف اور طمع سے بے نیاز ہو کر اپنے خالق کو پکارتی تھیں۔ ایک بار آپؒ پر جذب کی کیفیت طاری تھی۔ اہلِ بصرہ نے دیکھا کہ آپؒ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی لئے ہوئے بھاگی چلی جا رہی ہیں۔

لوگوں نے حضرت رابعہ بصریؒ کو اس حال میں دیکھا تو پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟ آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ "میں اس پانی سے دوزخ کی آگ کو بجھانے چلی ہوں کہ لوگ اسی کے خوف سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔"

"اور یہ آگ کس لئے ہے؟" لوگوں نے پوچھا۔

"میں اس آگ سے جنت کو پھونک ڈالنا چاہتی ہوں تا کہ جو لوگ جنت کی لالچ میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں، انہیں جنت نہ مل سکے۔"

یہ حضرت رابعہ بصریؒ کا اپنا اندازِ فکر تھا جسے جذب و مستی کی کیفیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ورنہ خوف و طمع دونوں حالتوں میں اللہ کی عبادت جائز ہے۔ قرآن حکیم میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک بار حضرت رابعہ بصریؒ ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگ رہی تھیں۔ "اے میرے معبود! اگر میں تیری عبادت دوزخ کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے دوزخ ہی میں ڈال دینا۔ اور اگر میری ریاضت حصولِ جنت کے لئے ہے تو اسے مجھ پر حرام کر دینا...... اور اگر میں صرف تیرے ہی لئے تیری پرستش کرتی ہوں تو مجھے اپنے دیدار سے ہرگز محروم نہ رکھنا۔" یہی وہ عشق ہے جس نے حضرت رابعہ بصریؒ کو ولایت کے منصب تک پہنچایا اور پھر آپؒ کا نام قیامت تک کے لئے محبت کی علامت بن کر رہ گیا۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے ساری زندگی تجرد کے عالم میں گزار دی۔ اس زمانے کے کچھ لوگوں نے آپؒ کی اس روش پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "آپ خود کو عارفہ کہتی ہیں مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس معروف سنت پر عمل نہیں کرتیں۔"

جواب میں حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ "مجھے تین باتوں کا اندیشہ ہے۔ اگر تم مجھے ان اندیشوں سے نجات دلا دو تو میں آج ہی نکاح کر لوں گی۔ میرا پہلا اندیشہ یہ ہے کہ مرتے وقت ایمان سلامت لے جاؤں گی یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ میرا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ

میں دیا جائے گا یا بائیں ہاتھ میں؟ تیسرا یہ کہ قیامت کے دن ایک گروہ کو دائیں طرف سے بہشت میں داخل کیا جائے گا اور دوسرے گروہ کو بائیں طرف سے دوزخ میں۔ تم لوگ بتاؤ کہ میں کس طرف ہوں گی؟"

حضرت رابعہ بصریؒ کے تینوں سوالوں کے جواب میں لوگوں نے کہا۔ "ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کا کیا حشر ہوگا؟"

لوگوں کا جواب سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "تم خود ہی بتاؤ کہ جس عورت کو اس قدر غم ہوں وہ شوہر کی خواہش کس طرح کر سکتی ہے؟"

حضرت رابعہ بصریؒ بڑے حکیمانہ انداز میں گفتگو فرماتی تھیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے صاحبانِ علم آپؒ کے حضور میں عاجز رہ جاتے تھے۔ ایک بار کسی شخص نے آپؒ کی گوشہ نشینی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"ذرا باہر نکل کر دیکھئے کہ کیسی بہار آئی ہوئی ہے۔"

حضرت رابعہ بصریؒ نے بے ساختہ فرمایا۔ "میرا کام صانع کو دیکھنا ہے، اس کی صنعت کو نہیں۔"

ایک بار ایک شخص آپؒ کی مجلس میں حاضر ہوا جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آپؒ نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے سر میں درد ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے دوبارہ پوچھا کہ اس کی عمر کیا ہے؟ جواب میں اس شخص نے کہا کہ اس کی عمر تیس سال ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے تیسرا سوال کیا کہ وہ اس عرصے میں بیمار رہا یا تندرست؟ اس شخص نے عرض کیا کہ وہ اس دوران کبھی بیمار نہیں ہوا۔

اس شخص کا جواب سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ "تم تیس سال تک تندرست رہے مگر اس عرصے میں ایک دن بھی شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے سر پر پٹی نہیں باندھی مگر آج ذرا سی دیر کے لئے بیمار ہوئے تو اپنے مالک کی شکایت کرنے کے لئے فوراً سر پر رومال باندھ لیا۔" آپؒ کی بات سن کر وہ شخص نہایت شرمندہ ہوا۔

ایک بار کچھ اہلِ علم لوگ جو آپؒ کی شہرت و محبوبیت سے حسد رکھتے تھے، مجلس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔ "اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ ہمیشہ مرد ہی کو نبی یا رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ آج تک کسی عورت کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔"

ان لوگوں کی بات سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ "بے شک یہی اللہ کا نظام ہے مگر ایک بات غور سے سن لو کہ مردوں ہی نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ کسی عورت نے آج تک یہ نہیں کہا کہ میں تمہارا بڑا رب ہوں۔" حضرت رابعہ بصریؒ کا اشارہ فرعونِ

مصر کی طرف تھا جو خدائی کے بلند و بانگ دعوے کیا کرتا تھا۔

حضرت رابعہؒ شاعری بھی کیا کرتی تھیں۔ آپؒ کا سارا کلام کیفیاتِ عشق سے معمور ہے۔ ایک مقام پر فرماتی ہیں۔

"اے نفس! تُو اپنے اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ اس کی نافرمانی بھی کرتا رہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے۔"

ایک اور مقام پر فرماتی ہیں۔ "میں تجھ سے محبت کرتی ہوں۔ دو طرح کی محبت۔ ایک محبت ہے آرزو اور تمنا کی...... اور دوسری محبت ہے صرف تیری ذات کی۔ میری وہ محبت جو آرزو اور تمنا سے لبریز ہے، وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی...... مگر وہ محبت جو صرف تیری ذات سے ہے، اسی محبت کا واسطہ، حجاب کو دُور کر دے تاکہ آنکھیں تیرا جلوہ دیکھ سکیں۔"

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ "رابعہ بصریؒ نے اپنے اشعار میں غرض اور آرزو کی جس محبت کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد اللہ کا احسان اور انعام ہے جو وہ اپنے بندوں پر روا رکھتا ہے...... اور جس حُبِ ذاتِ الٰہی کی بات کی ہے، اس سے مراد دیدارِ خداوندی کی محبت ہے جس کا نظارہ ان کے دل کی آنکھوں نے کیا اور یہی محبت سب سے بہتر اور برتر ہے۔ جمالِ ربوبیت کی لذت بجائے خود سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کے متعلق حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے صالح بندوں کو وہ چیز دیتا ہوں جسے عام آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، نہ عام کان سن سکتے ہیں اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزر سکتا ہے۔"

محبت کا یہ آبشار اٹھاسی برس تک جاری رہا۔ حضرت رابعہ بصریؒ 185ھ میں اس طرح دنیا سے رخصت ہوئیں جیسے بادِ نسیم کا کوئی جھونکا تیزی سے گزر جائے۔ وفات سے تھوڑی دیر قبل بصرہ کے کچھ لوگ عیادت کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت رابعہؒ نے انہیں دیکھ کر فرمایا۔

"فرشتوں کے لئے راستہ چھوڑ دو۔"

لوگ باہر چلے گئے تو آپؒ نے بستر سے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر تک بات کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر جب خاموشی چھا گئی تو لوگوں نے دروازہ کھولا۔ حضرت رابعہ بصریؒ دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ لوگوں نے اشک بار آنکھوں سے دیکھا۔ محبت کا نغمۂ سرمدی خاموش ہو چکا تھا مگر اس کا سوز اہلِ دل کو آج بھی اسی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش	....	604ھ
تاریخ وفات	....	670ھ
مزار مبارک	....	قونیہ (ترکی)

جلال الدین نام۔ روم اور رومی تخلص۔ بلخ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم شیخ بہاء الدین سے حاصل کی جو اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ مشہور بزرگ حضرت شمس تبریزؒ سے ملاقات ہوئی تو مولانا کی زندگی ہی بدل گئی۔ ایک درویش کی نگاہِ کیمیا تاثیر نے ہوش و خرد کو زیر و زبر کر دیا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ بے اختیار پکار اُٹھے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

"مثنوی مولانا روم" کو دنیا کے ادب عالیہ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ مگر شاعری کی کسی کتاب کو اس قدر احترام کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

اپنے وقت کی دونوں سپر پاورز (ایران اور روم) اہلِ اسلام کے ہاتھوں شکست و بربادی سے دوچار ہو کر قصۂ پارینہ بن چکی تھیں اور ان کے مرثیہ خواں تک باقی نہیں رہے تھے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا تھا کہ اہلِ ایمان صرف آخرت ہی میں کامیاب و کامران نہیں ہوں گے بلکہ دنیا میں بھی انہیں اقتدارِ اعلیٰ بخشا جائے گا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کا عروج اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ساری دنیا کی دولت ان کے قدموں میں تھی اور بڑے بڑے تاج و تخت ان کی ٹھوکروں سے پامال ہو رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب ایران کی فتح کے بعد مالِ غنیمت کے انبار دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ رو پڑے تھے اور سرِ دربار کسی نے عرض کیا تھا۔

"امیر المومنین! انتہائی خوشی کے موقع پر آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو؟"

جواب میں خلیفۂ ثانی نے فرمایا تھا۔ "میں اس لئے روتا ہوں کہ جہاں دولت کے قدم آتے ہیں، وہاں ایمان سلامت نہیں رہتا۔ اللہ تمہیں مال و زر کے فتنے سے محفوظ رکھے۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ دنیا کے سارے خزانوں کی کنجیاں مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ عظیم الشان محل تعمیر کئے جا رہے تھے مگر کاشانۂ دل ویران ہوتا جا رہا تھا۔ دیواروں میں قیمتی فانوس بھی آویزاں تھے مگر دماغوں کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جس قوم کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا تھا آج وہی قوم کنیزوں کے خوب صورت جسموں سے اپنے حرم سجا رہی تھی۔

پھر ایک دن بغداد کی شاہراہوں پر ایک مجذوب چیختا پھر رہا تھا۔ "لوگو! خدا کی نافرمانیوں سے باز آ جاؤ۔ چنگ و رباب توڑ دو اور شراب کے ذخیرے نالیوں میں بہا دو...... ورنہ قدرت کا پیمانۂ برداشت چھلکنے والا ہے۔ عذاب کے دن گنے جا چکے ہیں۔ بس کچھ گھڑیاں باقی ہیں۔ ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ سرکشی چھوڑ دو نہیں تو تمہارے کاندھوں سے گردنوں کے بوجھ کم کر دیئے جائیں گے۔ بڑا خون بہے گا، بڑی رسوائی ہو گی۔"

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ مجذوب کی لَے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ شروع میں لوگ اسے پاگل سمجھ کر ایک دلچسپ تماشے سے لطف اندوز ہوتے رہے مگر وہ دیوانہ تو بڑے پتے کی باتیں کر رہا تھا۔ بڑے خوف ناک راز فاش کر رہا تھا۔ آخر عشرت کدوں میں رہنے والوں کو اس وحشی کے نعرے گراں گزرنے لگے۔ مجذوب سے کہا گیا کہ وہ نعرہ زنی

بند کر دے۔ اس کی بے ہنگم آوازوں سے شرفاء کے سکون میں خلل پڑتا ہے۔ وہ کس عذاب کی باتیں کرتا ہے؟ عذاب ہمیں چھو بھی نہیں سکتا کہ ہم اہلِ ایمان ہیں۔ کئی بار تنبیہ کی گئی لیکن مجذوب نے اپنا چلن نہیں بدلا۔ وہ پریشان بالوں اور بوسیدہ کپڑوں کے ساتھ ہر گلی کوچے میں چیختا پھر رہا تھا۔

"اے بے خبرو! سرخ آندھی آنے والی ہے۔ اس کے تیز جھونکوں میں تمہارے پتھروں کے مکان رُوئی کے تیز گالوں کی مانند اُڑ جائیں گے۔ اب اس قہر سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ ہلاکت و بربادی تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔"

عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے لوگ موت کی خبریں سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آخر معززینِ شہر نے مجذوب کی باتوں کو بدشگونی کی علامت قرار دے کر ایک سنگدلانہ حکم جاری کر دیا۔ اب وہ بے ضرر انسان جدھر جاتا، لوگ اس پر غلاظت پھینکتے تھے۔ مجذوب ان کی اس حرکت پر قہقہے لگاتا تھا۔

"میرے جسم پر گندگی کیا اُچھالتے ہو۔ اپنے مسخ چہروں اور غلیظ لباسوں کی طرف دیکھو۔ عنقریب ان پر سیاہی مَلی جانے والی ہے اور کچھ دن خدا کے نظام کا مذاق اُڑا لو۔ پھر وقت تمہارا اس طرح مذاق اُڑائے گا کہ تم موت کو پکارو گے مگر موت بھی تمہیں قبول نہیں کرے گی۔"

اس کے بعد لوگ تشدد پر اُتر آئے۔ مجذوب جہاں سے گزرتا تھا، جوان اور بچے اس پر پتھر برساتے تھے۔ لاغر اور نحیف جسم اپنے خون میں نہا گیا۔ بدمست انسانوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ مجذوب بغداد کی ایک آباد شاہراہ پر کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ اس خوں رنگ تماشے کو دیکھنے کے لئے سینکڑوں انسان جمع ہو گئے تھے۔ مجذوب نے ہجوم کی طرف دیکھا اور بڑے اُداس لہجے میں بولا۔

"کیا تم میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ان سنگ دلوں کو منع کرے اور میری طرف آنے والے پتھروں کو روک لے؟"

مجذوب کی فریاد سن کر لوگوں کے قہقہے کچھ اور بلند ہو گئے۔ کسی نے سنگ باری کرنے والوں کو منع نہیں کیا۔ پورے مجمع کا ضمیر مر چکا تھا۔

"عذاب لکھا جا چکا۔" مجذوب آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چیخا۔ "لکھنے والے نے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا۔ "آگ، خون، موت، ذلت اور بربادی۔" پھر مجذوب نے بہتے ہوئے خون کو اپنے چہرے پر مل لیا۔ چند پتھر اور برسے۔ مجذوب زمین پر گر پڑا۔

"مسخرا آسمان کی خبریں دیتا ہے۔" لوگ دیوانہ وار ہنس رہے تھے۔ "یہ خبر نہیں کہ خود

اپنا کیا حال ہونے والا ہے؟'' ایک مجبور انسان پر مشقِ ستم کرنے کے بعد ہجوم منتشر ہو گیا۔ مجذوب کے جسم سے خون بہہ بہہ کر زمین پر جمتا رہا۔

آخر بغداد کے باہوش شہریوں نے ایک دیوانے سے نجات حاصل کر لی۔ اس دن کے بعد پھر کسی نے مجذوب کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے بہت دور جا چکا تھا۔

شہر کی فضائیں نغمہ بار تھیں۔ موسیقی کی پُرشور آوازوں نے گناہ کے خوابیدہ جذبوں کو بیدار کر دیا تھا۔ سیم تن بدنوں کے رقص نے جذبات کی دنیا میں وہ طوفان اٹھائے تھے کہ اہلِ اقتدار کی بینائی زائل ہو گئی تھی اور امراء اندھے ہو گئے تھے۔ سرحدی محافظوں کے بازو شل ہو گئے تھے اور تلواریں شاخِ گل کی مانند لہرا رہی تھیں۔

اور پھر اہلِ بغداد کو قہرِ خداوندی نے آ پکڑا۔ ہلاکو خان رات کے اندھیروں میں شمشیر بکف آگے بڑھ رہا تھا...... اور عظیم الشان اسلامی سلطنت کے نگہبان ہاتھوں میں چنگ و رباب لئے ہوئے جھوم رہے تھے۔ پھر ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ سنگِ سرخ سے بنے ہوئے سر بہ فلک محلات میں آگ لگی ہوئی تھی اور علم و حکمت کے ذخیرے سوکھی لکڑیوں کی طرح جل رہے تھے۔ شاندار تہذیب و تمدن کے تمام آثار وحشیوں کے نیزوں کی زد پر تھے۔ ہلاکو خان کے سامنے عالمانہ تقریریں کرنے والے بے شمار تھے مگر وہ تلوار کے سوا کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس فتنۂ عظیم کو صرف جرأت و شجاعت کے ہتھیاروں سے روکا جا سکتا تھا مگر مسلمان بہت پہلے ان ہتھیاروں کو زنگ آلود سمجھ کر اپنے اسلحہ خانوں میں دفن کر چکے تھے اس لئے چنگیز خان کا سفاک پوتا مسلمانوں کے سروں کے مینار بنا رہا تھا اور اہلِ بغداد ایک درندے سے تہذیب و شائستگی کی زبان میں رحم و کرم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ پھر یوں ہوا؎

آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا

اب ہلاکو خان کا رخ نیشا پور کی طرف تھا۔ یہاں بھی موت کی سرخ آندھی نے تباہی مچا دی۔ علم و حکمت کے کیسے کیسے تناور درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے۔ جن لوگوں نے کچھ دن پہلے بغداد کی شاہراہوں پر ایک مجذوب کو چیختے ہوئے دیکھا تھا آج انہیں اس پاگل انسان کی باتیں یاد آ رہی تھیں مگر وقت گزر چکا تھا۔ اچانک خبر آئی کہ تاتاریوں نے حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ جیسے بزرگ کو بھی شہید کر دیا۔ معرفت کا یہ مینار کیا گرا کہ گھروں میں سہمے ہوئے مسلمان موت کے خوف سے کانپنے لگے۔ اب ان کے درمیان سے وہ شخص بھی اُٹھ گیا تھا جس کی دعائیں آسمان پر سنی جاتی تھیں۔

دوسری جانگداز خبر آئی کہ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے بھی جامِ شہادت پی لیا۔

اس طرح کہ آپؒ نے خانقاہ سے باہر آ کر آخری سانس تک ہلاکو کی فوج سے جنگ کی اور مرتے وقت اپنی قوم کو ایک ہی پیغام دیا کہ مکانوں کو چھوڑ کر میدانِ کارزار میں نکل آؤ۔

حضرت نجم الدین کبریٰؒ کی شہادت نے مسلمانوں کی امید کی آخری کرن بھی بجھا دی تھی۔ معرفت کے اس بلند ترین مینار کے زمین پر گرتے ہی زلزلہ آ گیا تھا اور ظلم و ستم کی رات مزید طویل ہو گئی تھی۔

خون کا سیلاب راستہ بناتا ہوا مسلمانوں کے سرسبز و شاداب علاقوں سے گزر رہا تھا۔

اب ہلاکو خان کے لہو آشام لشکر کا رخ شام کے شہر ''قونیہ'' کی جانب تھا۔ اس لشکر کی سالاری بیجو خان کو سونپی گئی تھی۔ بیجو خان نے اپنی فوجیں شہر کے چاروں طرف پھیلا دیں اور قونیہ کا مکمل محاصرہ کر لیا۔ چند روز تک تو اہلِ شہر کو خوف و دہشت کے سوا کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا مگر جب محاصرے نے طول پکڑا تو قونیہ کے باشندوں کا سامانِ رسد بند ہو گیا جس سے ہر طرف بدحواسی پھیل گئی۔ اہلِ شہر میں مشورے ہونے لگے۔

کسی نے کہا۔ ''بیجو خان سے مصالحت کی بات کی جائے اور اس کے مطالبات مان کر اس عذاب سے نجات حاصل کی جائے۔''

فوراً ہی دوسرے شخص نے جواب دیا۔ ''ہلاکو خان مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہے۔ وہ علی الاعلان خود کو خدا کا قہر کہتا ہے۔ اس کے نزدیک امن و عافیت جیسے الفاظ کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔''

''پھر کیا ہو گا؟'' ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ آخر جب تمام ذہن سوچتے سوچتے مفلوج ہو گئے تو امیروں کی محفل میں ایک پریشان حال شخص داخل ہوا۔ اس مفلس انسان کو دیکھ کر دولت مندوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے مگر وہ لوگوں کے احساسات سے بے نیاز اندر چلا آیا اور بدمستوں کے درمیان کھڑے ہو کر بارعب لہجے میں کہنے لگا۔

''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے ایک ہم مذہب کو دیکھ کر بدحواس ہو گئے ہو۔ میں تم سے بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں کہ مجھے دیکھ کر تمہارے چہروں پر نفرت برسنے لگی ہے۔ اسی تنگ دلی اور بے ضمیری نے تمہیں یہ خوفناک دن دکھائے ہیں۔ تم اپنے عشرت کدوں میں شرابِ سرخ سے دل بہلاتے رہے اور مخلوقِ خدا اپنے خون میں نہاتی رہی۔ اب دولت کے یہ ذخیرے لے کر کہاں جاؤ گے کہ زمین تم پر تنگ ہو چکی ہے اور آسمان بہت دور ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اجنبی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پوری محفل پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔ ہر شخص کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ نزع کی حالت میں گرفتار ہو۔

''میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ اس قہرِ آسمانی کا بس ایک ہی علاج ہے۔'' اجنبی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''ہاں! ہاں! ہمیں بتاؤ۔'' تمام امراء بیک زبان چیخے۔ ''ہم اپنے سیم و زر کے سارے انبار لٹا دیں گے۔ خدا کے لئے ہمیں اس اذیت ناک صورتِ حال سے نجات دلاؤ۔ ہم گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ مرتے ہیں اور پھر دوسری ساعت میں جی اُٹھتے ہیں۔ ہلاکو خان کی دہشت ہمیں وقت سے پہلے مار ڈالے گی۔'' سب کے سب گداگروں کی طرح چیخ رہے تھے۔

''اس درویش کے پاس جاؤ جو تمہارے عشرت کدوں پر تھوک کر اپنی خانقاہ میں گوشہ نشیں ہو گیا ہے۔'' اجنبی نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے اہلِ محفل کے لئے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''وہ تمہارے سیم و زر کے ذخیروں کا محتاج نہیں۔ وہ تو خود شہنشاہ ہے۔ ایسا شہنشاہ جس کے سامنے ہلاکو کے سپاہی بھی حقیر کیڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے پاس جاؤ۔ اگر وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دے تو ممکن ہے کہ تمہارے سروں پر آگ کے شعلوں کی بجائے ابرِ رحمت برس جائے۔ اللہ اس کی بہت سنتا ہے۔''

اجنبی کی باتیں سن کر اہلِ مجلس بدحواسی کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ وہ اسی وقت درویش کے آستانے پر حاضر ہونا چاہتے تھے۔

''سنو......'' اجنبی نے پکار کر کہا۔ ''وہ آسانی سے نہیں مانے گا۔ اس کے دروازے پر بھکاریوں کی طرح جانا۔ وہ تمہاری قیمتی پوشاکوں اور زرنگار قباؤں سے نفرت کرتا ہے۔''

یہ کہہ کر اجنبی محفل سے نکل گیا۔ تھوڑی دور تک لوگوں نے اسے جاتے دیکھا اور پھر وہ اچانک نظروں سے غائب ہو گیا۔ تمام لوگ اس بات پر حیران تھے کہ وہ کون تھا؟ کیوں آیا تھا اور یکایک کہاں غائب ہو گیا؟ یہ ایک بڑا اہم واقعہ تھا۔ مگر لوگوں کے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ وہ انسان ہی سہی لیکن فرشتۂ رحمت بن کر آیا تھا۔ اس نے آگ اور خون کے درمیان گھرے ہوئے لوگوں کو سلامتی کی راہ دکھائی تھی۔

اب قونیہ کے معززین اور شرفاء کی جماعت اس درویش کے آستانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فاصلے ختم ہوئے، اجازت طلب کی گئی۔ درویش فطرتاً مہمان نواز تھا۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کو اندر بلا لیا۔ لوگ کانپتے قدموں سے درویش کے رُوبرو پہنچے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں لرز رہی تھیں اور چہرے موت کے خوف سے زرد تھے۔ بعض نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ مگر اس طرح کہ ان کی

آوازیں لرز رہی تھیں۔

''میرے پاس کیوں آئے ہو؟'' درویش نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔ ''اس کائنات میں میری کیا حیثیت ہے؟ تم اُس کی بارگاہ میں کیوں نہیں گئے جو لوحِ محفوظ کا مالک ہے۔ جس کے ایک اشارے پر تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔''

''شیخ! وہ ہماری نہیں سنتا۔'' قونیہ کے امراء نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہم بہت گناہ گار ہیں۔ ہمارے لئے درِ توبہ بند ہو چکا ہے۔''

''یہ سب غلط ہے۔'' اگرچہ درویش کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک دلنواز تبسم نمایاں رہتا تھا مگر وہ قونیہ کے امراء کی بات سن کر یکایک غضب ناک ہو گیا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ درِ توبہ کب بند ہوگا؟ جاؤ، اُسی کو پکارو! وہی اپنے بندوں کی سنتا ہے۔ اگر وہ نہیں سنے گا تو پھر اس کائنات میں کون سننے والا ہے؟''

امراء نے محسوس کر لیا کہ درویش اپنا دامن بچا رہا ہے۔ اجنبی نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ درویش آسانی سے ان کی بات نہیں مانے گا اس لئے وہ مزید گریہ و زاری کرنے لگے۔ ''آسمان سے ہماری فریادوں کا جواب نہیں آتا۔ شیخ! ہم تیرے آستانے سے واپس نہیں جائیں گے۔ اگر موت ہمارا مقدر بن چکی ہے تو پھر ہم تیرے قدموں میں مر جانا پسند کریں گے۔''

''تم نے دیکھا کہ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ شہید کر دیئے گئے۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ اپنے خون میں نہا کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ میں تو ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں۔ پھر تمہارے لئے کس طرح دعا کروں؟ کیسے کیسے پارسا اس فتنۂ عظیم میں زندگی سے محروم ہو گئے۔ جب ان کی دعائیں قہرِ آسمانی کو نہ روک سکیں تو پھر میں کس شمار میں ہوں؟'' درویش بڑے دردناک لہجے میں اپنی عاجزی کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر لوگ اس کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہیں صرف اپنے جان و مال کی فکر تھی۔ وہ درویش کے سامنے بہت دیر تک گریہ و زاری کرتے رہے۔

آخر درویش مجبور ہو گیا۔ اس سے مخلوقِ خدا کی چیخیں نہیں سنی جاتی تھیں۔ وہ اٹھا اور اپنا مصلّٰی لے کر خانقاہ سے نکل گیا۔ لوگوں نے بڑی حیرت سے درویش کے طرزِ عمل کو دیکھا۔ وہاں موجود ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ درویش ان کے شورِ فغاں سے تنگ آ کر خانقاہ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ پورے مجمع پر کچھ دیر کے لئے سکوتِ مرگ سا طاری رہا۔ پھر تمام لوگ خانقاہ سے باہر نکل آئے اور درویش کو دیکھنے لگے جو ساری دنیا سے بے نیاز تیز تیز قدموں کے ساتھ ایک سمت چلا جا رہا تھا۔

قونیہ کے تمام شرفاء اور امراء درویش کو خاموشی سے دیکھتے رہے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کے پیچھے جاتے۔ بس درویش کے چند خادم بے قرار ہو کر اپنے مخدوم کے پیچھے بھاگے۔ ان کے لئے اس مردِ قلندر کا یہ انداز نا قابلِ فہم تھا۔ خادم درویش کے قریب پہنچ گئے مگر اس سے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ درویش جس طرف سے بھی گزرتا تھا، کچھ لوگ اس کے ہمراہ ہو جاتے تھے...... مگر اس نے نظر اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔

اب وہ شہر کی حدود سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے ہمراہ چلنے والے خوف سے لرزنے لگے۔ سامنے ہلاکو کے سپہ سالار بیجو خان کا لشکر نظر آ رہا تھا۔ درویش یکا یک مڑا اور ان لوگوں سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔

”تم اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ کیا یہ کوئی تماشا ہو رہا ہے؟ اس قہر آسمانی سے خدا کی پناہ مانگو۔“ یہ کہہ کر درویش آگے بڑھا۔ اس کا انجانا سفر دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

ساتھ جانے والے اسی مقام پر رک گئے جہاں اس نے ٹھہر جانے کا حکم دیا تھا۔ درویش آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ منگول لشکر کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ تمام اہلِ شہر اور خادم جو اس وقت وہاں موجود تھے، خوف و دہشت سے کانپنے لگے۔ درویش کا ناتواں جسم منگول تیر اندازوں کے نشانے پر تھا۔ تاتاریوں کے ترکش سے نکلا ہوا ایک تیر بھی درویش کا کام تمام کر سکتا تھا...... مگر وہ مردِ خدا آج ہر شے سے بے نیاز تھا۔ اس کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ پھر وہ قونیہ کے ان باشندوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا جو اسے بیجو خان کے لشکر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

فاصلے مزید کم ہو گئے تھے۔ درویش ایک بلند ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ اس ٹیلے کے دوسری طرف تاتاریوں کا لشکر خیمہ زن تھا۔ درویش چوٹی تک پہنچا پھر اس نے اپنے اطراف پر نظر ڈالی۔ دور تک منگول سپاہی بکھرے ہوئے تھے اور نگاہوں کے سامنے سپہ سالار بیجو خان کا خیمہ تھا جو دوسرے خیموں سے زیادہ وسیع اور نمایاں نظر آ رہا تھا۔ درویش نے ٹیلے پر مصلیٰ بچھا دیا۔ ایک لمحے کے لئے آسمان کی طرف دیکھا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ ابھی چند ساعتیں بھی نہیں گزری تھیں کہ کسی تاتاری کی نظر درویش پر پڑی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں منگول سپاہی ٹیلے کی طرف متوجہ ہو گئے جہاں ایک مسلمان اپنے اللہ کی عبادت میں مشغول تھا۔ دشمن فوجی اس کی عبادت کا مفہوم تو نہیں سمجھ سکے مگر انہیں یہ خیال ضرور ہوا کہ وہ کوئی مسلمان جاسوس ہے جو بیجو خان کے لشکر کی مخبری کرنے آیا ہے۔

اس خیال کے پیدا ہوتے ہی منگول سپاہیوں میں ہلچل مچ گئی۔ اگر چہ درویش تنہا تھا لیکن جنگی اصول کے مطابق اس کی موجودگی نہایت خطرناک تھی۔ سپاہیوں نے اپنے کاندھوں پر لٹکتی ہوئی کمانیں اتار لیں۔ برق رفتاری کے ساتھ تیر چڑھائے۔ پوری قوت کا مظاہرہ کیا مگر کوئی ایک کمان بھی نہ کھنچ سکی۔ تنگ آ کر کچھ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کو استعمال کرنا چاہا تا کہ ٹیلے پر پہنچ کر مسلمان درویش کو تلواروں سے قتل کر ڈالیں لیکن اس وقت منگول سپاہیوں کی بے چارگی قابلِ دید تھی جب ان کے گھوڑے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکے۔ تاتاریوں نے بے زبان جانوروں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ فضا میں گھوڑوں کی چیخیں بلند ہوتی رہیں مگر ان سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا جا سکا۔ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ سارے لشکر میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ سپاہیوں کا شور سن کر بیجو خان بھی اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔ سپاہیوں سے اس ہنگامے کا سبب دریافت کیا تو بے شمار اُنگلیاں ٹیلے کی طرف اٹھ گئیں جہاں درویش اب بھی اپنے خدا کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”یہ کیسی دیوانگی کی باتیں ہیں؟“ بیجو خان نے چیخ کر کہا۔ ”کوئی بھی ذی ہوش انسان تمہاری احمقانہ گفتگو پر یقین نہیں کر سکتا۔“ یہ کہہ کر بیجو خان نے ایک سپاہی سے تیر کمان طلب کیا۔ وہ ایک ماہر تیر انداز تھا۔ ہلاکو کے پورے لشکر میں اس کی یہ صفت مشہور تھا۔ تمام سپاہی حیران و پریشان بیجو خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی سانسیں رکی ہوئی تھیں اور ذہنوں میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ اگر منگول سپہ سالار مسلمان جاسوس کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ وہ اس کی وحشیانہ عادتوں سے واقف تھے۔

آخر بیجو خان نے اپنی کمان کھینچی اور ایک قہر آلود نظر ان سپاہیوں پر ڈالی جن کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اپنی کمانیں کھینچنے سے عاجز رہے تھے۔ سپاہیوں کی جان پر بن آئی تھی اور اب انہیں اپنی موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ بیجو خان نے پوری طاقت سے کمان کھینچی، پھر فضا میں ایک مخصوص آواز اُبھری اور ترکش سے تیر چھوٹ گیا۔ منگول سپاہی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تیر کو دیکھ رہے تھے۔ چند ثانیوں کی بات تھی۔ تاتاریوں کا خیال تھا کہ دوسرے ہی لمحے مسلمان جاسوس کی لاش ٹیلے کی بلندی سے زمین کی پستیوں میں چلی جائے گی...... مگر ایسا نہیں ہوا۔ بیجو خان کا چھوڑا ہوا تیر درویش کے قریب سے نکل گیا۔ منگول سپہ سالار کا چہرہ احساسِ ندامت سے زرد ہو گیا۔ نشانہ چوک جانے پر وہ ناقابلِ بیان اذیت و کرب میں مبتلا تھا۔ شدید غضب کے عالم میں اس نے ترکش پر دوسرا تیر

چڑھایا۔ اس بار کمان کو یہاں تک کھینچا کہ اس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ نشانہ درست ہوتے ہی بیجو خان نے تیر چھوڑ دیا...... مگر اس مرتبہ بھی وہی ہوا۔ تیر سیدھا نشانے پر تھا مگر درویش کے قریب پہنچتے ہی کٹ کر دوسری طرف نکل گیا۔ اس کے بعد سپہ سالار بیجو خان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ پھر اس نے مسلمان جاسوس پر تیروں کی بارش کر دی لیکن ایک تیر بھی درویش کے جسم کو نہ چھو سکا۔ انتہائی طیش کے عالم میں بیجو خان نے کمان اُٹھا کر سپاہی کے سر پر دے ماری اور تیزی سے اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔ تلوار نکالی اور دوبارہ خیمے سے باہر آیا۔ وہ مسلمان جاسوس کو اپنے ہاتھ سے تہہ تیغ کرنا چاہتا تھا۔ بیجو خان غضب ناک حالت میں آگے بڑھا مگر بمشکل تمام تھوڑی ہی دور جا سکا تھا کہ اچانک منگول سپہ سالار کو محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ وہ بہت دیر تک ہوا میں اپنی شمشیر لہراتا رہا۔ اس کے ہاتھ مسلسل گردش کر رہے تھے مگر ٹانگیں پتھر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ آخر وہ اپنی بے کسی پر رو پڑا۔ اس نے گھبرا کر سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ سب کے سب سر جھکائے کھڑے تھے۔

''اے جادوگر! ہمیں معاف کر دے۔'' اچانک بیجو خان کی تیز آواز فضا میں گونجی۔

''ہم قونیہ کا محاصرہ اٹھا کر واپس جا رہے ہیں۔ اے عظیم ساحر! ہمیں جانے دے کہ ہم غلطی سے تیرے علاقے میں آ گئے تھے۔ ہماری بھول کو درگزر کر۔ بے شک! تُو اس مملکت کا شہنشاہ ہے۔ ہمیں اجازت دے کہ ہم اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں۔'' منگول سپہ سالار بیجو خان اس طرح فریاد کر رہا تھا جیسے واقعتہً وہ کسی طاقتور شہنشاہ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔

ابھی بیجو خان کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ یکایک اس کے پیروں میں خون کی گردش بحال ہو گئی۔ منگول سپہ سالار نے اپنی تلوار نیچے کر لی اور سر جھکائے ہوئے خیمے میں واپس آ گیا۔ کچھ دیر پہلے جس شخص کو جاسوس کے نام سے پکارا جا رہا تھا اب وہی بے اسلحہ اور نہتا انسان فاتح ٹھہرا تھا...... اور بیجو خان جیسا طاقتور دشمن ناکام و نامراد لوٹ رہا تھا۔

جب منگول سپاہی قونیہ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے اس وقت بیجو خان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے فوجیوں سے کہہ رہا تھا۔

''گھوڑوں کی رفتار تیز کر دو۔ یہ پورا علاقہ جادو کے زیرِ اثر ہے۔ اس بوڑھے ساحر نے ہر چیز کو باندھ کر رکھ دیا ہے۔'' ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی گھوڑوں کی پشت پر تازیانے برسنے لگے۔ فضا حیوانوں کی چیخوں سے گونجنے لگی۔ راستوں سے گرد و غبار اُٹھا اور پھر فتنۂ ہلاکو کا نقیب کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گیا۔

شہر قونیہ کے باشندے بہت خوش تھے۔ ایک درویش کی دعاؤں کے سبب ان کے سروں سے عذابِ آسمانی ٹل گیا تھا۔ درویش اپنی خانقاہ کی طرف آیا تو انسانی ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ لوگ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتے تھے مگر وہ ان تمام رسموں سے بیزار تھا۔ اس نے انتہائی تلخ لہجے میں لوگوں کو مخاطب کیا۔

''اگر آج نافرمانوں کی جماعت قہرِ خداوندی سے بچ گئی تو کل خیر نہیں۔ اس سے پہلے کہ دردناک عذاب تمہیں آ پکڑے، اپنے گناہوں سے توبہ کر لو۔ بے خبروں کے لئے وقت کا ہر لمحہ رہزن ہے۔ اپنے ایمان کی حفاظت کرو ورنہ وقت کے بے رحم قزاق تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ لوٹ کر لے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر درویش خانقاہ میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

مریدوں اور خدمت گاروں نے سنا۔ وہ اپنے رب کے حضور ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

''اے عزیز وجلیل! تُو نے دنیا کے سامنے میری شرم رکھ لی ورنہ یہ گناہ گار تو رُسوا ہو چلا تھا۔ اگر میں اپنی جان بھی نذر کر دوں تو تیرے اس احسان کا شکر یہ ادا نہیں ہو سکتا۔''

جن کی دعاؤں کے سبب شہر قونیہ فتنۂ ہلاکو سے محفوظ رہا، وہ درویش مولانا جلال الدین رومیؒ تھے۔

✿ ...... ✿ ✿ ...... ✿

مولانا رومؒ کا خاندانی نام محمد تھا۔ جلال الدین لقب اور عرفیت مولائے روم۔ آپؒ 604ھ میں بلخ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ مولانا رومؒ کا سلسلۂ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ تک براہِ راست پہنچتا ہے۔ مولانا رومؒ کے پردادا حضرت حسین بلخیؒ بہت بڑے صوفی اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ امرائے وقت ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خوارزم شاہ جیسے باجبروت حکمراں نے اپنی بیٹی کی شادی مولانا رومؒ کے دادا سے کر دی تھی۔ علم وفضل کے ساتھ اس خاندان کو دنیاوی عزت وتوقیر بھی حاصل تھی۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے والد کا نام شیخ بہاء الدین تھا۔ ان کے مریدوں میں سیّد برہان الدین ایک نامور عالم تھے۔ اس لئے مولانا روم کی تربیت کی ذمہ داری سیّد برہان الدین کے سپرد کی گئی۔ مولانا رومؒ نے اکثر ظاہری علوم ان ہی بزرگ سے حاصل کئے۔ تقریباً اُنیس سال کی عمر میں مولانا رومؒ اپنے والدِ محترم کے ساتھ قونیہ تشریف لے آئے۔ کچھ دن بعد آپؒ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ شفیق ومہربان باپ سے دائمی جدائی ایک بڑا جانگداز سانحہ تھا مگر اللہ نے مولانا رومؒ کو صبر وضبط کا حوصلہ عطا فرمایا۔ آپؒ نے اس غم سے نجات پانے کے لئے خود کو کتابوں میں گم کر دیا۔ پھر 629ھ میں جب مولانا رومؒ کی

عمر پچیس سال تھی، آپؒ نے مزید تحصیل علم کے لئے شام کا رخ کیا۔ یہاں آپؒ سات سال تک مقیم رہے اور مسلسل اپنے علم میں اضافہ کرتے رہے۔ پھر قونیہ واپس آ گئے۔ ساتھ ہی ان دنوں آپؒ کے استاد معظم سیّد برہان الدین بھی تشریف لے آئے۔

پھر مولانا رومؒ کا امتحان لیا گیا۔ جب سیّد صاحب کو یقین ہو گیا کہ ان کا شاگرد ظاہری علوم کی تکمیل کر چکا ہے تو پھر ایک دن فرمایا۔

''مخدوم زادے! اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہارے والد کی امانت تمہیں لوٹا دوں۔'' اس کے بعد سیّد برہان الدینؒ نے آپؒ کو اپنا مرید کیا اور تقریباً نو سال تک روحانی تعلیم دیتے رہے۔ سیّد برہان الدینؒ ایک با ہوش بزرگ اور بنیادی طور پر ایک عالم و فاضل شخص تھے۔ اس لئے طویل تربیت کے بعد بھی مولانا رومؒ کی زندگی پر عقل کا رنگ غالب رہا۔ دراصل سیّد صاحب یہی چاہتے تھے اور وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی رہے تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فطری طور پر ذہین ترین شخص تھے۔ والد محترم کی تعلیم و تربیت اور پھر سیّد برہان الدینؒ کی خصوصی توجہ نے مولانا کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اب آپؒ کا یہ عالم تھا کہ کسی علمی تقریب میں خطاب کرنے کھڑے ہو جاتے تو لوگ پتھر کی طرح ساکت و جامد ہوتے اور مولانا کی تقریر اس طرح سنتے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی خبر بھی نہ رہتی۔ یہ تاریخِ انسانی کا عجیب پہلو ہے کہ ہر دور میں حاسد اور تنگ نظر لوگوں کی کثرت پائی جاتی ہے۔ اگر عام انسانی طبقوں میں ایسے لوگ پائے جائیں تو یہ عمل زیادہ خطرناک نہیں ہوتا۔ مگر جب علماء کے دل و دماغ بھی اس بیماری کا شکار ہو جائیں تو پھر زمین پر بے شمار فتنے سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ جب مولانا رومؒ علماء کی صفوں میں نمودار ہوئے اور آپؒ نے اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا تو مخلوقِ خدا اس قدر گرویدہ ہوئی کہ دوسرے اہلِ کمال کی عظمتوں کے چراغ دھندلے ہونے لگے۔ یہ بات علماء کی ایک جماعت کو سخت ناگوار گزری۔ پھر حسبِ روایت مولانا رومؒ کی تحقیر کرنے کے لئے ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا گیا۔

پھر جب مولانا رومؒ ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے تو اچانک ایک شخص مجمع سے اُٹھا اور با آواز بلند کہنے لگا۔

''محترم مولانا! آپ اپنے پسندیدہ موضوع پر ہفتوں اور مہینوں کی تیاری کے بعد تقریر کرتے ہیں۔ یہ تو کوئی کمال نہیں ہے۔ اس طرح تو کوئی شخص بھی اپنے علم کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ پھر آپ میں کیا خوبی ہے؟''

''میں نے کبھی اپنے کمالات کا دعویٰ نہیں کیا۔'' مولانا رومؒ نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور میری زندگی کا مقصد مخلوقِ خدا کی خدمت ہے۔ ویسے اگر آپؒ اپنی طرف سے کسی موضوع کا انتخاب کر لیں تو میں اس موضوع پر بھی تقریر کرنے کی کوشش کروں گا۔'' مولانا رومؒ کا جواب سن کر ہزاروں انسانوں کے مجمع پر گہرا سکوت چھا گیا۔

وہ شخص دوبارہ اٹھا اور منصوبے کے مطابق اس نے کہا۔ ''مولانا! آج آپ سورۂ ''والضحیٰ'' کی تفسیر بیان کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ شخص اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس شخص کا خیال تھا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کسی فی البدیہہ موضوع پر تقریر کرنے سے عاجز رہیں گے اور پھر ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں ان کی محترم شخصیت ایک تماشا بن کر رہ جائے گی۔

ایک لمحے کے لئے مولانا رومؒ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اُبھرا۔ پھر آپؒ نے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کی اور حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجا۔ اس کے بعد انسانی ہجوم سے مخاطب ہوئے۔

''قرآن کریم کی اس سورۂ مقدسہ میں استعمال ہونے والا پہلا حرف ''واؤ'' ہے۔ آج میں اسی حرفِ مقدس کی تشریح کروں گا۔'' یہ کہہ کر مولانا رومؒ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا اور پھر مسلسل چھ گھنٹے تک صرف اس بات کی وضاحت کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ''والضحیٰ'' میں حرف ''و'' کیوں استعمال کیا ہے؟ پورے مجمع پر سناٹا طاری تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مولانا رومؒ کی زبان مبارک سے علم کا سمندر اُبل رہا ہے جس کی تیز موجوں میں آج سب کچھ بہہ جائے گا۔ ابھی آپؒ کی تقریر ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ وہی شخص اپنی جگہ سے دیوانہ وار اٹھا اور اس نے مولانا رومؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

''واللہ! آپ عظیم ہیں۔ آج پورے روم میں آپ کا کوئی ثانی موجود نہیں۔ یہاں کے لوگ آپ کے علم و فضل سے حسد رکھتے ہیں۔ میں بھی اسی لعنت کا شکار ہو گیا تھا۔ خدا کے لئے مجھے معاف فرما دیجئے۔''

مولانا رومؒ نے اس شخص کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور پھر ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو آپؒ کے خلاف درپردہ سازشیں کر رہے تھے۔ ''میں ہر اس شخص کو معاف کرتا ہوں جو مجھ سے بے سبب عداوت رکھتا ہے۔ اللہ ان کے سینوں میں بھڑکتی ہوئی آتشِ حسد کو ٹھنڈا کر دے اور انہیں اپنے علم و کرم سے ہدایت بخش دے۔''

یہ مولانا کی اعلیٰ ظرفی کا عظیم الشان مظاہرہ تھا جس نے بے شمار لوگوں کو آپ کا

عقیدت مند بنا دیا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ ظاہری تعلیم و تربیت کے تمام مراحل طے کر چکے تھے۔ آپؒ کی شہرت و محبوبیت میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ عوامی حلقوں سے لے کر امرائے وقت تک آپؒ کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن اس کے باوجود مولانا رومؒ کو اپنی زندگی میں ایک خلاء سا محسوس ہوتا تھا۔ اکثر تنہائی میں آپؒ کے ہونٹوں سے سرد آہ نکل جاتی۔ کبھی کبھی خاص دوستوں کی محفل میں بھی آپؒ اپنی اس محرومی کا اظہار فرماتے۔

"میں آج بھی پیاسا ہوں اور یہ پیاس نہ جانے کب تک برقرار رہے گی؟"

مولانا رومؒ کے بے تکلف دوست اس پیاس کا مفہوم پوچھتے تو آپؒ بے اختیار فرماتے۔ "میں خود بھی نہیں جانتا کہ یہ کیسی پیاس ہے؟ بس یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری روح تشنہ ہے۔"

دوست اس کا کیا جواب دیتے؟ وہ تو خود مولانا کے علم کے محتاج تھے۔ الغرض بہت دن تک مولانا کی یہی کیفیت رہی۔ پھر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے مولانا روم کی زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کا کتب خانہ نادر و نایاب تصنیفات کی موجودگی کے سبب پورے ملک میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ایک دن مولانا رومؒ اسی کتب خانے میں شاگردوں کو درس دے رہے تھے اچانک ایک اجنبی شخص اجازت کے بغیر اندر چلا آیا۔ مولانا رومؒ فطرتاً ایک متواضع انسان تھے اس لئے اجنبی کی اس طرح آمد پر ناراض تو نہیں ہوئے لیکن پھر بھی انہیں اس شخص کا آنا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اجنبی اپنے حلیے کے اعتبار سے ایک عام سا آدمی تھا۔ پریشان حال چہرے پر وحشت کا رنگ، معمولی لباس۔ مختصر یہ کہ اجنبی کی ظاہری شخصیت انتہائی غیر موثر تھی۔ اس لئے حاضرین میں سے کسی نے بھی اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ خود مولانا رومؒ نے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور شاگردوں کو درس دینے میں مشغول ہو گئے۔ اجنبی نے آتے ہی اہلِ مجلس کو سلام کیا اور پھر حاضرین کی صفوں سے گزرتا ہوا مولانا رومؒ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مولانا کے شاگردوں کو اجنبی کی یہ بے تکلفانہ ادا بھی سخت ناگوار گزری تھی مگر وہ استاد کے احترام میں خاموش رہے تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اجنبی شخص کو درسِ علم سے نکال دیتے یا پھر کم سے کم اسے سب سے پچھلی قطار میں بیٹھنے پر مجبور کر دیتے........ لیکن وہ آدابِ مجلس کے پیشِ نظر ایسا نہ کر سکے۔ پھر بھی ان کے ذہنوں میں اجنبی کے لئے ناپسندیدگی کا غبار

بھر گیا تھا۔ مولانا رومؒ کا درس جاری رہا۔ اس دوران حاضرین نے محسوس کیا کہ اجنبی شخص کو مولانا رومؒ کے درس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بار بار قیمتی کتابوں کے ذخیرے کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے ضبط نہ ہوا تو وہ درس کے دوران ہی بول اٹھا۔

"مولانا! یہ کیا ہے؟" اجنبی نے نادر و نایاب کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مولانا رومؒ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ آپؒ کو اجنبی کی اس جاہلانہ مداخلت سے اذیت پہنچی تھی مگر مولانا روم نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ "ذرا صبر کرو! میں اپنا کام مکمل کر لوں پھر تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔" مولانا رومؒ بڑے شیریں کلام تھے مگر اجنبی کی اس غیر اخلاقی حرکت کے باعث آپؒ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی شامل ہو گئی تھی۔

اجنبی نے پھر کوئی سوال نہیں کیا مگر وہ بدستور مولانا رومؒ کے کتب خانے کا جائزہ لیتا رہا۔

آخر مولانا کا درس ختم ہوا اور آپؒ اُس اجنبی کی طرف متوجہ ہوئے جس کی ناشائستہ حرکات نے حاضرین مجلس کے ذہنوں میں تکدر پیدا کر دیا تھا۔

"آپ کون ہیں اور یہاں کس لئے تشریف لائے ہیں؟" مولانا رومؒ اجنبی سے مخاطب ہوئے۔

"مولانا! آپ میرے بارے میں دریافت نہ کریں کہ میں کون ہوں؟" اجنبی نے بڑی بے رخی سے کہا۔ "بس مجھے میرے سوال کا جواب دیجئے کہ یہ کیا ہے؟" اجنبی کے اُٹھے ہوئے ہاتھ کا رخ کتابوں کی طرف تھا۔

اجنبی کا سوال مہمل تھا۔ بالآخر مولانا رومؒ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "کیا تمہاری بینائی کمزور ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" اجنبی نے اسی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں تو بہت دور تک دیکھ سکتا ہوں۔"

"پھر تمہیں نظر نہیں آتا کہ یہ کیا ہے؟" اجنبی کی بے سر و پا گفتگو نے مولانا جلال الدین رومیؒ جیسے شیریں بیان اور متحمل مزاج انسان کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

"مجھے تو بہت کچھ نظر آ رہا ہے مگر میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟" اجنبی بار بار ایک ہی سوال کو دہرائے جا رہا تھا۔

مولانا رومؒ کو اجنبی کا لہجہ بہت ناگوار گزرا۔ آخر آپؒ نے تلخ لہجے میں فرمایا۔ "یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے۔"

مولانا کا جواب سن کر اجنبی کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اچھا! یہ وہ ہے جسے میں نہیں جانتا۔'' ابھی فضا میں اجنبی کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ یکایک کتب خانے میں آگ بھڑک اُٹھی اور مولانا رومؒ کی نادر و نایاب کتابیں جلنے لگیں۔ یہ سب کچھ اس قدر ناقابلِ یقین تھا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ دم بخود رہ گئے اور حاضرینِ مجلس پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اجنبی بے نیازانہ آگے بڑھا۔ مولانا رومؒ نے پکار کر کہا۔ ''اے شخص! یہ کیا ہے؟'' مولانا نے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف اشارہ کیا۔

اجنبی مسکرایا۔ ''مولانا! یہ وہ ہے جسے آپ نہیں جانتے۔'' اتنا کہہ کر اجنبی واپس جانے لگا۔

مولانا رومؒ کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی۔ ''ہائے! میری نادر و نایاب کتابیں۔ اے شخص! تیری وجہ سے سب کچھ راکھ ہو گیا۔''

اجنبی جاتے جاتے رُک گیا اور پھر مڑ کر مولانا رومؒ سے مخاطب ہوا۔ ''اگر یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے تو پھر میں تمہیں تمہاری کتابیں واپس کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور پھر حاضرین نے دیکھا کہ بھڑکتے ہوئے شعلے بجھ گئے اور مولانا رومؒ کے کتب خانے میں آگ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کے بعد اجنبی کچھ کہے بغیر تیزی کے ساتھ چلا گیا۔

مولانا رومؒ پر ایک بار پھر حیرت طاری ہو گئی۔ آپؒ کچھ دیر تک گہرے سکوت کے عالم میں کھڑے رہے پھر آہستہ آہستہ اپنی کتابوں کی طرف بڑھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ کچھ کتابیں مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہوں گی اور بعض کو جزوی طور پر نقصان پہنچا ہو گا۔ مگر اس وقت روم کا سب سے بڑا عالم حیرت زدہ رہ گیا جب اس نے اپنی تمام کتابوں کو صحیح و سالم پایا۔ کتب خانے میں موجود شاگرد بھی ایک ایک ورق کو بغور دیکھ رہے تھے مگر ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہاں آگ لگنے کا واقعہ ہی پیش نہ آیا ہو۔ مولانا رومؒ اور حاضرین مجلس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اجنبی کو تلاش کیا گیا مگر دور دور تک اس کا پتہ نہیں تھا۔ وہ پُراسرار انداز میں آیا تھا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔

پھر جب حیرتیں کم ہوئیں اور اہلِ مجلس کے حواس بحال ہوئے تو شاگردوں نے مولانا رومؒ سے عرض کیا۔ ''استادِ محترم! یہ سب کچھ کیا ہے؟''

مولانا جلال الدین رومیؒ نے بڑے حسرت زدہ لہجے میں فرمایا۔ ''یہ وہ ہے جسے میں بھی نہیں جانتا اور تم بھی نہیں جانتے۔''

کچھ تذکرہ نویسوں نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن مولانا رومؒ حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے مطالعہ کر رہے تھے۔ اچانک ایک اجنبی شخص آیا اور مولانا کے قریب رکھی ہوئی کتابوں کے بارے میں پوچھنے لگا کہ یہ کیا ہے؟

مولانا رومؒ نے انتہائی بے رخی سے جواب دیا۔ ''یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے۔''

اجنبی نے مولانا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور تمام کتابیں اٹھا کر حوض میں ڈال دیں۔

مولانا رومؒ ایک غیر مہذب اجنبی کی اس حرکت کو برداشت نہ کر سکے اور سخت طیش کے عالم میں فرمانے لگے۔ ''اے جاہل شخص! تجھے خبر ہے کہ تُو نے کیسی نادر و نایاب کتابیں تباہ کر ڈالیں۔ یہ وہ قیمتی نسخے تھے جو کسی شہنشاہ کو بھی میسر نہیں ہوں گے۔''

اجنبی نے مولانا رومؒ کو شدید ضطراب میں مبتلا دیکھا تو مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں تمہاری کتابیں واپس کئے دیتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر اجنبی حوض میں اُتر گیا اور تمام کتابیں نکال کر مولانا کے حوالے کر دیں۔

مولانا رومؒ شدید حیرت کے عالم میں اپنی قیمتی کتابوں کو دیکھنے لگے۔ کسی کتاب کا ایک ورق بھی پانی میں نہیں بھیگا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' مولانا رومؒ نے اجنبی سے پوچھا۔

اجنبی نے ایک مخصوص تبسم کے ساتھ نہایت شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔ ''مولانا! یہ وہ ہے جسے آپ نہیں جانتے۔'' اتنا کہہ کر اجنبی چلا گیا اور مولانا جلال الدین رومیؒ حوض کے کنارے دم بخود بیٹھے رہے۔

جس اجنبی شخص کی کرامت نے مولانا رومؒ جیسے نابغۂ روزگار عالم کو حیران کر دیا تھا، وہ مشہور بزرگ حضرت شمس تبریزؒ تھے۔

حضرت شمس تبریزؒ کی اس ملاقات نے مولانا رومؒ کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ یہ ایسا زبردست انقلاب تھا کہ مولانا اپنی روش ہی بھول گئے۔ کتب خانہ بند کر دیا گیا اور درس و تدریس کے تمام سلسلے ختم ہو گئے۔ اب مولانا جلال الدین رومیؒ کو بس ایک ہی کام تھا کہ ہر وقت حضرت شمس تبریزؒ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی کہ پورے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مولانا کے ہزاروں عقیدت مند برملا کہا کرتے تھے۔

''قونیہ ویران ہو گیا اور اس ویرانی کا سبب وہ جاہل فقیر ہے جس نے ہم سے ہمارا عالم چھین لیا۔''

مولانا جلاالدین رومیؒ کے بعض عقیدت مند اور شاگرد جوشِ جذبات میں حد سے گزر گئے اور وہ حضرت شمس تبریزؒ کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتے

تھے۔ ’’کہاں آپ جیسا عالم فاضل اور کہاں وہ بے علم کوچہ گرد؟‘‘

مولانا رومؒ سب کچھ سنتے تھے مگر آپؒ پر کسی طنز اور کسی طعنہ زنی کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اگر کبھی کوئی عزیز یا دوست بہت زیادہ جرح کرتا تو بس اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے۔

’’تم کیا جانو کہ شمس تبریزؒ کون ہیں؟‘‘

اب ایک مخصوص کمرہ تھا، حضرت شمس تبریزؒ تھے اور مولانا رومؒ۔ باقی دنیا سے اب مولانا کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب مولانا رومؒ کو گھر والوں کا بھی ہوش نہیں رہا۔ بیوی شوہر سے اور بچے باپ سے بدظن رہنے لگے۔ آخر مولانا رومؒ کے اہلِ خانہ بھی حضرت شمس تبریزؒ کو جادوگر کہہ کر پکارنے لگے۔

’’تبریز کے سحر نے ہمارا گھر برباد کر دیا۔ خدا اسے غارت کر دے۔‘‘

قونیہ کا ایک ایک فرد حضرت شمس تبریزؒ کو برا بھلا کہہ رہا تھا مگر مولانا رومؒ اسی مردِ قلندر کی بارگاہ میں دست بستہ کھڑے تھے۔

حضرت شمس تبریزؒ کا پورا نام محمد شمس الدین تھا۔ شہر تبریز کے حوالے سے شہرتِ دوام پائی۔ حضرت شمس تبریزؒ 560 ھ میں بمقام سبزوار (عراق) میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد گرامی کا نام سیّد صلاح الدین محمد نور بخش تھا۔ حضرت شمس تبریزؒ کا سلسلۂ نسب براہِ راست حضرت امام جعفر صادقؒ سے جا ملتا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی حضرت شمس تبریزؒ کو تعلیم و تربیت کے لئے ان کے چچا عبدالہادیؒ کے سپرد کر دیا گیا۔ چچا نے بھتیجے پر بہت محنت کی۔ یہاں تک کہ تفسیر، فقہ اور حدیث کے ساتھ دیگر علوم سے بھی آراستہ کر دیا۔

جب 579 ھ میں سیّد صلاح الدین محمد نور بخشؒ دعوتِ اسلام کے لئے بدخشاں کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت شمس تبریزؒ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت ان کی عمر اُنیس سال تھی۔ بدخشاں میں ہزاروں لوگوں کو حق کی تعلیم دی۔ پھر ’’تبت کوچک‘‘ کی طرف گئے اور سینکڑوں انسانوں کو دین اسلام میں داخل کیا۔ پھر یہاں سے باپ اور بیٹے نے کشمیر کا رخ کیا۔ اس وقت یہاں کے لوگ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ حضرت سیّد صلاح الدینؒ اور حضرت شمس تبریزؒ کی کوششوں سے ہزاروں بت پرست باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ اس علاقے کی ’’چنگڑ‘‘ قوم نے انہیں بہت پریشان کیا مگر بعد میں یہ لوگ بھی جلد ہی مطیع و فرماں بردار ہو گئے۔

586 ھ میں حضرت شمس تبریزؒ والد محترم کے ہمراہ واپس اپنے وطن سبزوار تشریف لے گئے۔ یہاں حضرت شمس تبریزؒ کی شادی ہو گئی۔ آپؒ کے دو فرزند سیّد نصیر الدین محمد اور سیّد علاء الدین احمد پیدا ہوئے۔ سیّد علاء الدین احمدؒ ’’زندہ پیر‘‘ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

حالات و واقعات کے اعتبار سے حضرت شمس تبریزؒ کی شخصیت بہت زیادہ متنازع نظر آتی ہے۔ آپؒ نے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی اور تمام عمر ایک عجیب اذیت و کرب میں مبتلا رہے۔ بغداد تشریف لے گئے تو مقامی علماء کو آپؒ کے خیالات سے شدید اختلاف ہو گیا۔ بادشاہِ وقت ان علماء کے زیر اثر تھا۔ نتیجتاً حضرت شمس تبریزؒ کو شہر بدر ہونا پڑا۔ ابھی آپؒ بغداد کی حدود سے نکلے ہی تھے کہ اچانک بادشاہ کا بیٹا بیمار پڑا اور دوسرے دن مر گیا۔ بادشاہ کو خیال گزرا کہ شاید یہ الم ناک واقعہ حضرت شمس تبریزؒ سے بدسلوکی کے باعث رُونما ہوا ہے۔ مجبوراً اُس نے اپنے مشیرانِ خاص کو حضرت شمس تبریزؒ کی تلاش میں روانہ کرتے ہوئے کہا۔

’’کوئی بھی صورت ہو، انہیں بغداد واپس لاؤ۔‘‘

بادشاہ کا حکم پاتے ہی مشیرانِ خاص برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر دوڑ پڑے۔ حضرت شمس تبریزؒ ابھی بغداد کے نواح میں مقیم تھے کہ شاہی قاصدوں نے انہیں جا لیا اور پھر دست بستہ عرض کیا۔ ’’حضور! آپ بغداد واپس تشریف لے چلیں۔‘‘

شاہی کارندوں کی درخواست سن کر حضرت شمس تبریزؒ کے چہرے پر اذیت کا رنگ اُبھر آیا۔ ’’کل جس جگہ سے مجھے ذلیل کر کے نکال دیا گیا آج اسی مقام پر واپس جانے کے لئے کہہ رہے ہو؟ آخر تم لوگوں پر کیا افتاد پڑی ہے کہ مجھ خانہ بدوش کا خیال آ گیا؟‘‘

’’ہمارے بادشاہ کا یہی حکم ہے۔‘‘ شاہی کارندوں نے خوشامدانہ لہجے میں عرض کیا۔

’’میں تو بس ایک بادشاہ کا حکم مانتا ہوں۔‘‘ حضرت شمس تبریزؒ نے بے نیازانہ کہا۔ ’’باقی بادشاہوں کو میں نہیں جانتا۔‘‘

حضرت شمس تبریزؒ کے انکار سے صورتِ حال بگڑ گئی۔ شاہی کارندے ایک مردِ قلندر کے قدموں سے لپٹ گئے اور بہت دیر تک عاجزی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ آخر حضرت شمس تبریزؒ کو ان لوگوں پر رحم آ گیا۔ پھر یہ کہتے ہوئے شاہی کارندوں کے ساتھ ہو گئے۔ ’’چلو! تمہارے کہنے سے چلتا ہوں۔ مگر بغداد کے لوگ زیادہ دن تک مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے۔‘‘

جب حضرت شمس تبریزؒ شاہی محل میں پہنچے تو وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ تمام درباری سیاہ لباس پہنے ہوئے اپنے ولی عہد سلطنت کی موت کا سوگ منا رہے تھے۔ بادشاہ بڑے احترام کے ساتھ پیش آیا مگر اس کے چہرے پر غم و اندوہ کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

’’یہ سب کچھ کیا ہے؟‘‘ حضرت شمس تبریزؒ نے بادشاہ سے دریافت کیا۔ ’’پورا شہر

ماتم کدہ کیوں بنا ہوا ہے؟ کچھ دن پہلے جب میں یہاں سے گیا تھا تو بغداد کے در و دیوار کیف و نشاط سے جھوم رہے تھے مگر آج یہاں قبرستان جیسا سناٹا ہے۔"

بادشاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے حضرت شمس تبریزؒ کو ساتھ لے کر اس کمرے میں پہنچا جہاں اس کے محبوب بیٹے کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ حضرت شمس تبریزؒ نے سوالیہ نظروں سے بادشاہ کی طرف دیکھا۔

"یہ میرے جواں مرگ بیٹے کی میت ہے۔" بادشاہ نے نم ناک آنکھوں اور لرزتے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا۔ "آپ کے بغداد سے جاتے ہی یہ اچانک بیمار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے آغوشِ فنا میں چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی گستاخی کا شاخسانہ ہے جو میں نے آپ کی شان میں روا رکھی تھی۔"

حضرت شمس تبریزؒ مسکرانے لگے۔ "درویش کے ساتھ لوگ گستاخی سے پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی بھی شکایت نہیں۔"

بادشاہ بہت دیر تک معذرت طلب کرتا رہا۔

"میں نے گزشتہ باتوں کو فراموش کر دیا۔" حضرت شمس تبریزؒ نے اسی بے نیازی کے ساتھ کہا۔ "اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی دل آزاری کے سبب میرا بیٹا اس انجام تک پہنچا ہے۔" شدتِ غم سے بادشاہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"فی الواقع اگر یہی بات ہے تو آپ کے بیٹے کو سزا کیوں ملی؟ گناہ تو آپ نے کیا تھا۔" حضرت شمس تبریزؒ نے فرمایا۔

"ممکن ہے کہ قدرت نے میرے لئے یہی سزا منتخب کی ہو کہ میں تمام عمر بیٹے کی جدائی میں تڑپتا رہوں۔" بادشاہ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔

"اللہ اپنے رازوں کو خود ہی بہتر جانتا ہے۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" حضرت شمس تبریزؒ نے حاکم بغداد سے سوال کیا۔

"میری درخواست ہے کہ آپ میرے بیٹے کے حق میں دعائے خیر فرما دیں۔" بادشاہ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کی دعاؤں سے میرے بیٹے کو نئی زندگی مل جائے۔"

"ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ جو چلا گیا، سو چلا گیا۔" حضرت شمس تبریزؒ نے فرمایا۔ "پھر بھی تمہاری تالیفِ قلب کے لئے اپنے مالک کی بارگاہ میں عرض کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حضرت شمس تبریزؒ نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آپؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"اے اللہ! اگر تُو نے اس لڑکے پر میری دل آزاری کے باعث موت مسلط کر دی ہے تو میں اسے معاف کرتا ہوں۔ تُو بھی اس عاجز بندے محمد شمس الدین کی خاطر اپنے بے پناہ اور بے مثال فضل و کرم کا مظاہرہ کر اور اس بچے کو معاف فرما دے۔"

ابھی ایوانِ شاہی کے ایک کمرے میں حضرت شمس تبریزؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ شہزادے کے جسم کو جنبش ہوئی۔ پھر وہ اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

بادشاہِ بغداد کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ کبھی وہ حضرت شمس تبریزؒ کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنے محبوب بیٹے کی طرف جو وادیٔ فنا میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ یکایک شاہِ بغداد کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ یہ خوشی اور عقیدت کے آنسو تھے۔ پھر فرمانروائے بغداد حضرت شمس تبریزؒ کے قدموں میں جھک گیا۔ "یہ سب کچھ آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" حضرت شمس تبریزؒ نے شاہِ بغداد کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اس قادرِ مطلق کی کرم نوازی کا ادنیٰ مظاہرہ ہے جو اپنی ذات میں لاشریک ہے۔ بس اسی کا شکر ادا کرو اور اسی کی تسبیح بیان کرو۔"

یہ حضرت شمس تبریزؒ کی بڑی کرامت تھی مگر یہی کرامت ان کے لئے وبالِ جاں بن گئی۔ جب علمائے بغداد کو حضرت شمس تبریزؒ کی واپسی اور شہزادے کے زندہ ہونے کی خبر ملی تو وہ دوبارہ ایک نئے منصوبے کے ساتھ اس مردِ قلندر کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ کہا گیا کہ یہ شعبدہ بازی ہے اور اسلام میں شعبدہ بازی کی کوئی گنجائش نہیں۔

شاہِ بغداد نے بڑے دلائل کے ساتھ حضرت شمس تبریزؒ کا دفاع کیا۔ "اگر یہ شعبدہ بازی ہے تو پھر آپ میں سے کوئی شخص بغداد کے عوام کے سامنے ایسا کوئی مظاہرہ پیش کر دے۔ پھر میں سمجھ لوں گا کہ حضرت شمس تبریزؒ شعبدہ باز ہیں۔"

"ہم اہلِ ایمان ہیں اور ہمیں شعبدہ بازی سے کوئی نسبت نہیں۔" علمائے بغداد نے بیک زبان کہا۔ "شمس تبریزؒ نے پہلے اپنی ساحرانہ قوتوں سے شہزادے کو بے ہوش کر دیا پھر خود ہی جادو کے اثرات کو زائل کر دیا۔ نتیجتاً شہزادہ ہوش میں آ گیا اور سادہ لوح عوام سمجھنے لگے کہ ولی عہد سلطنت ایک مردِ خدا کی دعاؤں سے دوبارہ زندہ ہو گیا۔ یہ سب فریبِ نظر ہے۔ اسی کو شعبدہ بازی کہتے ہیں اور اسی کا نام جادوگری ہے۔ اگر وہ شخص ایسا ہی مستجاب الدعوات ہے تو پھر کسی قبرستان میں جا کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دے اور ان

مُردوں کو زندہ کر دے جو برسوں سے گہری نیند سو رہے ہیں۔''

عجیب کج بحثی کی فضا تھی۔ شاہِ بغداد نے حضرت شمس تبریزؒ کی بہت حمایت کی مگر علمائے بغداد یہی کہتے رہے۔ ''وہ ایک ساحر ہے اور اسلام میں ساحری حرام ہے۔'' بالآخر ایک طویل بحث کے بعد علمائے بغداد نے حضرت شمس تبریزؒ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور مطالبہ کیا کہ ان کی کھال کھنچوا کر بغداد سے باہر نکال دیا جائے۔

بغداد کے تمام اراکینِ سلطنت بھی علماء کے ہم نوا تھے۔ انجام کار بادشاہ کی مرضی کے خلاف بھرے مجمع میں حضرت شمس تبریزؒ کی کھال کھینچ لی گئی اور اس حالت میں بغداد سے نکال دیا گیا کہ پورا جسم لہولہان تھا۔ ولی عہد سلطنت شہزادہ محمد کو حضرت شمس تبریزؒ سے بہت عقیدت تھی۔ جب آپؒ شہر بدر ہوئے تو شہزادہ محمد بھی آپؒ کے ہمراہ تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے امرائے سلطنت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جس ملک میں حضرت شمس تبریزؒ جیسے صاحب کمال کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے وہ ایک لعنت کدہ ہے اور میں اس لعنت کدے میں سانس لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شہزادہ محمد، حضرت شمس تبریزؒ کے ساتھ بغداد کی حدود سے نکل گیا۔

بغداد سے نکل کر حضرت شمس تبریزؒ نے ہندوستان کا رخ کیا اور طویل مسافت طے کر کے ملتان پہنچے اور پھر اسی تاریخی شہر میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اس وقت مشہور بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتانی حیات تھے۔ جب آپؒ کو حضرت شمس تبریزؒ کی آمد کی اطلاع ملی تو شیخ نے ان کی خدمت میں دودھ کا پیالہ بھیجا۔

حضرت شمس تبریزؒ نے بڑے احترام کے ساتھ پیالہ لے لیا اور پھر اس میں گلاب کا پھول ڈال کر حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے خادم کو واپس کر دیا۔ بعض اہلِ تصوف نے اس واقعے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دودھ کا لبریز پیالہ بھیجنے سے حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کی مراد یہ تھی کہ ملتان میں اب کسی دوسرے درویش کی گنجائش نہیں۔ جواب میں حضرت شمس تبریزؒ نے دودھ کے پیالے میں گلاب کا پھول ڈال دیا اور اس سے ان کا مقصد تھا کہ وہ ملتان میں پھول بن کر رہیں گے یعنی ان کی ذات سے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

حضرت شمس تبریزؒ اپنے عہد پر قائم رہے مگر ملتان کے لوگوں نے بھی اہلِ بغداد کی طرح آپؒ کی شدید مخالفت کی۔ ایک بار یوں ہوا کہ حضرت شمس تبریزؒ کو گوشت بھوننے کے لئے آگ کی ضرورت پیش آئی۔ آپؒ نے شہزادہ محمد کو آگ لانے کے لئے بھیجا مگر پورے شہر میں کسی نے آگ نہیں دی۔ ایک سنگ دل شخص نے تو شہزادے کو اتنا مارا کہ

اس کے دلکش چہرے پر زخموں کے نشانات اُبھر آئے۔

''یہ کیا ہے؟'' حضرت شمس تبریزؒ نے شہزادے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو آگ لینے گئے تھے۔''

شہزادہ محمد نے پورا واقعہ سنایا تو حضرت شمس تبریزؒ کو جلال آ گیا۔ آپؒ نہایت غصے کی حالت میں اپنی خانقاہ سے نکلے۔ گوشت کا ٹکڑا ہاتھ میں تھا۔ پھر حضرت شمس تبریزؒ نے آسمان پر نظر کی اور سورج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''تو بھی شمس! میں بھی شمس! میرے اس گوشت کے ٹکڑے کو بھون دے۔''

اتنا کہنا تھا کہ یکایک گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا اور پھر یہ گرمی اتنی بڑھی کہ اہلِ ملتان چیخ اٹھے۔ در و دیوار جل رہے تھے اور پورا شہر آگ کی بھٹی بن کر رہ گیا تھا۔

کچھ باخبر لوگوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو حضرت شمس تبریزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ ''کیا چند نادانوں کے جرم کی سزا پورے شہر کو دے ڈالیں گے؟''

''یہ نادان نہیں، سفاک ہیں۔'' حضرت شمس تبریزؒ نے غضب ناک لہجے میں فرمایا۔ ''آگ جیسی بے قیمت چیز نہیں دے سکتے۔ میرے محبوب کے چہرے کو زخموں سے سجا دیا۔ آخر کیا جرم تھا اس کا؟ جانتے ہو اسے یہ کون ہے؟ بغداد کا شہزادہ ہے۔ میری خاطر دروازے دروازے بھیک مانگنے گیا۔ میں اس کے زخموں کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ جب تک سارے شہر کے جسم آبلوں سے نہیں بھر جائیں گے اس وقت تک مجھے قرار نہیں آئے گا۔''

''یہ آپ کے مقام سے واقف نہیں۔ خدا کے لئے انہیں معاف فرما دیجئے۔'' ملتان کے دانائے راز حضرات نے اپنے ہم وطنوں کی سفارش کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بات آپ جیسے بزرگ کے شایانِ شان بھی نہیں۔''

''خیر! جب خدا کو درمیان میں لے آئے ہو تو معاف کئے دیتا ہوں۔'' حضرت شمس تبریزؒ نے مقامی لوگوں کی جماعت سے فرمایا اور پھر سورج سے مخاطب ہوئے۔ ''اپنی حرارت کم کر دے۔ پتہ نہیں یہ لوگ روزِ حشر کی گرمی کو کیسے برداشت کریں گے؟'' آپؒ کا یہ فرمانا تھا کہ سورج کی حرارت اعتدال پر آ گئی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔ مگر عوام ملتان کی گرمی کو اسی واقعے کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

675ھ میں حضرت شمس تبریزؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپؒ کا مزار مبارک ایک

قلعہ نما فصیل کے اندر شیخ محمد جمال ملتانیؒ کے مزار سے کچھ فاصلے پر ہے۔

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ نے تحریر کیا ہے کہ حضرت شمس تبریزؒ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر چند کہ تاریخ میں فرشتہ کا ایک معتبر نام ہے مگر حضرت شمس تبریز کے بارے میں اس کی یہ روایت درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ بعد میں آنے والے مؤرخین نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا تھا کہ شمس تبریزؒ کے والد سیّد اصلاح الدینؒ اس بزرگ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو فرقہ اسماعیلیہ کا امام تھا مگر انہوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مولانا جلال الدین رومیؒ جیسے عالم و فاضل انسان بھی اس شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دیتے جو ان کے عقیدے سے مختلف عقیدہ رکھتا ہو۔ اس لئے حضرت شمس تبریزؒ کو اسماعیلی کہنا صریحاً غلط ہے۔ دراصل یہ ان لوگوں کی الزام تراشی تھی جن کا ظاہری علم حضرت شمس تبریزؒ کے روحانی کمالات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بحث سے قطع نظر حضرت شمس تبریزؒ بابا کمال جندیؒ کے مرید ہوئے لیکن عام صوفیوں کی طرح ''پیری مریدی'' اور ''بیعت و ارادت'' کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ سوداگروں کے انداز میں شہروں کی سیاحت کرتے رہتے۔ جہاں جاتے کسی سرائے میں ٹھہرتے اور پھر ایک گوشہ پکڑ کر مراقبے میں مصروف ہو جاتے۔

حضرت شمس تبریزؒ کا ذریعہ معاش مزدوری تھا۔ آپؒ ازار بند بنتے تھے اور اسی کو فروخت کر کے روزی حاصل کرتے تھے۔ ایک بار مناجات کے وقت یہ دعا مانگی۔

''الٰہی! کوئی ایسا بندۂ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا۔''

عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم چلے جاؤ۔ وہاں تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔

حضرت شمس تبریزؒ اسی وقت چل کھڑے ہوئے۔ قونیہ پہنچے تو رات کا وقت ہو چکا تھا۔ ''برنج فروشوں'' کی سرائے میں اُترے۔ صبح ہوئی تو آپؒ نے دیکھا کہ سرائے کے دروازے پر ایک بلند چبوترہ تھا۔ شہر کے اکثر امراء اور صاحبانِ ثروت تفریح کے لئے اسی چبوترے پر آ بیٹھتے تھے۔ حضرت شمس تبریزؒ بھی ایک گوشے میں بیٹھ جاتے اور خاموشی سے آنے جانے والوں کو دیکھتے رہتے۔

ایک دن مولانا جلال الدین رومیؒ اسی راستے سے گزرے تو حضرت شمس تبریزؒ چونک اُٹھے۔ مولانا کے ہزاروں شاگرد تھے جو ہاتھ باندھے اور نظریں جھکائے اپنے استاد کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی شہنشاہ کی سواری گزر رہی ہو۔

حضرت شمس تبریزؒ کے دل سے آواز آئی۔ ''یہی وہ مردِ خاص ہے جو تیری صحبت کا

متحمل ہو سکتا ہے۔''

جب مولانا جلال الدین رومیؒ چلے گئے تو حضرت شمس تبریزؒ نے کسی مقامی باشندے سے پوچھا۔ ''یہ صاحب کون ہیں جو ابھی یہاں سے گزرے ہیں۔ بڑی شان ہے ان کی۔''

''یہ مولانا جلال الدین رومیؒ ہیں۔'' بتانے والے نے بتایا۔ ''یہاں کے سب سے بڑے عالم۔ کوئی شخص ان کے علم و فضل کی ہمسری نہیں کر سکتا۔''

حضرت شمس تبریزؒ نے اسی شخص سے مولانا رومؒ کی خانقاہ کا پتہ پوچھا اور دوسرے دن مولاناؒ کے کت بخانے میں جا پہنچے۔ پھر کتابیں جلنے کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا۔

ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک دن حضرت شمس تبریزؒ نے مولانا رومؒ سے پوچھا۔

''حضرت بایزید بسطامیؒ کے ان دونوں واقعات میں کیونکر تطبیق ہو سکتی ہے، ایک طرف تو حضرت بایزیدؒ کا یہ حال تھا کہ آپؒ نے اس خیال سے زندگی بھر خربوزہ نہیں کھایا کہ پتہ نہیں، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کس طرح کھایا ہے؟ دوسری طرف اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ ''اللہ اکبر! میری شان کس قدر بڑی ہے؟'' حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام تر عظمتوں اور بزرگیوں کے باوجود فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔''

جواب میں مولانا رومؒ نے فرمایا۔ ''اگرچہ حضرت بایزید بسطامیؒ بہت پائے کے بزرگ تھے لیکن مقامِ ولایت میں وہ ایک خاص درجے پر ٹھہر گئے تھے اور اس درجے کی عظمت کے زیرِ اثر ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جایا کرتے تھے۔ اس کے برعکس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منازلِ تقرب میں برابر ایک پائے سے دوسرے پائے پر چڑھتے جاتے تھے۔ اس لئے جب بلند پائے پر پہنچتے تھے تو پہلا پایہ اس قدر پست نظر آتا تھا کہ اس سے استغفار کرتے تھے۔''

مولانا رومؒ کا جواب سن کر حضرت شمس تبریزؒ بہت خوش ہوئے۔

بغداد کے شہزادے محمد کی طرح مولانا رومؒ بھی حضرت شمس تبریزؒ کی شخصیت کے اسیر ہو گئے تھے۔ پھر یہ اسیری اس قدر بڑھی کہ مولانا رومؒ ساری دنیا سے بے نیاز ہو گئے۔ مولانا کے شاگرد اور اہلِ خانہ حضرت شمس تبریزؒ کو جادوگر کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ تمام باتیں کسی بڑے ہنگامے کا پیش خیمہ تھیں۔ حضرت شمس تبریزؒ اس صورتِ حال کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے۔ اور پھر ایک رات جب تمام لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے، حضرت شمس تبریزؒ خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل گئے۔

صبح جب مولانا رومؒ بیدار ہوئے تو اپنے پیر و مرشد کو نہ پا کر مولاناؒ کے دل پر قیامت گزر گئی۔ دیوانہ وار ہر طرف ڈھونڈتے پھرے۔ شہر کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر حضرت شمس تبریزؒ قونیہ کی حدود سے بہت دور جا چکے تھے۔ مولانا رومؒ کے شاگرد اور اہلِ خاندان حضرت شمس تبریزؒ کی رُوپوشی سے بہت خوش تھے۔ وہ لوگ برملا کہا کرتے تھے۔

"خدا کا شکر ہے کہ وہ جادوگر یہاں سے چلا گیا۔ اب مولانا اس کے طلسم سے آزاد ہو جائیں گے۔"

حضرت شمس تبریزؒ کی گمشدگی کے بارے میں صرف ایک شخص سپہ سالار نے جو مولانا رومؒ کی خدمت میں چالیس سال گزار چکے تھے، لکھا ہے کہ وہ فتنے کے خوف سے شب کی تاریکی میں کہیں چلے گئے تھے۔ اس کے برعکس تمام تذکرہ نویسوں نے یہ الم ناک حقیقت بیان کی ہے کہ جب مولانا رومؒ، حضرت شمس تبریزؒ سے ملاقات کرنے کے بعد ساری دنیا کو فراموش کر بیٹھے تھے اس دور میں مولاناؒ کے بعض انتہا پسند مریدوں نے حسد کی وجہ سے حضرت شمس تبریزؒ کو قتل کر دیا تھا۔

"اخبار الصالحین" کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت شمس تبریزؒ، مولانا رومؒ کے پاس خلوت میں بیٹھے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دے کر آپؒ کو بلایا۔ حضرت شمس تبریزؒ نے مولانا رومؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"مجھے قتل کرنے کیلئے بلاتے ہیں۔"

ابھی مولانا جلال الدین رومیؒ صورتِ حال کو سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ حضرت شمس تبریزؒ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ سات افراد آپؒ کے انتظار میں کھڑے تھے۔ جیسے ہی حضرت شمس تبریزؒ باہر تشریف لائے، ان لوگوں نے آپؒ پر حملہ کر دیا۔ قتل ہوتے وقت حضرت شمس تبریزؒ نے اس قدر زور سے نعرہ مارا کہ ساتوں آدمی بے ہوش ہو گئے۔ پیر و مرشد کی چیخ سن کر جب مولانا رومؒ خلوت کدے سے باہر آئے تو حضرت شمس تبریزؒ کی لاش موجود نہیں تھی۔ صرف خون کے چند قطرے فرش پر نظر آئے۔ حضرت شمس تبریزؒ کے قاتلوں میں مولانا رومؒ کا بیٹا علاء الدین محمد بھی تھا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا رومؒ نے زندگی بھر بیٹے کا منہ نہیں دیکھا۔ پھر کچھ دن بعد علاء الدین محمد ایک عجیب و غریب بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ بیماری کے دوران اس نے عزیزوں کے ذریعے مولانا رومؒ سے معافی طلب کی مگر مولانا نے اسے معاف نہیں کیا۔ پھر کچھ دن بعد علاء الدین محمد شدید اذیت و کرب کے عالم میں مر گیا۔ مولانا رومؒ نے اس کے جنازے تک میں شرکت نہیں کی۔ حضرت شمس تبریزؒ کے قتل کا یہ واقعہ 645ھ میں پیش آیا۔

اس سلسلے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت شمس تبریزؒ کو قتل کر کے آپؒ کی لاش کے ٹکڑے ایک کنوئیں میں ڈال دیئے گئے تھے۔ کچھ دن بعد مولانا رومؒ کے دوسرے فرزند سلطان ولد کو خواب میں بشارت ہوئی۔ حضرت شمس تبریزؒ فرما رہے تھے۔

"میرے جسم کے ٹکڑوں کو کنوئیں سے نکال کر مدرسے کے بانی امیر بدر الدین کے پہلو میں دفن کر دو۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ آپؒ قتل نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے۔ اور پھر آپؒ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

پھر وہ کون سے شمس تبریزؒ ہیں جو ملتان میں مدفون ہیں؟ بیشتر مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ وہی شمس تبریزؒ ہیں جو مولانا جلال الدین رومیؒ کے پیر و مرشد تھے۔ پھر قونیہ میں کون قتل ہوا؟ بہرحال ایسے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب دینا آسان نہیں۔ ہم نے قارئین کی معلومات کے لئے تمام روایتیں جمع کر دی ہیں۔

روایتوں کے ہزار اختلاف کے باوجود حضرت شمس تبریزؒ مولانا رومؒ سے ایک بار بچھڑے تو پھر دوبارہ نہیں ملے۔ اگرچہ دونوں بزرگوں کی یہ ملاقاتیں زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکیں لیکن جو کچھ ہونا تھا وہ چند مہینوں میں ظہور پذیر ہو گیا۔ حضرت شمس تبریزؒ کی ایک نگاہ کا یہ اثر تھا کہ مولانا رومؒ جیسے نادر روزگار عالم آخری سانس تک اس مردِ قلندر کی شخصیت کے طلسم سے آزاد نہ ہو سکے۔

مگر یہ ان کا خیال خام تھا۔ مولانا رومؒ کی بے قراریاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ راتیں پہلے بھی بے آرام گزرتی تھیں مگر اب مکمل طور پر بے خواب ہو گئیں۔ پہلے مولاناؒ کے دل میں سوز و گداز پنہاں تھا، اب آنکھوں سے بھی اس کا اظہار ہونے لگا تھا۔ شمس تبریزؒ کو یاد کر کے اس قدر گریہ و زاری کرتے کہ لوگوں کو آپؒ کی حالت پر ترس آنے لگتا۔ اسی زمانے میں مولانا رومؒ نے اس قدر دردناک اشعار کہے کہ انہیں سن کر اہلِ دل کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت شمس تبریزؒ رات کے اندھیرے میں قونیہ سے نکل کر دمشق تشریف لے گئے۔ مولانا رومؒ کو اپنے مرشد کے فراق سے ایسا صدمہ پہنچا کہ سب لوگوں سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشیں ہو گئے۔ یہاں تک کہ مریدانِ خاص کو خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر ایک مدت کے بعد حضرت شمس تبریزؒ نے دمشق سے مولاناؒ کو خط لکھا۔ اس خط نے آتشِ عشق کو بھڑکا دیا۔ مولانا رومؒ نے اس زمانے میں نہایت رقت آمیز اور پُر اثر اشعار کہے۔ جن لوگوں نے حضرت شمس تبریزؒ

کی شخصیت کو ہدفِ ملامت بنایا تھا انہیں سخت ندامت ہوئی۔ سب لوگ مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی کی درخواست کی۔

حضرت شمس تبریزؒ سے بچھڑنے کے بعد مولانا رومؒ نے ایسی شاعری کی جو عشق و سرمستی اور سوز و گداز سے لبریز تھی۔ یہ شمس تبریزؒ کی نگاہِ دلنواز ہی کا فیض تھا کہ مولاناؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "مثنوی مولانا روم" پیش کر کے عالمِ انسانیت پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ یہ شاعری کی ایسی عظیم و جلیل کتاب ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی عالمی ادب میں اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا...... اور جہاں تک مسلمانوں کی عقیدت کا تعلق ہے تو آج بھی مولاناؒ کی اس تصنیف کو پڑھنے سے پہلے بوسہ دیا جاتا ہے اور نہایت عظمت و احترام سے سروں پر رکھا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ اگر حضرت شمس تبریزؒ مولانا رومؒ سے ملاقات نہ کرتے تو شاید یہ عجوبۂ روزگار کتاب بھی دائرۂ تحریر میں نہ آتی۔ خود مولانا رومؒ نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

(مولانا روم اس وقت تک مولوی نہ ہو سکے جب تک شمس تبریزؒ کی غلامی اختیار نہ کر لی)

اس شعر سے اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت شمس تبریزؒ کیا تھے اور کم نظروں کے حسد نے کیسے برگزیدہ شخص کو مولانا رومؒ سے بچھڑ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت شمس تبریزؒ کی چند روزہ صحبتوں نے مولانا رومؒ کو قلندر بنا ڈالا تھا۔ ان ملاقاتوں سے پہلے مولاناؒ کا یہ حال تھا کہ شاہانِ وقت کے دربار سے بھی تعلق رکھتے تھے، قیمتی لباس پہنتے تھے اور جب گھر سے نکلتے تھے تو اس شان سے کہ سینکڑوں افراد پیچھے پیچھے ہوتے اور آپؒ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ آگے آگے چلتے۔ اگر کوئی اجنبی یہ منظر دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی حاکم اپنے تمام تر جلال و جبروت کے ساتھ گزر رہا ہے...... مگر جس دن سے حضرت شمس تبریزؒ کی غلامی اختیار کی تو آپؒ کی دنیا ہی بدل گئی۔

ریاضت اور مجاہدہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کسی مرید یا خادم نے مولانا رومؒ کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا یہاں تک کہ تکیہ اور بستر بھی نہیں ہوتا۔ اگر نیند غالب آ جاتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ اکثر روزہ رکھتے تھے۔ آج کوئی شخص مشکل سے اس بات پر یقین کرے گا کہ مولانا رومؒ پانی سے افطار کر لیا کرتے تھے اور مسلسل دس دس، بیس بیس

دن تک کچھ نہیں کھاتے تھے۔ اذان ہوتی تو فوراً قبلے کی طرف مُڑ جاتے اور چہرۂ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔

نماز میں اتنے مستغرق ہوتے کہ گرد و پیش کی خبر نہ رہتی۔ خادموں نے بارہا اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ عشاء کے بعد نماز کی نیت باندھی تو دو رکعتوں میں صبح ہو گئی۔ ایک بار جاڑوں کا موسم تھا۔ مولانا رومؒ نماز کے دوران رونے لگے اور یہاں تک روئے کہ داڑھی اور سینہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ خادم سپہ سالار کا بیان ہے کہ سردی کی شدت کے باعث آنسو رخساروں پر جمنے لگے تھے مگر مولانا کی محویت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آپؒ کا مزاج انتہائی قناعت پسندانہ تھا۔ سلاطین و امراء جس قدر تحائف بھیجتے، مولانا رومؒ اپنے مریدانِ خاص صلاح الدین زرکوبؒ یا حسام الدین چلپیؒ کے پاس یہ ہدایت دے کر بھیج دیتے کہ انہیں فوری طور پر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ گھر میں بہت زیادہ تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحب زاد سلطان ولد اصرار کرتے تو حسبِ ضرورت تھوڑی بہت رقم رکھ لیتے۔ جس دن گھر میں کھانے کا سامان نہ ہوتا اس روز مولانا رومؒ بہت خوش ہوتے اور بڑے والہانہ انداز میں فرماتے۔

"آج ہمارے گھر سے درویشی کی بُو آتی ہے۔"

مولانا رومؒ کی سخاوت و فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی مانگنے والا سوال کرتا اور مولانا کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو اپنی عبا یا پیرہن اُتار کر دے دیتے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

مولانا جلال الدین رومیؒ کی رقیق القلبی اور شدتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ کسی شخص کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس اپنی ذات پر آفات و مصائب کے پہاڑ بھی ٹوٹ پڑتے تو حرفِ شکایت زبان تک نہ لاتے۔ ایک بار شدید سردی پڑ رہی تھی۔ مولانا رومؒ کسی کام سے اپنے خلیفہ حسام الدین چلپیؒ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو حسام الدینؒ کے گھر کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ اگر مولاناؒ چاہتے تو نصف شب کے بعد بھی اس مکان پر دستک دے کر اہلِ خانہ کو بیدار کر سکتے تھے اور آپؒ کا یہ عمل حسام الدین چلپیؒ کے لئے باعثِ شرف ہوتا...... لیکن مولانا رومؒ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور نہ کسی کو آواز دی۔ رات بھر کھلے آسمان کے نیچے کھڑے رہے اور برف گر گر کر سر پر جمتی رہی۔ صبح جب حسام الدین چلپیؒ کے ایک خادم نے دروازہ کھولا اور مولاناؒ کو اس حالت میں کھڑے دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ بدحواسی کے عالم میں مکان کے اندر گیا اور حسام الدینؒ کو خبر دی۔ مولانا

رومؒ کے خلیفہ ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے آئے اور پیر و مرشد کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگے۔ مولاناؒ نے انہیں اٹھا کر گلے سے لگایا اور بہت دیر تک تسلی دیتے رہے۔ جب حسام الدینؒ کے آنسو رک گئے تو فرمایا۔

''میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہاری نیند میں خلل پڑے اور میری وجہ سے دوسرے مکینوں کو زحمت ہو۔''

یہ واقعہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ حسام الدین چلپیؒ آخری سانس تک اس رات کو فراموش نہ کر سکے۔ اکثر اپنے مریدوں کو درس دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔

''پیر و مرشد کا یہ عمل اس لئے تھا کہ ہم درویشی کا مفہوم سمجھ سکیں اور اپنی آنکھوں سے خدمتِ خلق کی زندہ تصویر دیکھ سکیں۔''

شہر قونیہ میں گرم پانی کا ایک چشمہ تھا۔ مولانا رومؒ کبھی کبھی وہاں غسل کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار مولاناؒ نے اس چشمے پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کچھ مریدوں اور خادموں نے ایک دن پہلے وہاں جا کر آپؒ کے غسل کے لئے مخصوص جگہ کا انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب مولانا رومؒ وہاں تشریف لے گئے تو آپؒ کی آمد سے چند لمحے قبل کچھ جذامی (کوڑھی) اسی مقام پر نہانے لگے۔ خادموں نے خوف ناک مرض میں مبتلا انسانوں کو ڈانٹ کر اس جگہ سے ہٹانا چاہا تو مولانا رومؒ نے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ جب وہ جذامی نہا کر چلے گئے تو آپؒ نے اسی جگہ کا پانی لے کر غسل کیا اور پھر اپنے خادم سے فرمایا۔

''احتیاط اچھی چیز ہے مگر ایسے بیماروں سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ لوگ بھی کل تک تمہاری طرح خوبصورت جسموں کے مالک تھے۔''

ایک بار محفلِ سماع آراستہ تھی۔ مولانا رومؒ نہایت سکون سے عارفانہ کلام سن رہے تھے۔ مگر دوسرے لوگوں کا یہ حال تھا کہ کوئی فرش پر تڑپ رہا تھا اور کوئی اپنا گریبان چاک کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک شخص نے سماع کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کر لیا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ بے خودی حد سے بڑھی تو وہ کسی بسمل کی طرح لوٹنے لگا۔ تڑپتے تڑپتے اس پر ایک شدید کیفیت طاری ہوتی کہ وہ مولاناؒ سے آ کر ٹکرا جاتا اور لوگ اسے پکڑ کر دور کر دیتے۔ کچھ دیر تک تو حاضرین نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا لیکن جب اس شخص سے کئی مرتبہ یہی حرکت سرزد ہوئی تو مولاناؒ کے خادموں نے اسے پکڑا اور محفل میں دور

لے جا کر بٹھا دیا۔ مولاناؒ کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ آپؒ نے اپنے خدمت گاروں سے تلخ لہجے میں فرمایا۔

''شراب اُس نے پی ہے اور مستی تم کر رہے ہو؟''

ایک بار مولانا رومؒ کی شریکِ حیات نے اپنی ملازمہ کو سخت سزا دی۔ اتفاقاً مولاناؒ بھی اسی وقت تشریف لے آئے۔ بیوی کی یہ حرکت دیکھ کر بہت ناراض ہوئے اور غم زدہ لہجے میں فرمانے لگے۔ ''تم نے خدا کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔ یہ اسی کی ذات پاک ہے جو غلاموں کو آقا اور آقاؤں کو غلام بنا دیتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس وقت کا تصور کرو جب تم کنیز ہوتیں اور یہ عورت مالکہ کی حیثیت رکھتی، پھر تمہارا کیا حال ہوتا؟'' مولاناؒ کی یہ اثر انگیز گفتگو سن کر شریکِ حیات نے اس ملازمہ کو آزاد کر دیا اور پھر جب تک زندہ رہیں، خادماؤں کو اپنے جیسا کھلاتیں اور پہناتیں یہاں تک کہ ہر معاملے میں محبت سے پیش آتیں۔

مولانا رومؒ کا یہ سلوک انسانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ آپؒ تو اس بارش کی طرح تھے جو سبزہ و گل کے ساتھ پتھر کی چٹانوں پر بھی برستی ہے۔ ایک بار امیرِ شہر معین الدین پروانہ کے یہاں محفلِ سماع جاری تھی۔ کسی معزز خاتون نے شرکائے مجلس کی تواضع کے لئے مٹھائی کے دو بڑے طباق بھیجے۔ بیشتر حاضرین کلامِ معرفت میں کھوئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک کتا محفل میں گھس آیا اور اس نے آتے ہی طباق میں منہ ڈال دیا۔ اہلِ محفل میں سے کسی کی نظر پڑی تو اس نے بلند آواز میں کتے کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا۔ مولانا رومؒ جو بہت دیر سے آنکھیں بند کئے سماع کی کیفیت میں گم تھے، چیخ سن کر چونک پڑے اور جب یہ منظر دیکھا تو اس شخص کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا جو کتے کو بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتے نے گھبرا کر شیرینی کھانی شروع کر دی اور پھر کچھ مٹھائی کے دانے منہ میں دبا کر محفل سے چلا گیا۔ کتے کے جانے کے بعد مولاناؒ نے فرمایا۔

''اس کی بھوک تم لوگوں کے مقابلے میں تیز تھی اس لئے مٹھائی پر بھی اسی کا حق زیادہ تھا۔''

ایک بار مولاناؒ اپنے مریدوں کے ہمراہ ایک تنگ گلی سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے وہاں ایک کتا اس طرح سو رہا تھا کہ راستہ بند ہو گیا تھا۔ مولانا چلتے چلتے رُک گئے۔ اچانک ایک شخص جو مولانا رومؒ کو جانتا تھا، گلی کی دوسری جانب سے آ رہا تھا۔ اس نے مولاناؒ کو کھڑا دیکھ کر کتے کو پتھر مارا، وہ چیختا ہوا بھاگ گیا۔ راستہ تو صاف ہو گیا لیکن

مولاناؒ کے چہرے پر دلی تکلیف کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ جب وہ شخص قریب آیا تو آپؒ نے اس سے فرمایا۔

”اے بندۂ خدا! تُو نے ایک جانور کی دل آزاری کر کے کیا پایا؟ میں کچھ دیر اس کے جاگنے کا انتظار کر لیتا۔“

مولانا رومؒ کے مسلک میں دل آزاری گناہِ عظیم تھی۔ اگر کوئی چیونٹی بھی آپؒ کے پیروں کے نیچے آ کر کچل جاتی تو مولاناؒ کو بہت دُکھ ہوتا۔ اکثر اوقات لوگوں کا دل رکھنے کے لئے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتے۔ ایک مرتبہ مولانا رومؒ بازار سے گزر رہے تھے۔ لوگوں نے آپؒ کو آتا دیکھا تو اپنی اپنی دکانوں پر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جب کچھ لڑکوں کی آپؒ پر نظر پڑی تو وہ بھاگتے ہوئے آئے اور مولاناؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لگے۔ مولاناؒ بچوں کو خوش کرنے کے لئے جواباً ان کے ہاتھ چوم لیتے۔ ایک لڑکا کسی کام میں مشغول تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

”مولانا! ابھی جائیے گا نہیں۔ میں ذرا کام سے فارغ ہو جاؤں۔“

مولاناؒ نے اس کی آواز سنی اور مسکرانے لگے۔ پھر آپؒ بہت دیر تک اس لڑکے کے انتظار میں کھڑے رہے۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر آیا تو اس نے مولاناؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تب آپ تشریف لے گئے۔

اسی طرح ایک دن بھرے بازار میں دو آدمی لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو فحش گالیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے کہہ رہا تھا۔ ”او شیطان! اگر تُو ایک کہے گا تو دس سنے گا......“

مولانا رومؒ اس طرف سے گزر رہے تھے۔ آپؒ اس شخص کے قریب گئے اور فرمایا۔

”بھائی! تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھے کہہ ڈالو۔ اگر تم ہزار کہو گے تو جواب میں ایک بھی نہ سنو گے۔“ مولانا کے حُسنِ کلام نے دونوں کو شرمندہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ باہمی رنجش کو ختم کر کے آپس میں دوست ہو گئے۔

یہ تھے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ جو نصف صدی تک بے شمار بندگانِ خدا کا روحانی علاج کرتے رہے۔ مگر یہ قدرت کا ایک عجیب نظام ہے کہ وقتِ معلوم پر بیماروں کی طرح مسیحا کو بھی دنیا سے رخصت ہونا پڑتا ہے......اور اب وہی سنگین وقت نزدیک آ پہنچا تھا۔ یہ 670ھ کا واقعہ ہے۔ ایک دن قونیہ میں زبردست زلزلہ آیا۔ لوگ خوف و دہشت سے چیخنے لگے۔ پھر مسلسل چار دن تک زلزلے کے شدید جھٹکے محسوس کئے جاتے رہے۔ شہر میں ایک قیامت سی برپا تھی۔ قونیہ کے کسی باشندے کو بھی اپنی زندگی کا بھروسہ

نہیں تھا کہ کب زمین میں شگاف پڑے اور وہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ ملک عدم روانہ ہو جائے۔

اس مسلسل اذیت ناک صورتِ حال سے گھبرا کر اہلِ شہر مولاناؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور آپؒ سے دعا کی درخواست کرنے لگے۔

مولانا رومؒ نے حسبِ عادت دلنواز تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ”زمین بھوکی ہے۔ لقمۂ تر چاہتی ہے۔ انشاء اللہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گی۔“ پھر لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی شخص ہراساں نہ ہو۔ جس پر گزرنا ہے، گزر جائے گی۔“

انسانی ہجوم مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو چلا گیا۔ مولاناؒ کے اس ارشاد کے بعد ہی زلزلہ تھم گیا تھا۔ شہر قونیہ کی گم شدہ رونق لوٹ آئی تھی......مگر دوسرے دن ایک خبر نے لوگوں سے یہ ساری خوشیاں چھین لیں۔ مولانا رومؒ اچانک شدید بیماری کا شکار ہو گئے تھے۔ پورا شہر عیادت کے لئے اُمڈ آیا۔ بہترین طبیبوں نے علاج کیا لیکن مرض لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ مریدوں اور خادموں نے رو رو کر کہا۔

”آپ کی دعاؤں سے بے شمار مریضوں نے صحت پائی ہے آج آپ ہماری خاطر اپنی صحت کے لئے دعا فرما دیجئے۔“

مولاناؒ نے عقیدت مندوں کی گفتگو سن کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ حاضرین سمجھ گئے کہ وقت قریب آ پہنچا ہے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن غروب آفتاب سے ذرا پہلے مولانا رومؒ اپنے خدا کی وحدانیت اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر گواہی دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

قونیہ میں گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہزاروں انسانوں نے شدتِ غم میں اپنے گریبان پھاڑ ڈالے۔ جنازہ اٹھا تو انسانوں کا ایک سیلِ رواں تھا جو اپنے روحانی پیشوا کو آہوں اور اشکوں کی آخری نذر پیش کرتا ہوا قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ بادشاہِ وقت بھی جنازے میں شریک تھا۔ میت کے آگے سینکڑوں عیسائی اور یہودی بھی انجیل اور توریت مقدس کی آیات پڑھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان غیر مسلموں کی آنکھیں اشک بار تھیں اور ہونٹوں پر جانگداز نوحے تھے۔

بادشاہ نے ان عیسائیوں اور یہودیوں کی یہ حالتِ زار دیکھ کر پوچھا۔ ”تمہیں مولانا سے کیا نسبت تھی؟“

جواب میں عیسائی اور یہودی علماء نے کہا۔ ”یہ تمہاری طرح ہمارا بھی محبوب ہے۔“

مولانا رومؒ کی عظمت کی یہ ایسی روشن دلیل تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ انہیں زیرِ زمین

سوئے ہوئے صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زندہ ہیں......

جب ریڈیو پاکستان کے مستقل پروگرام میں کوئی خوش الحان قاری مثنوی مولانا رومؒ کے اشعار پڑھتا ہے تو اہلِ دل یہی سمجھتے ہیں کہ مولانا ہمارے درمیان موجود ہیں۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ ذہنی اور روحانی اعتبار سے آخری سانس تک مولاناؒ کے زیرِ اثر رہے۔ یہاں تک کہ علامہ نے اس مردِ جلیل کو ''پیر روم'' کہہ کر پکارا اور ہمیشہ اس روحانی شاگردی پر نازاں رہے۔

صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ایک کلیم سر بکف

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش 470ھ
تاریخ وفات 561ھ
مزار مبارک .... بغداد شریف

وطن جیلان (ایران)......نام سیّد محی الدین......والد محترم سیّد ابو صالحؒ ......مادر گرامی اُم الخیر فاطمہؒ......نجیب الطرفین سیّد ......علومِ ظاہری کے قافلۂ سالار......قصرِ معرفت کے روشن ترین مینار......سکون جاں، قرار دلِ ناصبور......اولیائے کرام میں سب سے زیادہ محبوب و مشہور......مرکزِ احترام و ادب اور غوث اعظم لقب تھا۔

آپؒ کے کلام کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ حاضرین جوشِ جذبات میں گریبان چاک کر دیتے تھے اور مجلس وعظ سے بیک وقت کئی جنازے اُٹھتے تھے۔

نوجوان یادِ الٰہی میں غرق ہو چکا تھا۔ ہر شے سے آوازِ دوست آ رہی تھی۔ اب عشق کا وہ مرحلہ آ گیا تھا جہاں دنیا کے تمام مادی رشتے توڑ دیئے جاتے ہیں اور سجدہ گاہِ دل کو بتوں سے خالی کر دیا جاتا ہے۔ نوجوان بھی ذہنی یکسوئی اور سکونِ دل کی خاطر دنیا سے کنارہ کش ہو کر دریا کے کنارے آ پڑا تھا۔ یہاں حرص و ہوس کے ہنگامے نہیں تھے۔ یہاں آزاد ہوائیں نوجوان کو قلندرانہ پیغام دے رہی تھیں کہ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی۔

دریا کا بہتا ہوا صاف و شفاف پانی دل و دماغ کو زندگی کی آلائشوں سے پاک رکھنے کے لئے نغمۂ ازلی سنا رہا تھا۔ کئی دن جذب کے اسی عالم میں گزر گئے۔ نوجوان دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی منزلیں طے کرتا رہا۔ بالآخر روح کا سفر جاری رہا مگر جسم تھک گیا۔ نوجوان نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

نوجوان کو شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں۔ قرب و جوار میں انسانی آبادی کے آثار تک ناپید تھے۔

''سرمستیٔ عشق اسے کہاں لے آئی؟''

نوجوان نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر آسمان کی جانب نگاہ کی ایک صابر و شاکر بندے کی طرح۔ پھر اچانک اس کی نظر دریا میں بہتے ہوئے سیب پر پڑی۔ رزاقِ عالم کی رزاقی پر اُس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ وہ تیزی سے جھکا اور اس نے سیب کو پانی سے نکال کر کھا لیا پھر باآوازِ بلند خالق کائنات کا شکریہ ادا کیا۔

سیب کھانے کے بعد بھوک سے کسی حد تک نجات مل گئی اور نوجوان اس حُسنِ اتفاق کو دستِ غیب کی کارفرمائی سمجھ کر مطمئن ہو گیا...... مگر کچھ دیر بعد ہی یکایک اس کے ذہن میں ایک اندیشے نے سر اُبھارا۔

''یہ سیب کسی کی ملکیت تو نہیں تھا؟''

اس خیال کے آتے ہی نوجوان مضطرب ہو گیا اور اس کے پُرنور چہرے پر وحشت سی برسنے لگی جیسے اسے کسی نے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔

''کیا تُو نے سیب کے مالک سے اسے کھانے کی اجازت مانگی تھی؟'' کسی نے پکار کر کہا۔

نوجوان نے گھبرا کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی...... مگر وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

نوجوان ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ چند لمحوں بعد اسے وہی آواز پھر سنائی دی۔ دیکھتے

ہی دیکھتے ذہنی کشمکش وحشت میں تبدیل ہو گئی۔ نوجوان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی آوازیں ہیں اور اسے پکارنے والا کون ہے؟ آخر بہت دیر بعد اس پر یہ راز فاش ہوا کہ یہ آوازیں کسی غیر کی نہیں، خود اسے اس کا ضمیر پکار رہا ہے۔ پھر یہ خلش اس سے برداشت نہ ہو سکی اور وہ بے اختیار دریا کی اس سمت روانہ ہو گیا جدھر سے سیب بہہ کر آیا تھا۔

نوجوان تیز رفتاری کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے چلتا رہا اور قدم قدم پر دعا مانگتا رہا کہ سیب کے مالک سے ملاقات ہو جائے اور وہ اس سے اس بددیانتی کی معافی مانگ سکے۔ کافی طویل سفر تھا۔ کئی وقت کے فاصلوں سے نیم جاں مسافر تھکتا جا رہا تھا کہ اسے سیبوں کا ایک باغ دکھائی دیا۔ نوجوان کو اپنے نڈھال جسم میں تازگی کی ایک لہر سی محسوس ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ سیب کے کچھ درخت پانی پر جھکے ہوئے تھے۔ نوجوان کو یقین آ گیا کہ جس سیب نے کچھ دیر کے لئے اس کے شکم کی آگ کو سرد کیا تھا، اس کا تعلق اسی باغ سے تھا۔

نوجوان نے باغ میں کام کرنے والے مزدوروں سے پوچھا۔ ''اس باغ کے مالک کون ہیں؟ میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک مزدور نے نوجوان کو ٹھہر کر انتظار کرنے کے لئے کہا اور خود باغ کے ایک گوشے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد باغ کا مالک نظر آیا جو ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔

''کیسے آئے ہو نوجوان؟'' بوڑھے شخص کا لہجہ نہایت شگفتہ تھا۔ ''مجھ سے کوئی کام ہے؟''

نوجوان باغ کے مالک کی بزرگی کو دیکھتے ہوئے احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ ''میں دریا کے کنارے بیٹھا تھا کہ ایک سیب پانی میں بہتا نظر آیا۔ مجھے اس وقت شدت کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ نتیجتاً میں نے سیب اٹھا کر کھا لیا مگر اب میں اپنے ضمیر پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔''

باغ کے مالک نے بڑی حیرت کے ساتھ نوجوان کی گفتگو سنی، کچھ دیر تک غور کرتا رہا پھر نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں اپاہج نہیں ہوں ورنہ آپ سے اپنی اس غلطی کی معافی مانگ لیتا۔'' نوجوان نے مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا۔

بوڑھا استفہامیہ نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔ ''میں

تمہاری اس بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت سے اپنا مقصد بیان کرو۔"

"میرا مطلب یہ ہے بزرگ! کہ جب انسان کے دست و پا صحیح و سلامت ہوں تو اسے اپنے جرم کی سزا برداشت کرنی چاہئے۔" نوجوان نے ٹھہر ٹھہر کے مدھم آواز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھ میں ایک سیب کی قیمت ادا کرنے کی صلاحیت ہے مگر چونکہ میں نے نادانستگی میں ایک جرم کیا ہے، اس لئے اب سیب کی قیمت بازار کے مطابق نہیں ہوگی بلکہ جو کچھ آپ طے کریں گے وہی قیمت دل سے تسلیم ہوگی اور میں بہ رضا و رغبت اسے ادا کروں گا۔ اس کے بعد خدا کے یہاں میرے ذمے آپ کا کوئی حساب باقی نہیں رہے گا۔"

باغ کے مالک نے سر سے پاؤں تک دوبارہ نوجوان کی ظاہری شخصیت کا جائزہ لیا پھر انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

"نوجوان! میرا تمہارا حساب برابر ہونے کی دو شرطیں ہیں۔"

نوجوان نے حیرت سے باغ کے مالک کی طرف دیکھا۔ ایک معمولی چیز کی قیمت کی ادائیگی کے لئے پیشگی شرائط؟ اس نے سوچا مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔

"پہلی شرط یہ ہے کہ تم ایک ماہ تک مسلسل میرے باغ کے درختوں کو پانی دو گے۔"

باغ کے مالک نے اپنی شرائط کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جب تم میری مرضی کے مطابق اس کام کو تکمیل تک پہنچا دو گے تو پھر میں اپنی دوسری شرط بیان کروں گا۔ اگر ان میں سے ایک بھی شرط پوری نہ ہوئی تو میدانِ حشر تک تم میرے قرض دار رہو گے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ خدا نے چاہا تو میں بحسن و خوبی آپ کی یہ شرائط پوری کر دوں گا۔" نوجوان نے کسی تامل کے بغیر جواب دیا۔

باغ کے مالک نے ایک بار پھر حیرت بھری نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ ایک ماہ کی شدید محنت و مشقت ایک سیب کی قیمت کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا تھا مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ بہرحال آپ کو راضی کرنا ہے۔ اگر آپ راضی نہیں ہوں گے تو میرے جسم کا یہ داغ کس طرح مٹے گا؟"

باغ کے مالک پر کچھ دیر تک حیرت و سکوت کی کیفیت طاری رہی۔ پھر نوجوان کو مخاطب کر کے بولا۔ "اب تم اپنا کام شروع کر دو۔ ایک ماہ بعد ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر بوڑھا شخص بڑے بے نیازانہ انداز میں اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔

الغرض شدید محنت کے بعد جب نوجوان نے باغ کے مالک کی اس شرط کو تکمیل تک پہنچایا تو وہ جہاندیدہ شخص ذمے داری کے اس احساس پر حیران رہ گیا۔ نوجوان کی پیشانی پسینے سے تر تھی مگر اس کے ساتھ ہی سجدے کا وہ نشان بھی جھلک رہا تھا جو اس بات کی گواہی تھی کہ نوجوان نے اپنے ماہ و سال کس طرح گزارے ہیں؟ بوڑھے کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی مگر اس نے اپنی دلی کیفیات کا اظہار نہیں کیا۔

"اب آپ مجھے اپنی دوسری شرط بتائیں۔" نوجوان کے لہجے میں بیزاری نہیں، بے قراری تھی۔ وہ جلد از جلد باغ کے مالک کا قرض ادا کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے اپنی ریاضت میں ذہنی یکسوئی اور قلبی سکون حاصل ہو سکے۔

"دوسری شرط یہ ہے کہ تمہیں میری لڑکی سے شادی کرنی ہوگی۔" باغ کے مالک نے انتہائی سرد لہجے میں نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نوجوان بوڑھے شخص کی دوسری شرط سن کر حیران رہ گیا۔ "آپ مجھے جانتے تک نہیں کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میرا نسب نامہ کیا ہے؟ کس کردار کا مالک ہوں اور میرا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ان تمام باتوں کو جانے بغیر آپ نے اس قدر اہم فیصلہ کس طرح کر لیا؟"

ایک بار پھر نوجوان کی سوچ اور گفتگو نے باغ کے مالک کو متاثر کیا مگر وہ اپنی شرط پر قائم رہا۔ "یہ تمہاری ذمے داری نہیں۔"

"بہرحال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔" نوجوان نے انتہائی پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"مگر شادی سے پہلے میں تمہیں اپنی بیٹی کے عیب بھی بتا دینا چاہتا ہوں۔" باغ کا مالک بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "میری لڑکی پیدائشی بدصورت ہے جسے گردشِ تقدیر نے اپاہج اور اندھا بھی بنا دیا ہے۔" یہ کہہ کر بوڑھا شخص نوجوان کے چہرے پر اپنی دوسری شرط کا ردِعمل تلاش کرنے لگا۔

نوجوان نے فوری طور پر بوڑھے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس عجیب و غریب شرط پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ "اے ربِ عزیز و جلیل! اپنے اس حقیر ناتواں بندے کی دستگیری فرما۔"

پھر وہ باغ کے مالک سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری غلطی اسی وقت معاف ہو سکتی ہے، جب میں آنکھوں کی روشنی سے محروم، ایک بدصورت اپاہج لڑکی سے شادی کر لوں؟"

سوال یقیناً بہت پیچیدہ تھا جس کا باغ کے مالک کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ مگر صورتِ حال اس قدر اُلجھ گئی تھی کہ اب بوڑھے شخص کا اپنی بات پر قائم رہنا ضروری ہوگیا تھا۔ ''ممکن ہے، دنیاوی قانون کے اعتبار سے تمہیں میری یہ شرط بہت کڑی اور غیر مناسب معلوم ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اسے جبر سمجھو۔ مگر میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جب تک میری دوسری شرط پوری نہیں ہو جاتی، اس وقت تک میں تمہیں اپنا مجرم سمجھتا رہوں گا۔''

نوجوان نے بوڑھے کی اس وضاحت کے بعد پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ بس اس نے پُرعزم انداز میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے ربِ ذوالجلال! آزمائش کے اس راستے میں میرے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو استقامت دے۔ میں صرف تیری رضا چاہتا ہوں۔ تُو مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر!''

آسمان سے نوجوان کی دعا کا کیا جواب آیا؟ یہ انسان کی ظاہری آنکھ نہ دیکھ سکی۔ مگر باغ کے مالک نے اتنا ضرور دیکھا کہ ان دعائیہ کلمات کی ادائیگی کے بعد نوجوان کا چہرہ پُرسکون ہوگیا جیسے تائیدِ غیبی کے سبب اس کے نفس میں یہ بوجھ اٹھانے کی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے بعد نوجوان نے باغ کے مالک سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ایک باپ کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہوسکتی تھی کہ اس کی اپاہج، نابینا اور بدصورت بیٹی کو ایک خوبصورت نوجوان شوہر مل جائے۔ نتیجتاً باغ کے مالک نے شادی میں بہت عجلت کی اور دوسرے دن ہی تمام رسمیں ادا کر دی گئیں۔ نکاح کے بعد بوڑھے کے چہرے سے بے پناہ مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ نوجوان کے چہرے پر بھی خوشی کی ایک ایسی جھلک نمایاں تھی جسے پہلی ہی نظر میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ دونوں کے چہروں پر اپنے اپنے فرض کی ادائیگی کا نور تھا۔ بوڑھا یوں مطمئن تھا کہ اس کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو چکا تھا۔ اور نوجوان اس لئے مسرور تھا کہ اس نے بحسن وخوبی اپنے ایک گناہ کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔
اور جب اس نے پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھا تو اس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا جیسے کوئی اور لڑکی اس کی خلوت گاہ میں موجود ہے۔ باغ کے مالک نے اپنی بیٹی کا جو حلیہ بیان کیا تھا، حجلۂ عروسی میں موجود لڑکی اس سے یکسر مختلف تھی۔ روشن آنکھیں، دست و پا سالم اور پُرنور چہرہ۔ لڑکی کے نقش و نگار پر ملکوتی حُسن کا گمان ہوتا تھا۔ نوجوان انتہائی سراسیمگی کے عالم میں باغ کے مالک اور اپنے خسر کو ڈھونڈتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔

''بزرگ! شاید اہلِ خانہ سے غلطی ہوگئی۔'' نوجوان بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجھے کسی نئی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے۔''

''کیسی غلطی اور کیسی آزمائش؟'' باغ کے مالک نے مسکراتے ہوئے اپنے داماد سے پوچھا جو سر سے پاؤں تک تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔

''آپ نے اپنی دوسری شرط میں لڑکی کا جو ظاہری حلیہ بیان کیا تھا، میری بیوی اس کے مطابق نہیں ہے۔'' نوجوان نے اپنی حیرت و پریشانی کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا۔

باغ کا بوڑھا مالک نوجوان شدتِ اضطراب پر مسکرایا اور ایک شفیق باپ کی طرح بولا۔ ''اے میرے نیک بچے! وہ تیری ہی بیوی ہے۔ خالقِ کائنات نے تجھے اس سخت آزمائش میں ثابت قدم رکھا۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کو ایسے ہی انعامات سے نوازتا ہے۔''

باغ کے مالک کی گفتگو میں ایک عجیب رمز تھا۔ نوجوان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ آج وہ ایک بوڑھے تاجر کی شخصیت کا بالکل نیا انداز دیکھ رہا تھا۔

''مگر آپ نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا؟ میں یہ راز جاننے کے لئے سخت مضطرب ہوں۔'' نوجوان کی حیرت و بے قراری کا وہی عالم تھا۔

''فرزند! میں نے تم سے ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔ اپنی بیٹی کے بارے میں جو کچھ کہا وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔'' باغ کے مالک کے ہونٹوں پر ایک مطمئن اور آسودہ مسکراہٹ تھی۔

''میں نے کہا تھا کہ میری بیٹی بدصورت ہے، تم عنقریب دیکھ لو گے کہ تمہاری بیوی کے چہرے پر دنیاداری کا غازہ نہیں۔ ایسی لڑکیاں اس معاشرے میں بدصورت ہی کہلاتی ہیں جو اپنی شخصیت کو دنیا کے رنگوں اور لباسوں سے آراستہ نہیں کرسکتیں۔ میں نے کہا تھا کہ میری بیٹی اندھی بھی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اسلامی طرزِ معاشرت کے مطابق اس کی پرورش کی ہے۔ وہ اب تک کسی نامحرم کے سامنے نہیں آئی اور آئندہ بھی نامحرم کے لئے اس کی آنکھیں بے نور ہی رہیں گی۔ وہ اپاہج یوں ہے کہ اس کے قدم آج تک کفر و گناہ کے کوچے تک نہیں گئے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ میں نے کیا غلط کہا تھا؟''

اپنے خسر کی بات سن کر نوجوان حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا جہاں ایک پاکباز دوشیزہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔

❀ ❀ ❀

باغ کے یہ مالک مشہور صوفی بزرگ حضرت سیّد عبداللہ صومعیؒ تھے۔ ان کا سلسلۂ

نسب تیرھویں پشت میں سیّدنا حضرت امام حسینؓ سے مل جاتا ہے۔ حضرت سیّد عبداللہؒ بڑے زاہد اور پرہیزگار انسان تھے۔ ممنوعہ ایام کے علاوہ روزہ رکھتے اور ساری رات عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ حضرت سیّد عبداللہ صومعیؒ کی ہزاروں کرامات مشہور ہیں۔

شیخ محمد قزوینیؒ کا بیان ہے کہ ایک بار ان کے کچھ دوست اپنا مال لے کر ایک تجارتی قافلے کے ساتھ سمرقند کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ جب ایک صحرا سے گزر رہے تھے تو اچانک سینکڑوں مسلح سوار نمودار ہوئے اور انہوں نے تجارتی قافلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ تاجروں نے گھبرا کر حضرت عبداللہ صومعیؒ کو آواز دی۔

''سیّدی! یہ رہزن و قزاق ہمارے سروں پر آ پہنچے۔ دعا فرمائیے کہ خدا ہمیں ان کے شر سے محفوظ رکھے!''

ابھی صحرا میں ان آوازوں کی گونج باقی تھی کہ دیکھنے والوں نے دیکھا۔ حضرت سیّد عبداللہ صومعیؒ ان کے درمیان کھڑے مسلح سواروں کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

''ہمارا پروردگار پاک اور بے عیب ہے۔ اے سوارو! ہم سے دور ہو جاؤ!''

حضرت سیّد عبداللہؒ کا اتنا فرمانا تھا کہ یکایک تمام گھوڑے بھڑک اُٹھے اور پھر اپنے سواروں کو لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سواروں نے بار بار لگامیں کھینچیں مگر گھوڑے بھاگتے ہی رہے یہاں تک کہ وہ دُور دراز کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔

پھر جب یہ تاجر حضرات کامیاب سفر کے بعد جیلان واپس آئے اور انہوں نے اپنے مقامی دوستوں کو یہ واقعہ سنا تو سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور بے اختیار پکار اٹھے۔

''واللہ! شیخ تو یہیں موجود تھے اور ایک لمحے کے لئے بھی جیلان کی حدود سے باہر نہیں گئے۔''

حضرت سیّد عبداللہ صومعیؒ کی دختر کا خاندانی نام فاطمہ تھا۔ کنیت اُم الخیر اور لقب امت الجبار تھا۔ یہ اپنے وقت کی بہت بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔

اور جس نوجوان سے سیّدہ فاطمہؒ کی شادی ہوئی تھی، وہ اپنے عہد کے نامور بزرگ حضرت سیّد ابوصالح موسیٰؒ تھے۔ اور ان ہی عالی مرتبت ماں باپ کی روشن ترین نشانی تھے، غوث اعظم سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔

خدا قادر مطلق بھی ہے اور بے نیاز بھی۔ وہ بت پرستوں میں پیغمبر پیدا کرتا ہے اور پیغمبر کی نسل میں منکر و نافرمان اولادیں۔ یہ اس کی قدرت اور خلاقی کی عجیب مثال ہے۔ ورنہ عام طور پر جب اللہ اپنے کسی مخصوص بندے کی تخلیق کرتا ہے تو اس کے لئے ایک

ایسی زمین بھی ہموار کرتا ہے جس میں دنیا کی بہترین فصل پیدا ہو سکے۔ ایک نوجوان جو اپنے عہدِ شباب میں پرہیزگاری کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھا، غوث اعظمؒ اسی مردِ پاکباز کے فرزند تھے۔ ایسے فرزند کہ جس پر ماں باپ ہی نہیں سارا عالم اسلام ناز کرتا تھا اور یہ سلسلۂ ناز ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ساڑھے آٹھ سو سال گزر جانے کے باوجود اس مجلسِ ادب میں گناہ گاروں کا تو ذکر ہی کیا، ہر دور کا بڑے سے بڑا ولی بھی خوف سے لرزتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

غوث اعظمؒ صحیح النسب سیّد تھے۔ والد محترم کی طرف سے بارہویں پشت میں آپؒ کا سلسلہ حضرت سیدنا امام حسنؓ سے مل جاتا ہے۔ آپؒ کا خاندانی نام محمد عبدالقادر اور لقب محی الدین (مذہب کو زندہ کرنے والا) تھا۔ آپؒ کی ولادت 470ھ میں ہوئی۔ آپؒ کا آبائی وطن ایران کا ایک قدیم قصبہ جیلان ہے۔

آپؒ رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو دنیا میں تشریف لائے۔

اسی رات آپؒ کے والد محترم حضرت ابوصالحؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابۂ کرام اور اولیاءِ عظام کے ساتھ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔

''اے ابوصالح! تجھے اللہ تعالیٰ نے فرزند صالح عطا فرمایا ہے، وہ میرے بیٹے کے مانند ہے اور اولیاء میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔''

آپؒ کی پیدائش کی رات ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ معتبر مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس رات پورے شہر میں جس قدر بچے پیدا ہوئے، وہ سب کے سب لڑکے تھے۔ پھر وہ تمام لڑکے جوان ہو کر ولایت کی منزل تک پہنچے۔

آپؒ کی والدہ ماجدہ فرماتی ہیں کہ عبدالقادرؒ رمضان المبارک میں پیدا ہوئے اور انہوں نے پورے مہینے دن کے وقت دودھ نہیں پیا۔ دوسرے سال گہرے بادل ہونے کی وجہ سے رمضان کا چاند نظر نہیں آ سکا اور لوگ شبے میں پڑ گئے، آخر قرب و جوار کے چند لوگوں نے حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی والدہ ماجدہ سے دریافت کیا۔

''سیّدہ! کیا تمہیں رویت ہلال کی کوئی خبر ملی ہے؟''

جواب میں سیّدہ نے فرمایا۔ ''آج میرے عبدالقادر نے خلافِ عادت دن کے وقت دودھ نہیں پیا ہے اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ آج پہلا روزہ ہے۔''

کچھ دن بعد معتبر شہادتوں سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ دوسرے شہروں میں رمضان کا چاند نظر آ گیا تھا۔ پھر یہ بات دور دراز کے علاقوں میں بھی مشہور ہو گئی کہ

سادات عجم میں ایک مبارک بچہ پیدا ہوا ہے جو رمضان میں دن کے وقت دودھ نہیں پیتا۔"

خود حضرت غوث اعظمؒ نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"میرے ابتدائی حالات کے ذکر سے تمام عالم بھرا ہوا ہے اور میرا گہوارے میں روزہ رکھنا مشہور ہے۔" (ترجمہ)

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت شیخ عبدالقادرؒ نے ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ اچانک آپؒ کے والد محترم بیمار ہوئے اور دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اکثر اولیائے کرام کی زندگی میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ وہ عہد طفلی ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو جاتے ہیں اور پھر مادہ پرست لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان یتیم بچوں کی زیست کیسے بسر ہوگی اور دنیا میں کون ان کا پُرسانِ حال ہوگا۔ مگر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ جب یہی بے سہارا بچے ساری دنیا کا مرکزِ نظر قرار پاتے ہیں اور بڑے بڑے شاہانِ وقت ان کے آستانے پر کاسۂ سوال لئے کھڑے رہتے ہیں۔ قدرت کی اسی رسمِ خاص کے مطابق حضرت شیخ عبدالقادرؒ بھی بچپن میں یتیم ہوئے لیکن ابھی آپؒ کے نانا حیات تھے۔ حضرت سیّد عبداللہؒ نے آپؒ کو اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا اور محبوب نواسے کی تعلیم و تربیت جاری رکھی۔ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کا عہد طفلی دوسرے بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ آپؒ کو دوسرے بچوں کے کھیلوں اور مشغلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی اگر کبھی بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہوتے تو ایک غیبی صدا آپؒ کا تعاقب کرتی۔

"اے برکت دیئے ہوئے! میری طرف آ۔"

یہ آواز سن کر حضرت شیخ عبدالقادرؒ خوف زدہ ہو جاتے اور بھاگ کر اپنی مادر گرامی کی آغوش میں چھپ جاتے۔

کسی معتبر تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی تعلیم کا آغاز کب ہوا؟ پھر بھی ایک مستند روایت موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ دس برس کی عمر میں حصولِ علم کی غرض سے مکتب تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اس روایت کی بنیاد ایک مشہور واقعہ ہے۔ ایک بار حضرت شیخ عبدالقادرؒ سے پوچھا گیا۔

"آپ کو اپنے ولی ہونے کا علم کب ہوا؟"

جواب میں حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ "جب میں دس برس کا تھا تو اپنے شہر کے مکتب میں پڑھنے جایا کرتا تھا، راستے میں مردانِ غیب میرے پیچھے پیچھے چلتے دکھائی دیتے

تھے۔ پھر جیسے ہی مدرسے میں داخل ہوتا تو مردانِ غیب کو بار بار کہتے ہوئے سنتا...... اللہ کے ولی کو بیٹھنے کے لئے جگہ دو...... اللہ کے ولی کو بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔"

اٹھارہ سال کی عمر میں والدہ محترمہ نے ایک قافلے کے ساتھ آپؒ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے بغداد بھیجا۔ قافلہ ایک سنسان راستے سے گزرا تو اس علاقے کے ڈاکوؤں نے تمام مسافروں کا ساز و سامان لوٹ لیا اور حضرت شیخ عبدالقادرؒ کو کسی غریب آدمی کا بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ جب یہ لٹا ہوا قافلہ آگے بڑھنے لگا تو رہزنوں کے سردار نے آپؒ سے ازراہِ مذاق پوچھا۔

"بچے! تیرے پاس بھی کچھ ہے؟"

"ہاں۔" غوث اعظمؒ نے لٹیروں کی توقع کے خلاف جواب دیا۔

آخر سردار کے اشارے پر غوث اعظمؒ کی جامہ تلاشی لی گئی مگر رہزنوں کو کچھ نہیں ملا۔

"ہمیں بے وقوف بناتا ہے۔" ڈاکوؤں کا سردار ایک بچے کی بات کو مذاق سمجھ کر جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ مذاق کیا ہوتا ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں جو قبا کے دبیز استر میں بغل کے نیچے ٹانکی گئی ہیں۔" حضرت شیخؒ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

سردار کے کہنے پر دوبارہ تلاشی لی گئی۔ آخر اس کے ساتھی اشرفیاں پانے میں کامیاب ہو گئے۔ تمام رہزنوں کو اس بات پر حیرت تھی کہ اگر لڑکا ان اشرفیوں کی نشاندہی نہ کرتا تو وہ اُس طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے۔ لڑکے کی صاف گوئی پر سردار کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ تعجب ہوا تھا اس لئے وہ حضرت شیخ عبدالقادرؒ سے یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"لڑکے! تُو جھوٹ بول کر اپنی ان اشرفیوں کو چھپا سکتا تھا۔ پھر تُو نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"رخصت کرتے وقت میری مادر گرامی نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ اگر جان پر بھی بن جائے تو جھوٹ نہ بولنا۔ یہی میری والدہ کا حکم تھا۔ اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے تو میں اس حکم کو ٹال نہیں سکتا تھا۔" حضرت شیخ عبدالقادرؒ نے اس قدر جرأت و بے باکی کے ساتھ فرمایا کہ تمام رہزن دم بخود رہ گئے۔ قزاقوں کے سردار پر سکتہ طاری تھا۔ پھر اچانک اس کے ساتھیوں نے اسے روتے ہوئے دیکھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند لفظوں کی حرارت سے پتھر بھی پگھل جائے گا۔ عجیب انقلابی لمحات تھے۔ جس شخص کے لئے قتل و غارت ایک کھیل تھا، اس کی آنکھیں اشک برسا رہی تھیں۔

”سردار! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ ساتھی لٹیروں نے پوچھا۔

”افسوس! میں ہلاک ہو گیا۔ اس لڑکے کو اپنی ماں سے کئے ہوئے عہد کا اس قدر پاس ہے اور میں اپنے اس عہد کو دن میں کئی بار توڑ دیتا ہوں جو میں نے خالق کائنات سے کیا ہے۔“ یہ کہہ کر سردار نے لوٹا ہوا مال تمام مسافروں کو واپس کر دیا اور حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے ہاتھوں کو بے اختیار چوم لیا۔

”تُو عظیم ہے کہ مجھ جیسے پستی میں گرے ہوئے انسان سے ملا۔ تُو میرا راہ نما ہے کہ تُو نے مجھے سچائی کا راستہ دکھایا۔ تُو حق کی روشنی ہے کہ اگر آج کی رات تجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو میں زندگی بھر گناہوں کے اندھیرے میں بھٹکتا رہتا۔“

پھر قزاقوں کے سردار پر ناقابلِ بیان وحشت طاری ہو گئی اور وہ رات کے سناٹے میں چیختا ہوا کہیں گم ہو گیا۔

”اے دنیا! میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

یہ غوث اعظمؒ کی پہلی کرامت تھی جس نے ایک رہزن کی زندگی کا نقشہ بدل دیا تھا۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

حضرت غوث اعظمؒ فطرتاً نہایت رقیق القلب اور فیاض انسان تھے۔ آپؒ سے لوگوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ نتیجتاً بغداد پہنچتے پہنچتے آپؒ نے تمام اشرفیاں ضرورت مندوں پر صرف کر دیں اور خود فاقہ کشی میں مبتلا ہو گئے۔

ایک موقع پر آپؒ نے فرمایا۔ ”جب میں پہلے پہل بغداد میں داخل ہوا تو وہاں تین دن تک مجھے کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں ملی۔ آخر میں تنگ آ کر ”ایوان کسریٰ“ کی طرف نکل گیا۔ (یہ وہی ایوان ہے جس کے چودہ کنگرے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت کے وقت گر گئے تھے) وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ مجھ سے بھی زیادہ ضرورت مند لوگ اس دنیا میں موجود ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ایوانِ کسریٰ میں تقریباً ستر اولیاء اپنے شکم کی آگ بجھانے کے لئے جائز اور حلال چیزیں تلاش کر رہے تھے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ان بزرگوں کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا مروت کے خلاف ہے۔ مجبوراً بغداد کی طرف لوٹ آیا۔

راستے میں مجھے ایک اجنبی شخص ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ میرے شہر جیلان کا رہنے والا ہے۔ اگرچہ میں اس سے واقف نہیں تھا لیکن پھر بھی عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، یہ تمہاری والدہ محترمہ نے بھیجا ہے۔ میں نے سونے کے اس ٹکڑے سے کھانے پینے کی کچھ

اشیاء خریدیں اور دوبارہ ایوانِ کسریٰ پہنچ کر وہ ساری چیزیں ان درویشوں کے سامنے رکھ دیں۔

”یہ کیا ہے؟“ ان فاقہ زدہ مگر غیرت مند درویشوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے سارا ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گوارا نہیں ہوا کہ میں تو پیٹ بھر کر روٹی کھاؤں اور آپ جیسے صاحبانِ کمال بھوکے رہ جائیں۔ اسے قبول فرما لیجئے تاکہ مجھے سکونِ قلب حاصل ہو۔“

درویشوں نے میری اس نذر کو قبول کر لیا اور میں ان کی دعاؤں کے سائے سائے بغداد کی طرف لوٹ آیا۔ میرے پاس کچھ رقم باقی تھی۔ میں نے اس سے کچھ اور کھانا خریدا، پھر فقراء کو آواز دی۔

”آؤ میرے بھائیو! رزاق عالم نے غیب سے ہمارے لئے سامانِ رزق فراہم کر دیا ہے۔“

میری آواز سنتے ہی وہ درویش جمع ہو گئے جو فاقہ کشی کی شدت سے جاں بہ لب ہو رہے تھے۔ پھر ہم سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور دوسرے وقت کے لئے ایک لقمہ بھی بچا کر نہیں رکھا۔“

؎ خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

حضرت شیخ عبداللہ سلمیؒ کی روایت ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرمایا کرتے تھے۔

ایک بار مجھے کئی دن تک کھانا نہیں ملا۔ اتفاق سے ایک روز میں محلّہ ”قطیعہ شرقیہ“ میں چلا گیا۔ سرِ راہ مجھے ایک شخص ملا اور اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کسی باورچی کی دکان پر چلے جاؤ اور میرا یہ خط دکھا کر اپنے کھانے کے لئے پسندیدہ چیزیں خرید لو۔“

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا اور خط لے لیا۔ پھر وہ اجنبی مجھے نظر نہیں آیا۔ میں دل ہی دل میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے باورچی کی دکان پر پہنچا اور اس اجنبی شخص کا لفافہ آگے بڑھا دیا۔ باورچی نے میرے ہاتھ سے خط لے کر رکھ لیا اور مجھ سے پوچھا۔

”لڑکے! تمہیں کیا درکار ہے؟“

میں نے میدہ کی چند روٹیاں اور خبیص (ایک خاص قسم کا حلوہ) طلب کیا۔

باورچی نے کسی پس و پیش کے بغیر وہ چیزیں میرے حوالے کر دیں۔

مجھے باورچی کے اس طرزِ عمل پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ آخر میں اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''تم نے اس خط کو کھول کر بھی نہیں دیکھا اور مطلوبہ اشیاء میرے سپرد کر دیں۔ یہ کیا راز ہے؟''

باورچی نے مسکراتے ہوئے ایک نظر مجھے دیکھا۔ ''لڑکے! تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں کھانا لے کر اس سنسان مسجد میں چلا گیا، جہاں بیٹھ کر اپنا سبق دہرایا کرتا تھا۔ کھانا میں نے اپنے سامنے رکھ لیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کھاؤں یا نہ کھاؤں کہ اچانک میری نظر ایک اور لفافے پر پڑی۔ یہ لفافہ مسجد کی دیوار کے سائے میں زمین پر پڑا تھا۔ میں نے وہ لفافہ اٹھا لیا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

''اللہ کے شیروں کو لذتوں اور خواہشوں سے کیا غرض؟ یہ لذتیں تو ضعیف اور کمزور لوگوں کے لئے ہیں۔''

یہ تحریر پڑھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پورا جسم خوف و دہشت سے کانپنے لگا۔ میں نے فوراً ہی اپنا رومال اٹھا لیا اور کھانے کی چیزیں وہیں چھوڑ دیں پھر مسجد کے ایک گوشے میں دو رکعت نماز ادا کی اور وہاں سے چلا آیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

شیخ ابوبکر تمیمیؒ کا بیان ہے حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔

''ایک بار بغداد میں قحط پڑا جس کی وجہ سے مجھے کئی روز تک کھانا میسر نہیں آیا۔ میں گری پڑی چیزیں تلاش کر کے کھا لیتا تھا۔ ایک دن بھوک کی شدت اتنی بڑھی کہ میں دریائے دجلہ کی طرف چلا گیا تا کہ ''کاہو'' کے پتے اور کوئی سبزی کھا کر اس کڑے وقت کو گزار سکوں مگر جہاں بھی جاتا، وہاں پہلے سے سینکڑوں افراد موجود ہوتے۔ اگر کوئی چیز ملتی بھی تو اس پر ضرورت مندوں کا ہجوم ہوتا۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کہ کھانے کے ایک لقمے کے لئے دوسرے بھوکوں سے مزاحمت کروں۔ آخر مجبور ہو کر شہر کی طرف واپس لوٹ آیا لیکن یہاں بھی مجھے کوئی گری پڑی چیز دستیاب نہ ہو سکی۔

غرض بھوک کی شدت مجھے کوچہ کوچہ پھراتی رہی یہاں تک کہ میں ایک مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ ضعف و ناتوانی کے سبب تیز چکر آ رہے تھے۔ کبھی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل جاتا اور یوں محسوس ہونے لگتا جیسے میں زمین پر گر کر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ آخر بڑی مشکل سے مسجد کے اندر داخل ہوا اور ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔

اسی دوران ایک عجمی نوجوان مسجد میں نان اور بھنا ہوا گوشت لے کر آیا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ بھوک کی وجہ سے میری یہ حالت تھی کہ جب وہ نوجوان کھانے کے لئے لقمہ اٹھاتا تو بے اختیار میں اپنا منہ کھول دیتا۔ جب کئی بار مجھ سے یہ اضطراری عمل سرزد ہوا تو میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

''اے میرے نفس! یہ بے صبری تجھے اہلِ دنیا کے سامنے رُسوا کر دے گی۔ آخر توکل اور قناعت بھی تو کوئی شے ہے۔ تُو اس راستے کو اختیار کیوں نہیں کرتا؟''

اتنے میں اچانک اس عجمی نوجوان کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے بڑی محبت سے کہا۔

''آیئے بھائی! بسم اللہ!''

میں نے انکار کیا مگر وہ مسلسل اصرار کرتا رہا۔ کچھ اس کی تواضع کا اثر تھا اور کچھ میری مجبوری آخر میں عجمی نوجوان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔

ابھی میں نے چند لقمے ہی لئے تھے کہ وہ نوجوان مجھ سے میرے حالات دریافت کرنے لگا۔ ''آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کیا مشغلہ ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ جیلان کا رہنے والا ہوں اور علم فقہ حاصل کرنے کی غرض سے بغداد آیا ہوں۔''

''میرا تعلق بھی جیلان سے ہے۔'' اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

دیارِ غیر میں اپنے ایک ہم وطن کو دیکھ کر مجھے بھی ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔

''کیا آپ جیلان کے رہنے والے ایک نوجوان عبدالقادر کو جانتے ہیں؟'' اس نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

''میرا ہی نام عبدالقادر ہے۔'' میں نے عجمی نوجوان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

میری بات سنتے ہی اس کے ہاتھ سے کھانے کا لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر پڑا اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

ابھی میں اس کی بدلتی ہوئی کیفیت پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اپنے ہم وطن کی یہ بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر میں نے بھی کھانا چھوڑ دیا۔

وہ نوجوان بہت دیر تک سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا اور اس کی آنکھوں سے بہتے رہے۔

''تم نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟ خیریت تو ہے؟'' میں نے مضطرب ہو کر نوجوان سے پوچھا۔

''اب یہ روٹی میرے حلق سے نہیں اُتر سکتی۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔'' شدید رقت کے سبب نوجوان کو گفتگو کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

''تم کس جرم کی بات کر رہے ہو؟ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔'' نوجوان کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے میرے اندر بھی اضطرابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

''میرے بھائی! یقین کرو کہ میں تمہیں بہت دنوں سے تلاش کر رہا ہوں۔'' نوجوان نے روتے ہوئے کہا۔ ''جب میں بغداد آیا تھا تو میرا ذاتی خرچ بھی موجود تھا مگر تمہاری جستجو نے اتنا طول کھینچا کہ ساری رقم صرف ہو گئی۔ تین دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجبوراً آپ کی امانت میں سے کچھ رقم لے کر یہ چیزیں خریدیں اور پیٹ کی آگ بجھانے بیٹھ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ آپ ہی کا کھانا ہے۔''

میں حیرت سے عجمی نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کیسی امانت؟ میں تمہاری بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔''

''جب میں جیلان سے رخصت ہو رہا تھا تو آپ کی والدہ محترمہ نے مجھے آٹھ دینار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ رقم میرے بیٹے عبدالقادر تک پہنچا دینا۔'' نوجوان نے امانت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر افسوس! میں اس راستے میں ثابت قدم نہ رہ سکا۔ تین دن کی فاقہ کشی نے مجھے خیانت پر مجبور کر دیا۔'' یہ کہہ کر نوجوان ہچکیوں سے رونے لگا۔ ''اللہ میرے اس گناہ کو معاف فرمائے۔''

میں بہت دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر جب اس نوجوان کی حالت سنبھلی تو ہم دونوں نے باقی کھانا کھایا اور رزاق عالم کا شکر ادا کیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے چار دینار اسے دے دیئے کہ وہ میری ہی طرح غریب الوطن بھی تھا اور مجبور تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اسی طرح شیخ ابو محمد عبداللہ جبائیؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

ایک دن میں کسی ویران مقام پر بیٹھا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ کئی وقت کی فاقہ کشی کے سبب بار بار میری آنکھیں دُھندلی ہو جاتی تھیں اور سر چکرانے لگتا تھا۔ ناگہاں ایک صدائے غیبی سنائی دی۔

''عبدالقادر! کب تک بھوکا رہے گا؟ جا، کسی سے قرض لے لے تاکہ تجھے علم حاصل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔''

''میں اپنے وطن سے بہت دور ہوں، یہاں میرا کوئی شناسا نہیں۔ پھر مجھے کون قرض

دے گا؟'' میں نے اس غیبی آواز کے جواب میں کہا۔

''جس نے تجھے اس ویرانے میں پکارا ہے، وہی تیرے قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ اطمینان سے اپنا کام کر!''

دوسری بار صدائے غیبی سن کر میں ایک نان بائی کے پاس پہنچا اور اسے کہا۔

''بھائی! مجھے روزانہ ڈیڑھ روٹی قرض دے دیا کرو۔ اس شرط پر کہ مجھے کہیں سے کچھ رقم مل گئی تو میں تمہارا سارا قرض لوٹا دوں گا...... اور اگر اس دوران مر جاؤں تو مجھے معاف کر دینا۔''

میری بات سن کر نان بائی رونے لگا۔ ''آپ کا جتنا جی چاہے، میری دکان سے لے جایا کریں۔''

پھر میں نان بائی کی دکان سے روزانہ ڈیڑھ روٹی لے آتا۔

آخر جب مجھے اسی طرح قرض کی روٹی کھاتے ہوئے مدت گزر گئی تو ایک دن بڑی شدت سے یہ خیال آیا۔

''عبدالقادر! تُو کب سے قرض لئے جا رہا ہے مگر ادائیگی کی کوئی صورت نہیں۔''

اس خیال سے مجھے بڑی شرم آئی اور میں اس روز نان بائی کی دکان پر نہیں گیا۔

دوسرے دن مجھے پھر وہی صدائے غیبی سنائی دی۔ ''جب ہم نے تمہارے قرض کی ادائیگی کا ذمہ لے لیا تھا تو پھر اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟''

''نان بائی کے سامنے بارِ ندامت سے میرا سر نہیں اُٹھتا۔ اب میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔''

''مگر قرض ادا کرنے تو جانا ہی پڑے گا۔'' غیبی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

''قرض کہاں سے ادا ہو گا؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''زمین و آسمان میں سارے خزانے اللہ کے ہیں اور وہی تمہارا قرض ادا کرے گا۔ فلاں مقام پر چلے جاؤ اور وہاں تمہیں جو کچھ ملے اس سے نان بائی کا سارا حساب بے باق کر دو۔''

آخر میں حیرت میں ڈوبا ہوا اس ویران مقام پر پہنچا جس کی طرف صدائے غیبی نے اشارہ کیا تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر میری دستگیری فرمائی تھی۔ وہاں زمین پر سونے کا ایک چمکتا ہوا ٹکڑا اس طرح پڑا تھا جیسے وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔ میں نے اس ٹکڑے کو اٹھا لیا اور پھر نان بائی کے حوالے کر دیا۔

نان بائی نے محبت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''میاں! اتنی کیا جلدی تھی؟''

شیخ ابومحمد عبداللہ جبائیؒ کی روایت ہے۔ حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا۔

اہل بغداد کی ایک جماعت علم فقہ میں مشغول تھی۔ جب اناج کٹنے کے دن آتے تو طالب علموں کی یہ جماعت ''یعقوبا'' نام کے ایک گاؤں میں چلی جاتی اور مقامی باشندے علم کی سرپرستی کے طور پر اس جماعت کو کچھ غلہ دے دیتے۔ ایک بار ان لوگوں نے مجھے بھی اناج حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ میں اس وقت کم عمر تھا، اس لئے ان کے ساتھ چلا گیا۔

اسی گاؤں میں ایک نہایت عابد و زاہد بزرگ شریف یعقوبیؒ رہتے تھے۔ مجھے ان کی زیارت کا شوق ہوا اور میں سارے کام چھوڑ کر بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو بہت سے لوگ شیخ کے حلقے میں موجود تھے۔ میں بھی خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ شیخ شریف یعقوبیؒ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ بظاہر وہ سیدھی سادی بات کہتے مگر ہر شخص اپنی علمیت اور ذہنی صلاحیت کے مطابق مفہوم اخذ کرتا۔ یہی شیخ کی تقریر کا کمال تھا۔ آخر مجلس ختم ہوئی اور تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے مگر میں شیخ کے سامنے کھڑا رہا۔

''نوجوان! کیا کوئی سوال باقی رہ گیا ہے؟'' شیخ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر فرمایا۔ ''بیٹھ جاؤ!''

میں نے شیخ کے حکم پر عمل کیا۔

''اب کہو، کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے آپ کی تقریر سنی مگر وہ تمام اہل مجلس کے لئے تھی۔ میری خواہش ہے کہ شیخ مجھے کوئی خاص نصیحت فرمائیں۔''

شیخ شریف یعقوبیؒ نے بہت غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

''طالبانِ حق کسی غیر کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔''

یہ سن کر میرے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شیخ کی روشن آنکھوں پر اس گاؤں میں میرے آنے کا مقصد ظاہر ہوگیا ہو۔ شریف یعقوبیؒ کی نصیحت کے بعد نہ میں کسی مقام پر گیا اور نہ میں نے کسی سے سوال کیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اساتذہ سے سبق لے کر جنگل کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ پھر بیابانوں اور خرابوں میں،

دن ہو یا رات، آندھی ہو یا موسلا دھار بارش، گرمی ہو یا سردی، اپنا مطالعہ جاری رکھتا تھا۔ اس وقت میں اپنے سر پر ایک چھوٹا سا عمامہ باندھتا اور معمولی کپڑے کا جبہ پہنتا تھا۔ کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے تھے۔ پھر دریائے دجلہ کے کنارے اُگنے والی ترکاریاں کھا کر شکم کی آگ سرد کرتا۔ کبھی کبھی یہ ترکاریاں بھی ہاتھ نہ آتیں کیونکہ بھوک کے مارے ہوئے دوسرے فقراء بھی ادھر کا رخ کرلیا کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر مجھے شرم آتی تھی کہ میں درویشوں کی حق تلفی کروں۔ مجبوراً وہاں سے چلا جاتا اور اپنا مطالعہ جاری رکھتا۔ پھر نیند آتی تو خالی پیٹ ہی کنکریوں سے بھری ہوئی زمین پر سو جاتا۔

حضرت غوث اعظمؒ اپنے اسی زمانہ طالب علمی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''میں زمانے کی جن سختیوں سے دوچار ہوا، انہیں برداشت کرتے کرتے پہاڑ بھی پھٹ جاتا۔ یہ تو اس ذات بے نیاز کا کام ہے کہ میں بہ عافیت ان خارزاروں سے گزر گیا۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ذی الحجہ 1496 ھ میں علم قرأت، علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم کلام، علم نعت، علم ادب، علم نحو، علم عروض، علم مناظرہ، علم تاریخ اور علم انساب کی تکمیل کی۔ اس وقت آپؒ کی عمر 26 سال تھی۔ یہ بھی حضرت غوث اعظمؒ کی ایک زندہ کرامت ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

پھر جب آپؒ نے فتویٰ دینا شروع کیا تو علمائے ظاہر کی صفوں میں ہلچل سی مچ گئی۔

''چھبیس سالہ نوجوان علم شریعت کی گہرائیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔'' ایک دنیا دار بوڑھے عالم نے کہا۔ انہیں حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی نوجوانی سے شکایت تھی۔ وہ علم کو عمر کی زیادتی سے مشروط کرنا چاہتے تھے۔

پھر ان دنیا دار علماء نے حضرت غوث اعظمؒ کے خلاف ایک محاذ بنالیا۔ ''شرعی مسائل کا حل پیش کرنا کارِ طفلاں نہیں ہے۔ عبدالقادر نے فتویٰ دینے کا اجازت نامہ کس سے حاصل کیا؟''

جب عقیدت مندوں نے حضرت غوث اعظمؒ سے یہ سوال کیا تو آپؒ نے فرمایا۔

''میرے اساتذہ میرے علم سے مطمئن ہیں اور ان کا اطمینان ہی میرا اجازت نامہ ہے۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تمام اساتذہ درویش اور گوشہ نشین تھے۔ انہیں دربارِ خلافت میں تقرب حاصل نہیں تھا، اس لئے دنیا دار علماء ان فقراء کی علمی حیثیت کو تسلیم

کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

پھر نہایت زور و شور سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خلاف ایک مہم چلائی گئی۔

"یہ نوجوان اس وقت تک فتویٰ دینے کا اہل نہیں، جب تک وہ بغداد کے نامور علماء سے اجازت نامہ حاصل نہ کرلے۔"

اجازت نامہ حاصل کرنے کی ایک ہی شرط تھی کہ حضرت شیخ عبدالقادرؒ ان علماء کے سامنے پیش ہو کر امتحان کے مرحلے سے گزریں۔

حضرت غوث اعظمؒ پہلے ہی ویرانوں اور جنگلوں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ علماء ظاہری کا یہ انداز دیکھا تو آپؒ کا دل مزید اچاٹ ہو گیا۔ آپؒ بغداد چھوڑ کر دوبارہ انہی بیابانوں میں واپس چلے جانا چاہتے تھے...... مگر بعض عقیدت مندوں نے عرض کیا۔

"لوگ آپ کے اس طرزِ عمل کو بہانہ بنالیں گے۔"

"مجھے اللہ کے راستے میں کسی کی پرواہ نہیں ہے۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "اہلِ دنیا جو چاہیں کریں۔"

عقیدت مندوں کا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر غوث اعظمؒ علمائے بغداد کے سامنے ایک طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہونے اور امتحان کے مرحلے سے گزرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

علمائے ظاہری مسرور و مطمئن تھے کہ ایک نوجوان نے ان کے جلال و جبروت کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

اور حضرت غوث اعظمؒ کے عقیدت مند پریشان، مضطرب تھے کہ کہیں انہیں علمائے بغداد کے سامنے خفت و شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آخر امتحان کی ساعت آ پہنچی۔ تمام علماء بغداد جنہیں حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے فتویٰ دینے پر اعتراض تھا، ایک بڑی عمارت میں جمع ہوئے۔ بہترین لباس زیب تن کئے، سروں پر عمامے سجائے، پیشانیوں پر نمود و نمائش کی لکیریں اور آنکھوں میں علم و آگہی کا خمار۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک معمولی کپڑے کا جبہ پہنے کمرے میں داخل ہوئے۔ بلند آواز میں حاضرین کو سلام کیا اور نظریں جھکائے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ حضرت غوث اعظمؒ کی یہ نشست عین علماء بغداد کے سامنے تھی۔

دنیا دار علماء نے بہت غور سے حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ پھر انہیں یقین آ گیا کہ یہ نوجوان علم کے سمندر کی گہرائیوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔

کچھ دیر تک مجلس پر گہرا سکوت طاری رہا۔ پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں اور بہت نرم لہجے میں فرمایا۔

"حضرات! میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ کسی امتحان سے گزر سکوں...... مگر جب رسمِ دنیا یہی ٹھہری ہے تو پھر بسم اللہ!" یہ کہہ کر حضرت غوث اعظمؒ نے امتحان لینے والے علماء کو بہت غور سے دیکھا۔

بس ایک نظر کی بات تھی۔ سب کچھ زیر و زبر ہو گیا۔ علمائے بغداد نے محسوس کیا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے نظر ملتے ہی ان کے اندر ایک انقلاب سا برپا ہو گیا ہے مگر وہ اس انقلاب کو کوئی نام دینے سے قاصر تھے۔

"حضرات! آپ سوال کیجئے۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک سائل کے انداز میں علماء بغداد سے عرض کیا۔ "آپ کو میرے علم کے کس پہلو پر شک ہے، اس کا اظہار فرمائیے۔ عالم الغیب چاہے گا تو آپ کے سارے شکوک و شبہات دور فرما دے گا کہ ہر حال میں وہی اپنے بندوں کا مشکل کشا اور کارساز ہے۔"

جو علم اپنی ذات کی خوشنودی اور نام و نمود کی غرض سے حاصل کیا گیا تھا، اس کے سارے دفتر لپیٹ دیئے گئے۔ علمائے بغداد حضرت غوث اعظمؒ سے کیا سوال کرتے؟ ان میں تابِ گویائی ہی کہاں باقی رہی تھی؟ ساری زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ امتحان کیا لیتے کہ خود ان کے دماغ تاریک ویرانوں میں تبدیل ہو گئے تھے...... اور ان ویرانوں میں بے خبری کی خاک اُڑ رہی تھی۔ علماء بغداد کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کی متاعِ علم اس طرح لٹ جائے گی اور وہ کسی مفلس و نادار کی مانند خالی ہاتھ لئے کھڑے رہیں گے۔

بس ایک نظر کا کھیل تھا، ساری عمر کا سرمایہ برباد ہو کر رہ گیا۔ علمائے بغداد محسوس کر رہے تھے کہ کسی نادیدہ ہستی نے چند لمحوں میں ان کا تمام علم سلب کر لیا ہے۔ اسی کیفیت کو حضرت امیر خسروؒ نے اپنے ایک مصرع میں بیان کیا ہے۔

"چھاپ تلک سب چھین لی موسے نیناں ملائے کے"

(وہ تیری ایک نظر کیا تھی کہ جس نے میرے ماتھے سے بت پرستی کی تمام نشانیاں مٹا ڈالیں)

یہ اس مشہور زمانہ منقبت کا مصرع ہے جو حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں کہی تھی۔ اس مصرع میں اہلِ ایمان کی روحانی طاقت کا ذکر کیا گیا ہے۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک حدیث پاک ہے۔

''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

علمائے ظاہر اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ اس وقت حضرت غوث اعظمؒ بھی اللہ کے نور سے دیکھ رہے تھے۔ دنیا کی ایسی کون سی روشنی ہے جو اللہ کے نور کے مقابل ٹھہر سکے۔ نتیجتاً ساری روشنیاں بجھ کر رہ گئیں اور علمائے بغداد کے ذہنوں پر اندھیرے مسلط ہو گئے۔

علمائے ظاہر کو خاموش پا کر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ دوبارہ ان سے مخاطب ہوئے۔

''آپ حضرات کوئی سوال کیوں نہیں کرتے؟ خود بھی پریشان ہوئے اور مجھے بھی زحمت میں مبتلا کیا۔''

''کیا سوال کریں؟ ایسا لگتا ہے کہ علم ہی ہمارے ذہنوں سے رخصت ہو گیا ہے۔'' تمام علماء نے بیک زبان کہا۔

''پھر اجازت دیجئے کہ مجھے دنیا میں اور بھی کام ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت غوث اعظمؒ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم کہاں جا رہے ہو عبدالقادر؟ ہمارا علم تو ہمیں لوٹا دو۔'' علمائے بغداد گریہ وزاری کرنے لگے۔ ''ہم تو ایک خالی مشکیزہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ دماغ کے سارے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ وہ پانی کہاں گیا جو ہمارے ذہنوں کو سیراب کرتا تھا۔'' علماء کی فریادوں سے پوری مجلس گونجنے لگی۔

اس شورِ فغاں سے اہلِ مجلس کو اندازہ ہوا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نظر پڑتے ہی علمائے بغداد کا تمام علم ہی سلب ہو گیا تھا اور امتحان لینے والے خود ایک عجیب امتحان سے گزر رہے تھے۔ ناقابلِ یقین منظر تھا۔ اساتذہ خود ایک طالب علم سے بخشش وعطا کا سوال کر رہے تھے۔

حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا۔

''میں شمشیر برہنہ اور چڑھی ہوئی کمان ہوں۔ میرا تیر نشانے پر لگنے والا ہے...... میرا نیزہ بے خطا...... اور میرا گھوڑا بے زین ہے...... میں عشقِ خداوندی کی آگ ہوں...... حال واحوال کا سلب کرنے والا...... دریائے بے کراں...... اور رہنمائے وقت......''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ عالم جذب میں فرما رہے تھے۔

''بے شک! بے شک! ہمیں یقین آ گیا۔'' علمائے بغداد بے اختیار پکار اُٹھے۔

''ہم تمہیں پہچانے نہیں تھے عبدالقادر! ہماری اس کوتاہی سے درگزر کرو اور اپنا دل صاف کر لو۔''

''اس ذات پاک نے عبدالقادر کے دل و دماغ کی ساری کدورتیں دور کر دی ہیں۔ وہ اپنے سینے میں دشمنوں کے لئے بھی شکایتوں کا غبار نہیں رکھتا۔'' حضرت غوث الاعظمؒ نے جواباً فرمایا۔

''تو پھر خدا کے لئے ہمیں معاف کر دو۔'' علمائے ظاہر نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''میرا علم دنیا سے نہیں، مجھے عالم الغیب سکھاتا ہے۔ اے بے خبرو! اے دنیا کے سنوارنے والو! اپنی آخرت برباد نہ کرو۔ میں نے تمہیں معاف کیا، اللہ بھی معاف فرمائے کہ اس کی بخشش کے بغیر انسان کا کہاں ٹھکانا؟'' یہ کہہ کر حضرت غوث الاعظمؒ تشریف لے گئے۔

آپؒ کے جاتے ہی علمائے بغداد کے سوئے ہوئے ذہن بیدار ہو گئے۔ دماغ کی تاریک رہ گزر پر دوبارہ وہی روشنی پھیل گئی۔

اس واقعہ کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ظاہری اور باطنی علم کی روشنی عام ہو گئی۔ مخالف علماء سرنگوں ہو گئے اور دشمن قدم بوسی کے لئے حاضر ہونے لگے...... مگر حضرت غوث الاعظمؒ کی دنیا سے بے رغبتی پھر لوٹ آئی اور آپؒ شہر کی آباد محفلیں چھوڑ کر ویرانوں کی طرف نکل گئے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

شیخ ابوسعود احمد کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے مجھ سے فرمایا۔

''میں پچیس سال تک تن تنہا عراق کے بیابانوں، ویرانوں اور خرابوں میں پھرتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نہ لوگ مجھے پہچانتے تھے اور نہ میں لوگوں کو پہچانتا تھا۔ تاہم اس وقت میرے پاس رجال الغیب اور جن آیا کرتے تھے۔ میں ان دونوں جماعتوں کو علم طریقت سکھایا کرتا تھا۔''

یہاں مغربی اقوام کا ذکر نہیں کہ وہ تو مادہ پرستی کے تحت الثریٰ میں اُتر گئی ہیں۔ اگر ان کے یہاں روحانیت باقی ہے تو بس اس شکل میں کہ زندگی بھر گناہ کرتے رہو اور ایک بار کلیسا (چرچ) میں جا کر پادری کے ہاتھ پر توبہ کر لو، تمام قصہ پاک۔ بالفرض اگر کسی عیسائی کو توبہ کا موقع نہ ملے تو اسے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ

علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر قیامت تک کے لئے تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے یہاں ریاضت اور مجاہدات کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔ بدقسمتی سے عیسائیوں کا یہی عقیدہ ایک دوسری شکل میں بے شمار مسلمانوں کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اہلِ اسلام کی اکثریت بے عملی کا شکار ہے اور یہ نظریہ عام ہو گیا ہے کہ کسی پیر کا دامن تھام لو، حشر میں وہی پیر ان کے سارے گناہ معاف کرا دے گا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو عمل پر تو یقین رکھتی ہے مگر روحانی تربیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ ان کے نزدیک بزرگانِ دین کی ریاضتیں محض گوشہ نشینی کا بہانہ ہیں۔ وہ درویشوں اور فقیروں کو آرام طلب اور کاہل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں گوشہ گیر ہو کر عبادت کرنا بہت آسان کام ہے۔ خود علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر پر بھی ایک ایسا وقت گزرا ہے جب وہ شاعرانہ جوش میں درویشوں پر طعنہ زن نظر آتے ہیں۔

جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

یا پھر اُن کا یہ مشہور شعر۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تُو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

حالانکہ یہ وہی اقبال ہیں جو 1905ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان جانے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے تھے اور محبوب الٰہیؒ کے قدموں میں کھڑے ہو کر اپنی مشہور نظم "التجائے مسافر" پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ بھی ہے۔

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال

یا شاعرِ مشرق کی وہ نظم جو انہوں نے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی شان میں تحریر کی تھی۔

دل بے تاب جا پہنچا دیار پیر سنجر میں
میسر ہے جہاں سامانِ دردِ نا شکیبائی

یہاں "پیر سنجر" سے مراد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں۔ فی الحال یہاں اس سنجیدہ بحث کی زیادہ گنجائش نہیں مگر پھر بھی اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ موجودہ نظامِ خانقاہ سے بندگانِ خدا کو شکایتیں ہو سکتی ہیں مگر وہ نظامِ خانقاہی جو حضرت غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت بہاء الدین زکریا

ملتانیؒ سے منسوب ہے، اس پر نکتہ چینی کرنا محض جہالت اور بے خبری ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دستِ حق پر ڈیڑھ لاکھ کے قریب راجپوتوں کا مسلمان ہونا ایک تاریخ ساز واقعہ ہے، کوئی طلسمی فسانہ یا جادوئی قصہ نہیں۔ یہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی ریاضت ہی تھی جس نے آپؒ کے عمل میں بے پناہ کشش اور نظر میں دلوں کو بدل دینے کی طاقت پیدا کر دی تھی...... ورنہ نمازیں تو آپ بھی پڑھتے ہیں...... اور روزے تو میں بھی رکھتا ہوں۔

آج کا مسلمان درویشوں کی ریاضت اور مجاہدے کو آرام طلبی اور کاہلی اس لئے سمجھتا ہے کہ وہ ان الفاظ کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا ہے۔ دراصل ریاضت ہی زندگی کے ہر شعبے میں فتوحات کی کلید ہے۔ اگر ہم روحانیت سے ہٹ کر بھی اس لفظ کی توجیہہ کریں تو ہر مقام پر "ریاضت" ہی کا کمال نظر آئے گا۔ دنیا کی سب سے بڑی رزمیہ نظم "شاہ نامۂ فردوسی" بھی اسی ریاضت کا عطیہ ہے۔ مشہور فارسی شاعر فردوسی "شاہ نامہ" لکھنے کے لئے ایک باغ میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ جب تیس سال بعد وہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل طویل ترین نظم لکھ کر باغ سے باہر آیا تو پوری دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے، بیوی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی، بہت سے احباب اور رشتہ دار اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ بس ایک بہن باقی رہ گئی تھی۔

آپ نے دیکھی فردوسی کی شاعرانہ ریاضت؟ اس نے دنیا کی عظیم ترین نظم تخلیق کرنے کے کیا کیا کھویا تھا۔ اسی طرح موسیقی ہو یا مصوری، دنیا کا کوئی ہنر، کوئی فن ریاضت کے بغیر زندۂ جاوید نہیں ہوتا۔

اگر آپ مادہ پرستی کے اس دور میں فنونِ لطیف کو قابلِ ذکر نہیں سمجھتے تو آیئے سائنس کی بات کریں۔ اس موضوع پر کتابیں تو بے شمار لوگ پڑھتے ہیں مگر کوئی مؤجد نہیں بن جاتا۔ کروڑوں افراد برسوں دیوانوں کی طرح کسی ایک چیز کے تعاقب میں بھاگتے رہتے ہیں، تب کہیں جا کر کوئی ایک شخص اس چیز پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے اور پھر نئی ایجاد عالمِ ظہور میں آتی ہے۔ آج دنیا میں جتنی سائنسی ایجادات موجود ہیں، اگر ہم ان کے مؤجدوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ وہ زندگی بھر کس اذیت اور کرب میں مبتلا رہے؟ کتنی آرزوؤں کا خون ہوا اور کتنے خواب فنا ہوئے، یہ کسی کو نہیں معلوم۔ دنیا نے صرف ایجادات کا مشاہدہ کیا، ان کے مؤجدوں کی ریاضت نہیں دیکھی۔ اگر عام لوگ ان مؤجدوں کو دیکھ لیتے تو وہ انہیں مجنوں اور وحشی نظر آتے۔ یہی ریاضت کی انتہا ہوتی ہے۔

اب ہم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حوالے سے اس روحانی ریاضت کا ذکر کریں گے جس نے ایک یتیم بچے کو "غوثیت" کے درجے تک پہنچایا۔

* * *

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں پہلے پہل عراق میں داخل ہوا تو حضرت خضر علیہ السلام نے میرا ساتھ دیا مگر میں انہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ میں نے ان سے بہت پوچھا کہ وہ کون بزرگ ہیں مگر وہ اپنا تعارف کرانے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ آخر اس شرط پر راضی ہوئے کہ میں کسی بات میں ان کی مخالفت نہیں کروں گا۔ میں نے اقرار کرلیا۔ پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ ایک دن تمہیں خود بخود پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں؟ تین سال بعد مجھے ان کا خیال آیا تو دل نے کہا کہ وہ حضرت خضرؑ تھے۔

اس عرصے میں دنیا اور اس کی خواہشات مختلف شکلوں میں مجھ پر ظاہر ہوتی رہیں مگر اللہ تعالیٰ مجھے ان کی طرف مائل ہونے سے بچالیتا تھا۔ شیاطین نئی نئی صورتیں اختیار کر کے میرے پاس آتے اور مجھ سے لڑتے تھے مگر خداوند ذوالجلال مجھے ان پر غالب رکھتا تھا۔ میرا نفس مجسم ہو کر اپنی تسکین کے لئے کبھی مجھ سے عاجزی کرتا اور کبھی جنگ پر آمادہ ہوجاتا لیکن قادر مطلق نے مجھے اس پر بھی غلبہ عطا کیا۔

میں اپنے نفس کو طرح طرح کی ریاضتوں اور مشقتوں میں ڈالتا رہتا۔ ایک سال سبزی یا گری پڑی چیز کھاتا اور کئی کئی دن تک پانی نہ پیتا۔ ایک سال تک پانی پیتا اور کئی کئی دن تک کوئی سبزی یا گری پڑی چیز نہ کھاتا۔ اور پھر ایک سال تک کئی کئی دن تک نہ کچھ کھاتا، نہ پیتا اور نہ سوتا۔

ایک رات شدت کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں "ایوانِ کسریٰ" میں جا کر سو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے غسل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے اسی وقت دریائے دجلہ پر جا کر غسل کیا۔ پھر جا کر سویا تو وہی حالت ہوگئی۔ گھبرا کر اٹھا اور دوبارہ غسل کیا۔ اتفاقاً تیسری بار بھی وہی حادثہ پیش آ گیا۔ موسم بہت سخت اور ناقابل برداشت تھا۔ میرے نفس نے مجھے تھپک کر سلانا چاہا کہ صبح غسل کرلینا....... مگر میں نے اپنے نفس کی ایک نہ مانی اور تیزی سے دریائے دجلہ کی طرف چلا گیا۔ پھر نیند آجانے کے خوف سے ایوان کی چھت پر چڑھ گیا اور ساری رات ٹہل کر گزار دی۔

میں نے تقریباً ایک ہزار علوم وفنون صرف اس لئے حاصل کئے کہ دنیا کے جھگڑوں، وسوسوں اور اندیشوں سے نجات حاصل کروں۔ یہاں تک کہ حقیقی راحت میسر آجائے۔

لوگ مجھے مجنون اور پاگل کہتے۔ میں جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جاتا۔ چلتے چلتے میرے پیروں میں آبلے پڑ جاتے اور پھر ان سے خون جاری ہوجاتا۔ لوگ میری حالت پر ترس کھا کر کسی طبیب کے پاس لے جاتے مگر وہاں پہنچ کر میری حالت اور بھی خراب ہوجاتی۔ کبھی کبھی مجھ میں اور کسی مُردہ شخص میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ یہاں تک کہ لوگ کفن لے آتے اور غسال کو بلا کر مجھے نہلانے کے لئے تختے پر لٹا دیا جاتا۔ مگر اچانک میری حالت درست ہوجاتی۔

* * *

ایک رات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ویرانے میں خاموشی کے ساتھ ذکر الٰہی کر رہے تھے۔ یکایک وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور آپؒ ایک زوردار چیخ مار کر زمین پر گر پڑے مگر بے ہوش نہیں ہوئے۔ عین اسی وقت غوث الاعظمؒ سے کچھ فاصلے پر چند لٹیرے کسی گھر میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ انسانی چیخ سن کر وہ قزاق یہی سمجھے کہ رات کے نگراں سپاہی ان کے تعاقب میں یہاں تک آپہنچے ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی، پھر ایک انسانی جسم کو زمین پر پڑا دیکھ کر وہ غوث الاعظمؒ کے قریب آئے۔ ایک ڈاکو جھکا اور اس نے آپؒ کا چہرہ دیکھ کر کہا۔

"ارے! یہ تو عبدالقادر مجنون ہے۔ اس بھلے آدمی نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔"

* * *

ایک موقع پر حضرت غوث الاعظمؒ نے شیخ ابوالعباس سے فرمایا۔

"میں برج عجمی میں گیارہ برس رہا، ایک دن میں نے عہد کیا کہ جب تک کوئی اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلائے گا، میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گا، نہ پانی پیوں گا۔ چنانچہ بھوک اور پیاس کے عالم میں کئی دن گزر گئے۔ پھر ایک روز ایک شخص کھانا لایا اور میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ بھوک کی شدت اس قدر تھی کہ میرا نفس مجھ پر غالب آنے لگا۔ پھر میں کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے ہی والا تھا کہ مجھے اپنا عہد یاد آ گیا۔ میں نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا۔

"چاہے میری موت ہی واقع کیوں نہ ہوجائے، مگر میں عہد نہیں توڑوں گا۔"

ابھی برج میں میرے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ایک اور چیخ سنائی دی۔ "ہائے بھوک! ہائے بھوک۔" یہ میرے نفس کی آواز تھی۔ مگر میں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اسی دوران میرے پیر ومرشد حضرت شیخ ابوسعیدؒ داخل ہوئے۔

"عبدالقادر! یہ کیا ہے؟" پیر ومرشد نے میرے نفس کی چیخیں سن کر فرمایا۔

میں نے عرض کیا۔ ''یہ میرے نفس کا اضطراب ہے مگر روح اپنے مالک کے ذکر میں مشغول ہے اور اسے قرار حاصل ہے۔''

اس کے بعد پیر و مرشد مجھے گھر لے گئے اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے لگے۔ یہاں تک کہ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

شیخ ابوالعباس کا بیان ہے کہ ایک مجلسِ خاص میں حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا۔

''میں چالیس دن تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا رہا اور پندرہ سال تک ایک رات میں پورا قرآن شریف ختم کیا۔ ایک رات میں سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ میرے نفس نے مجھ سے سوال کیا۔

''کاش! تُو ایک گھڑی سو جائے، پھر تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر عبادت کرے۔''

مجھے فوراً خطرے کا احساس ہوا کہ یہ میرے نفس کا فریب ہے۔ وہ مجھے آرام کے بہانے سلا دینا چاہتا ہے۔ پھر میں نے اپنے نفس کو سزا دینے کے طور پر، ایک ٹانگ کے سہارے کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا اور اسی حالت میں ختم کر دیا۔

شیخ ابو محمد عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت غوث الاعظمؒ کی خدمت میں چالیس سال رہا۔ آپؒ رات کے اوّل حصے میں نماز پڑھتے، درمیانی حصے میں ذکر کرتے اور تیسرے حصے میں ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر تلاوت قرآن فرماتے۔ پھر ایک طویل سجدہ ادا کرتے۔ چہرۂ مبارک زمین پر ملتے اور گریہ و زاری کے ساتھ دعائیں مانگتے رہتے۔ صبح آپؒ کے رُخِ تابناک پر ایسا نور ہوتا کہ دیکھنے والی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتیں۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جس قدر نفس کشی کرتے، شیطان اسی شدت سے آپؒ کے تعاقب میں لگا رہتا۔ شیطانی مکر و فریب کے بارے میں غوث الاعظمؒ نے اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''شیاطین ہیبت ناک صورتوں میں مسلح ہو کر قطار در قطار میرے سامنے آتے اور مجھ پر آگ پھینکتے۔ میں اپنے خدا کی پناہ مانگتا اور پھر تائید غیبی سے وہ آگ بجھ جاتی۔ ایک بار ایک نہایت بدصورت شخص میرے پاس آیا۔ اس کے جسم سے بدبو آ رہی تھی۔ میں نے اسے بندۂ خدا سمجھ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ورنہ اس کا وجود میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

''عبدالقادر! معرفت کے شہنشاہ ہوتے ہوئے تم اس ویرانے میں کہاں بھٹک رہے ہو؟'' اُس کریہہ المنظر شخص نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے کیسے پہچانتے ہو؟'' مجھے حیرت تھی کہ اس ویرانے میں یہ شناسا کہاں سے آ گیا۔''

''مجھ سے زیادہ تمہیں کون پہچانے گا؟'' وہ بدصورت شخص بڑے مکروہ انداز میں ہنسا۔ ''میں ابلیس ہوں اور تمہیں مبارکباد دینے آیا ہوں۔''

میں اُس کے طرزِ تخاطب پر سنبھل گیا۔ وہ مجھے اسیر کرنے کے لئے مکر و فریب کا نیا جال لے کر آیا تھا۔

''کیسی مبارکباد؟'' میں نے ابلیس سے پوچھا۔

''مجھے اور میرے گروہ کو تم نے اپنی پرہیزگاری سے عاجز کر دیا ہے۔ اس لئے میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں اور کچھ دن تمہاری خدمت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں سے دور ہو جا بدنصیب! تجھے میری پرہیزگاری نے نہیں، خدا کی قدرت نے عاجز کیا ہے۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ ایک غیبی ہاتھ نے اس کے سر پر ایک کاری ضرب لگائی اور وہ زمین میں دھنس گیا۔

پھر وہی شیطان میرے پاس آیا اور آگ کے شعلوں سے میرے ساتھ جنگ کرنے لگا۔ اس کے حملے بہت خطرناک تھے۔ میں نے گھبرا کر اپنے اللہ کو پکارا۔ یکایک اس ویرانے میں ایک شہسوار نمودار ہوا۔ اس نے تلوار میری طرف بڑھائی جسے دیکھتے ہی شیطان بھاگ کھڑا ہوا۔

تیسری بار وہی شیطان مجھے پھر نظر آیا مگر اس وقت وہ مجھ سے دور بیٹھا گریہ و زاری میں مشغول تھا اور اپنے سر پر خاک ڈال رہا تھا۔ ''عبدالقادر! اب میں تجھ سے بالکل مایوس ہو چکا ہوں۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''ملعون! یہاں سے چلا جا۔ میں تجھ سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہوں۔''

پھر اس نے میرے گرد بہت سے جال بچھا دیئے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ وسوسوں اور اندیشوں کے جال ہیں جن کے ذریعے میں تم جیسے لوگوں کو شکار کرتا ہوں۔''

میں نے ایک سال تک شیطان کے بچھائے ہوئے ان جالوں پر توجہ کی پھر ایک ... آیا کہ خدا کے فضل و کرم سے وہ سب کے سب ٹوٹ گئے۔

اس کے بعد مجھ پر میرا نفس ظاہر کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ابھی اس کے امراض باقی ہیں۔ اس کی خواہشات زندہ ہیں اور اس کا شیطان سرکش ہے۔ میں نے سال بھر تک اس کی طرف توجہ نہ کی۔ آخر نفس کی تمام بیماریاں جڑ سے جاتی رہیں۔ اس کی خواہشات مُردہ ہوگئیں۔ اس کا شیطان مسلمان ہوگیا اور سارے کام اللہ کے لئے ہوگئے۔ میں اپنی ہستی سے جدا ہوگیا مگر پھر بھی اپنے مقصد کو نہیں پہنچا۔

پھر میں توکل کے دروازے پر آیا مگر یہاں بہت بڑا ہجوم تھا۔ میں اس ہجوم کو چیر کر نکل گیا۔

پھر میں شکر کے دروازے پر آیا۔ یہاں بھی بہت بڑا ہجوم تھا مگر میں تیزی سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا۔

پھر میں مشاہدے کے دروازے پر آیا۔ یہاں بھی وہی ہجوم تھا، بڑی کشاکش کے بعد اندر داخل ہوا۔

اور آخر میں فقر کے دروازے پر آیا تو اسے خالی پایا۔ میں اس میں بڑی آسانی کے ساتھ داخل ہوگیا۔ پھر جب اندر پہنچا تو وہاں وہ ساری چیزیں موجود تھیں جنہیں میں ترک کرچکا تھا۔ یہاں مجھے ایک بہت بڑے خزانے کی فتوحات میسر آئیں۔ روحانی عزت، حقیقی غنا اور سچی آزادی ملی۔ یہاں آکر میں نے اپنی زیست کو مٹا دیا، اپنے اوصاف کو چھوڑ دیا جس سے میری ہستی میں ایک دوسری حالت پیدا ہوگئی۔

❁ .... ✿ ✿ .... ❁

حضرت غوث اعظمؒ کے حوالے سے شیطان کے مکر و فریب کا ایک اور اہم واقعہ اسلامی تصوف کی دنیا میں مشہور ہے۔ اس واقعے کو تمام معتبر تذکرہ نگاروں نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حضرت غوث الاعظمؒ کے صاحب زادے حضرت شیخ ضیاء الدینؒ کی روایت ہے کہ ایک مجلس میں والد محترم نے مجھ سے فرمایا۔

"ایک بار دورانِ سیاحت میں ایک ایسے جنگل کی طرف نکل گیا جہاں "آب و دانے" کا نام تک نہ تھا۔ مجھے کئی دن تک پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں آیا۔ پیاس کی شدت اس قدر بڑھی کہ میں نیم جاں ہوکر رہ گیا۔ پھر میں نے بے چارگی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا۔ یکایک بادل کا ایک ٹکڑا اٹھا اور میرے سر پر آکر برسنے لگا۔ میں نے اپنی پیاس بجھائی اور اپنے پالنے والے کا شکر ادا کیا۔

پھر اسی رات میں ذکر الٰہی میں مشغول تھا کہ اچانک میرے چاروں طرف تیز روشنی

پھیل گئی۔ میں نے گھبرا کر دیکھا، زمین سے لے کر آسمان تک نور ہی نور تھا۔ مجھے یقین آگیا کہ میری ریاضت قبول ہوگئی ہے کیونکہ میں نے آج تک ایسی نورانی فضا نہیں دیکھی تھی۔ ابھی میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کررہا تھا کہ اس نور سے ایک پُرجلال آواز پیدا ہوئی۔

"عبدالقادر! ہم تیری عبادت سے بہت خوش ہوئے۔"

تمام عمر جسے تلاش کیا تھا آج وہی ذات پاک مجھ سے ہم کلام تھی۔ میں جواب میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا مگر جذبات کی شدت نے مجھ سے قوتِ گویائی چھین لی تھی۔

"نوید ہو تجھے کہ تُو نے ہماری رضا حاصل کرلی۔" نور سے دوبارہ وہی پُرجلال آواز اُبھری۔

اس بار بھی میں نے کچھ عرض کرنا چاہا مگر زبان میرا ساتھ نہ دے سکی۔

"عبدالقادر! میں تیرا پروردگار ہوں۔" تیسری بار وہی صدا سنائی دی۔ "میں نے تیری عبادت سے خوش ہوکر تجھ پر حرام چیزیں بھی حلال کردی ہیں۔"

اس طرزِ کلام نے مجھ پر دہشت طاری کردی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیسی روشنی ہے اور اس کے پس پردہ کون ہے۔

"لَا حول وَلا قوۃ اِلّا باللہ العلی العظیم"

میں نے با آواز بلند پڑھا پھر میری آواز کی گونج ختم ہوتے ہی ساری روشنی زائل ہوگئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اب میرے سامنے ایک کریہہ المنظر شخص کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بڑے عجیب سے لہجے میں بولا۔

"افسوس! میرا یہ وار خالی گیا۔ میں نے اپنی اس تدبیر سے سینکڑوں اولیاء کو گمراہ کیا ہے مگر عبدالقادر! تُو اپنے علم کی وجہ سے بچ گیا ورنہ آج راندۂ درگاہ ہوجاتا۔"

میں نے دوبارہ "لاحول" پڑھی اور ابلیس سے مخاطب ہوکر کہا۔

"دُور ہوجا مردود! تُو ایک لمحے کے لئے بھی مکروفریب سے باز نہیں آسکتا۔ چلتے چلتے بھی وار کررہا ہے۔ میں اپنے علم کی وجہ سے نہیں، خدا کے فضل و کرم کے سبب تیرے فتنے سے محفوظ رہا۔"

ابلیس کچھ دیر تک میرے سامنے کھڑا اپنا سر پیٹتا رہا اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا۔

"افسوس! ہزار بار افسوس کہ آج تیرا نام میرے ماننے والوں کی فہرست سے خارج ہوگیا۔"

بعض مؤرخین نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اچانک نور سے ایک آواز

پیدا ہوئی۔

''عبدالقدر! تُو نے ہمیں راضی کر لیا۔ ہم بطور انعام تجھ پر باقی زندگی کی عبادت معاف کرتے ہیں۔''

جب حضرت غوث اعظمؒ یہ واقعہ بیان فرما چکے تو آپؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ ضیاء الدینؒ نے عرض کیا۔

''آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ وہ شیطان ہے جو نور کے پردے میں آپ سے ہم کلام ہے؟''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ ''صرف اس کے اس قول سے کہ حرام چیزیں بھی حلال کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کو حرام کاموں اور فحش باتوں کا حکم نہیں دیتا۔''

دوسری روایات کے مطابق آپؒ نے اپنے صاحب زادے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''جب اللہ نے اپنے بڑے سے بڑے رسول پر عبادت معاف نہیں کی تو پھر عبدالقادر کی کیا حیثیت ہے؟ بس اسی بات سے میں نے پہچانا کہ وہ شیطان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔''

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب اخلاقی قدریں زوال پذیر ہو چکی تھیں اور پورا بغداد فتنہ و فساد سے بھر گیا تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے یہ جاں سوز مناظر دیکھے تو آپؒ کے قلبِ حساس کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ آپؒ نے قرآن شریف گلے میں حمائل کیا اور بغداد کو خیر باد کہہ دیا۔ ابھی حضرت غوث اعظمؒ شہری حدود سے نکلے ہی تھے کہ ایک صدائے غیبی سنائی دی۔

''عبدالقادر! کہاں جا رہے ہو؟''

''شہر کے فتنوں سے دُور کسی جنگل بیابان کی طرف!'' حضرت غوث اعظمؒ نے جواب دیا۔

''واپس لوٹ جاؤ۔ تمہاری وجہ سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے گا۔'' غیبی آواز نے کہا۔

''مجھے مخلوق سے کیا غرض۔ میں تو اپنے دین کی حفاظت کے لئے کسی ویرانے کی طرف جاتا ہوں۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جواب دیا۔

''تم یہیں رہو۔ تمہارا دین سلامت رہے گا۔'' غیبی آواز نے آپؒ کو تسلی دی۔

حضرت غوث اعظمؒ واپس تشریف لے آئے اس کے بعد آپؒ کے ذہن میں کچھ

سوالات پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جس قدر ان سوالات پر غور کرتے دماغ اُلجھتا چلا جاتا یہاں تک کہ آپؒ کی اس ذہنی کشمکش نے اضطراب کی شکل اختیار کر لی۔ پھر یہ بے چینی اس قدر بڑھی کہ حضرت غوث اعظمؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''اے مشکل کشائے عالم! مجھے اپنے ایسے کسی باخبر بندے سے ملا دے کہ جس کی وجہ سے میرے سارے شبہات دور ہو جائیں۔''

دوسرے دن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک مکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک بزرگ نمودار ہوئے۔ بزرگ کے چہرے سے معرفت کا جلال ظاہر ہو رہا تھا۔

''عبدالقادر! تم نے اللہ تعالیٰ سے کل کیا مانگا تھا؟'' بزرگ نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پر ان بزرگ کا اس قدر رعب قائم ہوا کہ آپؒ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکے اور شدید حیرت کے عالم میں خاموش کھڑے رہے۔

بزرگ نے غضب ناک نظروں سے حضرت غوث اعظمؒ کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر اس قدر زور سے دروازہ بند کیا کہ اطراف کا گرد و غبار اُڑ کر آپؒ کے چہرے پر پڑا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حیرت و سکوت کے عالم میں کچھ دیر تک بند دروازے کو دیکھتے رہے۔ پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں آگے تشریف لے گئے۔ ابھی آپؒ نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ رات کا واقعہ یاد آ گیا جب آپؒ نے اللہ کے کسی خاص بندے سے ملاقات کے لئے دعا کی تھی۔ حضرت غوث الاعظمؒ فوراً ہی واپس لوٹ آئے مگر وہاں کوئی مکان موجود نہیں تھا۔ آپؒ کو بہت رنج ہوا کہ منزل کے قریب پہنچ کر بھی دور ہو گئے۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ملاقات ان ہی بزرگ سے ہوئی۔ آپؒ نے فوراً پہچان لیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ان بزرگ کی محبت کی وجہ سے حضرت غوث اعظمؒ کے ذہن میں اُبھرنے والے سارے شبہات دور ہو گئے۔

یہ بزرگ حضرت شیخ حماد بن مسلمؒ تھے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ولایت کے آثار تو بچپن ہی سے ظاہر تھے مگر خود آپؒ کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب آپؒ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ ایک بار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب

آپؒ ''منارہ اُم القرون'' کے قریب پہنچے تو آپؒ کی ملاقات شیخ عدی بن مسافرؒ سے ہوئی۔ شیخ عدیؒ بھی اس وقت نوجوانی کی منزل سے گزر رہے تھے۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' شیخ عدیؒ نے حضرت غوث اعظمؒ سے پوچھا۔

''خدا کے گھر حاضری دینے کا ارادہ ہے۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

''کیا اس مبارک سفر میں میرا اور آپ کا ساتھ ہو سکتا ہے؟'' شیخ عدیؒ نے دوسرا سوال کیا۔

''کیوں نہیں۔ ہزار بار۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

پھر ایک دن اسی سفر کے دوران آپ دونوں کی ملاقات ایک برقع پوش نوعمر حبشی لڑکی سے ہوئی۔ یہ حبشی لڑکی اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے بہت لاغر و نحیف تھی۔ اس لڑکی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف دیکھا اور شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

''آج آپ نے مجھے بہت تھکا دیا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا۔

''ابھی میں بلادِ حبشہ میں تھی مجھے اس وقت مشاہدہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل پر تجلی کی ہے۔'' حبشی لڑکی نے پُرسوز لہجے میں کہا۔ ''اور آپ پر اپنے اس فضل و کرم کی بارش کی ہے جو زمانہ حال میں کسی دوسرے پر نہیں کی گئی۔ اس لئے بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت شیخ عدیؒ حیرت سے اس حبشی لڑکی کی گفتگو سنتے رہے۔

''میرا ارادہ ہے کہ آج دن بھر میں آپ دونوں صاحبوں کے ہمراہ رہوں اور آپ ہی کے ساتھ روزہ افطار کروں۔''

''ہمارے سرآنکھوں پر۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت شیخ عدیؒ نے بیک زبان فرمایا۔

اس کے بعد حضرت غوث اعظمؒ اور حضرت شیخ عدیؒ ایک طرف اور حبشی لڑکی دوسری طرف چلے گئے۔ پھر جب افطار کا وقت آیا تو تینوں حضرات ایک مقام پر جمع ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت شیخ عدیؒ اس بات پر حیران تھے کہ وہاں افطار کا کوئی سامان موجود نہیں تھا اور حبشی لڑکی نہایت اطمینان کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی تھی۔

ابھی وہ دونوں حضرات یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک طباق آسمان سے اُترا۔ اس طباق کو دیکھ کر حبشی لڑکی نے بڑے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''اللہ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے میری اور میرے مہمانوں کی عزت کی۔ ہر رات میرے لئے دو روٹیاں اُترا کرتی تھیں لیکن آج چھ روٹیاں بھیجی گئی ہیں۔''

تینوں بزرگوں نے دو دو روٹیاں کھائیں اس کے بعد پانی کے کوزے اُترے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا بیان ہے کہ وہ پانی اپنی حلاوت اور لذت میں دنیا کے پانی سے بہت مختلف تھا۔

پھر وہ حبشی لڑکی دونوں بزرگوں سے رخصت ہو کر چلی گئی۔

ایک دن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور شیخ عدیؒ طواف کر رہے تھے کہ شیخ عدیؒ کے دل پر انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی اور شیخ عدیؒ بے ہوش ہو گئے۔ دیکھنے والے خیال کرتے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت غوث اعظمؒ نے دوبارہ اسی حبشی لڑکی کو دیکھا۔ وہ شیخ عدیؒ کے قریب آئی اور بے اختیار کہنے لگی۔

''تمہیں وہی زندہ کرے گا جس نے تمہیں مار ڈالا ہے........ پاک ہے وہ ذات کہ جس کی تجلی کے سامنے کوئی شے باقی نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ خود اسے برقرار نہ رکھنا چاہے۔''

پھر وہ حبشی لڑکی حضرت غوث اعظمؒ سے مخاطب ہوئی۔

''اے نوجوان! میں نہیں جانتی کہ آئندہ تیرا کیا مرتبہ ہوگا؟ اس وقت تو میری آنکھیں بس اتنا دیکھ رہی ہیں کہ تیرے چاروں طرف ایک نورانی خیمہ ہے اور آسمان تک تجھے فرشتوں نے گھیر رکھا ہے اور اولیاء کی نگاہیں اپنے اپنے مقامات پر تیری طرف لگی ہوئی ہیں اور سب کے سب خواہش مند ہیں کہ تیری ذات سے انہیں فیض حاصل ہو۔''

یہ کہہ کر وہ حبشی لڑکی چلی گئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے دوبارہ اس کی ملاقات نہیں ہوئی مگر وہ یہ ظاہر کر گئی کہ ویرانوں اور خرابوں میں زیست بسر کرنے والا فاقہ کش نوجوان اپنے وقت کا غوث ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بے شمار اساتذہ سے علم شریعت اور اس وقت کے مروجہ فنون حاصل کئے۔ آپؒ کا شاگردی اختیار کرنے اور بزرگوں کی خدمت میں نیاز مندی ظاہر کرنے کا انداز بھی بڑا عجیب تھا۔ اگر کسی بزرگ کی صحبت میں چند لمحے بھی گزرتے تو اپنے اساتذہ کی فہرست میں شامل کر لیتے۔ اگر کسی اہل علم سے ایک سوال بھی کرتے تو وہ شخص عمر بھر کے لئے آپ کا استاد قرار پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے جن سے حضرت غوث اعظمؒ فیض یاب ہوئے۔ آپؒ نے طریقت کی تعلیم حماد بن مسلمؒ سے حاصل کی۔

آخر شدید ریاضتوں اور طویل مجاہدوں کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت ابوسعید مبارک مخزومیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قاضی ابوسعید مبارکؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔

غوث اعظمؒ کو دیکھ حضرت قاضی ابوسعید مبارکؒ نے فرمایا۔ ''بس اے جانِ بے قرار! اب گوشہ نشین ہو جا۔''

''شیخ! یہ دلِ مضطرب کسی ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتا۔'' حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے عرض کیا۔

''جب تیرا دل ہی قرار نہیں پکڑے گا تو پھر مخلوقِ خدا تجھ سے کس طرح فیض یاب ہو گی؟'' حضرت قاضی ابوسعید مبارک مخزومیؒ نے فرمایا۔

''شیخ! میں نجات چاہتا ہوں۔'' حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے دوبارہ عرض کیا۔

''اللہ نے تجھے تو نجات بخش دی۔ اب ان شکستہ حالوں کا خیال کر جو نجات کی تلاش میں در در بھٹک رہے ہیں۔'' قاضی ابوسعید مبارکؒ نے فرمایا۔

پھر وہ نیک ساعت آ پہنچی جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی حضرت قاضی ابوسعیدؒ کے دستِ مبارک پر بیعت ہو گئے۔

رسم بیعت ادا ہونے کے بعد پیر و مرشد نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔ ''حضرت ابوسعید مبارک مخزومیؒ نے مجھے کھانا تو اس وقت بھی کھلایا تھا جب میں ''برج عجمی'' میں مقیم تھا اور فاقہ کشی کی حالت میں کئی دن گزر گئے تھے...... مگر یہ کھانا اس کھانے سے بہت مختلف تھا۔ پیر و مرشد کا عطا کردہ ایک لقمہ شکم میں جاتے ہی عجیب کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ ہر لقمے کے ساتھ مجھے محسوس ہوتا کہ میرا باطن نور سے بھر گیا ہے۔ وہ ایک عام سادہ سی غذا تھی مگر اس کی لذت بیان نہیں کی جا سکتی۔ دنیا کے بہترین کھانے بھی ہیچ تھے۔''

اس کے بعد حضرت قاضی ابوسعید مبارکؒ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو خرقہ ولایت عطا کرتے ہوئے فرمایا۔

''عبدالقادر! یہ وہ خرقہ ہے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرمایا تھا۔ پھر ان سے حضرت حسن بصریؒ کو عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد حضرت حبیب عجمیؒ، حضرت شیخ داؤد طائیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ، حضرت ابوالفضل عبدالواحد تمیمیؒ، حضرت شیخ طرطوسیؒ اور حضرت شیخ ابوالحسن علیؒ سے ہوتی

ہوئی یہ مقدس امانت مجھ تک پہنچی...... اور اب میں یہ امانت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اللہ اس کی حفاظت کرے اور تمہیں اپنے پیرانِ طریقت کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

حضرت قاضی ابوسعید مبارک مخزومیؒ کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پر رقت طاری ہو گئی۔ ایک موقع پر حضرت غوث اعظمؒ نے اپنی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''ریاضتوں اور مجاہدوں کے دوران مجھ پر عجیب عجیب اسرار منکشف ہوئے تھے۔ پھر جب خرقہ ولایت پہنا تو دل ونظر کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس قدر تجلیاتِ الٰہی کا ظہور ہوا کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔''

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت قاضی ابوسعید مبارکؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہی رہتا تھا۔ آپؒ چاہتے تھے کہ ایک بار پھر ان ہی بیابانوں اور خرابوں کی طرف نکل جائیں جہاں سکوت اور ویرانی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کوئی آپ کو دیکھے اور نہ آپ کسی کو دیکھیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی دنیا سے بیزاری، خلوت نشینی اور دشت نوردی اس لئے نہیں تھی کہ آپؒ رہبانیت کے قائل تھے۔ اللہ نے حضرت غوث اعظمؒ کو عقل سلیم عطا فرمائی تھی۔ آپؒ اسلام کی روح سے واقف تھے اور اس دنیا کو دارالعمل سمجھتے تھے۔ دراصل اس گوشہ نشینی کی وجہ بغداد کے وہ سیاسی اور معاشرتی حالات تھے جنہوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے قلبِ حساس کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

عام مسلمانوں کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ تو کیڑے مکوڑوں کی طرح گناہوں کی دلدل میں رینگ رہے تھے۔ خود علماء کا یہ حال تھا کہ وہ صرف اپنی ذات کو سربلند رکھنے کے لئے ایک دوسرے کے مسلک پر طعنہ زنی کر رہے تھے۔ مناظروں کی مجلسوں میں دستارِ فضیلت اُچھالی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے ہم مذہب کو کافر قرار دینا سب سے زیادہ آسان کام تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی ایک تقریر میں اس وقت کے علماء کی ظاہری حالت اس طرح بیان فرمائی ہے۔

''اے علم وعمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت؟ اے اللہ اور رسولؐ کے دشمنو! اے بندگانِ خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں مبتلا ہو۔ اے عالمو! اے زاہدو! شاہان وسلاطین کے لئے تم کب تک منافق بنے رہو گے؟ ان سے دنیا کا زر

و مال اور لذتیں لیتے رہو گے؟ تم اور اکثر بادشاہ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے لئے ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تو اسی بے پناہ اور بے مثال طاقت سے منافقوں کی شوکت توڑ دے اور ان کو ذلیل فرما۔ یا پھر انہیں توبہ کی توفیق دے...... اور ظالموں کا قلع قمع فرما اور زمین کو ان سے پاک کر دے یا پھر ان کی اصلاح فرما دے۔“

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی یہ پُرسوز تقریر پڑھ کر ایک عام مسلمان بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت کے علماء اور شیوخ کی اکثریت کس بے حسی کے ساتھ دنیا سے چمٹی ہوئی تھی اور کس بے ضمیری سے اپنی غیرت دینی کو سلاطین کے درباروں میں فروخت کر رہی تھی۔

ایک اور موقع پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اسلام رو رہا ہے...... اور ان فاسقوں اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے ظلم سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد کر رہا ہے۔ اپنے سے پہلے گزر جانے والوں اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کرو کہ ”امر و نہی“ بھی کرتے تھے اور کھاتے پیتے بھی تھے اور پھر دفعتہً موت پا کر ایسے ہو گئے جیسے کبھی ہوئے نہ تھے۔ تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتا بھی شکار کھیلنے اور کھیتی اور مویشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کا خیر خواہ ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر خوشی کے مارے کھلاریاں کرتا ہے...... حالانکہ وہ اسے شام کے وقت صرف ایک دو نوالے یا ذرا سی مقدار میں کھانا دیا کرتا ہے...... اور تُو ہر وقت اللہ کی مختلف نعمتیں شکم سیر ہو کر کھایا کرتا ہے...... مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اسے مقصود ہے نہ تُو اس کو پورا کرتا ہے اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے بلکہ اس کے برعکس اس کا حکم رد کرتا ہے اور اس کی حدودِ شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔“

یہ تھا علماء وقت کا احوال۔

دوسری طرف برسر اقتدار طبقہ تھا جس نے ذاتی منصب و جاہ کی خاطر اسلامی مملکت کی سالمیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ علماء کے عہد میں سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اپنے عروج پر تھی۔ سیاست کے میدان میں سلجوقی سلاطین خود کو عظیم و برتر ثابت کرنا چاہتے تھے...... اور عباسی خلفاء کا دعویٰ تھا کہ اقتدار صرف ان کی میراث ہے اور کوئی دوسری قوم اس کا استحقاق نہیں رکھتی۔ نتیجتاً دونوں سیاسی گروہوں میں خوف ناک معرکہ آرائی ہوتی۔ دونوں طرف مسلمان ہوتے اور ایک کلمہ گو

دوسرے کلمہ گو کی گردن پر بڑی بے رحمی اور سفاکی سے خنجر آزمائی کرتا۔

اس طرح کے واقعات خلیفہ مسترشد کے زمانے میں کئی بار پیش آئے۔ یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول خلیفہ تھا۔ بہت شجاع، حوصلہ مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت ہی عبادت گزار ... خلیفہ مسترشد خاص و عام سب کی نظروں میں محبوب تھا۔ اکثر جنگوں میں اس کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر 10 رمضان 519 ھ میں سلطان مسعود اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں مسترشد کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔

سلطان مسعود کا لشکر فاتح ٹھہرا اور خلیفہ مسترشد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اہلِ بغداد کی املاک لوٹ لی گئیں۔ پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح دوسرے صوبوں میں بھی پھیل گئی مگر بغداد خاص طور پر اس الم ناک واقعے سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ یہاں کے باشندے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور ان کے دل و دماغ میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا۔ انتہا یہ ہے کہ پردہ دار خواتین بھی کھلے سروں کے ساتھ نوحہ خوانی کرتی ہوئی گھروں سے باہر نکل آئیں...... اور خلیفہ مسترشد کی قید اور اس کے آلام و مصائب پر سرِ راہ ماتم کرنے لگیں۔ آخر دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے اور پھر یہ فتنہ اس قدر بڑھا کہ کم و بیش تمام خطے متاثر ہو گئے۔ ملک سنجر نے صورتِ حال کی سنگینی کو پوری شدت سے محسوس کیا اور اپنے بھتیجے کو معاملے کی نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ خلیفہ مسترشد کو بحال کر دے۔ ملک مسعود نے فوری طور پر چچا کے حکم کی تعمیل کی اور عباسی خلیفہ کو رہا کر دیا......

مگر بدقسمتی سے مسترشد قصرِ خلافت تک نہ پہنچ سکا۔ باطنیوں کی ایک طاقت ور جماعت جو عام مسلمانوں کے عقائد اور سیاسی معاملات میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھی، بہت دنوں سے گھات لگائے کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھی۔ خلیفہ مسترشد، ملک مسعود کی قید سے آزاد ہو کر قصرِ خلافت کی طرف جا رہا تھا کہ باطنیوں نے اسے راستے ہی میں قتل کر دیا۔ یہ عباسی خلیفہ کی تیرہ بختی تھی یا ملک مسعود کی سازش کہ سلطان سنجر کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور مملکتِ اسلامیہ میں امن بحال نہ ہو سکا۔ بعض مؤرخین نے اپنے شبہات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ملک مسعود کے انتظامات سخت ہوتے تو باطنیوں کا سفاک خنجر خلیفہ مسترشد کی شہ رگ کو نہیں چھو سکتا تھا۔ چند مسلح سپاہیوں کے ہمراہ عباسی خلیفہ کو ایک عام قیدی کی طرح روانہ کر دینا حماقت نہیں، گہری سازش تھی۔ بہرحال مسترشد کو جوانی کے عالم میں قتل کر دیا گیا۔ مرتے وقت عباسی خلیفہ کی عمر 45 سال اور تین ماہ تھی۔ مدت خلافت 17 سال اور بیس دن۔ مسترشد آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم

برقرار رکھی تھی۔ اس کے بعد مسلمان حکمرانوں نے مکمل طور پر دنیا داری کے انداز اختیار کر لئے۔ پھر کوئی سلطان بنا، کسی نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا، اور کوئی "ظلِ الٰہی" یا "ظلِ سبحانی" کے منصب پر فائز ہو گیا۔

یہی وہ الم انگیز واقعات تھے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسے حساس انسان کو ہمہ وقت مضطرب رکھتے تھے۔ پھر جب قلب و روح کی یہ اذیت حد سے گزر جاتی تو آپؒ ویرانوں اور خرابوں کی طرف نکل جاتے تا کہ آپؒ کی آنکھیں ان جاں سوز مناظر سے محفوظ رہ سکیں۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

شاید ایک بار پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کسی بیاباں کا رخ اختیار کرتے مگر اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آپؒ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا اور گوشہ نشینی کی خواہش کو یکسر بدل ڈالا۔

ایک رات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ سرورِ کونینؐ نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"فرزند! تم بات کیوں نہیں کرتے؟" (وعظ کیوں نہیں کہتے؟)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے عرض کیا۔ "آقا! میں عجمی ہوں۔ فصحائے عرب کے سامنے کس طرح زبان کھول سکتا ہوں؟"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "اچھا اپنا منہ کھولو۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے آقا کے حکم پر عمل کیا۔

سرورِ کائناتؐ نے سات بار یہ آیت پڑھ کر آپؒ کے حلق پر دم فرمائی۔

"بلا پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ۔" (ترجمہ)

دوسری روایت اس طرح ہے کہ جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے عجمی ہونے کے سبب اپنی معذوری کا اظہار کیا تو سرکارِ دو عالمؐ نے سات بار اپنا لعابِ دہن آپؒ کے منہ میں ڈالا اور پھر فرمایا۔

"جاؤ عبدالقادر! اب مخلوقِ خدا کو نصیحت کرو۔"

سلسلۂ خواب ختم ہوا تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے محسوس کیا کہ دشت نوردی اور گوشہ نشینی کا جذبہ آپؒ کے دل سے رخصت ہو چکا ہے۔

پھر اہلِ بغداد نے فرزند سادات کو انسانی ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے دیکھا۔

"میں کہ میری تلوار مشہور ہے...... میری کمان کھنچی ہوئی ہے...... میرا تیر سینہ

شگاف ہے...... میرا نیزہ نشانہ باز ہے...... میں محفوظ ہوں...... میں ملحوظ ہوں۔ روزہ دارو! آؤ...... شب بیدارو! آؤ...... پہاڑوں کے عبادت گزارو! آؤ...... اور خانقاہ نشینو! آؤ...... خدا کے کام کے لئے میرے پاس آؤ کہ میں اسی کے امر سے تمہیں بلاتا ہوں...... میرے فیض کا دریا بے کنار ہے۔ عزت رب کی قسم! اچھے برے سب میرے سامنے ہیں۔ میری نگاہیں لوحِ محفوظ پر ہیں۔ میں دریائے علم و مشاہدۂ الٰہی کا تیراک ہوں۔ میں خدائے تعالیٰ کی حجت ہوں۔ میں نائب و وارثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں۔ میری مجلس میں فرشتے اور مردانِ غیب اس لئے آتے ہیں کہ مسجد سے بارگاہِ اقدس کے آداب سیکھیں۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جس وقت یہ تقریر فرمائی، آپ کے صاحبزادے سیّد عبدالرزاقؒ منبر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہو گئے۔ سیّد عبدالرزاق کے لباس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ منبر سے تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں سے فرزند کے کپڑوں کی آگ بجھائی۔ اہلِ مجلس پر وجد طاری تھا۔ انہیں خبر ہی نہیں ہو سکی کہ سیّد عبدالرزاقؒ کے لباس میں آگ کب لگی اور حضرت شیخؒ نے اس آگ کو کس طرح بجھایا۔

پھر جب مجلس اپنے اختتام کو پہنچی تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے سیّد عبدالرزاقؒ سے دریافت فرمایا۔ "فرزند! اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہے؟"

سیّد عبدالرزاقؒ نے عرض کیا۔ "جب میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے مردانِ غیب ساکت و مدہوش کھڑے اس طرح نظر آئے کہ سارا آسمان ان سے بھرا ہوا تھا اور سب کے جسموں میں آگ لگی ہوئی تھی۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت قاضی ابوسعید مبارک مخرمیؒ کے مدرسے سے وعظ کا آغاز فرمایا تھا۔ مگر کچھ دن بعد ہی لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسے میں بیٹھنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر چند اہلِ خیر نے مدرسے کی عمارت میں توسیع کر دی لیکن طالبانِ شوق کی کثرت کے سبب یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی۔ آخر آپؒ نے بندگانِ خدا کی تسکین کیلئے شہر کے باہر عیدگاہ کو اپنی مجلسِ وعظ بنا لیا۔ حضرت شیخؒ کی کرسی اس طویل و عریض میدان میں رکھ دی جاتی اور لوگ قطار در قطار آپؒ کے گرد جمع ہونے لگے۔

معتبر اور مستند مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلسِ وعظ میں

حاضرین کی تعداد ستّر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ معتقدین اور مریدین ایسے مواقع پر سوچا کرتے تھے کہ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد حضرت شیخؒ کی تقریر سے کس طرح مستفیض ہو سکے گی؟ ان کی یہ سوچ فطرت کے اس اصول کے مطابق تھی کہ انسانی آواز ایک مخصوص اور محدود دائرے میں سنی جا سکتی ہے۔ اس وقت لاؤڈ اسپیکر جیسا برقی آلہ ایجاد نہیں ہوا تھا جس کے ذریعے بیک وقت لاکھوں انسان کسی واعظ کی تقریر سن سکتے ہیں۔ مگر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس وعظ میں نزدیک و دور بیٹھنے والا ہر شخص کسی آلے کی مدد کے بغیر آپؒ کی تقریر اس طرح سن لیتا تھا جیسے حضرت شیخؒ صرف اسی سے مخاطب ہوں۔ یہ آپؒ کی بڑی کرامت ہے جس پر ایک نہیں، ہزاروں گواہیاں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

شیخ ابوالحسن سعد انصاریؒ کا بیان ہے کہ میں 529ھ میں بغداد پہنچا اور سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوا۔ تاخیر سے پہنچنے کے سبب مجھے آخری صفوں میں جگہ میسر آسکی۔ اس وقت حضرت شیخؒ ''زہد'' کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کاش آپ ''معرفت'' پر کچھ ارشاد فرمائیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے سنا کہ حضرت شیخؒ فرما رہے تھے۔

''معرفت کیا ہے؟'' پھر آپؒ نے معرفت کے موضوع پر ایسی فکر انگیز اور پُر اثر تقریر فرمائی کہ اس سے پہلے میں نے کسی عالم کی زبان سے نہیں سنی تھی۔

اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کاش حضرت شیخؒ ''شرک'' کے موضوع پر تقریر فرما دیں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے موضوع بدل دیا اور شرک پر ایسی تقریر فرمائی کہ میرے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ آج سے پہلے الفاظ و معانی کا ایسا سیلاب میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

پھر میں نے چاہا کہ حضرت شیخؒ ''فنا اور بقا'' کے مسئلے میں میری تسلی فرما دیں۔ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ''فنا اور بقا'' کے موضوع پر بھی ایسی تقریر فرمائی جو نادر روزگار تھی۔

مجھے اپنی ذات پر فخر ہونے لگا کہ حضرت شیخؒ کس فیاضی کے ساتھ مجھ پر توجہ فرما رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آپؒ نے آج کی مجلسِ وعظ صرف میرے ہی لئے وقف کر دی ہے۔ میں نے سوچا کہ کاش حضرت شیخؒ ''غیب و حضور'' کے مسئلے کو بھی حل فرما دیں۔

سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے میری اس خواہش کو بھی پذیرائی بخشی اور ''غیب و حضور'' کی ایسی عقدہ کشائی فرمائی کہ میرا بے قرار ذہن سکون پا گیا۔

تقریر ختم کرنے کے بعد سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے حاضرین کی پچھلی صف پر نگاہ کی اور براہِ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''ابوالحسن! کیا یہ تیرے لئے کافی ہے؟''

حضرت شیخؒ کی زبان مبارک سے یہ سننا تھا کہ میری حالت غیر ہو گئی۔ میں نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک ہم عصر بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے جنات کی حاضری کا عمل کیا مگر کوئی جن حاضر نہیں ہوا۔ یہ بات میرے لئے بڑی حیران کن تھی۔ اس سے پہلے جب بھی عمل پڑھتا، جن بلا تاخیر حاضر ہو جاتے تھے لیکن اس روز عجیب صورتِ حال تھی۔ میں نے کئی گھنٹے تک اپنا عمل جاری رکھا۔ بالآخر وظیفے سے متعلق جن حاضر ہوئے۔ میں نے ان سے تاخیر کا سبب پوچھا۔

''ہم سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس وعظ میں حاضر تھے۔ اسی وجہ سے ہمیں یہاں تک پہنچنے میں دیر ہو گئی۔'' ایک جن نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کیا تم لوگ بھی حضرت شیخؒ کی مجلس میں حاضر ہوتے ہو؟'' میں نے حیران ہو کر اجنہ سے پوچھا۔

''آدمیوں کے اجتماع سے زیادہ وہاں ہمارا اجتماع ہوتا ہے اور ہمارے کئی قبائل ان کے دستِ مبارک پر ایمان بھی لا چکے ہیں۔'' اجنہ نے ایک عجیب راز کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

بزرگ اس انکشاف پر حیران رہ گئے اور انہیں پہلی بار اندازہ ہوا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی پُر اثر تقریروں سے صرف انسانوں ہی کو نہیں، آتشیں مخلوق کو بھی مسخر کر لیا ہے........ اور آخر ایسا کیوں نہ ہوتا؟ جس شخص کو بارگاہِ رسالت سے وعظ کہنے کا حکم دیا گیا ہو، اس کی زبان میں ایسی ہی تاثیر ہونی چاہئے تھی کہ اجنہ بھی اپنا راستہ تبدیل کر دیتے اور اس کی بارگاہِ جلال میں صف بستہ کھڑے رہتے۔

ایک بار سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کھلے میدان میں تقریر فرما رہے تھے۔ اس وقت دس ہزار سے زیادہ انسانوں کا ہجوم تھا اور ہر شخص وجد و کیف کی حالت میں حضرت شیخؒ کے ارشاداتِ گرامی سن رہا تھا۔ یکایک ایک سیاہ بادل اُٹھا اور آسمان پر چھا گیا۔ پھر تھوڑی دیر

بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔ ''میں تو صرف تیرے لئے تیری مخلوق کو جمع کرتا ہوں اور تُو انہیں منتشر کرنا چاہتا ہے۔''

ابھی فضا میں آپؒ کے الفاظ کی بازگشت تھی کہ اس میدان پر پانی برسنا بند ہو گیا جہاں آپؒ تقریر فرما رہے تھے۔ مگر میدان کے چاروں طرف پورے زور و شور سے بارش ہوتی رہی۔ ہزاروں انسانوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے حضرت شیخؒ کی اس کرامت کو دیکھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس واقعے کی شہرت دُور تک پھیل گئی اور پورا بغداد آپؒ کا وعظ سننے کے لئے اُمڈ پڑا۔ دُور دراز کے علاقوں میں رہنے والے ہزاروں انسان طویل سفر کی صعوبتیں اختیار کر کے آپؒ کی مجلسِ وعظ میں حاضر ہوتے اور اپنے دل و دماغ کی کثافتیں دور کر کے واپس چلے جاتے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے خطبے کا آغاز اس طرح کرتے۔

''الحمد للہ رب العالمین۔'' اس کے بعد آپؒ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتے۔ پھر اپنے رب کی حمد و ثناء کرتے اور کبریائی بیان کرتے۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر گواہی دیتے اور محسن انسانیتؐ کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتے۔ پھر خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کی تعریف فرماتے۔ تقریر کے آخر میں اس طرح دعا فرماتے۔

''اے پروردگار! امام اور امت، حاکم اور محکوم دونوں کو صلاحیت نصیب کر۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال۔ انہیں نیکی کی توفیق دے اور ایک دوسرے کے شر سے محفوظ رکھ۔ اے مولا! تُو ہمارے مخفی رازوں سے مطلع ہے، ان کی اصلاح کر۔ تجھے ہمارے گناہوں کی خبر ہے، انہیں معاف فرما۔ تُو ہمارے عیبوں سے آگاہ ہے، انہیں چھپا۔ تُو ہماری ضرورتوں کو جانتا ہے، انہیں پورا فرما۔ جن باتوں سے تُو نے منع کیا ہے، انہیں کرنے کا ہمیں موقع نہ دے۔ اور ہمیں توفیق دے کہ ہم تیرے احکام کے پابند رہیں۔ ہمیں اپنی اطاعت و عبادت کی عزت نصیب کر اور گناہوں کی ذلت میں ہمیں نہ ڈال۔ اپنے ماسوا سے ہمیں اپنی طرف کھینچ لے۔ جو تجھ سے ہمیں دور کرے، اسے ہم سے دور کر دے۔ ہمیں اپنا ذکر کرنے کا طریقہ سکھا اور صبر و شکر کی توفیق دے۔ اور اطاعت و عبادت میں ہمیں خلوص و یقین نصیب کر۔ اے پروردگار! ہم بھول جائیں یا ہم سے قصداً کوئی خطا ہو جائے تو درگزر فرما اور ہم پر اتنا بوجھ نہ ڈال جتنا کہ تُو نے اگلی اُمتوں پر ڈالا تھا۔ اے مولا! جس بات کی ہم میں طاقت نہ ہو اس میں تُو ہمیں مجبور نہ

کر۔ ہم سے نرمی فرما اور ہمارے گناہوں کو بخش دے اور اپنا فضل و کرم ہمارے شامل حال رکھ۔ تُو ہی ہمارا مالک اور حقیقی مددگار ہے۔ تُو ہی کافروں پر بھی ہماری مدد فرما۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تقریر کے دوران حاضرین کی یہ حالت ہوتی کہ جیسے روحیں پرواز کر چکی ہیں اور بے جان جسم مجلس وعظ میں موجود ہیں۔ کبھی کبھی سانسوں کی آوازیں سنائی دیتیں جن سے اندازہ ہوتا کہ سامعین زندہ ہیں...... ورنہ ہر طرف صرف ایک ہی آواز گونجتی رہتی...... حضرت شیخؒ کی پُر جلال اور باجبروت آواز......

تقریر کرنے کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حاضرین سے اس طرح مخاطب ہوتے۔ ''قال (بیان) ختم ہوا۔ اب ہم ''حال'' کی طرف آتے ہیں۔''

آپؒ کے یہ الفاظ سنتے ہی پورے مجمع کی حالت بگڑ جاتی اور لوگوں میں عجیب سا اضطراب پیدا ہو جاتا۔ ہر طرف سے گریہ و زاری کی آوازیں اُبھرنے لگتیں۔ کوئی شدتِ جذبات میں گریبان چاک کر کے جنگل کی راہ لیتا اور کوئی چیختے چیختے اپنی جان سے گزر جاتا۔ اکثر آپؒ کی مجلسِ وعظ سے کئی کئی جنازے نکلتے۔

یہ اسی ذاتِ پاکؐ کے لعاب دہن کا معجزہ تھا، جس نے عالم خواب میں آپؒ سے فرمایا تھا۔ ''جاؤ عبدالقادر! اب وعظ کہو۔''

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک روز حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس میں دس ہزار سے زیادہ افراد موجود تھے۔ حاضرین میں شیخ علی بن ابی نصر بھی موجود تھے جو آپؒ کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی حضرت شیخؒ کی تقریر شروع نہیں ہوئی تھی اور حاضرین مجلس آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ یکایک شیخ علی کو نیند آ گئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''خاموش ہو جاؤ!...... خاموش ہو جاؤ!''

حضرت شیخؒ کا یہ فرمانا تھا کہ حاضرین مجلس اس طرح خاموش ہو گئے کہ ان کی سانسوں کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ منبر سے نیچے اُتر آئے اور شیخ علیؒ کے روبرو ادب سے کھڑے ہو گئے۔ اہل مجلس حیران تھے کہ آج تک ان کے سامنے ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بہت دیر تک اسی حالت میں شیخ علیؒ کے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے پھر جب شیخ علیؒ بیدار ہوئے اور انہوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اپنے سامنے استادہ پایا تو خود بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

"علی! بیٹھ جاؤ۔" آپؒ نے اپنا دستِ شفقت شیخ علیؒ کے کاندھے پر رکھتے ہوئے فرمایا۔

"آپ کھڑے ہوں تو پھر یہ ناچیز کس طرح بیٹھ سکتا ہے؟" فرطِ عقیدت سے شیخ علیؒ کا لہجہ سرشار تھا۔

"بیٹھ جاؤ علی!" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے شیخ علی کے کاندھے کو دباتے ہوئے فرمایا۔ "میں کہہ رہا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔"

شیخ علیؒ حکم شیخ سے مجبور تھے۔ ناچار اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

"کیا سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی آپ کی خواب گاہ میں تشریف لائے تھے؟" حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے شیخ علیؒ سے دریافت فرمایا۔

"جی ہاں! ابھی کچھ دیر پہلے مجھے سرور کائناتؐ کے دیدار کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔" شیخ علیؒ نے رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

"میں سردارِ دو جہاںؐ کے احترام ہی میں کھڑا تھا۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

شیخ علیؒ، سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مقام سے واقف تھے مگر پھر بھی انہوں نے بڑی حیرت سے حضرت شیخؒ کی طرف دیکھا۔

"کیا سرکارِ دو عالمؐ نے آپ کو کوئی ہدایت بھی فرمائی ہے؟" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے شیخ علیؒ سے دریافت کیا۔

"جی ہاں! بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میرے لئے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضر رہوں۔"

جس مجلس روحانی پر گنبد خضرا کی شعاعیں منعکس ہوں اس مجلس کی برکتوں کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے صاحب زادے سیّد عبدالوہابؒ نے حصولِ علم کی غرض سے کئی ممالک کی سیاحت کی۔ 33 سال تک مختلف علوم حاصل کرنے کے بعد سیّد عبدالوہابؒ نے ایک مجلس میں اپنے والد محترم سے وعظ کہنے کی اجازت مانگی۔

"تمہیں اجازت ہے فرزند!" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "علم کی جو دولت حاصل کی ہے اسے بندگانِ خدا میں بے دریغ تقسیم کرو۔"

اجازت پاتے ہی سیّد عبدالوہابؒ منبر پر تشریف لے آئے پھر آپؒ نے فصاحت و

بلاغت کے دریا بہا دیئے مگر اہل مجلس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس سلسلے میں خود حضرت سیّد عبدالوہابؒ کا بیان ہے کہ اہل مجلس آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور میری تقریر کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ مجلس کا یہ رنگ دیکھ کر میں منبر سے نیچے اتر آیا۔

اس کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنی نشست سے اٹھے اور منبر پر تشریف لے گئے۔ پھر آپؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اے لوگو! کل میں روزے سے تھا۔ ام یحییٰ نے ایک کورے سکورے میں کچھ انڈے بھون کر طاق پر رکھ دیئے تھے کہ ایک بلی آئی اور اس نے سکورے کو طاق سے نیچے پھینک دیا۔ سکورا ٹوٹ گیا اور انڈے خاک میں مل گئے۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ابھی اتنا ہی فرمایا تھا کہ حاضرین مجلس کی حالت غیر ہوگئی۔ ہر طرف "حق، حق" کے نعرے بلند ہونے لگے۔ آپؒ کے صاحبزادے حضرت سیّد عبدالوہابؒ نے یہ منظر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔

پھر مجلس وعظ ختم ہوئی تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے خلوت میں سیّد عبدالوہابؒ سے فرمایا۔

"فرزند! تقریر کرتے وقت تمہارا چہرہ متغیر کیوں تھا؟"

"مجھے اس بات سے اذیت پہنچی کہ میری عالمانہ تقریر رائیگاں گئی۔" سیّد عبدالوہابؒ نے افسردہ لہجے میں عرض کیا۔

"مگر میرے معمولی الفاظ نے محفل کو زیر و زبر کر دیا۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "جی ہاں! مجھے اس بات پر بھی حیرت ہے۔" سیّد عبدالوہابؒ نے عرض کیا۔

"غور سے سنو فرزند! میں اس فرق کو واضح کرتا ہوں۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

سیّد عبدالوہابؒ ہمہ تن گوش ہوگئے۔

"فرزند! تمہیں اپنے سفر ظاہر پر ناز ہے۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے صاحب زادے کے اس خیال کی طرف اشارہ کیا جو تقریر کرنے سے پہلے سیّد عبدالوہابؒ کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ "مگر تم نے ابھی تک عالم باطن کا سفر نہیں کیا۔ جب میں کلام کرتا ہوں تو خداوند ذوالجلال کی تجلیاں اثر لے کر نمودار ہو جاتی ہیں کیونکہ میری نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ میں خودی کو گم کر کے کلام کرتا ہوں اور تم خودی میں قائم ہو کر بولتے ہو۔"

حضرت سیّد عبدالوہابؒ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا کہ انہیں علم ظاہری پر ناز تھا اور

وہ سمجھتے تھے کہ ان کی عالمانہ تقریر حاضرین مجلس کے دل و دماغ کو مسخر کر لے گی...... مگر ایسا نہ ہوسکا۔

پھر جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے معمولی باتوں سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تو اہلِ مجلس بے حال ہو گئے۔ حالانکہ بظاہر ذکر انڈوں، مٹی کے سکوروں اور بلی کا تھا مگر حقیقتاً یہ وجود، نفس اور شیطان کی طرف اشارے تھے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے اور اثر پیدا کرنے والے نے ان معمولی الفاظ میں اتنی جان ڈال دی کہ اہل مجلس کے دل گرما گئے۔

شیخ عمرؒ کا بیان ہے کہ حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کوئی مجلس وعظ ایسی نہ ہوتی تھی کہ جس میں یہود و نصاریٰ اسلام قبول نہ کرتے ہوں یا بڑے بڑے قزاق، شرابی، فاسق و فاجر، ملحد و زندیق، بدعقیدہ اور بدکردار لوگ آپؒ کے دستِ حق پرست پر توبہ نہ کرتے ہوں۔

ایک بار ایک عیسائی راہب جس کا نام سنان تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس میں حاضر ہوا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ پھر اس نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر کہا۔

''میں یمن کا رہنے والا عیسائی ہوں۔ اگرچہ مجھے اپنی قوم میں بلند درجہ حاصل تھا لیکن مذہب کے معاملے میں عجیب سی خلش محسوس ہوتی تھی۔ پھر یہ ذہنی خلش بڑھتی چلی گئی اور میں نے چند مسلمان علماء سے رجوع کیا۔ مجھے ان کے عقائد درست معلوم ہوئے یہاں تک کہ میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اس شخص کے ہاتھ پر ایمان لاؤں جو یمن میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور شرع کا پابند ہو۔ ابھی میں ایسے شخص کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ ایک رات مجھے نیند آ گئی۔ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا۔ آپؑ فرما رہے تھے۔

''سنان! تم بغداد جاؤ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرو۔ کیونکہ وہ اس وقت رُوئے زمین کے تمام لوگوں سے افضل ہیں۔''

شیخ عبداللہ جیلانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے دستِ مبارک پر پانچ ہزار سے زیادہ یہودی اور عیسائی مسلمان ہوئے...... اور ایک لاکھ سے زیادہ قزاقوں، فاسقوں، بدکاروں اور بدعقیدہ انسانوں نے توبہ کی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا لقب ''محی الدین'' تھا۔ یعنی دین کو زندہ کرنے والا۔ ایک مجلس خاص میں کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کا لقب محی الدین کس طرح ہوا؟ حضرت شیخؒ نے جواباً فرمایا۔

''ایک بار میں بغداد سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپسی میں جب شہر کے قریب پہنچا تو ایک نہایت خستہ حال اور ضعیف و ناتواں شخص میرے سامنے آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے اجنبی سے پوچھا۔

''اے بھائی! تجھے کیا تکلیف ہے؟''

''میں اپنا حال کسی کو کیا سناؤں کہ مجھے کون کون سی بیماریاں لاحق ہیں۔'' ضعیف و ناتواں شخص نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں قریب المرگ ہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو مجھ پر رحم کرو اور ایسی دوا دے دو کہ جسے پی کر جانبر ہوسکوں۔''

میں نے چند آیاتِ قرآنی پڑھ کر اس شخص پر دم کیں۔ ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ وہ کسی سہارے کے بغیر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم کی لاغری کافور ہو گئی اور چہرہ کسی پھول کی مانند تر و تازہ نظر آنے لگا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہیں تمہاری گم شدہ صحت دوبارہ مل گئی۔'' میں نے اپنے دینی بھائی کی صحت یابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''عبدالقادر! تم نے مجھے پہچانا؟'' اجنبی شخص نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔

''ذاتی طور پر میں تم سے واقف نہیں ہوں۔'' میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

''تم مجھ سے خوب واقف ہو۔'' اجنبی شخص نے کہا۔ ''میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین اسلام ہوں۔ ضعف و ناتوانی کے سبب میرا یہ حال ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے ہاتھوں زندہ کیا ہے اور آج سے تم ''محی الدین'' ہو۔''

یہ کہہ کر وہ شخص غائب ہو گیا اور میں نماز ادا کرنے کے لئے جامع مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک برہنہ پا شخص بھاگتا ہوا میرے قریب آیا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''سیّدی محی الدین!''

میں نے اس شخص کو حیرت سے دیکھا پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر اپنے راستے پر چلا گیا اور میں مسجد میں داخل ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے دوگانہ ادا کیا اور جیسے ہی سلام پھیرا تمام نمازی میرے چاروں طرف جمع ہو گئے اور ''محی الدین...... محی الدین'' پکارنے لگے۔ اس سے پہلے کسی شناسا، کسی دوست اور کسی شخص نے مجھے اس لقب کے ساتھ نہیں پکارا تھا۔

بے شک آپؒ محی الدین تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؒ کو ایسی وجاہت و قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہ ہو سکی۔

شیخ ابن قدامہ کہتے ہیں۔ ''میں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے زیادہ کسی کی

تعظیم ہوتے نہیں دیکھی۔ آپؒ کی مجلسِ درس وعظ میں شریک ہونے والے عالموں اور فقیہوں کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایک وقت میں چار چار سو دواتیں شمار کی گئی ہیں جو آپؒ کے ارشادات قلم بند کرنے کے لئے لائی جاتی تھیں۔ امیروں اور وزیروں کا تو ذکر ہی کیا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس میں تو خلیفۂ وقت بھی نیازمندانہ حاضر ہوتا اور ادب سے سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔

شیخ ابوب العباس معصلیؒ کا بیان ہے کہ ایک بار میں سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مدرسے میں موجود تھا کہ عباسی خلیفہ مستنجد باللہ حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو زانو ہو کر بیٹھ گیا پھر عرض کرنے لگا۔

"حضرت! مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔"

سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے اسی پُر جلال لہجے میں خلیفۂ وقت کو اس کے فرائض اور بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں نصیحت فرمائی۔ مستنجد باللہ سر جھکائے حضرت شیخؒ کی تقریر سنتا رہا۔ پھر جب آپؒ خاموش ہوئے تو عباسی خلیفہ نے سر اٹھایا اور اپنے خدمت گار کو اشارہ کیا جو مدرسے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

خدمت گار آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں اشرفیوں سے لبریز دس تھیلیاں موجود تھیں۔

عباسی خلیفہ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے درخواست کی۔ "اگر آپ اس حقیر سی نذر کو قبول فرمالیں تو میں ساری زندگی اپنی خوش بختی پر نازاں رہوں گا۔"

"تمہاری مملکت میں بے شمار حاجت مند ہیں۔ ان کی ضرورتوں کا خیال کرو۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے حسن ادا کے ساتھ خلیفہ کی نذر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر مستنجد باللہ اس طرزِ انکار کو سمجھ نہیں سکا اور وہ مسلسل اصرار کرتا رہا۔

آخر حضرت شیخؒ کے چہرۂ مبارک پر جلال کے آثار نمودار ہوئے پھر آپؒ نے ان میں سے دو تھیلیاں اُٹھا لیں اور انہیں نچوڑنے کے انداز میں دبایا۔ حاضرین مجلس کی آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ تھیلیوں سے تازہ تازہ انسانی خون ٹپک رہا تھا۔

فرطِ حیرت سے مستنجد باللہ کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پھر آپؒ نے انتہائی غضب ناک لہجے میں عباسی خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ مجھے پلانے کے لئے اس کے بندوں کا خون لائے ہو؟ تم نے خوب قدر کی۔"

خلیفہ مستنجد باللہ شدتِ خوف سے بے ہوش ہو گیا۔

پھر کچھ دیر بعد جب اس کے ہوش وحواس درست ہوئے تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے دوبارہ اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"بس چلے جاؤ۔ اگر مجھے رسول کریمؐ کے نسب کا لحاظ نہ ہوتا تو خدا کی قسم! اس خون کو تمہارے محلات تک بہا دیتا۔"

خلیفہ مستنجد باللہ کا تعلق سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے خاندان سے تھا اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

قرآن حکیم کے مطابق "اموال اور اولاد" اہلِ ایمان کے لئے بڑی آزمائش ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ان دونوں آزمائشوں میں ثابت قدم رہے۔ آپؒ کے کئی فرزندوں کا انتقال اس وقت ہوا جب آپؒ مجلس وعظ میں ہزاروں انسانوں سے مخاطب تھے۔ حضرت شیخؒ کو اس جاں گداز واقعہ کی خبر دی گئی مگر آپؒ نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اہل مجلس کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ ان کے مسیحا کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اہلِ خانہ اور خدمت گاروں نے فرزند کی تکفین کی اور جب مجلس وعظ ختم ہو گئی تو جنازہ آپؒ کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ حضرت شیخؒ نے نماز پڑھائی اور پھر بیٹے کو قبر میں اتارتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ کی رضا یہی تھی۔ ہم ہر حال میں اس سے راضی ہیں اور وہ بھی ہم سے راضی رہے۔"

جب بیٹے کی موت بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے کارِ تبلیغ میں کوئی خلل نہ ڈال سکی تو دنیا کی رنگینیاں اور دل فریبیاں آپؒ کو کس طرح متاثر کر سکتی تھیں؟

حضرت شیخ عبدالقادرؒ کا قول ہے۔

"دنیا سے اپنا حصہ اس طرح نہ کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تُو کھڑا ہو....... بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازے پر اس طرح کھا کہ تُو بیٹھا ہوا ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے کھڑی ہو۔ دنیا اس کی خدمت کرتی ہے جو حق تعالیٰ کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے وہ اسے ذلیل کرتی ہے۔ کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تونگری کے قدم پر۔"

ایک اور موقع پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، مگر دل میں رکھنا جائز نہیں۔ دنیا کا دروازے پر کھڑا ہونا جائز مگر اندر داخل ہونا جائز نہیں...... اور یہ تیرے لئے کوئی عزت کی بات بھی نہیں۔"

جس مردِ حق نے تمام تر دنیا کو اپنے دروازے پر کھڑا رکھا اور ایک بار بھی اسے اندر

داخل ہونے کی اجازت نہ دی ہو اس کے قدم شاہانِ وقت کے دروازے کی طرف کیونکر اُٹھتے؟ اب اگر عباسی خلیفہ مستنجد باللہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے جلال و جبروت کو دیکھ کر بے ہوش ہو جائے تو اہل دنیا کو تعجب کیوں ہے؟

حافظ ابو عبداللہ محمد بن یوسفؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اخلاقِ عالیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حضرت شیخ مستجاب الدعوات تھے۔ اگر کوئی عبرت کی بات کی جاتی تو فوراً آپؒ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ آپؒ بہت رقیق القلب، شگفتہ رو، کریم النفس، وسیع العلم، بلند اخلاق اور عالی نسب تھے۔ عبادات و مجاہدات میں آپؒ کا پایہ بہت بلند تھا۔''

مفتی عراق محی الدین ابو عبداللہ فرماتے ہیں۔

''حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غیر مہذب بات سے انتہائی دُور، حق اور معقول بات سے بہت قریب تھے۔ اگر احکامِ خداوندی اور حدودِ الٰہی میں سے کسی پر دست درازی ہوتی تو آپؒ کو جلال آ جاتا۔ خود اپنے معاملے میں کبھی کسی سے ناراض نہ ہوتے۔ آپؒ اللہ تبارک تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے۔ کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ آپؒ کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو اپنا پیرہن مبارک ہی اتار کر سائل کے حوالے کر دیتے۔''

علامہ ابن نجار کی روایت ہے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''اگر ساری دنیا کی دولت میرے قبضے میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا کر اسے خرچ کر ڈالوں۔''

ایک اور روایت کے مطابق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے۔ کوئی چیز اس میں ٹھہرتی ہی نہیں۔ اگر ہزار دینار میرے پاس آئیں تو رات گزرنے نہ پائے اور وہ خرچ ہو جائیں۔''

شیخ محمد بن یحییٰ حنبلیؒ فرماتے ہیں۔ ''ہر رات وسیع دستر خوان بچھتا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول کرتے۔ ہمیشہ کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے۔ طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے اور تحمل فرماتے۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ حضرت شیخؒ کی مجلس میں اس سے زیادہ کوئی دوسرا معزز اور مقرب نہیں ہے۔ ساتھیوں میں سے کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کا حال دریافت کرتے اور اس کی فکر رکھتے۔ آپؒ کو تعلقات کا بڑا پاس اور لحاظ رہتا تھا۔ غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے۔ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھا لیتا تو اسے مان لیتے اور جو کچھ آپؒ جانتے تھے، اسے پردۂ راز

میں رکھتے۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فرزند سید عبدالرزاقؒ کا بیان ہے کہ ایک بار والد محترم حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس وقت خدمت گاروں کا ایک بڑا مجمع آپؒ کے ہمراہ تھا۔ راستے میں ایک آبادی کے قریب شام ہوئی تو آپؒ نے خدام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔

''اس بستی میں تلاش کرو کہ سب سے زیادہ مفلس و نادار شخص کون ہے؟''

بہت تحقیق و جستجو کے بعد مریدوں اور خدمت گاروں نے عرض کیا کہ اس بستی میں ایک گھرانا بہت عسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ سن کر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وہاں تشریف لے گئے۔ صاحب مکان ایک بوڑھا اور محتاج شخص تھا۔ اس کی بیوی بھی ضعیف اور بیمار تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔

حضرت شیخؒ نے صاحب مکان سے فرمایا۔ ''ہم لوگ آپ کے دولت کدے پر قیام کرنا چاہتے ہیں۔''

صاحب مکان نے بڑی حسرت سے سیّدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف دیکھا۔ وہ آپؒ سے واقف نہیں تھا پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ بزرگوں کی یہ جماعت اس کے مکان پر قیام فرمائے مگر اپنی حالتِ زار کا احساس کر کے وہ اُداس ہو گیا تھا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے صاحب مکان کو ذہنی کشمکش کا اسیر پایا تو بڑی شفقت سے فرمانے لگے۔ ''بھائی! اگر تم نہیں چاہتے تو ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں۔''

''اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی کہ خدا کے نیک بندے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔'' بوڑھا صاحبِ مکان رونے لگا۔ ''مگر اپنی کم نصیبی کو کیا کروں کہ مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے میرے پاس سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہے۔''

''بس! تمہارا یہ احسان ہی کافی ہے۔ درویشوں کی خوب تواضع ہو گئی۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے صاحب مکان کی تالیف کی اور پھر اپنے ساتھیوں اور خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ ہمارے قیام کے لئے یہی جگہ سب سے بہتر ہے۔''

دوسرے دن بستی کے مشائخ اور اُمراء کو معلوم ہوا تو بوڑھے شخص کے شکستہ مکان پر بھیڑ لگ گئی۔ دولت مند اور صاحب ثروت لوگ دست بستہ عرض کرنے لگے۔ ''سیّدی! آپ ہمارے گھروں کو رونق بخشیں۔ یہ جگہ آپ کے ٹھہرنے کے قابل نہیں۔''

''میں اپنے میزبان کی دل شکنی نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ جگہ بہت عزیز ہے۔ اس نے

جیسی میری تواضع کی ہے شاید تم لوگ اس طرح نہ کر سکو۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے امراء کی پیشکش کو قبول نہیں فرمایا۔

بالآخر اس علاقے کے تمام عقیدت مندوں نے اپنی نذریں اس مکان پر جمع کرنا شروع کر دیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "میں اور میرے ساتھی اس سامان میں سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز قبول نہیں کریں گے۔ یہ سب کچھ میرے میزبان کے لئے ہے۔"

اس سامان میں اس قدر غلہ، بکریاں اور سونا چاندی شامل تھا کہ وہ غریب بوڑھا راتوں رات ایک مالدار شخص بن گیا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اسی طرح غریبوں کی دل جوئی فرمایا کرتے تھے۔

ایک بار آپؒ ایثار کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ یکایک آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئے۔ اہلِ مجلس آپؒ کے اس عمل پر حیرت زدہ تھے مگر حضورِ شیخؒ کسی کو تابِ گویائی نہیں تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا پھر اہلِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"میں تم سے زیادہ نہیں، صرف سو دینار کے لئے کہتا ہوں۔"

حضرت شیخؒ کا فرمان سنتے ہی چالیس افراد مجلس سے اُٹھے اور اپنے گھروں سے دینار لا کر خدمتِ عالیہ میں پیش کر دیئے۔ آپؒ نے صرف ایک شخص کے سو دینار اٹھا لئے اور اپنے ایک خادم کو دیتے ہوئے فرمایا۔

"تم شونیزیہ کے قبرستان میں جاؤ۔ وہاں ایک ضعیف العمر شخص بربط بجا رہا ہوگا۔ اُسے یہ دینار دے کر میرے پاس لے آؤ۔"

خادم چلا گیا اور آپؒ نے باقی لوگوں کے دینار انہیں واپس کر دیئے۔ ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ حضرت شیخؒ نے یہ سو دینار کس کے لئے طلب کئے ہیں؟

خادم شونیزیہ کے قبرستان پہنچا۔ وہاں ایک بوڑھا شخص آنکھیں بند کئے بڑے والہانہ انداز میں بربط بجا رہا تھا۔ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خدمت گار نے با آواز بلند اسے سلام کیا۔ بربط نواز نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اپنا ساز بجانا چھوڑ دیا۔

"پیر و مرشد نے تمہارے لئے سو دینار بھیجے ہیں۔" حضرت شیخؒ کے خادم نے تھیلی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

بربط نواز نے سیّدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام سنا تو ایک زور کی چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

پھر جب وہ ہوش میں آیا تو خدمت گار نے کہا۔ "پیر و مرشد تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔"

بوڑھے نے بربط اپنے کاندھے پر رکھا اور خدمت گار کے ساتھ ہو لیا۔

اہلِ مجلس نے بڑی حیرت سے بوڑھے کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ بربط نواز پر نظر پڑتے ہی سیّدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

"تم میرے پاس آؤ۔" اس وقت حضرت شیخؒ منبر پر تشریف فرما تھے۔

بوڑھا بربط نواز سر جھکائے آگے بڑھا اور سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔

"اب تم اپنے قصے کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرو۔" حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

بربط نواز نے عرض کیا۔ "سیّدی! میں بچپن ہی سے بہت عمدہ گانا بجاتا تھا۔ اگر کسی چوراہے پر کھڑے ہو کر اپنا بربط چھیڑ دیتا تو میرے گرد لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ پورا مجمع نہایت ذوق و شوق سے میرا گانا سنتا۔ پھر تمام سننے والے حسبِ حیثیت مجھے انعام و اکرام سے نواز کر چلے جاتے۔ برسوں یہی عمل جاری رہا۔ پھر جب میں جوان ہوا تو لوگوں کی رغبت کم ہونے لگی۔ میرا فن پہلے سے زیادہ نکھر گیا تھا مگر سننے والے میری طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ لوگوں کی داد و دہش کے انداز بھی بدل گئے۔ ماہ و سال گزرتے رہے۔ میں پورے جوش و خروش سے بربط بجاتا رہا لیکن سامعین کی بے التفاتی کا وہی عالم رہا۔ آخر میں اہل دنیا کے تغافل سے بیزار ہو گیا اور میں نے شہری حدود کو چھوڑ کر قبرستان کو اپنا مسکن بنالیا۔ پھر میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ کسی زندہ شخص کو اپنا گانا نہیں سناؤں گا۔ اب میرے سامعین صرف وہ لوگ ہوں گے جو اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔ اس عہد کے بعد میں نے ایک بار بھی شہر کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ برسوں سے قبرستان در قبرستان گھوم رہا ہوں اور مُردوں کو اپنا گانا سناتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں بوڑھا ہو گیا۔ کبھی کسی طرف سے کوئی بندۂ خدا آتا جاتا مجھے کھانے کے لئے دو روٹیاں دے دیتا۔ اس طرح میرا پالنے والا میری پرورش کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر بربط نواز بوڑھا کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

اہلِ مجلس بڑی حیرت سے یہ عجیب و غریب واقعہ سن رہے تھے۔

بربط نواز نے دوبارہ عرض کیا۔ "آج صبح ہی سے مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی۔ میں نے اپنا بربط اٹھایا اور پورے زور و شور سے گانا شروع کر دیا۔ اچانک ایک قبر سے آواز آئی۔ کوئی مجھے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"بھائی! تم کہاں تک مُردوں کو اپنا گانا سناؤ گے۔ اب تم خدا کے ہو جاؤ اور اسے اپنا

گانا سناؤ۔"

یہ غیبی آواز سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے ہاتھ رک گئے اور زبان گنگ ہو گئی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ میں زمین پر اسی قبر کے نزدیک بیٹھ گیا اور مجھے گہری نیند آ گئی۔ میں بہت دیر تک سوتا رہا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے یہ اشعار پڑھے۔

"الٰہی! قیامت کے دن کے لئے میرے پاس کوئی سامان نہیں، سوائے اس کے کہ دل سے امید مغفرت رکھتا ہوں اور زبان سے تیری حمد و ثناء بیان کرتا ہوں۔"

"امید رکھنے والے کل تیری بارگاہ میں با مراد ہوں گے اگر میں محروم رہ جاؤں تو میری بدقسمتی پر سخت افسوس ہے۔"

"اگر صرف نیک لوگ ہی تیری خواہش کیا کرتے تو گناہ گار لوگ کس کے پاس جا کر پناہ لیتے۔"

"میرا بڑھاپا قیامت کے دن تیری بارگاہ میں میرا شفیع بنے گا۔ امید ہے کہ تُو میری ضعیفی پر نظر کر کے مجھے دوزخ سے بچائے گا۔" (ترجمہ)

اس کے بعد بوڑھے بربط نواز نے عرض کیا۔ "ابھی میں یہ اشعار پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کے خادم نے مجھے یہ دینار عطا کئے۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

"میرا ارادہ ہی کیا؟ سب کچھ اسی کا ہے۔" بوڑھے نے رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔ "آپ کے طفیل مجھے سب کچھ مل گیا۔" یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنا بربط توڑ دیا اور با آواز بلند کہا۔ "اللہ مجھے معاف کرے۔ میں گانے بجانے سے تائب ہوتا ہوں۔"

بوڑھے کا یہ حال سن کر ان چالیس افراد نے بھی اپنے دینار اسی شخص کو دے دیئے۔ یہ وہی دینار تھے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے واپس کر دیئے تھے۔

بوڑھے بربط نواز کے سنائے ہوئے واقعات اور اس کی توبہ کے منظر نے اہلِ مجلس کو بے حال کر دیا۔ حاضرین پر ایسا وجد طاری ہوا کہ ہر گوشے سے گریہ و زاری کی آوازیں اُبھرنے لگیں اور بہت سے لوگوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے۔ روایت ہے کہ اسی مجلس میں شدت خوف الٰہی کے سبب پانچ افراد اپنی جانوں سے گزر گئے۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اسی طرح غریبوں اور مسکینوں کی حاجت روائی فرماتے تھے۔

تمام مؤرخین اور تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے گھر کا ضروری سامان خریدنے کے لئے بہ نفسِ نفیس بازار تشریف لے جاتے۔ جب سفر میں ہوتے تو منزل پر پہنچ کر اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھتے، روٹیاں پکاتے اور اپنے ساتھیوں میں تقسیم فرماتے۔

خدام یہ صورتِ حال دیکھ کر عرض کرتے۔ "حضور! یہ سارے کام ہم کر لیں گے۔ آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں؟"

جواب میں حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے۔ "اگر میں یہ کام کر لوں تو کیا حرج ہے؟"

جب آپؒ کی زوجہ محترمہ علیل ہوتیں تو خانہ داری سے متعلق سارے امور خود ہی انجام دیتے۔ گھر صاف کرتے، روٹی پکاتے اور بچوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے...... اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ آپؒ کنوئیں سے پانی بھر کر لاتے اور کسی کا تعاون قبول نہ فرماتے۔

ایک بار ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کسی کام سے تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک گلی سے آپؒ کا گزر ہوا تو وہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بچے نے حضرت شیخؒ کو دیکھ کر کہا۔

"مجھے بازار سے مٹھائی لا دیجئے۔" بچے نے اپنی جیب سے ایک پیسہ نکال کر حضرت شیخؒ کی طرف بڑھایا۔

آپؒ نے بچے سے کوئی تعرض نہیں کیا اور پیسے لے کر مٹھائی لانے کے لئے آگے بڑھے۔ ابھی حضرت شیخؒ نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ دوسرے بچے نے آپؒ کو آواز دی۔

"میرے لئے بھی مٹھائی لیتے آیئے گا۔"

حضرت شیخؒ واپس لوٹے اور اس بچے کے پیسے بھی لے لئے۔ اس طرح چار پانچ بچوں نے یہی عمل کیا۔ حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ ہر بار واپس آتے اور بچے کے ہاتھ سے پیسے لے کر آگے تشریف لے جاتے۔ آخر بچوں کے مطالبات ختم ہوئے۔ آپ نے بازار جا کر مٹھائی خریدی اور تمام بچوں میں تقسیم کر دی۔ ایسا کرتے وقت حضرت شیخؒ کی پیشانی مبارک پر ہلکی سی شکن تک نہیں تھی بلکہ آپؒ بچوں کو دیکھ کر مسکرا دیئے تھے۔

یہ تھے سیّدنا محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ جن کے ہیبت و جلال سے عباسی خلیفہ مستنجد باللہ بے ہوش ہو گیا تھا...... اور غریبوں کے بچے نہ صرف آپؒ سے بے تکلفانہ گفتگو

کرتے تھے بلکہ بعض اوقات اپنے کام بھی کرا لیتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ہمیشہ غریبوں اور مسکینوں کے پاس بیٹھتے۔ فقراء کا اس قدر احترام کرتے کہ ان کے کپڑے تک صاف کر دیتے..... لیکن اس کے برعکس اراکینِ سلطنت، معززینِ وقت اور دولت مندوں کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے۔ اگر کبھی خلیفۂ وقت حاضر خدمت ہوتا تو آپؒ قصداً دولت خانے میں چلے جاتے پھر خلیفہ بیٹھ جاتا تو مجلس میں تشریف لاتے تا کہ آپؒ کو سربراہِ مملکت کے احترام میں کھڑا نہ ہونا پڑے۔

بغداد میں ایک مشہور بزرگ حرادہؒ گزرے ہیں۔ انہوں نے طویل عمر پائی اور ہزاروں بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ حرادہؒ فرماتے ہیں۔

''میں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بڑھ کر کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب، محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا۔ آپؒ اپنی عظمتِ روحانی اور وسعتِ علم کے باوجود چھوٹے کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت فرماتے، کمزوروں کے پاس اُٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ تواضع اور انکساری سے پیش آتے۔ آپؒ کبھی کسی رئیس یا صاحبِ اقتدار شخص کی تعظیم میں کھڑے نہیں ہوئے اور کبھی کسی وزیر یا حاکم کے دروازے پر تشریف نہیں لے گئے۔''

جب کسی دینی معاملے میں خلیفۂ وقت کو خط لکھتے تو اس طرح تحریر فرماتے۔

''عبدالقادر تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے۔ اس کا حکم تم پر جاری ہے اور اس کی اطاعت تم پر واجب ہے وہ تم پر حجت ہے اور وہ تمہارا پیشوا ہے۔''

جب خلیفہ، سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مکتوب گرامی کو دیکھتا تو پہلے اسے آنکھوں سے لگاتا، پھر بوسہ دیتا اور بعد ازاں بے اختیار ہو کر کہتا۔

''شیخ عبدالقادرؒ سچ فرماتے ہیں۔''

حافظ عماد الدین ابن کثیر، سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے سیرت و کردار کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

''حضرت شیخ کا سلسلۂ تبلیغ صرف عوام تک محدود نہیں تھا۔ آپؒ امراء کے اعمال پر بھی گہری نظر رکھتے۔ اگر کوئی خلیفہ یا وزیر بے عملی کا مرتکب ہوتا تو آپؒ بھرے مجمع میں علی الاعلان اسے ٹوک دیتے۔ بندگانِ خدا پر ظلم ڈھانے والے حاکموں کی گرفت کرتے اور انہیں عذابِ آخرت سے ڈراتے۔ ''خدا اور دین'' کے معاملے میں آپؒ کبھی خاموش نہیں رہے اور بڑی سے بڑی طاقت کی بھی پرواہ نہیں کی۔''

ایک بار عباسی خلیفہ مقتفی نے ابوالوفا یحییٰ بن سعید کو قاضی کے منصب عظیم پر فائز کر دیا۔ یہ شخص اپنی سنگ دلی کے باعث پورے بغداد میں ''ظالم'' کے لقب سے مشہور تھا۔ جب یہ خبر سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچی تو آپؒ مجمع عام میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو آپؒ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

''خلیفہ مقتفی! بہت غور سے سنو! میں تم سے مخاطب ہوں۔ تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو اپنی عادات و کردار میں ''اظالم الظالمین'' ہے۔ کل قیامت کے دن تم اس رب العالمین کو کیا جواب دو گے جو ''ارحم الراحمین'' ہے۔''

جب خلیفہ مقتفی کے کارندوں نے اسے حضرت شیخؒ کا یہ فرمان سنایا تو وہ شدتِ خوف سے کانپنے لگا۔ پھر بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عباسی خلیفہ پر بہت دیر تک یہ کیفیت طاری رہی۔ آخر جب مقتفی کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے ابوالوفا یحییٰ بن سعید کو قاضی کے عہدے سے ہٹا دیا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شخصیت کا یہ جاہ و جلال، کلام کی یہ تاثیر، صاحبان اقتدار سے یہ بے نیازی، دنیا کی مادی طاقتوں سے یہ بے خوفی، بس اسی ایک سجدے کا نتیجہ تھی جو انہوں نے پوری سچائی کے ساتھ اپنے خالق کے حضور کیا تھا۔ پھر اسی ایک سجدے نے حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کو تمام سجدوں سے نجات عطا کر دی تھی۔

قرآن حکیم کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ ''اللہ کے دین میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی اللہ کے دین میں پورے پورے داخل ہو گئے تھے۔

قرآن حکیم کی ایک اور آیت کا مفہوم ہے کہ ''اے لوگو! دوسروں سے وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے۔''

اس آیت مقدسہ کی مختصر تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ''قول و عمل'' کے تضاد کو پسند نہیں کرتا۔ ایمان کی تعریف ہی یہ ہے کہ انسان اپنے دل سے اللہ کی وحدانیت کی تصدیق کرے، زبان سے گواہی دے اور عمل سے ثابت کرے کہ وہ ہر حال میں احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ اسی کو ''قول و فعل'' کی یکسانیت کہتے ہیں اور اسی کا نام ایمان ہے۔

عمل کے حوالے سے سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک عجیب واقعہ ہے جسے غیر مسلم دانش مندوں نے بھی اپنی تحریروں میں بطورِ خاص پیش کیا

ہے۔ ایک صحابی کا بچہ بہت زیادہ مٹھائی کھاتا تھا۔ باپ اپنے بچے کی اس عادت سے سخت بیزار تھا۔ نتیجتاً وہ صحابی بچے کو لے کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی کہ ان کا بچہ میٹھا کھانا چھوڑ دے۔ جواب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کچھ دن بعد حاضر ہوں۔ صحابی حسب ارشاد دوبارہ بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"بچے! تم میٹھا مت کھایا کرو۔"

جب باپ اپنے بچے کو لے کر چلا گیا تو صحابہ کرامؓ نے بصد ادب و احترام عرض کیا۔

"حضور! اس بچے کو چند دنوں کی تاخیر سے نصیحت کرنے میں کیا حکمت تھی؟"

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "اس وقت میں خود بڑی رغبت سے شہد کھایا کرتا تھا پھر ایک بچے کو اس بات کی تلقین کس طرح کرتا جس پر میں خود عمل پیرا نہیں تھا۔"

یہ ہے "قول و فعل" کی وہ یکسانیت جس کے بارے میں ہندوستان کے رہنما موہن داس کرم چند گاندھی نے علی الاعلان کہا تھا۔

"میں نے پوری تاریخ انسانیت کا مطالعہ کر لیا۔ صرف پیغمبر اسلام ہی ایک ایسے انسان ہیں جن کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ ان کے عمل کا تابع ہوتا تھا۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمتی تھے اور آپؒ کے "قول و فعل" میں پوری ہم آہنگی تھی۔ اسی وصفِ خاص نے آپؒ کو مومن بنایا اور پھر آپؒ غوثیت کے درجے پر فائز ہوئے۔

"غوثیت" بزرگی کا ایک خاص درجہ ہے۔ روحانی دنیا میں حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ "غوث اعظم" کے لقب سے عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ "غوث" کے لغوی معنی ہیں "فریاد رس" یعنی فریاد کو پہنچنے والا۔ چونکہ حضرت شیخ غریبوں، بے کسوں اور حاجت مندوں کے مسائل پر پوری توجہ فرماتے تھے، اسی لئے آپؒ کو "غوث" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ اکثر عقیدت مند آپؒ کو "پیران پیر" اور "دستگیر" کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو "غوث اعظم" کا لقب بارگاہِ خداوندی سے عطا ہوا۔ مردانِ غیب نے آپؒ کو اسی لقب سے مخاطب کیا اور پھر یہ لقب

اس قدر عام ہوا کہ اکثر لوگوں کو آپؒ کا حقیقی نام یاد نہیں رہا مگر وہ غوث اعظمؒ کو خوب جانتے تھے۔

تاریخوں میں درج ہے کہ جس روز حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ "غوث اعظم" کے خطاب سے نوازے گئے، اسی روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا معمول تھا کہ جب مسجد تشریف لے جاتے تو راستے میں ہر چھوٹے بڑے کو باآواز بلند سلام کرتے۔ مسجد کے قریب ہی ایک دکان تھی۔ دکان کا مالک بظاہر ایک عام سا مسلمان تھا مگر حضرت شیخؒ سے نہایت عقیدت رکھتا تھا۔ حضرت شیخؒ حسب عادت اسے بھی سلام کرتے۔ دکان کا مالک آپؒ کو دیکھتے ہی احتراماً نیچے اتر آتا، سلام کا جواب دیتا اور بڑے نیاز مندانہ انداز میں آپؒ سے مصافحہ کرتا، پھر دکان بند کر کے نماز ادا کرنے کے لئے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پیچھے پیچھے مسجد میں داخل ہو جاتا۔ برسوں سے یہی صورتِ حال جاری تھی۔ پھر جس روز حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو "غوثِ اعظم" کا لقب عطا ہوا تو آپؒ نے حسب روایت دکان کے قریب پہنچ کر باآواز بلند فرمایا۔

"السلام علیکم یا اخی!"

"وعلیکم السلام یا غوث اعظم!" یہ کہتا ہوا دکاندار نیچے اُتر آیا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق انتہائی عقیدت مندانہ انداز میں حضرت شیخؒ سے مصافحہ کیا۔

سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے حیرت سے دکاندار کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ "تمہارے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی کس طرح آئی؟"

"سیّدی! کیسی تبدیلی؟" دکاندار نے نہایت ادب سے عرض کیا۔

"کیا تم روزانہ اسی طرح میرے سلام کا جواب دیا کرتے تھے؟" سیّدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

حضرت شیخؒ کے سلام کے جواب میں دکاندار ہمیشہ "وعلیکم السلام یا سیّدی" کہا کرتا تھا مگر آج اس نے "غوث اعظم" کہہ کر مخاطب کیا تو آپؒ نے اُس سے اس تبدیلی کا سبب پوچھا۔

"اب مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو غوث اعظم کے لقب سے یاد کروں۔" فرطِ عقیدت سے دکاندار کا سر جھک گیا۔

"جو راز خدا اور اس کے مردانِ غیب کو معلوم ہے، وہ تم پر کس طرح فاش ہو گیا؟"

حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "کیا تم کوئی خاص وظیفہ پڑھتے ہو؟"

''سیّدی! میں پانچ وقت کی نماز، ذکر و تسبیح اور درود شریف کے علاوہ کوئی خاص عمل نہیں کرتا۔'' دکاندار نے سر جھکائے ہوئے عرض کیا۔

''یقیناً تم کوئی خاص عمل کرتے ہو مگر تمہیں اس کا احساس نہیں۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ ''اچھا بتاؤ تم عبادت کے علاوہ اپنی عام زندگی میں کس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہو؟''

دکاندار کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے بڑے انکسار کے ساتھ عرض کیا۔ ''جب روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزیں کمی کے سبب گراں ہو جاتی ہیں تو میں لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے زیادہ قیمت وصول نہیں کرتا۔ میں ہر حال میں پورا تولتا ہوں۔ یہاں تک کہ مخلوقِ خدا کا ایک دانہ بھی میرے ذمے باقی نہیں۔''

''بے شک! تم خدائی راز جاننے کے لائق ہو۔ اتنا ہی دیانت دار شخص اس امانت کا بار اُٹھا سکتا تھا۔'' حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا اور دکاندار کو سلامتی ایمان کی دُعائیں دیتے ہوئے مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

یہ راز تو حق تعالیٰ ہی جانتا تھا کہ حضرت غوث اعظمؒ ولایت کے کس درجے پر فائز تھے۔ مگر تاریخ کا ایک عام طالب علم بھی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک عالم باعمل تھے۔ آپؒ کی ذات مبارک میں ''مردِ مومن'' کی وہ تمام نشانیاں جمع تھیں جن کی طرف اللہ نے اپنی آخری کتاب میں واضح اشارہ کیا ہے۔

حصولِ علم کی خاطر آبلہ پائی...... سلامتی ایمان کے لئے نفس کشی اور دنیا کی تمام لذتوں سے بے رغبتی...... اور اللہ کی کبریائی کا اقرار کرنے کے لئے ہر مادی طاقت کی نفی...... غریبوں اور بے کسوں کی محفل میں باپ اور بھائی سے زیادہ شفیق، مہربان، بھوکوں کو اپنے دہن کا لقمہ عطا کرنے والا، ننگوں کو اپنا پیرہن مبارک بخش دینے والا، امراء کے دروازوں کی طرف پیٹھ کر لینے والا، بزمِ احباب میں صباسخن شیریں۔

کلام..... دربارِ خلافت میں شمشیر بے نیام...... یہ ہے سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شخصیت کا مختصر سا خاکہ...... ہم گناہ گاروں کی نظر ہی کیا...... مگر دل کہتا ہے کہ ایسے مردِ جلیل کو غوث اعظم ہی ہونا چاہئے۔

نامور بزرگ شیخ محمد بن علیؒ بغداد کے مشہور فقیہہ ابو محمد الحسن، شیخ ابوبکر عبداللہ نصرؒ اور حافظ عبدالحیثؒ کا بیان ہے کہ ہم اس مجلس وعظ میں موجود تھے جو سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مہمان خانے میں منعقد ہوئی تھی۔ وعظ کے دوران حضرت شیخؒ نے فرمایا تھا۔

''میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔''

سنتے ہی شیخ علی بن ابی نصرؒ اپنی نشست سے اٹھے اور منبر کے قریب جا کر حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا قدم مبارک اپنی گردن پر رکھ لیا۔ اس کے بعد تمام حاضرین نے آگے بڑھ کر اپنی گردنیں خم کر دیں۔

معتبر تاریخی روایتوں کے مطابق اس وقت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس وعظ میں عراق کے تقریباً تمام مشائخ موجود تھے۔ بعض مؤرخین نے سینتالیس مشائخ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہ سب وہی بزرگ تھے جنہوں نے حضرت غوث اعظمؒ کے سامنے اپنی گردنیں خم کر دی تھیں۔

شیخ ارمنیؒ کا بیان ہے کہ جب حضرت غوث اعظمؒ نے یہ فرمایا کہ۔ ''میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔'' تو مردانِ غیب کی ایک بہت بڑی جماعت ہوا میں اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ یہ جماعت آپؒ ہی کی طرف آ رہی تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ان لوگوں کو آپؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔

شیخ مطرؒ کا بیان ہے کہ ایک مجلس میں شیخ محمدؒ اور شیخ احمدؒ بھی موجود تھے۔ اس وقت شیخ مکارمؒ نے فرمایا۔

''میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جس روز حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا کہ۔ ''میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔'' تو اسی وقت رُوئے زمین کے تمام اولیاء نے مشاہدہ کیا کہ ''قطبیت'' کا جھنڈا حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے سامنے نصب کیا گیا ہے اور ''غوثیت'' کا تاج جو ''شریعت و طریقت'' کے نقش و نگار سے آراستہ تھا، آپؒ کے سر مبارک پر سجا ہے۔''

یہ منظر دیکھ کر دسوں ''ابدالوں'' نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فرمان مبارک کے سامنے سر تسلیم خم کر دیئے تھے۔ شیخ مطرؒ نے شیخ مکارمؒ سے پوچھا۔ ''وہ دس ابدال کون تھے؟''

شیخ مکارمؒ نے فرمایا۔ ''ان ابدالوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ شیخ بقاءؒ، شیخ ابوسعیدؒ، شیخ عدی بن مسافرؒ، شیخ موسیٰؒ، شیخ احمد بن رفاعیؒ، شیخ عبدالرحمٰنؒ، شیخ ابو محمدؒ، شیخ حیات بن قیسؒ اور شیخ ابو مدین مغربیؒ۔''

تاریخِ تصوف کا مطالعہ کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام بزرگ ولایت کے کس درجے پر فائز تھے۔

صوفیاء کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ کا یہ فرمان حالتِ جذب کا

نتیجہ تھا۔ یعنی جس وقت حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے اس وقت آپؒ کیف و استغراق کے عالم میں تھے۔

اس کے برعکس مشائخ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ حضرت غوثِ اعظمؒ کا یہ فرمان خدا کے حکم سے تھا۔

شیخ عدی بن ابوالبرکاتؒ کہتے ہیں کہ میں نے چچا محترم شیخ عدی بن مسافرؒ سے دریافت کیا۔ ''کیا حضرت غوث اعظمؒ سے قبل بھی کسی بزرگ نے اس طرح کہا ہے کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے؟''

شیخ عدی بن مسافرؒ نے فرمایا۔ ''نہیں! یہ فرمان صرف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات مبارک کے لئے مخصوص ہے۔''

شیخ عدی بن ابوالبرکاتؒ نے دوسرا سوال کیا۔ ''اس کے معنی کیا ہیں؟''

''اس سے محض مقامِ فردیت مراد ہے۔'' شیخ عدی بن مسافرؒ نے فرمایا۔ فردیت کے معنی ہیں ''تنہا'' یعنی سب لوگوں میں برتر اور منفرد۔

''کیا ہر زمانے میں فرد ہوتا ہے؟'' شیخ عدی بن ابوالبرکاتؒ نے عرض کیا۔

''ہاں! مگر حضرت غوث اعظمؒ کے سوا کسی اور فرد کو اس کے کہنے کا حکم نہیں ہوا۔'' شیخ عدی بن مسافرؒ نے فرمایا۔

''کیا سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس کے کہنے پر مامور ہوئے تھے؟'' شیخ عدی بن ابوالبرکاتؒ نے عرض کیا۔

''بے شک! آپؒ کو اس کا حکم صادر ہوا تھا اور حکم ہی کی وجہ سے اولیاء نے اپنی گردنیں خم کر دی تھیں۔'' شیخ عدی بن مسافرؒ نے فرمایا۔ ''دیکھو! فرشتے بھی اسی وقت حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھکے تھے، جب باری تعالیٰ نے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔''

شیخ احمد رفاعیؒ کا بھی یہی قول ہے کہ حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ اس بات کے کہنے پر مامور ہوئے تھے کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔

شیخ ابواسحٰق ابراہیمؒ، شیخ علیؒ، شیخ ابوسعیدؒ اور شیخ سعید بن قیسؒ کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے یہ بات خدا کے حکم سے کہی تھی۔

شیخ الاسلام شہاب الدین احمد بن حجر عسقلانیؒ سے حضرت غوث اعظمؒ کے اس قول کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے فرمایا۔ ''اس سے حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات کا بکثرت ظاہر ہونا مراد ہے۔''

ان تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ نے اپنی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے اور آپؒ کے اس فرمان کو تسلیم کرتے ہوئے اس زمانے کے بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء نے اپنی گردنیں خم کر دی تھیں۔

اب زیر بحث یہ مسئلہ ہے کہ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اس قول کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ نے اس مسئلے کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ حل کیا ہے۔ شیخ موصوف فرماتے ہیں۔ ''حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے اس قول میں ''قدم'' کے حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی طریقہ۔''

''قدم'' کی اس تشریح کے بعد حضرت شیخؒ کے فرمان کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا طریقہ اس زمانے کے تمام اولیاء کے طریقوں سے ارفع و اعلیٰ تھا اور آپؒ کی روحانی فتوحات انتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔

عزالدین بن عبدالسلام نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فرمان اس دور کے اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ بھی اپنے ایک مکتوب میں اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

''جاننا چاہئے کہ یہ حکم اسی وقت کے اولیاء کے لئے مخصوص ہے۔ اولیائے متقدین اور متاخیر اس حکم سے خارج ہیں۔''

اسی حوالے سے ایک عجیب عبرت ناک واقعہ بھی کتابوں میں درج ہے۔

جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا یہ فرمان کسی دوسرے بزرگ تک پہنچا تو انہوں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''عبدالقادر جیلانیؒ کا قدم دوسرے ولیوں کی گردن پر ہو گا، میری گردن پر ان کا قدم ہرگز نہیں۔''

حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے عقیدت مندوں نے بارگاہِ شیخ میں اس واقعے کا ذکر کیا تو آپؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔

''وہ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ خدا ان کا بھلا کرے۔''

بظاہر بات ختم ہو گئی اور لوگ اس واقعے کو بھول گئے...... مگر کچھ دن بعد ہی وقت نے ایک ایسے انداز سے کروٹ لی کہ اہل دل لرز کر رہ گئے اور خدا کی پناہ مانگنے لگے۔

وہ بزرگ جنوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فرمان کو جھٹلایا تھا، حافظ قرآن تھے اور بڑی خوش الحانی کے ساتھ قرأت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں علومِ ظاہری

میں بھی مہارت تھی اور رسمِ دنیا کے مطابق دربارِ خلافت میں بھی رسائی رکھتے تھے۔ شاید یہی وہ اعزاز تھا جس نے انہیں مغرور بنا دیا تھا۔ اور پھر اسی غرور نے انہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فرمان کی تکذیب پر اُکسایا۔

ایک دن وہی بزرگ اپنے عقیدت مندوں اور خدمت گاروں کے ساتھ کسی دیہاتی علاقے سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک نہایت حسین وجمیل عیسائی دوشیزہ پر پڑی جو اپنے جانوروں کو چرا رہی تھی۔ بزرگ کے قدم پتھر کے ہو کر رہ گئے اور وہ ایک نامحرم لڑکی کو حیرت وسکوت کے عالم میں دیکھنے لگے۔

عقیدت مندوں اور خدمت گاروں کو بزرگوں کی اس حالت پر تعجب بھی تھا اور خفت بھی۔ آخر جب بہت دیر گزر گئی تو ایک مرید نے بصد احترام آگے چلنے کے لئے عرض کیا۔

بزرگ نے جواب میں کہا۔ ''تم لوگ واپس چلے جاؤ! میری منزل آ گئی۔ میں یہیں قیام کروں گا۔''

بزرگ کے تمام مرید اور خدمت گار حیران و پریشان تھے۔ وہ اپنے مرشد کو اس حال میں تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے مگر بزرگ نے انہیں دوبارہ غضب ناک لہجے میں حکم دیا۔

''تم لوگ واپس جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

چاروناچار تمام عقیدت مند، مرید اور خدمت گار واپس چلے گئے۔

دوسرے دن ایک مرید جو بہت زیادہ مقرب تھا، ڈرتے ڈرتے جنگل میں پہنچا۔ بزرگ کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہو گئی تھی۔ وہ عیسائی دوشیزہ کے پیچھے پیچھے اس طرح پھر رہے تھے جیسے اس کے ادنیٰ ملازم ہوں۔ مرید کا دل بجھ کر رہ گیا۔ اس نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ شیخ کے حضور میں عرض کیا۔

''شیخ! واپس تشریف لے چلئے۔ علم کے پیاسوں کی نظریں فرشِ راہ ہیں اور مجلسِ وعظ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔''

''کون علم کے پیاسے...... اور کیسی مجلسِ وعظ؟'' بزرگ نے مرید کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''میں اس کے سوا کسی کو نہیں پہچانتا۔'' بزرگ نے عیسائی دوشیزہ کی طرف اشارہ کیا۔

پھر کچھ دن بعد اسی مرید نے ایک اور ہولناک منظر دیکھا۔ عیسائی دوشیزہ کا جنگل میں دُور دُور پتہ نہیں تھا اور وہ بزگ اس کے جانوروں کی نگہبانی کر رہے تھے۔

''پیر و مرشد! یہ سب کچھ کیا ہے؟'' مرید نے بڑے کرب ناک لہجے میں عرض کیا۔

''میں جس سے محبت کرتا ہوں، اس کی ہر نسبت میرے لئے محترم ہے۔'' بزرگ نے کہا اور عیسائی دوشیزہ کی بھیڑ بکریوں کو لے کر آگے بڑھ گئے۔

پھر ایک دن اسی مرید نے دیکھا کہ بزرگ جنگل میں ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے اور جانوروں کے بچے ان کے سینے اور گردن پر چڑھے ہوئے تھے۔

مرید کو اچانک ان بزرگ کے وہ الفاظ یاد آئے جب انہوں نے حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فرمان کو جھٹلاتے ہوئے کہا تھا۔

''دوسرے ولیوں کی گردن پر عبدالقادر جیلانی کا قدم ہوگا، میری گردن پر ان کا قدم ہرگز نہیں۔''

یہ خیال آتے ہی مرید شدتِ خوف سے کانپ اٹھا۔ اس نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ عیسائی دوشیزہ وہاں موجود نہیں تھی۔ مرید آگے بڑھا اور اس نے اپنے پیر و مرشد کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ بزرگ جاگ اٹھے اور اپنے مرید سے ناخوشگوار لہجے میں کہنے لگے۔

''تم نے مجھے کیوں جگایا؟...... آخر تم کون ہو؟''

''شیخ! میں آپ کا ایک ادنیٰ خدمت گار ہوں۔'' مرید نے نہایت غم زدہ لہجے میں عرض کیا۔

''میں تمہیں نہیں پہچانتا۔'' بزرگ نے اس طرح کہا کہ ان کے چہرے پر دیرینہ شناسائی کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

''کیا آپ کو قرآن پاک بھی یاد نہیں؟'' مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

بزرگ کچھ دیر تک سوچتے رہے جیسے وہ اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ آخر ان کے بجھے ہوئے چہرے پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور پھر وہ عجیب سے لہجے میں کہنے لگے۔ ''ہاں! مجھے قرآن حکیم کی ایک سورۃ یاد ہے۔ قل ھو اللہ احد۔'' (کہہ اللہ ایک ہے)

یہ سن کر مرید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جو شخص اپنے وقت کا بہترین حافظ قرآن تھا، آج اسے صرف چار آیتیں یاد تھیں۔ فرنگی دوشیزہ کے عشق نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

مرید چپ چاپ واپس چلا گیا۔ پھر ہزاروں انسانوں نے دیکھا کہ وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے قدموں میں لپٹا ہوا گریہ وزاری کر رہا تھا۔

''سیّدی! انہیں معاف کر دیجئے۔''

"کسے معاف کردوں؟" حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

مرید اس واقعے کو دہرانے لگا جسے سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ اور اکثر اہلِ مجلس فراموش کر چکے تھے۔

"میرے دل میں ان کے لئے کوئی غبار نہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر بھی میں نے انہیں معاف کردیا۔" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے با آواز بلند فرمایا۔

"آپ ان کے حق میں دعائے خیر فرمائیے کہ وہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔" مرید زار و قطار رو رہا تھا۔ "وہ گمراہی کی آخری منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ بس اگلا قدم ان کو ہلاکت و بربادی کی غار میں لے جائے گا۔"

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ "جب سارے خزانے تیرے ہیں تو پھر تیرے سوا کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ اسے بھی اپنی شانِ غفاری کے طفیل بخش دے جس نے مجھے جھٹلایا۔"

جیسے ہی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، بزرگ کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرے کی دیوار ہٹ گئی ہے اور دماغ پر پڑا ہوا تاریکیوں کا پردہ سرک گیا ہے۔ انہوں نے فرنگی دوشیزہ پر لعنت بھیجی اور شہر کی طرف واپس لوٹ آئے۔

پھر اپنی خانقاہ جانے کی بجائے سیدھے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی درس گاہ میں حاضر ہوئے اور غوث اعظمؒ سے اپنی متکبرانہ روش کی معافی مانگتے ہوئے با آواز بلند عرض کرنے لگے۔

"سیّدی! میری گردن پر بھی آپ ہی کا قدم مبارک ہے۔"

اس واقعے سے ہر دور کے بزرگوں نے عبرت حاصل کی۔

خود حضرت غوث اعظم سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک موقع پر فرمایا ہے۔

"میری تکذیب تمہارے لئے زہر قاتل ہے اور دنیا و آخرت کی تباہی کا سبب ہے۔ اگر شریعت نے میری زبان بند نہ کردی ہوتی تو میں تمہیں بتا دیتا کہ تم نے اپنے گھروں میں کیا کھایا اور کیا چھپا کر رکھا ہے؟ میں تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہوں کیونکہ تم میری نظر میں شیشے کی طرح ہو۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جسمانی اعتبار سے نازک اور کمزور تھے۔ قد درمیانہ تھا

اور رنگ گندمی۔ سینہ مبارک کشادہ تھا اور داڑھی لمبی اور گنجان۔ دونوں بھنویں باریک تھیں اور آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ آواز پُر جلال اور بلند تھی۔ جس وقت کلام فرماتے تو پوری مجلس گونجنے لگتی تھی۔ لہجے کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہی آپؒ گفتگو شروع کرتے یا مجمع عام میں کچھ ارشاد فرماتے، تمام سننے والے دم بخود رہ جاتے۔ حاضرین مجلس کی مجال نہ تھی کہ وہ آپؒ کی تقریر کے سوا کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔

یہی حال آپؒ کی روشن آنکھوں کا تھا۔ قدرت نے عجیب روشنی اور مقناطیسی کشش عطا کی تھی۔ کسی فرد یا مجمع کو ایک نظر دیکھ لیتے تو وہ آپؒ کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مزاج از حد لطیف تھا اور طبیعت انتہائی نفاست پسند۔ صفائی اور خوشبو کا بہت اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ آپؒ کے لباس سے عالمانہ شان ظاہر ہوتی تھی مگر کپڑا نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے لباس میں ریشم شامل نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ مذہب اسلام میں ایک مرد کے لئے ریشم کا استعمال ناجائز ہے۔

بعض کم نظر اس بات پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ ایک درویش کو قیمتی پوشاک سے کیا غرض؟ دراصل یہ اعتراض کم علمی اور کسی حد تک جہالت کا نتیجہ ہے۔ عام طور پر یہ بات مشہور کر دی گئی ہے کہ درویش اور فقراء بوسیدہ، شکستہ اور معمولی لباس استعمال کرتے ہیں اور یہی ان کی ولایت کی شان ہے۔ بے شک! ہمیں تاریخ میں ایسے بزرگ بھی نظر آتے ہیں مگر اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ قیمتی پوشاک اہل معرفت پر حرام ہے۔ اصولی طور پر اسرافِ بے جا اور نمود و نمائش حرام ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی نہایت قیمتی لباس استعمال فرماتے تھے۔

ایک بار ایک مالدار شخص حضرت ابو حنیفہؒ کی مجلس میں حاضر ہوا مگر اس کا ظاہری حلیہ اس قدر خراب تھا کہ دیکھنے والے اسے انتہائی مفلس و نادار انسان سمجھ رہے تھے۔ حضرت ابو حنیفہؒ نے بھی اسے ایک ضرورت مند انسان ہی سمجھا۔ پھر جب مجلسِ درس ختم ہوگئی تو امام اعظمؒ نے اپنے مُصلّے کا کونہ ہٹاتے ہوئے فرمایا۔

"اے شخص! اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رقم لے لے۔"

حضرت ابو حنیفہؒ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ اپنے مُصلّے کے نیچے رقم رکھتے تھے اور تنہائی میں اسی طرح حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری فرمایا کرتے تھے۔

اس شخص نے نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

"حضرت! مجھے اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ میں تو صرف آپ کا وعظ سننے کے

لئے حاضر ہوا تھا۔"

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور آپؒ نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ "اے شخص! امیر و کبیر ہوتے ہوئے بھی تُو نے مفلسوں سی شکل کیوں بنائی جسے دیکھ کر اللہ کے بندے دھوکا کھاتے ہیں۔ پہلے اپنا حلیہ درست کر، پھر میری مجلسِ درس میں آ۔"

وہ شخص اُٹھ کر جانے لگا تو حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا۔ "اللہ اپنی نعمتوں کے اظہار کو پسند کرتا ہے۔"

اسی طرح حضرت امام مالکؒ بھی قیمتی لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی بزرگوں کی اسی روایت پر عمل پیرا تھے۔

بغداد کے مشہور تاجر شیخ ابوالفضل بیان کرتے ہیں۔

"ایک بار حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا خادم میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"مجھے ایسا کپڑا درکار ہے جس کے ایک گز کی قیمت ایک اشرفی کے برابر ہو۔"

شیخ ابوالفضل نے حضرت غوث اعظمؒ کے خدمت گار کو مطلوبہ کپڑا فراہم کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم اس قدر قیمتی کپڑا کس کے لئے خرید رہے ہو؟"

خادم نے حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام لیا اور کپڑا لے کر چلا گیا۔

خادم کے جانے کے بعد شیخ ابوالفضل نے سوچا کہ جب درویش اتنا قیمتی لباس زیب تن فرمائیں گے تو پھر خلیفۂ وقت کون سا کپڑا استعمال کرے گا؟

پھر ایک دن شیخ ابوالفضل حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی درس گاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپؒ کوئی شرعی مسئلہ بیان فرما رہے تھے۔ درس ختم ہوا تو حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ ابوالفضل کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ابوالفضل! مجھے ربِ جلیل کی عزت کی قسم! جب تک میرا معبود خود حکم نہیں دیتا، میں اس وقت تک کوئی قیمتی کپڑا نہیں پہنتا۔" حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد کے تاجر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس لباس کے متعلق بھی جس کا کپڑا تم سے منگوایا گیا تھا، مجھے یہ حکم ملا تھا۔ تجھے میرے حق کی قسم! ایک پیرہن ایسا بھی پہن جس کے ایک گز کپڑے کی قیمت ایک اشرفی کے برابر ہو۔"

تاجر ابوالفضل یہ سن کر لرز گیا اور معافی مانگنے لگا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ اہلِ ظاہر یہی خیال کرتے ہیں۔" حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "ابوالفضل! جسے تم قیمتی لباس سمجھ رہے ہو، یہ لباس نہیں،

میت کا کفن ہے۔ جب کوئی درویش عالم سلوک میں ہزار بار مر چکتا ہے تو اس کو ایک کفن عطا ہوتا ہے۔"

یہ تھی حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے قیمتی لباس کی حقیقت۔

روایت ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ ہر روز صبح نیا لباس تبدیل فرماتے تھے اور پرانا لباس کسی درویش کو دے دیا کرتے تھے۔ اکثر بزرگوں کا خیال ہے کہ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فقراء اور مساکین ہی کی خاطر نیا پیرہن استعمال فرماتے تھے۔

اسی طرح حضرت شیخؒ ہر جمعہ کو نیا جوتا پہنتے تھے اور پرانا جوتا کسی درویش یا فقیر کو دے دیا کرتے تھے۔ یہ آپؒ کے جود و سخا کا ایک منفرد انداز تھا جسے اہلِ دل سمجھتے تھے۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اکثر اوقات خچر پر سوار ہوتے تھے۔ ویسے آپؒ کو اونٹ کی سواری بھی پسند تھی۔

حضرت غوث اعظمؒ کی خوراک بالکل سادہ تھی۔ آپؒ کے واسطے علیحدہ اناج بویا جاتا تھا جس کی قیمت آپؒ خود ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپؒ کے احباب میں سے کچھ لوگ اس کام پر مقرر تھے۔ ایک شخص ہر سال آپؒ کے لئے بطور خاص اناج بویا کرتا تھا۔ پھر دوسرا شخص اسے پسوا کر اور روزانہ مغرب سے قبل روٹیاں پکوا کر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ کھانے کے وقت جس قدر غرباء آپ کے پاس موجود ہوتے، ان میں برابر سے روٹیاں تقسیم فرما دیتے۔ جو کچھ بچ رہتا، اسے خود تناول فرما لیتے۔ حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خوراک بہت کم تھی۔ اکثر دنوں میں آپؒ روزہ رکھتے۔ بسا اوقات ترکِ حیوانات فرماتے یعنی گوشت، گھی اور دودھ کا استعمال چھوڑ دیتے۔ کبھی گوشت بہت شوق سے کھاتے۔

گوشت کھانے کے حوالے سے آپؒ کی حیاتِ مبارک کا ایک عجیب واقعہ مشہور ہے۔

اس واقعے کو بڑے بڑے مشائخ نے پانچ مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ایک بار ایک عورت اپنے لڑکے کو لے کر حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی۔

"میرا یہ لڑکا آپ سے بہت محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ اس لئے میں اپنے حق سے دستبردار ہوتی ہوں اور اسے آپ کی غلامی میں پیش کرتی ہوں۔"

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس لڑکے کو قبول فرما لیا۔

پھر کچھ دن بعد جب وہ عورت اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے آئی تو لڑکے کی ظاہری حالت دیکھ کر افسردہ ہو گئی۔ مسلسل ریاضت کی وجہ سے لڑکا کمزور نظر آ رہا تھا اور اس کے

چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔

ماں کی ممتا نے جوش مارا اور وہ بیٹے سے پوچھنے لگی۔ ''فرزند! تمہیں یہاں کھانے کو کیا ملتا ہے؟''

''جو کی روٹی۔ کبھی سبزی کے ساتھ اور کبھی نمک کے پانی کے ساتھ۔'' لڑکے نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر ماں کو شدید اذیت پہنچی اور پھر وہ مدرسے سے اُٹھ کر حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت حضرت شیخؒ مرغ کا گوشت کھا رہے تھے اور آپؒ کے سامنے ایک برتن میں صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔

عورت اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار بول اُٹھی۔ ''میں نے اپنے جگر گوشے کو آپ کی غلامی میں اس لئے تو نہیں دیا تھا کہ وہ جو کی روٹیاں کھا کھا کر نیم جان ہو جائے۔''

''خاتون! ریاضت کا تو ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جسم کمزور ہو جائے اور روح طاقت حاصل کر لے۔ تمہارا بیٹا بھی اسی مرحلے سے گزر رہا ہے۔'' حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

عورت سلوک کی منازل سے واقف نہیں تھی۔ اس لئے حضرت شیخؒ کی بارگاہ میں گستاخی کی مرتکب ہوگئی۔ ''آپ خود تو مرغ کا گوشت کھا رہے ہیں اور میرے بیٹے کے لئے صرف جو کی بے مزہ روٹیاں؟ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

عورت کا طرزِ گفتگو دیکھ کر خدمت گار لرز اٹھے مگر حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کی پیشانی مبارک پر ہلکی سی شکن تک نہیں اُبھری۔ آپؒ نے کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر مرغ کی ہڈیوں پر ہاتھ رکھ دیا اور باآواز بلند فرمایا۔

''کھڑی ہو جاؤ اس اللہ کے حکم سے جو بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرتا ہے۔'' (ترجمہ)

جیسے ہی سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، مرغ زندہ ہو کر بولنے لگا۔

پھر آپؒ نے اس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جب تیرا بیٹا اس قابل ہو جائے تو اسے اختیار ہے، جو چاہے سو کھائے۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اس کرامت کو بڑے بڑے مشائخ اور ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے۔

شیخ علی بن ابی نصرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانے میں حضرت غوث اعظمؒ

سے بڑھ کر کسی بزرگ کو صاحبِ کرامت نہیں پایا۔ کوئی بھی شخص جس وقت آپؒ کی کرامت کو دیکھنا چاہتا، دیکھ لیتا۔ کرامت کبھی آپؒ سے ظاہر ہوتی تھی اور کبھی آپؒ میں ظاہر ہوتی تھی۔

شیخ ابو عمرو عثمانؒ کا بیان ہے کہ حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات سلک مروارید (موتیوں کی لڑی) کی مانند تھیں۔ اگر کوئی شخص اپنی آنکھیں کھلی رکھتا تو ہر روز حضرت شیخؒ کی کئی کرامات دیکھ لیتا۔

شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلامؒ کا قول ہے کہ جس قدر تواتر کے ساتھ سیّدنا محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات بیان کی گئی ہیں، کسی اور ولی کی نہیں۔

اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بستان العارفین'' میں امام نوویؒ نے بھی یہی فرمایا ہے۔

نور الدین ابوالحسنؒ نے اپنی تصنیف ''بہجۃ الاسرار'' میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ بعض لوگوں نے ''بہجۃ الاسرار'' پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں غلط روایات درج کی گئی ہیں اور حضرت شیخؒ کے روحانی مقام کو ثابت کرنے کے لئے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

مخالفین کے اعتراضات کا جواب علامہ کاتب چلپیؒ نے اس طرح دیا ہے۔

''میں کہتا ہوں کہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں کون سی ہیں جو حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ میں نے ہر چند جستجو کی مگر مجھے کوئی روایت ایسی نہیں ملی جس میں دوسروں نے ''بہجۃ الاسرار'' کے مصنف کی متابعت نہ کی ہو۔ بڑی سے بڑی کرامت جو حضرت شیخؒ کی ذات سے منسوب ہے، وہ یہ ہے کہ آپؒ نے بعض مُردہ انسانوں کو زندہ کر دیا۔ مجھے اپنی حیات کی قسم! اس روایت کو علامہ تاج الدین سبکیؒ نے نقل کیا ہے اور یہی روایت شیخ ابن رفاعیؒ سے بھی منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو دنیا اور آخرت میں جو تصرف عطا فرمایا ہے، اسے وہ غبی، جاہل اور حاسد شخص کیوں کر سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی تمام عمر کتابوں کے مضامین سمجھنے میں ضائع کی اور تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ زندگی بھر کتابوں کی ورق گردانی پر قناعت کرتا رہا مگر اس نے حق تعالیٰ کے بخشش عطا کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے سیّدنا شیخ جنید بغدادیؒ نے فرمایا ہے...... ہمارے طریقے کی تصدیق ولایت ہے۔''

بے شک مُردوں کا زندہ ہو جانا انسانی عقل سے بعید ہے مگر قدرت کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں بلکہ خلاق عالم کے نزدیک یہ ایک ادنیٰ فعل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور خاص یہ معجزہ دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا۔

"قم باذن اللہ۔" (کھڑا ہو جا خدا کے حکم سے)

یہ وہ مشہور کلمہ ہے جس کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بے شمار مُردہ انسانوں کو زندہ کیا۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ کھڑی ہو جاؤ اس اللہ کے حکم سے جو بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرتا ہے۔

ہمارے سامنے مختلف زمانوں میں پیش آنے والے دو مختلف واقعات ہیں مگر دونوں کی اصل ایک ہے۔ ایک اللہ کے برگزیدہ رسول کا معجزہ ہے...... اور دوسرا اللہ کے برگزیدہ ولی کرامت۔ اس دلیل کو سن کر بعض کم نظر کہیں گے کہ ہم نے ایک ولی کو رسولوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ رسول اوّل و آخر رسول ہوتا ہے۔ کوئی ولی کتنا ہی صاحبِ کرامت کیوں نہ ہو، وہ رسولوں کے منصب و جگہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ اولیاء کی شخصیت میں انبیائے کرام ہی کے کردار کی جھلک نظر آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کی پرستش کرتے تھے اور سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی اسی ذاتِ واحد کے نام لیوا تھے۔ اب اگر قادرِ مطلق نے اپنے ایک خاص بندے کو عوام الناس کے سامنے سرخرو کر دیا تو لوگوں کو حیرت کیوں ہے؟

آج کی اس سائنس زدہ دنیا میں بھی کبھی کبھی ایسے واقعات رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ ماہر ڈاکٹر ایک شخص کی موت کا اعلان کر دیتے ہیں مگر آٹھ دس گھنٹے بعد جب اسی مُردہ شخص کو قبر میں اتارا جاتا ہے تو اس کی سانسیں دوبارہ بحال ہو جاتی ہیں۔ اب اگر کہنے والے یہ کہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو کوئی اس کا کیا جواب دے۔

اولیاء را ہست قدرت از اِلٰہ
تیر جستہ باز گردانند راہ

اللہ کی طرف سے اولیاء کو یہ قدرت بخشی گئی ہے کہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کو موڑ کر واپس لا سکتے ہیں۔

مولانا رومؒ کے شعر میں بھی بنیادی بات اسی قدرتِ خداوندی کا اظہار ہے جس کے زیرِ اثر ناممکن، ممکن ہو جاتا ہے اور ممکن، ناممکن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مُردہ انسان زندہ ہو جاتے ہیں اور زندہ لوگ آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ فاعلِ حقیقی صرف اللہ کی ذات باقی اس کے کارندے ہیں۔ وہ جس سے چاہتا ہے اپنا کام لے لیتا ہے۔ جسے پسند کرتا ہے اپنا مقرب بنا لیتا ہے...... اور جسے ناپسند کرتا ہے اسے حشر تک کے لئے راندۂ درگاہ کر دیتا ہے۔

ایک مقام پر حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

"اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے۔ اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے۔ اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے۔ اسے اپنا ہاتھ دو جو تمہیں گرنے سے سنبھال لے گا اور جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا۔ تمہیں نفسِ بدکار اور رفیقانِ گمراہ سے نجات دے گا۔ جو شیاطین، خواہش اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے ڈاکو اور تمہیں ہر نفیس، عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے...... کب تک عادت...... کب تک خواہش...... کب تک رعونت...... کب تک دنیا...... کب تک آخرت...... کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم اس خدا کو چھوڑ کر جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہے۔ اوّل ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے۔ دلوں کی محبت، روحوں کا اطمینان، گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف ہے اور اسی کی طرف سے ان کا صدور ہے۔"

یہ ہے سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نظریۂ توحید جو قرآن و سنت کے عین مطابق ہے۔

ایک اور موقع پر حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔

"اگر حدودِ الٰہی (احکامِ شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنے میں پڑ گئے ہو اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے۔ فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو۔ اسے مضبوط تھام لو۔ نفس کی خواہشات کو جواب دو۔ اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔"

ایک بار حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک عقیدت مند حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"سیّدی! میں نے ایک شخص کو ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ہوا میں تو پرندے بھی اُڑتے ہیں۔" حضرت غوث اعظمؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "بعض جادوگر بھی یہ شعبدے دکھاتے رہتے ہیں۔"

"مگر اس شخص نے زمین پر اُتر کر نماز ادا کی تھی۔" عقیدت مند نے عرض کیا۔

"نماز" کا ذکر آیا تو حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ پھر آپؒ نے اپنے عقیدت مند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اے شخص! کیا تجھے وہ مقام یاد ہے جہاں اس مردِ خدا نے نماز ادا کی تھی؟"

"سیّدی! وہ جگہ تو میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔" عقیدت مند نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ وہ ہوا میں اُڑنے والے شخص سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔

"چلو! ہم بھی اس مردِ خدا سے ملاقات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ درس گاہ سے باہر تشریف لائے اور اپنے خدمت گاروں کے ہمراہ اس طرف روانہ ہو گئے۔

جب طویل سفر طے کر کے حضرت غوث اعظمؒ وہاں پہنچے تو ہوا میں پرواز کرنے والا شخص موجود نہیں تھا۔

عقیدت مند شرمسار نظر آنے لگا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اسے تسلی دی اور فرمایا۔ "مسافر کسی ایک جگہ کب ٹھہرتے ہیں۔ چلو! وہ مقام ہی دیکھ لیتے ہیں جہاں اس مردِ خدا نے سجدہ کیا۔"

عقیدت مند نے اس جگہ کی نشاندہی کی۔ صحرا کی ریت پر انسانی ہاتھوں اور پیروں کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔

حضرت غوث اعظمؒ کچھ دیر تک ان نشانات کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر افسردہ لہجے میں فرمانے لگے۔ "افسوس! میرا قیمتی وقت اس شخص کو تلاش کرنے میں برباد ہو گیا جسے عبادت کا ظاہری طریقہ بھی نہیں آتا۔ جو بندہ اپنے خدا کو صحیح انداز میں سجدہ نہ کر سکے، پھر اگر وہ ہوا میں بھی اُڑے تو کیا کمال ہے؟"

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب انسانی عقائد و اعمال کمزور ہو گئے تھے اور تمام لوگ محیر العقول باتوں کو ایمان کی روشن علامت سمجھنے لگے تھے۔ شاید اس راز کو فاش کرنے کے لئے حضرت غوث اعظمؒ وہاں تشریف لے گئے تھے۔

"صحت نماز کمال بندگی ہے۔ ہوا میں اُڑنا کوئی کمال نہیں۔"

کرامت تو ایک خوشبو ہے۔ اگر کہیں گلاب ہے تو مہکے گا۔ کرامت تو ایک روشنی ہے۔ اگر سورج کا وجود ہے تو گہرے بادلوں میں بھی محسوس کیا جائے گا۔ ایک نابینا شخص بھی رات اور دن میں تفریق کر سکتا ہے۔ کرامت تو ایک آگ ہے۔ اگر انگارہ ہے تو دہکے گا۔ نہ مہکتا ہے، نہ چمکتا ہے، نہ دہکتا ہے، تو پھر یہ سمجھ لو کہ راکھ ہے۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپؒ اپنے اللہ پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ آپؒ کی خلوت و جلوت میں کسی ناحق کا گزر ممکن نہیں تھا۔ آپؒ کے ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی۔ شریعت ہی آپؒ کا علم تھا اور شریعت ہی آپؒ کا عمل۔ پھر اگر ایسے مردِ مومن کی دعا سے کوئی مُردہ شخص زندہ ہو جائے اور کمان سے

چھوٹا ہوا تیر واپس لوٹ آئے تو اہلِ دنیا کو تعجب کیوں ہے؟

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ "ہم اپنے بندے کے ہاتھ اور زبان بن جاتے ہیں۔" ایک مردِ مومن کی یہی شان ہے اور یہی کمال بندگی ہے۔ حضرت سیّدنا محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ بھی اسی مقامِ بندگی پر فائز تھے جہاں خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

حضرت غوث اعظمؒ کی کرامات کا شمار ممکن نہیں۔ پھر بھی ہم چند ایسی کرامات کا ذکر کریں گے جنہیں نہایت معتبر اور ثقہ راویوں نے تواتر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نامور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "عوارف المعارف" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک شخص نے حضرت غوث اعظمؒ سے پوچھا۔

"سیّدی! آپ نے نکاح کیوں کیا؟"

جواب میں سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "بے شک! میں نکاح کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس سے میرے اوقات میں کدورت پیدا ہو جائے گی۔ مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ عبدالقادر تم نکاح کر لو۔ اللہ کے یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ پھر جب یہ وقت آیا تو حق تعالیٰ نے مجھے چار ازواج عنایت کیں۔ جن میں سے ہر ایک مجھ سے کامل محبت رکھتی ہے۔"

حضرت غوث اعظمؒ کی بیویاں بھی آپؒ کے روحانی کمالات سے فیض یاب تھیں۔

آپ کے صاحب زادے حضرت شیخ عبدالجبارؒ اپنی والدہ سے متعلق بیان کرتے ہیں کہ جب بھی اُم محترم کسی اندھیرے مکان میں تشریف لے جاتی تھیں تو وہاں شمع کی طرح روشنی ہو جاتی تھی۔ ایک موقع پر حضرت بابا محترم بھی وہاں تشریف لے آئے۔ جیسے ہی آپؒ کی نظر اس روشنی پر پڑی وہ یک بہ یک غائب ہو گئی۔

"یہ شیطان کی روشنی تھی۔ اسی لئے میں نے اسے ختم کر دیا۔" حضرت بابا محترم نے فرمایا۔ "اب میں اس روشنی کو ایمان کی روشنی میں تبدیل کئے دیتا ہوں۔"

اس کے بعد اُم محترم جب بھی کسی تاریک مکان میں جاتی تھیں تو وہ روشنی چاند کی روشنی معلوم ہوتی تھی۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

شیخ ابوالحسن علی قرشیؒ کا بیان ہے کہ ایک بار میں اور شیخ علی بن ابی نصرؒ، حضرت غوث اعظمؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ بغداد کا مشہور تاجر ابو غالب فضل اللہ حاضر ہوا اور عرض

کرنے لگا۔

''سیدی! دعوت قبول کرنا مسنون ہے۔ اس لئے آپ مجھ گناہ گار کی بھی دعوت قبول فرمائیے۔''

حضرت غوث اعظمؒ سر جھکائے کچھ دیر سوچتے رہے۔ اہلِ مجلس کو خیال گزرا کہ آپؒ انکار فرما دیں گے۔ کیونکہ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ دولت مندوں کے مکان پر تشریف نہیں لے جاتے تھے اور نہ کسی امیر وکبیر شخص کی دعوت قبول فرماتے تھے۔

ابو غالب فضل اللہ امید وبیم کی حالت میں بیٹھا رہا۔ آخر سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد کے تاجر پر نظرِ کرم کی اور اس کی دعوت قبول فرمائی۔ ابو غالب کیف ومسرت کے عالم میں واپس لوٹا اور اس نے نہایت پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔

جب حضرت غوث اعظمؒ ابو غالب کے مکان پر تشریف لے گئے تو وہاں پہلے ہی شہر کی معزز ہستیاں موجود تھیں اور بغداد کے بڑے بڑے مشائخ سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا انتظار کر رہے تھے۔

دسترخوان بچھایا گیا۔ انواع واقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے۔ آخر میں ابو غالب کے دو ملازم ایک بہت بڑا مٹکا اٹھا کر لائے اور اسے کمرے کے گوشے میں رکھ دیا۔ حاضرین کی نظریں سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چہرۂ مبارک پر مرکوز تھیں مگر آپؒ سر جھکائے استغراق کے عالم میں تشریف فرما تھے۔

کچھ دیر بعد حضرت غوث اعظمؒ نے شیخ علیؒ کو حکم دیا کہ مٹکا اٹھا کر آپؒ کے پاس لایا جائے۔ شیخ علیؒ اور ایک دوسرے خادم نے وہ مٹکا لا کر حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کے سامنے رکھ دیا۔

''اسے کھول دو۔'' حضرت غوث اعظمؒ نے شیخ علیؒ کو حکم دیا۔

شیخ علیؒ نے مٹکا کھول دیا۔ اس کے اندر ایک جذامی، اپاہج اور نابینا لڑکا تھا۔

''ابو غالب! تم نے اس بچے کو مٹکے میں کیوں قید کر رکھا ہے؟'' حضرت غوث اعظمؒ نے اپنے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''حضور! میرا بچہ جذام کے مرض میں مبتلا ہے۔ اندھا اور اپاہج ہے۔ اسے کہاں لے جاؤں؟'' ابو غالب زار وقطار رو رہا تھا۔

سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کھڑے ہوئے اور بیمار لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''بچے! اللہ کے حکم سے باہر آجا اور پروردگار کی اس خوبصورت دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ۔''

جیسے ہی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، اپاہج اور جذامی لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ پھر وہ خوشی کے عالم میں چیختا ہوا اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

حضرت غوث اعظمؒ کی دعا کا اثر دیکھ کر حاضرین محفل دم بخود تھے اور ابو غالب کے مکان میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ہر طرف ایک شور سا برپا تھا۔ میزبان اور مہمانوں کی ایسی بے خبری کے عالم میں سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کھانا کھائے بغیر وہاں سے چلے آئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اب ہم حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اس کرامت کا ذکر کریں گے جس کا روحانی دنیا میں بہت شہرہ ہے۔

روایت ہے کہ ایک بار دریائے دجلہ میں پوری بارات غرق ہوگئی۔ یہ سانحہ اس قدر الم ناک تھا کہ جن گھروں میں کچھ دیر پہلے شادیانے بج رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ بن کر رہ گئے۔ پھر جب متاثرین کو کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو وہ گریہ وزاری کرتے ہوئے حضرت غوث اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت شیخؒ نے غمزدہ لوگوں کو صبر کی تلقین فرمائی مگر دُلہن کی ماں بے اختیار پائے مبارک سے لپٹ گئی۔

''آپ کی دعاؤں نے ہزاروں بگڑی تقدیریں بنائی ہیں، پھر مجھ بدنصیب کے لئے صرف الفاظ کی بھیک کیوں؟ میرے دامنِ مراد کو بھر دیجئے ورنہ میں اسی طرح آپ کے در پر فریاد کرتے کرتے مر جاؤں گی۔''

''عبدالقادر کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ وہ تو خود قادرِ مطلق کا محتاج ہے۔'' حضرت غوث اعظمؒ نے ایک بار پھر اس غم زدہ ماں کو تسلی دی جس کی چیخیں سن کر حاضرینِ مجلس بھی افسردہ نظر آنے لگے تھے۔

''وہ آپ کی بہت سنتا ہے۔ آپ اس سے میرے داماد اور بیٹی کی زندگی مانگ لیجئے۔'' شکستہ دل ماں کسی بچے کی طرح سرِ مجلس مچل گئی۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بہت دیر تک گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر آپ اس غم زدہ عورت اور سوگوار خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ دریا کے کنارے تشریف لے گئے۔

''اے اللہ! یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ مجھے تیری ذات پاک سے نسبت ہے۔ سوا اس

نسبت کے صدقے میں اپنے بندوں کی مشکل آسان فرمادے۔''

یہ کہہ کر حضرت غوث اعظمؒ نے تھوڑا سا پانی اپنے دستِ مبارک میں لیا اور پھر دریا کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''اے دجلہ! خدا کے حکم سے خشک ہو جا اور مسافروں کو سلامتی سے گزرنے کے لئے جگہ دے دے۔''

حضرت غوث اعظمؒ کا یہ فرمانا تھا کہ دریا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور وہ جگہ خشک نظر آنے لگی جہاں باراتی غرق ہوئے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پورا انسانی قافلہ زندہ وسلامت تھا۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی یہ کرامت اس قدر تواتر کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

بعض علماء نے اس کرامت کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بارات سے مراد اسلام کی زبوں حالی تھی۔ عیش پرست شہنشاہوں اور دنیا دار عالموں نے اسلامی آداب و قوانین کو حرص و ہوس کے دریا میں غرق کر دیا تھا۔ حضرت سیّدنا محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے اسی ڈوبی ہوئی بارات کو نکالا اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ شریعت کسے کہتے ہیں اور دینِ مصطفیٰؐ کیا ہے؟''

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

دین اسلام کے لئے ''دردمندی اور جاں سوزی'' حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی حیاتِ مبارک کا نمایاں پہلو ہے۔ اللہ نے ایسی دردمندی اور جاں سوزی بہت کم اولیاء کو بخشی ہے۔ ایک موقع پر حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیادیں بکھری جاتی ہیں، اے باشندگانِ زمین! آؤ اور جو گر گیا ہے اسے مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے اسے درست کر دیں۔ یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوگی۔ سبھی کو مل کر کام کرنا چاہئے۔ اے سورج! اے چاند! اور اے دن! تم سب آؤ۔''

اسلام کی زبوں حالی میں خود مسلمانوں کا اپنا ہاتھ تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسری اسلام دشمن طاقتیں بھی ہمہ وقت سازشوں میں مصروف رہتی تھیں۔ یہودی اور عیسائی علماء اپنے اپنے مذاہب کی برتری ثابت کرنے کے لئے حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے مناظرے کرتے مگر ہر بار انہیں شکست و ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک بار حضرت غوث اعظمؒ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک پر تقریر فرما رہے تھے کہ ایک عیسائی راہب مجلس وعظ میں داخل ہوا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔

جب غوث اعظمؒ کی تقریر ختم ہوئی تو عیسائی راہب نے کہا۔ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اسلام پر فضیلت حاصل ہے۔''

حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے دلیل طلب کی تو عیسائی راہب انتہائی پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے مگر تمہارے پیغمبر سے ایسا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا۔''

حضرت غوث اعظمؒ نے عیسائی راہب کو سمجھایا۔ ''اللہ نے اپنے تمام پیغمبروں کو معجزات عطا کئے تھے مگر معجزہ فضیلت کی بنیاد نہیں۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں۔ اللہ نے اپنے دین کو رسالت مآبؐ کے ذریعے مکمل فرمایا۔ اب دنیا میں وہی اہل ایمان ہے جو پیغمبر اسلامؐ کی رسالت پر گواہی دے۔''

عیسائی راہب کج بحثی پر قائم رہا۔ آخر حضرت غوث اعظمؒ کو جلال آ گیا۔ آپؒ نے عیسائی راہب سے دریافت کیا۔ ''تیرا کوئی عزیز بغداد میں دفن ہے؟''

''ہاں! میرا باپ اسی شہر میں زیر زمین سو رہا ہے۔'' عیسائی راہب نے جواب دیا۔

''میں تیرے باپ کی قبر دیکھنا چاہتا ہوں۔'' حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

عیسائی راہب، حضرت غوث اعظمؒ کی بات سمجھنے سے قاصر تھا مگر پھر بھی وہ آپؒ کو اس قبرستان میں لے گیا جہاں اس کا باپ دفن تھا۔

''کیا تُو اپنے باپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے؟'' حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے عیسائی راہب سے فرمایا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' عیسائی راہب نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

حضرت غوث اعظمؒ نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے با آواز بلند فرمایا۔ ''قم باذن اللہ۔'' (اُٹھ جا اللہ کے حکم سے)

دیکھتے ہی دیکھتے قبر شق ہو گئی۔ یہ منظر دیکھ کر عیسائی راہب کے حواس گم ہو گئے۔ اس کا باپ تابوت میں زندہ بیٹھا تھا۔

''جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے، اپنے باپ سے پوچھ لے۔'' حضرت غوث اعظمؒ دوبارہ عیسائی راہب سے مخاطب ہوئے۔

مگر وہاں حیرت وسکوت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ عیسائی راہب سکتے کے عالم میں بے

حس و حرکت کھڑا رہا۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے دوبارہ اشارہ کیا اور قبر بند ہوگئی۔

بہت دیر بعد عیسائی راہب کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت یہ ہے کہ وہ اللہ کی روشن نشانی تھے۔ رسول برحق تھے اور ان تمام تہمتوں سے پاک تھے جنہیں تم اپنے عقائد کا لازمی حصہ سمجھتے ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر گواہی ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مگر جہاں تک مُردوں کو زندہ کرنے کا تعلق ہے تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام بھی بحکم خدا یہ کام انجام دے لیتے ہیں۔''

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا۔

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے طویل مدت تک بندگانِ خدا کو اپنے کمالاتِ ظاہری و باطنی سے مستفیض فرمایا۔ آپؒ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ مُردہ دلوں کی مسیحائی کی اور مادہ پرست دنیا میں روحانیت کا عالمگیر ذوق پیدا کر دیا۔ پھر آپؒ کا وقتِ رخصت آ پہنچا۔

وصال سے پہلے آپؒ کے صاحب زادے حضرت شیخ عبدالوہابؒ نے عرض کیا کہ مجھے وصیت فرمائیے۔

جواب میں حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا۔ ''ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا کے سوا کسی سے خوف نہ کھاؤ اور نہ اس کے سوا کسی سے اُمید رکھو اور اپنی تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر دو۔ صرف اسی پر بھروسہ رکھو اور سب کچھ اسی سے مانگو۔ توحید اختیار کرو کہ توحید پر سب کا اجماع ہے۔ جب دل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹتی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے۔''

پھر اپنے فرزندوں سے فرمایا۔ ''میرے گرد سے ہٹ جاؤ۔ میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں۔ میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) بھی حاضر ہیں۔ ان کے لئے جگہ خالی کر دو۔''

حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے صاحب زادے حضرت شیخ عبدالرزاقؒ اور حضرت شیخ موسیٰؒ کا بیان ہے کہ آپؒ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر فرماتے تھے۔ ''تم پر سلام اور خدا کی رحمتیں اور برکتیں۔ حق کی طرف رجوع کرو اور جنت میں داخل ہو۔ میں ابھی

تمہارے پاس آیا۔''

غوث اعظمؒ کے صاحب زادے شیخ عبدالعزیزؒ نے آپؒ کی تکلیف کا حال دریافت کیا تو فرمایا۔

''مجھ سے کوئی کچھ نہ پوچھے۔ میں علم الٰہی میں پلٹے کھا رہا ہوں۔ میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ نہ انسان، نہ جن، نہ فرشتہ۔ خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا۔ حکم بدل جاتا ہے اور علم نہیں بدلتا۔ حکم منسوخ ہو جاتا ہے، علم منسوخ نہیں ہوتا۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصلی تحریر ہے۔''

آپؒ کے صاحب زادے حضرت شیخ عبدالجبارؒ نے فرمایا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟

جواب میں فرمایا۔

''میرے تمام اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، وہ اپنے خدا کے ساتھ صحیح ہے۔''

پھر وقت آخر آیا تو باآواز بلند فرمایا۔ ''میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک و برتر ہے، زندہ ہے اور جسے فنا ہونے کا اندیشہ نہیں۔ پاک ہے وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں۔''

آپؒ کے صاحب زادے حضرت موسیٰؒ کا بیان ہے کہ آپؒ نے لفظ ''تعزز'' فرمایا مگر صحت کے ساتھ ادا نہ ہو سکا۔ آپؒ بار بار اسے دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ لفظ آپؒ کی زبان مبارک سے ٹھیک ٹھیک ادا ہو گیا۔ پھر تین بار ''اللہ'' فرمایا۔ اس کے بعد آپؒ کی آواز غائب ہو گئی۔

حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے گیارہ ربیع الثانی 561 ہجری میں انتقال فرمایا۔ وصال کے وقت آپؒ کی عمر 90 سال تھی۔ بغداد میں آسودۂ خاک ہوئے۔ ساڑھے آٹھ صدیاں گزر جانے کے باوجود مزار مبارک آج بھی مرجع خلائق ہے۔

دور دراز کے علاقوں سے عقیدت مندوں کے ہزاروں قافلے بغداد آتے ہیں، اور اپنے روحانی پیشوا کو سلام کر کے واپس چلے جاتے ہیں...... مگر جو باہوش ہیں اور تاریخ کا شعور رکھتے ہیں، انہیں اس موقع پر ایک آواز سنائی دیتی ہے...... اور وہ آواز امام ابن تیمیہؒ کی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ سے کون واقف نہیں۔ وہ شریعت کے معاملے میں شمشیر برہنہ تھے۔

ہمیشہ اولیاء کی کرامات کے منکر رہے...... مگر جب امامؒ کے سامنے حضرت غوث اعظمؒ کا نام لیا گیا تو امامؒ نے بے اختیار فرمایا۔

"شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات حدِ تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔ ان سے انکار ممکن نہیں۔"

حضرت غوث اعظمؒ کی ولایت و کرامات پر امام ابن تیمیہؒ کی گواہی بڑی عجیب گواہی ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ ولادت	....	582ھ
تاریخ وصال	....	666ھ
مزار مبارک	....	پاک پتن شریف

خاندانی نام فریدالدین مسعود...... گنج شکر لقب...... والد محترم قاضی جلال الدین سلیمان...... مادر گرامی قرسم خاتون۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوئے۔ طلب علم میں اسلامی ممالک کے طویل سفر اختیار کئے اور مشائخ اسلام کی کثیر تعداد سے فیض یاب ہوئے۔ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پہلی بار آپؒ کو دیکھا تو اپنے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "قطب! تم اس شہباز کو زیر دام لائے ہو جس کا آشیانہ آسمان کی انتہائی بلندیوں پر ہے۔"

قریش کے قبیلہ، عدی کا ایک طویل قامت جنگجو، بے باک اور شجاع انسان آج محض اس لئے اپنے گھر سے نکلا تھا کہ وہ سرزمین عرب پر خدائے واحد کا پیغام سنانے والے کو تہہ تیغ کر کے اہل قریش کے بتوں کو سربلند رکھے گا۔ اس کے ہاتھوں میں شمشیر بے نیام دیکھ کر بیک وقت کئی آوازیں گونجنے لگیں۔

''اے سرِعام قہر وغضب کا مظاہرہ کرنے والے! اپنے گھر کی طرف دیکھ کہ تیرے بہن اور بہنوئی بھی اسی جادوگر کے طلسم میں گرفتار ہیں۔'' (معاذ اللہ! شروع میں اہلِ عرب قرآن کریم کو جادو اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساحر کہتے تھے)

اس نے لوگوں کی طعنہ زنی کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ پھر وہ اپنے جفا کار ارادوں کے ساتھ پلٹا، بہن اور بہنوئی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ساری دنیا کی نفرت موجزن تھی۔ پھر اس کی ہیبت وجلال سے لبریز آواز سنائی دی۔

''اس سے پہلے کہ میں تمہارے کاندھوں کو سروں کے بوجھ سے ہلکا کر دوں، مجھے وہ کلام سناؤ جسے تم ساری دنیا سے چھپ کر تنہائی میں پڑھتے ہو۔'' اس باجبروت انسان کے خوف سے اسلام کے دونوں نام لیوا خاموش رہے۔

''میں تمہیں اس حالتِ سکوت میں بھی قتل کر سکتا تھا مگر تمہاری زبان سے وہ کلام سننا چاہتا ہوں جس نے تمہیں تمہارے آباؤ اجداد کی رسموں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ کیا تمہارے دلوں کے سکون کے لئے ''لات ومنات'' کا نام کافی نہیں تھا؟'' قبیلہ عدی کا وہ مردِ جری اپنی بہن اور بہنوئی کو عربوں کے قد آور بتوں کی عظمتیں یاد دلا رہا تھا۔

پھر وہ کلام پڑھا گیا جو پہاڑوں پر نازل کر دیا جاتا تو پورا سلسلۂ کوہسار خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ایک زلزلہ تھا جس نے دلوں کی زمین کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا۔ قبیلہ عدی کا سردار بھی اس کلام کی ہیبت سے لرزنے لگا۔ انسانی خون کی لذت طلب کرنے والی شمشیر پیاسی رہ گئی۔

پھر وہ قبیلہ عدی کا سردار اس انسانِ کامل کی بارگاہ میں حاضر ہوا جو فرش نشیں ہونے کے باوجود ناقابل تسخیر شہنشاہ تھا۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر قبیلۂ عدی کا سردار اپنے حواس کھو بیٹھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی تلوار کے ساتھ اپنا سر بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں رکھ دیا۔

پھر وہی قبیلہ، بنو عدی کا سردار ایک مسلمان کی حیثیت سے ''میدانِ بدر'' میں نمودار ہوا۔ قریش کے تمام قبائل کے سرکش کفار اپنے جسموں پر بہترین اسلحہ سجا کر اہل ایمان کے مقابل آئے تھے۔ مگر قبیلۂ عدی کا کوئی فرد اس خوف سے ادھر نہیں آیا تھا کہ حلقۂ

اسلام میں ان کا سردار موجود تھا۔ (یہ رعب و دبدبے کی عجیب مثال تھی جس پر دنیا کے تمام نفسیات داں اور تاریخ نویس آج بھی حیران نظر آتے ہیں)

پھر وہی باجبروت انسان ''غزوۂ احد'' میں اپنے آقا کے سامنے ثبوت پیش کرنے آیا مگر جب یہ جانگداز خبر عام ہوئی کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیئے گئے تو اس آہنی اعصاب رکھنے والے انسان نے یہ کہہ کر اپنی تلوار توڑ دی۔

''جس ذاتِ مقدس کے لئے ہم برسرپیکار تھے، جب وہی دنیا میں موجود نہیں تو پھر زندگی ایک الزام ہے۔ اب کس کے لئے خون بہائیں اور کس کے لئے جان دیں۔''

پھر 9 ہجری میں خبر گرم ہوئی کہ قیصر روم کے تیور بدل گئے ہیں اور وہ عرب پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں آمادۂ جہاد ہوں اور اپنے مادی وسائل اسلام کی نذر کریں۔ یہ سن کر وہ جاں نثارِ نبوت آگے بڑھا اور اپنا نصف سرمایہ سرورِ کونینؐ کے قدموں میں رکھ دیا۔

پھر اسی سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بات پر ناراض ہو کر ازدواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پیغمبر اسلام کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ آپؐ نے تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس کی بیٹی حفصہؓ کو بھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریکِ حیات ہونے کا شرف حاصل تھا ان گراں بار لمحوں میں تمام صحابہ اُداس تھے۔ وہ خود شاید اضطراب کی حالت میں درِ رسالتؐ پر حاضر ہوا۔ اس نے بلند آواز میں دربان کے سامنے گریہ زاری کرتے ہوئے کہا۔

''شاید آقاؐ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی کی سفارش کے لئے آیا ہوں۔ رب کعبہ بہتر جانتا ہے کہ حفصہؓ کے سلسلے میں میرے دل پر عکس ملال تک نہیں۔ میں تو حضورؐ کی تنہائی کے خیال سے آزردہ ہوں۔ اگر آقاؐ مجھے حکم دیں تو اللہ کی قسم! اسی وقت حفصہؓ کی گردن کاٹ دوں۔''

پھر اس کے ایمان وعشق نے کئی مرحلے طے کئے۔ یہاں تک کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''اسے دیکھ کر شیطان بھی فرار ہو جاتا ہے۔''

پھر وہ مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوا اور اس نے ایسی عجیب بات کہی کہ دنیا کی پوری تاریخ جمہوریت کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ جس کے رعب و جلال کو قریش کے تمام قبائل اپنے دلوں پر محسوس کرتے تھے اور اس کے نام سے جزیرۃ العرب کے بڑے بڑے سرکش سہمے ہوئے رہتے تھے، وہ اقتدار میں آنے کے بعد اعلان کر رہا تھا۔

"اے لوگو! میں نے اپنے دروازے کے کواڑ نکال پھینکے ہیں تا کہ تمہارے اور میرے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہے۔"

پھر اس نے اپنی ذمے داریوں کا عجیب و غریب دائرۂ کار طے کرتے ہوئے کہا۔

"اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو میں اس کا جواب دہ ہوں۔" دعوے سب کرتے ہیں مگر ان پر عمل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس نے اپنے دس سالہ دورِ خلافت میں انسان تو انسان، کسی جانور کو بھی بھوکا نہیں مرنے دیا۔ انتظامی امور کے سلسلے میں یہ انسانی تاریخ کی عجیب ترین مثال تھی۔

عہدِ جاہلیت میں مصر کا علاقہ قحط سالی کا شکار ہو جاتا تو دریائے نیل میں طغیانی لانے کے لئے خوبصورت دوشیزاؤں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ وہ برسرِ اقتدار آیا تو اس نے دریائے نیل کے نام خط لکھا اور پانی اس طرح ابل پڑا کہ اس دن سے آج تک مصر کا وہ علاقہ قحط سالی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کے تحریر کردہ چند الفاظ کرامت کا اعلیٰ ترین نشان ٹھہرے اور بے شمار معصوم دوشیزائیں ایک وحشیانہ رسم کا شکار ہونے سے بچ گئیں۔

پھر دس سال، چھ ماہ اور چار دن تک بارِ خلافت اُٹھانے کے بعد وہ منزلِ آخرت کی جانب بڑھا۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ نماز کے دوران ایک کینہ پرور یہودی اس کے جسم پر خنجر آزما ہوا۔ وہ 23 ھ کا تاریک دن تھا جب 26 ذی الحجہ کو مسجد کا فرش اس کے لہو سے سرخ ہو گیا۔

پھر اسی شکستہ حالت میں اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو طلب کیا۔ مہلک زخموں کے باوجود اس کا وہی لہجہ تھا، وہی آہنگ تھا اور وہی جلال تھا۔ اس نے اپنے فرزند جلیل کو عجیب وصیت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم خلافت کے قریب نہیں جاؤ گے اور نہ زندگی بھر اس منصب و جاہ کی تمنا کرو گے۔ تم نے محسوس کیا ہوگا کہ اس بارِ گراں کو اٹھاتے اٹھاتے تمہارا باپ تھک چکا تھا۔ پھر بھی اگر تمہاری نظروں میں خلافت کوئی شرفِ عظیم ہے تو یہ سوچ کر مطمئن ہو جانا کہ قبیلۂ عدی سے بس یہ شخص کافی تھا جو بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا ہے...... اور چند ساعتوں کے بعد اپنے رب کے حضور چلا جائے گا۔"

اور پھر یکم محرم 24 ہجری کو وہ اپنے رب کے حضور چلا گیا۔

شہادت کی وہ رات ناقابلِ بیان اذیت و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اگر شرع اجازت دیتی تو بے شمار زبانوں پر اس کے مرثیے ہوتے۔ لوگ گریباں چاک کر کے اپنے گھروں سے نکل آتے اور پوری مملکتِ اسلامیہ ماتم کدہ بن جاتی۔ سنتِ نبویؐ نے

لوگوں کو فریاد و فغاں سے روک دیا تھا مگر فرطِ الم سے ان کے سینے فگار تھے اور آنکھیں اشک بار تھیں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ شدتِ غم سے بے قرار ہو کر جبلِ اُحد کی طرف نکل آئے تھے۔ یکایک آپؓ نے سنا کہ پہاڑی پر بہت سے لوگ گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ پہاڑ کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ دور دور تک کسی متنفس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ صحابیِ رسولؐ کے خیال میں وہ جنوں کی ایک جماعت تھی جو ایک مردِ شہید کا ماتم کرنے آئی تھی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے با ہوش و حواس سنا۔ شب کے سناٹے میں بہت سی درد بھری آوازیں گونج رہی تھیں۔

"آج بھلائی نے دنیا سے پیٹھ موڑ لی۔"

یہ وہی مردِ جلیل ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے علامہ اقبالؒ نے اسی ہستیِ محترم کے دوبارہ عکس فگن ہونے کی پیش گوئی کی ہے۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹا دیا تھا
سنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ہاں! یہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ ہی تھے جن کے تدبر اور اندازِ حکمرانی کو دیکھ کر ہندوستان کے نجات دہندہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ "اگر بھارت ایک مثالی ترقی چاہتا ہے تو اسے دوسرا عمر فاروقؓ پیدا کرنا ہوگا۔"

گاندھی کے خوابِ پریشاں سے قطع نظر، یہی نسل فاروقی گردشِ روز و شب کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی کابل اور غزنی کی چٹانوں تک پہنچی۔ درویش فرخ شاہؒ اسی نسل کے امین تھے۔ آپؒ کے روحانی کمالات اور بلند کرداری نے پتھروں کو یہاں تک پگھلایا کہ شاہانِ غزنی بھی آپؒ کی بارگاہ میں خم نظر آتے تھے۔

حضرت فرخ شاہؒ کی چوتھی پشت میں حضرت شیخ شعیبؒ پیدا ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی اس خاندان کی عظمتوں کا ایسا اسیر تھا کہ ایک دن اس نے اپنے وزیروں سے کہا۔

"میری دلی خواہش ہے کہ میں شیخ شعیب سے قریبی رشتہ قائم کرلوں۔"

"سلطان ذی وقار! یہ کس طرح ممکن ہے؟" محمود غزنوی کے ایک وزیر نے عرض کیا۔ وہ ابھی تک اپنے سلطان کے اشارے کو نہیں سمجھا تھا۔

"اگر شیخ شعیب میری بہن سے شادی کرنا چاہیں تو یہ میرے لئے بڑا اعزاز ہوگا۔"

بالآخر سلطان محمود غزنوی نے وضاحت کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ دی۔

اس گفتگو کے فوراً بعد معتمد درباری حضرت شعیبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلطان محمود غزنوی کی خواہش کا اظہار کیا۔

حضرت شیخ شعیبؒ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر آپؒ نے سلطانی قاصدوں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "درویشی اور شہنشاہی میں کوئی جوڑ نہیں۔ آخر یہ رشتہ کس طرح قائم ہوگا؟ پھر بھی اگر سلطان بضد ہیں تو پہلے اس لڑکی کی رضا معلوم کرو جسے شاہی محلات سے نکل کر ایک درویش کی شکستہ خانقاہ کا رخ کرنا ہے۔ کیا وہ دنیا کی تمام تر آسائشیں ترک کر کے ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہے جو فرش نشیں ہے اور غربت و افلاس کی فضاؤں میں سانس لیتا ہے۔"

در پردہ حضرت شیخ شعیبؒ نے انکار کرنے کی کوشش کی تھی مگر سلطان محمود غزنوی طے کر چکا تھا کہ اس کی بہن کے لئے ایک شوہر کی حیثیت سے یہ فاروقی نوجوان سب سے زیادہ موزوں ہے۔ پھر حضرت شیخ شعیبؒ کی شرط یاد دلائی گئی تو سلطان نے شاہی خاندان کی معمر خواتین کے ذریعے اپنی بہن کی رضامندی بھی حاصل کر لی اور ایک دن یہ رشتہ طے پا گیا۔ اس موقع پر بعض اعتراض کرنے والوں نے یہ بھی کہا کہ شیخ شعیبؒ کی ظاہری حیثیت اس قابل نہیں کہ وہ ایک عظیم حکمران کے برادرِ نسبتی کہلا سکیں۔

سلطان محمود غزنوی نے کھلے دل کے ساتھ دنیا پرستوں کی یہ تنقید سنی اور پھر ایک روز سرِ دربار ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میری حکمرانی تمہارے جسموں پر ہے مگر شیخ شعیبؒ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ فرخ شاہؒ کی اولاد میں سے ہیں اور فرخ شاہؒ روحانیت کے شہنشاہ تھے۔ اگر لوگ اس حوالے کو بھی تسلیم نہیں کرتے تو وہ فرخ شاہؒ کے مورثِ اعلیٰ کی طرف دیکھیں۔ میں اپنی بہن کو اس نوجوان کے عقد میں دے رہا ہوں جسے حضرت عمر فاروقؓ سے نسبت خاص ہے۔ اگرچہ یہ تعلق بہت دور سے سہی لیکن رہتی دنیا تک میری بہن کو یہ منفرد اعزاز حاصل رہے گا کہ وہ بھی فاروق اعظمؓ کے خاندان میں ایک کنیز کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی۔" یہ کہتے کہتے سلطان محمود غزنوی بہت زیادہ جذباتی ہوگیا تھا اور حضرت شیخ شعیبؒ کی ظاہری حیثیت پر اعتراض کرنے والے مجرموں کی طرح منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔

پھر کچھ کہنے والوں نے حضرت شیخ شعیبؒ سے بھی سرگوشیوں میں کہا۔ "آپ ایک عظیم نسل اور سرخرو خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمود غزنوی لاکھ منصبِ سلطانی پر فائز

سہی مگر وہ اوّل و آخر غلام زادہ ہے۔ ایک بے داغ خاندان میں غلامی کا یہ پیوند کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔"

حضرت شیخ شعیبؒ نے بہت صبر و تحمل سے ان لوگوں کی باتیں سنیں اور پھر یہ کہہ کر "آقائیت و غلامی" کے مفروضوں کو باطل قرار دے دیا۔

"رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ایک غلام بھی آقا کا لباس پہن لیتا ہے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت قنبرؓ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان دونوں غلاموں کا درجہ دنیاوی شہنشاہوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔"

حضرت شیخ شعیبؒ نے سچ ہی فرمایا تھا۔ اسلام میں غلامی کا کوئی کافرانہ تصور موجود نہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

علامہ اقبالؒ نے حضرت بلال حبشیؓ کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

آگ توحید کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشیؓ رکھتے ہیں

پھر ایک دوسرے موقع پر اس طرح فرمایا۔

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشیؓ کو دوام ہے

(یہاں رومی سے مراد حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نہیں بلکہ سکندر رومی ہے جو فاتح عالم کہلاتا تھا)

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے غلام حضرت قنبرؓ کو علامہ اقبالؒ نے اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

قطرۂ آب وضوئے قنبرؓ نے
در بہا برتر زخون قیصرے

(حضرت قنبرؓ جس پانی سے وضو کیا کرتے تھے اس ایک قطرے کی قیمت شہنشاہ قیصر روم کے خون سے زیادہ تھی)

اسلام کے اسی آفاقی اصول کے تحت حضرت شیخ شعیبؒ نے ان لوگوں کے نظریات کو سختی سے جھٹلا دیا تھا جو سلطان محمود غزنوی کو غلام زادہ اور اس کی پاک سیرت بہن کو غلام

زادی کہہ کر پکار رہے تھے۔

اور پھر وہ دن بھی آیا جب حضرت شیخ شعیبؒ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ اب اگر چہ آپؒ ظاہری طور پر بھی خاندانِ شاہی کے ممتاز ترین رکن بن گئے تھے لیکن اہلِ دنیا کے سامنے آپؒ نے اپنے اس حوالے کو کبھی پیش نہیں کیا۔ سلطان محمود غزنوی نے دولت کے انبار آپؒ کی نذر کرنا چاہے مگر حضرت شیخ شعیبؒ نے ہمیشہ یہی فرمایا۔

"برادرِ محترم! اس معاملے میں آپ سے مصالحت نہیں ہو سکتی۔"

سلطان محمود غزنوی جیسے فاتح سے قریبی رشتہ رکھنے کے باوجود حضرت شیخ شعیبؒ نے پوری زندگی فقر و فاقے میں بسر کی۔

وقت کا قافلہ اپنی مقررہ حدود سے آگے بڑھتا رہا۔ سلطان محمود غزنوی اپنے سینے پر فتوحات کے بے شمار تمغے سجائے ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اسلامی سلطنت میں انتشار پیدا ہوا تو چنگیز خان کے فتنے نے سر اُبھارا۔ کابل اور غزنی بھی منگولوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ شعیبؒ کے والدِ محترم حضرت شیخ احمدؒ بھی تاتاریوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت شیخ احمدؒ نے کسی اور جگہ جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ بہر حال والدِ گرامی کی شہادت اور کابل و غزنی کی تباہی نے حضرت شیخ شعیبؒ کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔

حضرت شیخ شعیبؒ اپنی بیوی، تین صاحبزادیوں اور دیگر اہلِ خاندان کے ساتھ مختلف ناہموار راستوں سے گزرتے ہوئے لاہور تشریف لائے۔ پھر آپؒ نے قصبہ قصور میں قیام فرمایا۔ (ماضی میں یہ جگہ ایک قصبے کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر آج اس قصبے کا شمار پاکستان کے بڑے شہروں میں ہوتا ہے) قصور کے قاضی اس حقیقت سے باخبر تھے کہ آنے والا کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت شیخ شعیبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ پھر قاضی صاحب نے اس دور کے حکمران سلطان شہاب الدین غوری کو عریضہ ارسال کرتے ہوئے تحریر کیا۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت فرخ شاہؒ کے وارثوں نے سرزمین ہند کو اپنی قیام گاہ کے لئے منتخب کیا ہے۔ اگر سلطان مناسب سمجھیں تو اس طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔"

سلطان شہاب الدین غوری نے فوری طور پر حضرت شیخ شعیبؒ کے نام ایک خط تحریر کیا۔ "آپ کلی طور پر مختار ہیں کہ اپنے دینی اور دنیاوی کام جس طرح چاہیں انجام دیں۔ اس سلسلے میں آپ مجھے ہر قدم پر اپنا معاون پائیں گے۔" یہ ایک اشارہ تھا کہ اگر حضرت شیخ شعیبؒ چاہیں تو انہیں فرمانِ شاہی کے ذریعے بڑی سے بڑی جاگیر دی جا سکتی ہے۔

سلطان کا خط دیکھ کر حضرت شیخ شعیبؒ نے جواب میں لکھا۔ "سلطان کی اس عنایت و نوازش کا شکریہ! ہمیں دولت و اقتدار کی کوئی خواہش نہیں۔ یہ چیز ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہم اس کے تعاقب میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھائیں گے۔" یہ آپؒ کے صبر و قناعت کا زندہ ثبوت تھا کہ آزمائش کی کڑی دھوپ میں بھی آپؒ نے سائبان تلاش نہیں کیا اور اپنا دستِ طلب کسی حکمران کی طرف نہیں بڑھایا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے وقت ضائع کئے بغیر دوسرا خط قاضی قصور کے نام تحریر کیا۔ "یہ ایک غیور خاندان کے خوددار وارث ہیں۔ صاحبِ کرامت بھی اور صاحبِ کمال بھی۔ اس لئے تم خود ہی شیخ شعیبؒ کو ایسے عہدہ و منصب کی پیشکش کرو جو ان کے شایانِ شان ہو۔"

سلطان کا خط ملتے ہی قاضی قصور حضرت شیخ شعیبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو فرمانروائے ہند کے ارادوں سے باخبر کیا۔

حضرت شیخ شعیبؒ کسی پر بارگراں بننا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے مجبوراً آپ نے کھتوال (کھوتوال) کا عہدۂ قضا قبول کر لیا۔ پھر اس علاقے کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ شریعت کسے کہتے ہیں اور اسلامی عدل و انصاف کس شے کا نام ہے؟ حضرت شیخ شعیبؒ کے قاضی بن جانے کے بعد پورا علاقہ امن و سکون اور عافیت و سلامتی سے ہمکنار ہو گیا۔

❁ ❁ ❁ ❁

حضرت جمال الدین سلیمانؒ، حضرت شیخ شعیبؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ عین عالمِ شباب میں آپؒ کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو بڑے بڑے اہلِ دانش حیران رہ جاتے۔ حضرت جمال الدین سلیمانؒ کے سیرت و کردار اور علمی کمالات نے ملتان کے مشہور بزرگ حضرت مولانا وجیہہ الدینؒ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ پھر یہ تعلق خاطر اس قدر بڑھا کہ مولانا وجیہہ الدینؒ نے اپنی صاحبزادی قرسم خاتون کا نکاح شیخ جمال الدین سلیمانؒ سے کر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے قرسم خاتونؒ کی ایک کرامت کا ذکر کیا ہے جس سے آپؒ کی روحانی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک رات قرسم خاتونؒ تہجد کی نماز میں مشغول تھیں۔ اس وقت شیخ جمال الدین سلیمانؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک چور گھر میں داخل ہو گیا۔ چور نے گھر میں داخل ہوتے وقت ہی سوچا تھا کہ یہاں ایک بیوہ عورت اور چار معصوم بچے مقیم ہیں۔ کسی محافظ مرد کے موجود نہ ہونے سے اس کا کام آسانی کے

ساتھ تکمیل پا جائے گا۔ وہ اس یقین اور اعتماد کے ساتھ اندر داخل ہوا کہ اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

چور جیسے ہی گھر کے اندر پہنچا، اس کی نظر قرسم خاتونؒ پر پڑی۔ بابا فریدؒ کی مادر گرامی اس کمرے کے دروازے پر نماز میں مشغول تھیں جہاں ان کے چاروں بچے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ چور نے دیکھا کہ قرسم خاتونؒ کی آنکھیں بند تھیں مگر ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ چور کچھ دیر تک اس انتظار میں کھڑا رہا کہ عورت دروازے سے ہٹے تو کمرے میں داخل ہو کر اپنے مقصد کی تکمیل کر سکے۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ ایک شب بیدار خاتون ہے جو ساری رات اپنے رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتی ہے۔ بالآخر چور نے ارادہ کر لیا کہ اگر عورت مزاحم ہوئی تو وہ جبر و تشدد کے ذریعے اسے راستے سے ہٹا کر اندر داخل ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بار پھر عورت کی جانب دیکھا۔ قرسم خاتونؒ اسی طرح آنکھیں بند کئے اپنے خالق کے تصور میں کھوئی ہوئی تھیں۔ چور آگے بڑھا مگر ابھی اس نے چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہو گا کہ وہ اپنی آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو گیا۔ یہ ایک ناقابل یقین حادثہ تھا۔ چور بہت دیر تک گھر کی دیواروں سے سر ٹکراتا رہا مگر اسے واپسی کا راستہ نہ مل سکا۔ فرار کی تمام راہیں بند پا کر اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ قہرِ آسمانی ہے جس نے آنکھوں کی روشنی زائل کر کے اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی چور نے چیخنا شروع کر دیا۔

''میں اپنے عقیدے کے اعتبار سے ایک بت پرست ہوں اور چوری میرا پیشہ ہے۔ میں اس گھر میں بھی چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں سامان و اسباب چرا کر فرار ہو جاتا، اپنی آنکھوں کی روشنی کھو بیٹھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس مکان کی چار دیواری میں کوئی ایسی بزرگ ہستی موجود ہے جس کی دہشت نے مجھے اندھا کر دیا ہے۔ میں اس بزرگ ہستی سے دردمندانہ التجا کرتا ہوں کہ وہ میرا گناہ معاف کر دے۔'' یہ کہہ کر ہندو چور کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اپنی التجا کا جواب سننا چاہتا تھا۔

قرسم خاتون حسب معمول استغراق کی حالت میں تھیں مگر جب ایک چور کی آوازیں مسلسل گونجنے لگیں تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ مکان کے صحن میں ایک طویل قامت انسان ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اس کے لڑکھڑا کر چلنے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کی روشنی کھو چکا ہے۔ قرسم خاتونؒ کچھ دیر تک اس مضبوط و توانا شخص کی بے کسی اور مجبوری کا جائزہ لیتی رہیں جسے اس مکان میں داخل ہونے سے پہلے اپنی

جارحیت اور جسمانی طاقت پر بہت ناز تھا۔

اچانک اجنبی کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ ''سننے والا یقیناً سن رہا ہو گا۔ اسے اس کے خدا کا واسطہ کہ وہ میری حالت زار پر خاموش نہ رہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ چوری اور ڈکیتی میرا مستقل پیشہ ہے لیکن اگر مجھے میری آنکھوں کی گمشدہ روشنی مل گئی تو میں ہمیشہ کے لئے دل آزاری کے اس کاروبار کو ختم کر دوں گا۔''

حضرت بابا فریدؒ کی والدہ محترمہ پھر بھی خاموش رہیں۔ اس سکوت مسلسل سے وہ منکر د سرکش انسان مزید دہشت زدہ ہو گیا۔ پھر اس نے براہِ راست خاتون خانہ کو پکارا۔ ''میں ان قابل احترام خاتون سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہ کو معاف کر دیں۔ بے شک! میں نے انہیں تنہا سمجھ کر چوری کا ارادہ کیا تھا کہ ایک کمزور عورت اور اس کے معصوم بچے میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میری بینائی بحال ہو گئی تو میں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو ترک کر دوں گا اور پتھر کے تمام بتوں کو توڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جاؤں گا۔''

ایک لٹیرے کی گریہ و زاری سن کر قرسم خاتونؒ نے اپنا وظیفۂ نیم شبی چھوڑ دیا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ''دنیا سمجھتی ہے کہ میں بے یار و مددگار ہوں مگر تُو جس کا محافظ ہو اسے کون لاوارث کہہ سکتا ہے۔'' تائید غیبی پر قرسم خاتونؒ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ''تیری رحمت جس گھر کی نگہبانی کرتی ہو اسے رہزنوں سے کیا خطرہ؟ اگر سارا زمانہ بھی قزاق بن کر اس چار دیواری پر ٹوٹ پڑے تو میرا اور میرے بچوں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ بے شک! تُو ہی میرا کفیل ہے اور تُو ہی میرا وکیل۔ میں تیری بندگی پر نازاں ہوں کہ تُو نے مجھ ناتواں عورت کا بدلہ اس مرد سے لے لیا جو بظاہر قوی بھی تھا اور ستم گر بھی۔''

قرسم خاتونؒ کے لہجے کی رقت میں دم بدم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند تھے۔ ہونٹوں میں لرزش تھی مگر اچانک دعا کا انداز بدل گیا۔ ''تُو نے مجھ بے سروساماں کی حفاظت کی اور ایک ظالم انسان کے فتنہ و شر سے محفوظ رکھا...... لیکن اب میں تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ تُو نے جس کی بینائی سلب کی ہے، اس کی آنکھوں کو دوبارہ روشن کر دے۔ وہ بھی تیرا ہی بندہ ہے جو کچھ دیر کے لئے سیدھے راستے سے بھٹک گیا تھا۔ اب وہ تیرے قہر و جلال کا مظاہرہ دیکھ رہا ہے۔ اگر تُو نے بھی اس کی دستگیری نہ کی تو وہ کہاں جائے گا؟ تیرے سوا اس کی کوئی پناہ گاہ نہیں، کوئی راہ نہیں۔ میں نے اپنا جرم معاف کر دیا۔ اب تُو بھی اس کے گناہوں سے چشم پوشی فرما۔ تُو اس پر قادر ہے کہ وہ تمام عمر آنکھوں کی روشنی سے محروم رہ کر کوچۂ گمراہی میں بھٹکتا رہے...... اور تُو

اس پر بھی قادر ہے کہ آنکھوں کے ساتھ اس کے دل کی سیاہی بھی دور ہو جائے۔"

پھر یکا یک اس بت پرست قزاق نے محسوس کیا کہ آنکھوں کے سامنے سے اندھیرے کی بلند دیوار ہٹ گئی ہے۔ اس کی بینائی بحال ہو چکی تھی۔ وہ لرزتے قدموں سے اس تخت کی طرف بڑھا جہاں قرسم خاتونؒ محوِ عبادت تھیں۔

"میں اپنے اس عمل پر اس قدر شرم سار ہوں کہ اظہارِ ندامت کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔" پتھر کے پجاری کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اے شخص! جس نے تیری بینائی کو زائل کر دیا تھا، وہی اس کائنات کا خالق ہے..... اور دوبارہ جس نے تیری آنکھوں کی روشنی بحال کی ہے وہی ذات عبادت اور پرستش کے لائق ہے۔ اس کائنات میں اسی کا حکم جاری و ساری ہے۔ ہم سب بے دست و پا اور مجبور ہیں۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔" قرسم خاتونؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں قزاق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میرا تو بس اتنا فرض ہے کہ تجھ سے تیرا حل دریافت کروں۔ یقیناً تجھے کسی ضرورت نے پریشان کیا ہوگا کہ تُو اس غیر اخلاقی فعل پر آمادہ ہو گیا۔ میرے یہاں تیری حیثیت ایک مہمان کی سی ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنی ضرورت بیان کر۔ شاید میں تیرے کسی کام آ سکوں۔" قرسم خاتونؒ ایک بزرگ کی بیٹی تھیں۔ ایک ولی صفت شوہر کی بیوہ تھیں اور اس کے علاوہ آپؒ نسل سادات سے بھی تعلق رکھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپؒ ایک لٹیرے کے سامنے بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اور لٹیرے کی خجالت کا یہ عالم تھا کہ اگر اس وقت زمین شق ہو جاتی تو وہ اپنے غلیظ و ناپسندیدہ وجود کے ساتھ سینۂ خاک میں سما جاتا۔

"خاتون! بس میرے لئے یہی بہت ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔" چور کے ہونٹوں پر ایک عاجزانہ التجا تھی جیسے وہ کسی کے سامنے کاسۂ گدائی لئے کھڑا ہو۔

"اے شخص! تُو نے مجھے کیا ضرر پہنچایا ہے کہ میں تجھے معاف کر دوں۔" قرسم خاتونؒ نے جواباً فرمایا۔

"میرا یہی جرم کیا کم ہے کہ میں نے آپ جیسی پاکباز عورت کو آزار پہنچانے کا ارادہ کیا۔" پتھر کا پجاری لحظہ بہ لحظہ پگھلتا جا رہا تھا۔

"ان سے معافی مانگ کہ جن کے حقوق تُو نے غصب کئے ہیں۔" قرسم خاتونؒ کے لہجے سے جلالِ روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ان سے معذرت طلب کر جو تیری وجہ سے برباد ہو گئے ہیں۔ اور اس کی بارگاہ میں دامن پھیلا جس نے تجھے توانائی کے ساتھ عقل بخشی۔ مگر تُو بے جان اور حقیر چیزوں کی پرستش کرتا رہا ہے۔ واپس جا اور اپنے تاریک

ماضی پر غور کر۔ روشنی کی آواز سن جو تجھے برسوں سے پکار رہی ہے۔"

یہ کہہ کر قرسم خاتونؒ نے منہ پھیر لیا اور ہندو لٹیرا اس طرح واپس جانے لگا جیسے وہ اپنی زندگی کی آخری بازی بھی ہار گیا ہو۔

یہ عجیب واقعہ نصف شب کے سناٹے میں پیش آیا تھا۔ قصبے کے کسی فرد کو خبر بھی نہیں تھی کہ حضرت جمال الدین سلیمانؒ کی بیوہ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟ بس ایک خدائے حاضر و ناظر نے اس چور کو داخل ہوتے اور پھر قرسم خاتونؒ کو معاف کرتے دیکھا تھا۔ اس لٹیرے کے خلاف نہ کوئی ثبوت تھا اور نہ کوئی گواہی۔ اندھیرے میں ایک سایہ اُبھرا اور کچھ دیر بعد تاریکی میں اس کا عکس تک ڈوب گیا۔ بظاہر اب کسی جرم کا نشان تھا اور نہ مجرم کا وجود...... مگر کون جانے کس کے ذہن میں کیسا حشر برپا تھا اور دل میں انقلاب کی کیسی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی محلے کے لوگوں نے دیکھا، ایک دراز قامت اجنبی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ قرسم خاتونؒ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

حضرت جمال الدین سلیمانؒ کی بیوہ نے آنے والوں سے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ کہنے والے نے کہا۔ "آپ نے گزشتہ رات کے واقعے کو ابھی فراموش نہیں کیا ہوگا۔ میں وہی بے راہ رو انسان ہوں جو کل رات آپ کے مکان میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔"

"اب کیوں آئے ہو؟" قرسم خاتونؒ نے لٹیرے سے دریافت کیا۔

"اس ابدی روشنی کی ایک کرن حاصل کرنے کے لئے جس نے بت کدوں میں جلنے والے صدیوں پرانے چراغوں کو بجھا کر رکھ دیا ہے۔" بت پرست لٹیرا زار و قطار رو رہا تھا۔ "اب مندروں میں ہر طرف دھواں پھیل گیا ہے۔ ہر طرف گھور اندھیرا ہے۔ مجھے کوئی دیوتا، کوئی بھگوان نظر نہیں آتا۔ بس اب مجھے اور میرے اہلِ خانہ کو دولتِ ایمان عطا کر دیجئے کہ ہمارے دل بھی بتوں کے وجود سے پاک ہو جائیں۔"

"کہو خدا ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے رسول ہیں۔" قرسم خاتونؒ نے آنے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

ہزاروں سال سے حلقۂ بُتاں میں زیست بسر کرنے والے ایک خاندان کے کچھ افراد پر یکا یک خدا نے اپنی رحمت کی نظر کی اور وہ انسان ہدایت پا گیا جو اپنی فطرت میں پتھر کا پجاری اور عادت میں سنگ دل قزاق تھا۔

معتبر تاریخوں میں یہ واقعہ واضح طور پر رقم کیا گیا ہے کہ ہدایت پانے کے بعد اس

لٹیرے نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ جس جفاکشی سے وہ ڈاکے ڈالا کرتا تھا اسی سخت کوشی کے ساتھ اس نے آدابِ شریعت پر عمل کیا اور مذہب اسلام کی اس قدر خدمات انجام دیں کہ اس کا شمار خدا کے برگزیدہ بندوں میں ہونے لگا۔ پھر اسی عبداللہ نے شیخ عبداللہؒ کے نام سے شہرت حاصل کی۔ یہاں تک کہ انتقال کے بعد شیخ عبداللہؒ کو حضرت بابا فریدؒ کے والد محترم حضرت جمال الدین سلیمانؒ اور بڑے بھائی حضرت اعزالدین محمودؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آج بھی جب زائرین، خاندانِ فاروقی کے دیگر بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوتے ہیں تو انہیں ایک اور مزار کا گنبد بھی روشن نظر آتا ہے۔ لوگ قطار در قطار اپنے سروں کو جھکائے ہوئے اس مرقد کی طرف بڑھتے ہیں۔ پھر ان کے ہاتھ دعا کے لئے بلند ہو جاتے ہیں۔ یہ مرقد حضرت شیخ عبداللہؒ کا ہے۔ جب تک حضرت شیخ عبداللہؒ کا مزار زمین پر موجود ہے، آنے والے اسی طرح آتے رہیں گے اور انہیں خداوند ذوالجلال کی کرشمہ سازیوں کا اندازہ ہوتا رہے گا۔

جسے چاہے اس کو تُو سرمد بنا دے
جسے چاہے اس کو تُو منصور کر دے

یہی وہ قرسم خاتونؒ ہیں جو اپنے وقت کی بڑی عابدہ تھیں۔ انہی محترم خاتون کی دعاؤں سے ایک بت پرست قزاق نے ہدایت پائی تھی اور معرفت کے اس عظیم وجلیل گھرانے کی تربیت نے ایک بدنام لٹیرے کو شیخ کے بلند درجے تک پہنچایا تھا...... اور ان ہی خاتون کے بطن سے تین فرزند حضرت فریدالدین مسعودؒ، حضرت اعزالدین محمودؒ اور حضرت نجیب الدین متوکلؒ پیدا ہوئے۔ آپؒ کی ایک صاحبزادی حضرت ہاجرہؒ تھیں جن کی آغوشِ محبت میں مشہور بزرگ حضرت علی احمد صابر کلیریؒ نے آنکھ کھولی تھی۔

عام تاریخی کتابوں میں حضرت بابا فریدؒ کا سال پیدائش 582ھ درج ہے۔ مگر جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپؒ 569ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپؒ کی عمر پانچ چھ سال ہوگی کہ مشفق ومہربان باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

حضرت فریدالدین مسعودؒ (بابا فریدؒ) کا دورِ یتیمی دیگر اہلِ خاندان کی نظر میں آفات ومصائب کا زمانہ تھا لیکن آپؒ کی والدہ قرسم خاتونؒ اپنے اللہ کے فیصلے پر راضی بہ رضا تھیں۔ جب رشتے دار خواتین نے گریہ وزاری کرتے ہوئے قرسم خاتونؒ سے یہ سوال کیا کہ ان بچوں کا کیا ہوگا تو حوصلہ مند ماں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''بے شک! ان بچوں کے باپ اس وقت دنیا سے رخصت ہو گئے جب انہیں طاقت ور ہاتھوں اور محفوظ سائبان کی ضرورت تھی۔ لیکن اس ظاہری محرومی کے باوجود نہ

میں خود کو لاوارث سمجھتی ہوں اور نہ میرے بچے بے سہارا ہیں۔ میں جس اللہ کی پرستش کرتی ہوں وہ اوّل وآخر بھی ہے، باطن وظاہر بھی اور حیّ وقیوم بھی۔''

قرسم خاتونؒ کا جواب سن کر بین کرنے والی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں اور یہ پاک سیرت اور جانباز خاتون ان چاروں بچوں کی تربیت میں مشغول ہو گئیں جو باپ کی محبت کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔

❁ ...... ❁❁ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ کو شکر گنج یا گنج شکر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ آپؒ کا لقب ہے۔ مگر اس طرح کہ آپؒ کے اسم گرامی کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ بعض کتابوں میں ''شکر گنج'' کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب پہلی بار قرسم خاتونؒ نے اپنے بیٹے کو نماز کی تلقین کی تو فرمایا۔

''فرزند! نماز ادا کیا کرو۔ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے اور اپنے عبادت گزار بندوں کو بے شمار انعامات سے نوازتا ہے۔''

حضرت فریدالدین مسعودؒ اس وقت بہت کم سن تھے۔ اس لئے مادر گرامی سے پوچھنے لگے۔ ''جو بچے نماز پڑھتے ہیں انہیں اللہ کی طرف سے کیا انعام ملتا ہے؟''

مادر گرامی نے فرمایا۔ ''نمازی بچوں کو پہلے شکر ملتی ہے۔ پھر جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو اللہ انہیں دوسرے انعامات سے نوازتا ہے۔''

حضرت فریدالدین مسعودؒ والدہ محترمہ کی بات سن کر مطمئن ہو گئے۔ پھر جب وہ اِدھر اُدھر چلے جاتے تو قرسم خاتونؒ خاموشی سے مُصلّے کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتیں۔ حضرت بابا فریدؒ نماز ادا کرتے اور شکر کی صورت میں اپنا انعام پا لیتے۔

یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ پھر ایک روز قرسم خاتونؒ گھریلو مصروفیات میں اپنا روزانہ کا عمل بھول گئیں۔ دوسرے دن یاد آیا تو آپؒ نے اپنے فرزند کو بلا کر پوچھا۔

''فرید! کیا کل تمہیں مُصلّے کے نیچے سے شکر ملی تھی؟'' قرسم خاتونؒ کے لہجے سے اضطراب نمایاں تھا۔

''جی ہاں! مجھے ہر نماز کے بعد شکر مل جاتی ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے بصد احترام عرض کیا۔

بیٹے کی بات سنتے ہی قرسم خاتونؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

''تُو نے مجھے فرید کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ اگر تیرا دستِ غیب اسے شکر

فراہم نہ کرتا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتا؟"

پھر قرسم خاتونؒ نے بابا فریدؒ کو گلے لگایا اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "میرا بیٹا فریدالدین مسعود، گنج شکر ہے۔"

تصوف کی اکثر کتابوں میں یہی روایت درج ہے کہ جس روز قرسم خاتونؒ نے بابا فریدؒ کو شکر گنج کہہ کر پکارا، اسی دن سے آپؒ کا یہ لقب مشہور ہو گیا...... مگر بعد کے تذکرہ نگاروں نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کو شکر گنج کا لقب آپؒ کی والدہ محترمہ نے نہیں دیا تھا بلکہ یہ بابا فریدؒ کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ ہے جس کی تفصیلات آگے پیش کی جائیں گی۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

حضرت بابا فریدؒ نے ابتدائی تعلیم کھوال کے مکتب میں حاصل کی۔ آپؒ کے استاد گرامی سیّد نذیر احمد اپنے وقت کے عالم و فاضل انسان تھے۔ حضرت بابا فریدؒ نے گیارہ سال کی عمر میں قاری محمدؒ کی نگرانی میں قرآن کریم حفظ کیا۔ اس کے بعد والدہ محترمہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں دیگر رشتے دار بھی آپؒ کے ہمراہ تھے۔ حضرت بابا فریدؒ نے مادر گرامی سے عرض کیا۔

"میری خواہش ہے کہ استاد محترم بھی اس سفر میں ہمارے شریک ہوں۔"

جواباً قرسم خاتونؒ خاموش رہیں۔ غالباً ان کی مرضی نہیں تھی کہ سیّد نذیر احمد بھی ان کے ہم سفر ہوں۔ سیّد نذیر احمد مالی اعتبار سے ایک تنگ دست انسان تھے مگر ان کے صبر و قناعت کا یہ حال تھا کہ کسی رئیس کے سامنے دستِ طلب دراز کرنا تو بڑی بات ہے، آپؒ کی آنکھوں میں کبھی عکسِ سوال تک نہیں اُبھرا۔ حضرت بابا فریدؒ اپنے استاد گرامی کی اس مجبوری سے باخبر تھے، اس لئے جب والدہ محترمہ نے حج کا ارادہ کیا تو آپؒ خاموش نہ رہ سکے۔

"سیّد نذیر احمد نے مجھ پر اپنی وہ دولت لٹائی ہے جو دنیا میں بڑے بڑے شہنشاہوں کو میسر نہیں آتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ استاد گرامی کو طوافِ کعبہ کی سعادت حاصل ہو جائے۔ اللہ نے ہمیں اس قابل کیا ہے کہ ہم سیّد صاحب کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی احسان نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم اپنے احساناتِ عظیم کے بارِ گراں کو کسی حد تک کم کر سکیں گے۔"

بیٹے کی شدتِ جذبات دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اللہ کا شکر ہے کہ میرا مسعود احسان فراموش نہیں ہے۔"

جب طالبانِ شوق کا یہ مختصر سا قافلہ دیارِ حجاز کی جانب روانہ ہوا تو حضرت بابا فریدؒ کی خوشی ناقابل بیان تھی۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد حضرت بابا فریدؒ کو مزید تعلیم کے لئے ملتان بھیج دیا گیا۔ آپؒ بڑی جانفشانی سے مولانا منہاج الدین کی مسجد میں دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ حضرت بابا فریدؒ کے شوقِ علم کا یہ حال تھا کہ لڑکپن کے باوجود دنیا کی ہر دلکشی سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ مسجد میں آنے جانے والے ایک ایسے لڑکے کو دیکھا کرتے تھے جو ہر وقت کتابوں کے اوراق میں گم رہتا تھا۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ 587ھ میں حضرت فرید الدین مسعودؒ کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس وقت آپؒ کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔ ایک روز حضرت بابا فریدؒ مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ آپؒ کا معمول تھا کہ مطالعے کے وقت گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ مگر اس روز بابا فریدؒ کے انہماک میں فرق آ گیا۔ وہ ایک تیز خوشبو تھی جس نے آپؒ کو چونک جانے پر مجبور کیا۔ بابا فریدؒ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک روشن چہرہ بزرگ وضو خانے کی طرف جا رہے تھے۔ بابا فریدؒ انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔

وہ بزرگ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ حضرت قطبؒ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی دعوت پر ملتان تشریف لائے تھے۔ بابا فریدؒ کا دل مطالعے سے اچاٹ ہو گیا۔ بار بار کتاب کی طرف متوجہ ہوتے، مگر ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا۔ آخر آپؒ نے کتاب بند کر دی اور حضرت قطبؒ کی طرف دیکھنے لگے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وضو کیا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ بابا فریدؒ نے ایک بار پھر اپنا مطالعہ جاری رکھنا چاہا مگر یکسوئی حاصل نہ کر سکے۔ بار بار حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی طرف دیکھتے اور اپنے آپ سے سوال کرتے۔

"یہ بزرگ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ ایسی روشنی تو میں نے کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھی۔"

الغرض حضرت قطبؒ نے نماز ادا کی اور پھر مسجد کے اس گوشے کی طرف تشریف لائے جو بابا فریدؒ کے مطالعے کے لئے مخصوص تھا۔ جیسے ہی حضرت قطبؒ نزدیک پہنچے، نسلِ فاروقی کا نوجوان وارث آپؒ کے جلالِ معرفت سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھے رہو فرزند!'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ اگرچہ حضرت قطبؒ کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی تبسم تھا لیکن آپؒ کے جلالِ روحانی نے بابا فریدؒ کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا اور زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

''کون سی کتاب پڑھ رہے ہو؟'' حضرت قطبؒ نے ایک بار پھر بزرگانہ محبت کا مظاہرہ کیا۔

''نافع کا مطالعہ کر رہا ہوں۔'' بابا فریدؒ کی زبان سے بمشکل یہ الفاظ ادا ہوئے۔ (واضح رہے کہ جن دنوں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، ملتان کی مسجد میں تشریف لائے تھے، اس وقت حضرت بابا فریدؒ، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''نافع'' کا مطالعہ کر رہے تھے)

''انشاء اللہ یہ کتاب تمہیں بہت نفع پہنچائے گی۔'' حضرت قطبؒ نے نوجوان طالب علم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا۔

''میرا نفع تو حضرت کی نگاہِ کیمیا اثر میں پوشیدہ ہے۔'' بابا فریدؒ نے نہایت وارفتگی کے عالم میں عرض کیا۔

حضرت قطبؒ نے نوجوان طالب علم کی طرف بہت غور سے دیکھا۔ ''تمہیں کیا معلوم کہ میں کون ہوں؟''

''بے شک! میں آپ کی ذاتِ گرامی سے واقف نہیں مگر دل کہتا ہے کہ آپ کے قدموں سے اُٹھنے والا غبار ہی میری منزل ہے۔'' بابا فریدؒ کی عقیدت و وارفتگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، نوجوان طالب علم کے جذبات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ پھر آپؒ نے بابا فریدؒ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا مہمان ہوں اور ان ہی کی خانقاہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگر تمہیں فرصت ہو تو تم بھی وہاں آنا۔''

اس کرم نوازی پر بابا فریدؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؒ نے حضرت قطبؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت قطبؒ نے بابا فریدؒ کو دعاؤں سے سرفراز کیا اور اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ کی طرف تشریف لے گئے۔

❁ …… ✡ ✡ …… ❁

بابا فریدؒ پر ایک ایک لمحہ گراں تھا۔ خدا خدا کر کے رات گزاری اور پھر فجر کی نماز پڑھتے ہی حضرت قطبؒ سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب حضرت بہاء الدین زکریاؒ

کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو وہاں مشتاقانِ دید کا ایک ہجوم تھا۔ بابا فریدؒ نے خدمت گاروں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تشریف لائے ہوئے ہیں اور ان ہی کے دیدار کے لئے اہلِ ملتان بے قرار و مضطرب ہیں۔

یہ سن کر حضرت بابا فریدؒ پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ''شہنشاہِ معرفت خود ایک غلام کے پاس تشریف لائے؟ یہ کیسی خوش نصیبی ہے فرید؟'' آپؒ خود کلامی کے انداز میں بول رہے تھے۔ خدمت گار، بابا فریدؒ کے جذبات کی اس کیفیت کو نہ سمجھ سکا اور آگے بڑھ گیا۔ آپؒ بہت دیر تک اسی حالت میں کسی ستون کی مانند کھڑے رہے۔ پھر جب سرشاری کی رَو گزر گئی تو آپؒ نے خانقاہ کے ایک خادم سے عرض کیا۔

''میں بھی حضرت قطبؒ کی قدم بوسی کو حاضر ہوا ہوں۔''

''شیخ کو اتنی فرصت کہاں؟'' خادم نے بابا فریدؒ کو غور سے دیکھا اور ایک عام نوجوان سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''راستے میں کھڑے ہو جایئے صاحب زادے! شیخ گزریں گے تو دیدار کر لینا۔''

''اس چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ساری زندگی کھڑے رہ کر گزار سکتا ہوں۔ مگر تم ایک بار شیخ سے عرض کر کے تو دیکھو۔ شاید وہ اس غلام کو شرفِ باریابی بخش دیں۔'' بابا فریدؒ نے درخواست کی۔

خدمت گار نے ٹالنا چاہا مگر بابا فریدؒ ایک ہی التجا کرتے رہے۔ آخر حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا خادم جھنجلا گیا۔

''شیخ سے کیا عرض کروں؟ کون آیا ہے؟''

''بس اتنا عرض کر دینا کہ طالب علم فرید حاضر ہوا ہے۔''

خادم کا خیال تھا کہ اس بزمِ معرفت میں ایک طالب علم کا گزر نہیں ہو گا مگر جب اس نے حضرت قطبؒ کے روبرو ڈرتے ڈرتے بابا فریدؒ کا نام لیا تو آپؒ نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

''اسے جلدی بھیجو۔ ہم اسی کا تو انتظار کر رہے تھے۔''

واپس آ کر خادم نے بڑی حیرت سے نوجوان طالب علم کی طرف دیکھا۔ ''جاؤ! شیخ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

بابا فریدؒ لرزتے قدموں سے مجلس عرفان میں داخل ہوئے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ جیسے بزرگوں کے جلال و نور کا یہ عالم تھا کہ آپؒ

کی آنکھ نہیں اُٹھتی تھی۔ بہت دیر تک سر جھکائے دو زانو بیٹھے رہے۔

حضرت قطبؒ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے مخاطب ہوئے۔ ''شیخ! یہ فرید ہے۔ میرا فرید۔''

حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے نوجوان طالب علم کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ''ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔''

بابا فریدؒ دونوں بزرگوں کی گفتگو سن رہے تھے مگر آپؒ میں نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آٹھ دن تک ملتان میں مقیم رہے۔ اس دوران بابا فریدؒ ایک خدمت گار کی طرح حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں موجود رہے۔

ایک دن خلوت میسر آئی تو حضرت قطبؒ سے عرض کرنے لگے۔ ''یہ غلام، شاہ کے دامنِ لطف وعنایت سے مستقل وابستگی چاہتا ہے۔''

''انشاء اللہ تمہیں یہ وابستگی بھی مل جائے گی۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔

پھر جب حضرت قطبؒ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے رخصت ہو کر دہلی تشریف لے جانے لگے تو بابا فریدؒ بھی آپؒ کے ہمراہ تھے۔ کوئی تین منزل گزر جانے کے بعد حضرت قطبؒ نے ایک مقام پر ٹھہر کر فرید الدین مسعودؒ سے فرمایا۔

''بابا فرید! اب تم واپس جاؤ اور کچھ دن تک علم ظاہری حاصل کرو۔ اللہ کی تخلیق کردہ دنیا کا مشاہدہ کرو۔ اس کے بندوں سے ملو کہ کون کس مقام پر کیا کر رہا ہے؟ پھر دہلی کا رُخ کرنا۔ تم مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔''

بابا فریدؒ پیر و مرشد کا حکم سن کر اُداس ہو گئے۔ آپؒ کو یہ منزلِ فراق گوارہ نہیں تھی۔

حضرت قطبؒ کی نگاہوں سے بابا فریدؒ کی دلی کیفیت پوشیدہ نہیں تھی اس لئے فرمانے لگے۔ ''فراق و وصال کتابِ زندگی کے دو باب ہیں۔ یہ جدائی بہت عارضی ہے۔ بندہ جب خدا کے راستے میں قدم رکھے تو سب سے پہلے اسے تسلیم و رضا کے مفہوم پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ اب تم جاؤ کہ مرضیٔ خدا یہی ہے۔''

بابا فریدؒ غم ناک آنکھوں کے ساتھ واپس آ گئے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس ملاقات سے دو تاریخی حقائق سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپؒ اٹھارہ سال کی عمر ہی میں سلسلۂ چشتیہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ عام طور پر بھی مشہور ہے کہ حضرت قطبؒ نے بابا فریدؒ کو ملتان میں بیعت فرمایا تھا۔ مگر بعض مستند کتابوں

سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان میں حضرت قطبؒ نے زبانی طور پر وعدہ کر لیا تھا اور باقاعدہ رسمِ بیعت کئی سال بعد دہلی میں ادا کی گئی تھی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ملتان سے رخصت ہوتے وقت حضرت قطبؒ نے حضرت فرید الدین مسعودؒ کو ''بابا فرید'' کہہ کر پکارا تھا۔ یہ معرفت کا ایک راز تھا جسے صرف حضرت قطبؒ ہی سمجھتے تھے۔ آپؒ کی مستقبل شناس نگاہوں پر یہ راز منکشف ہو چکا تھا کہ ملتان کے ایک مکتب میں دینی تعلیم حاصل کرنے والا، نوجوان طالب علم آنے والے زمانے کا بڑا بزرگ ہے اور اسی رعایت سے حضرت قطبؒ نے آپؒ کو بابا فریدؒ کے لقب سے یاد کیا اور پھر اسی روز سے یہ لقب دائمی حیثیت اختیار کر گیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت قطبؒ کے رخصت ہو جانے کے بعد بابا فریدؒ ملتان سے کوٹھوال پہنچے اور مادرِ گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قرسم خاتونؒ نے تعجب سے پوچھا۔ ''مسعود! تم وقت سے پہلے کیوں لوٹ آئے؟ کیا تمہاری تعلیم مکمل ہو گئی؟''

جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات کا احوال سنایا اور پیر و مرشد کی ہدایت کا ذکر کیا۔ والدہ محترمہ بیٹے کی اس خوش بختی سے بہت مسرور ہوئیں اور فرمانے لگیں۔ ''مسعود! مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔ خداوندِ ذوالجلال نے میرے گریۂ نیم شب کو سنا اور میری دعاؤں میں تاثیر پیدا کی۔ تمہاری بلند اقبالی کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے بزرگ خود تم تک پہنچے اور تمہیں دولتِ لازوال سے سرفراز کیا۔ اب تمہاری نجات اسی میں ہے کہ پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل خوش دلی کے ساتھ کرو۔ یہاں تک کہ حضرت قطبؒ تم سے راضی ہو جائیں۔''

پھر بابا فریدؒ مادرِ گرامی کی دعاؤں کے سائے میں ہندوستان سے بغداد کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں بغداد پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا جو بخارا سے ہو کر گزرتا تھا۔ چنانچہ حضرت بابا فریدؒ پہلے بخارا تشریف لے گئے اور حضرت اجل شیرازیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت اجل شیرازیؒ اپنے دور کے مشہور بزرگ تھے۔ آتشِ عشق نے انہیں اس قدر جلایا تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ سلاطینِ وقت اور امرائے زمانہ سے ملاقات کرنے کو حرام سمجھتے تھے۔ اگر کوئی اہلِ ثروت ادھر سے گزر بھی جاتا تو چیخنے لگتے۔

''خدا کے لئے یہاں سے دُور ہو جا کہ تیری وجہ سے میری روح پر عذاب نازل ہو

رہا ہے۔"

مگر جب حضرت بابا فریدؒ کو دیکھا تو بے اختیار فرمایا۔

"میرے محبوب! کہ تیری آمد اہلِ دل کے لئے سرمایۂ سکون ہے۔"

بابا فریدؒ تقریباً ایک ماہ تک حضرت اجل شیرازیؒ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت شیخؒ کی خانقاہ میں بخشش و عطا کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی ضرورت مند شخص خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ اگر آپؒ کے پاس اس وقت کچھ بھی نہ ہوتا تو خشک خرمائی دے کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے۔

"اے غنی! تُو خوب دیکھ رہا ہے کہ تیرے بندے اجل کے پاس کچھ بھی نہیں۔ آنے والے سمجھتے ہیں کہ مجھے تیری ذات سے ایک نسبت خاص ہے۔ اے امیروں کے دستگیر! اے شہنشاہوں کے کفیل! لوگوں کی اس خوش گمانی کی آبرو رکھ! ان کے دریدہ دامنوں کو اپنے کرم سے سی دے اور ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے فضل سے بھر دے۔" حضرت اجل شیرازیؒ اس دعا کے ساتھ جسے رخصت کر دیتے وہ زندگی بھر کسی کا محتاج نہ ہوتا۔

اپنے قیام کے دوران ایک بار بابا فریدؒ نے حضرت اجل شیرازیؒ سے دریافت کیا۔

"آپ کے نزدیک درویش کون ہے؟"

بابا فریدؒ کے اس سوال پر اجل شیرازیؒ نے حاضرین کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں فرمایا۔ "اہل مجلس غور سے سن لیں۔ میں اس سلسلے میں وہی کہتا ہوں جو حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے۔ حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ اہل دنیا سے رسم و راہ رکھنا اور امرائے وقت سے ملاقاتیں کرنا فقیر کے لئے قطعاً حرام ہے۔"

حضرت اجل شیرازیؒ کی خانقاہ میں حاضری کے علاوہ بابا فریدؒ نے بخارا کے مضافات کی بھی سیر کی۔ ایک دن آپؒ ایک غار میں داخل ہوئے جہاں ایک بزرگ سالہا سال سے محوِ عبادت تھے۔ بابا فریدؒ نے ان بزرگ سے بھی دعائیں حاصل کیں اور رخصت ہونے سے پہلے دریافت کیا کہ آپ ایک تارک الدنیا شخص کا لباس پہن کر صرف اس غار تک کیوں محدود ہو گئے ہیں؟"

بزرگ نے جواباً فرمایا۔ "جب دنیا انسان کو بہت زیادہ ستانے لگے اور انسان بھی محسوس کرنے لگے کہ وہ ہلاک ہو جائے گا تو اسے لازم ہے کہ وہ شہر سے نکل کر جنگلوں کا رخ کرے۔ میں بھی یہی سوچ کر اس غار میں مقید ہوا تھا مگر یہاں بھی مجھے دولت سکون میسر نہیں۔" اتنا کہہ کر بزرگ خاموش ہو گئے۔

بابا فریدؒ نے دوبارہ عرض کیا۔ "حضرت! اپنا کوئی مشاہدہ تو بیان فرمائیں تا کہ یہ

عاجز اپنے علم میں اضافہ کر سکے۔"

بزرگ نے ایک سرد آہ کھینچی۔ "فرید! میں جاں سوختہ، تجھ سے اپنی روداد کیا بیان کروں؟ ساٹھ سال سے اس غار میں رہتا ہوں مگر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا، جب مجھ پر کوئی بلا نازل نہ ہوتی ہو اور جس روز بلا نازل نہیں ہوتی تو گریہ و زاری کر کے خود اس کے لئے التجا کرتا ہوں۔ جب مرضیٔ دوست آزمائش میں پوشیدہ ہے تو پھر میں کیوں نہ اس کی آرزو کروں۔ فرزند! تجھے بھی بس میرا یہی سبق ہے کہ انسان کو بلاؤں پر اس طرح صبر کرنا چاہئے کہ جیسا صبر کرنے کا حق ہے۔"

حضرت بابا فریدؒ ان بزرگ سے مل کر دوبارہ حضرت اجل شیرازیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر دوسرے دن سرزمینِ بخارا کو الوداع کہا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

بخارا کی حدود سے نکل کر بغداد پہنچے اور مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "عوارف المعارف" کا کچھ حصہ بابا فریدؒ کو خود پڑھایا اور اس کے مطالب ذہن نشین کرائے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں امراء قیمتی تحائف اور زرِ کثیر لے کر حاضر ہوتے تھے مگر شیخؒ کا حکم تھا کہ جو کچھ بھی آئے اسے بلا تاخیر بندگانِ خدا میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرمایا کرتے تھے۔

"اگر دولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جائے تو اہل دنیا، درویش کو تونگری کا طعنہ دیں گے اور یہ ایک بڑی سنگین تہمت ہو گی جسے درویش کسی بھی حال میں برداشت نہیں کر سکتا۔ درویشی تو نام ہی خود فروشی کا ہے۔ سو میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔"

ایک دن حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ، حضرت اوحد الدین کرمانیؒ، اور حضرت شیخ برہان الدین سیستانیؒ حاضر تھے۔ بابا فریدؒ نے دیکھا کہ حضرت شیخؒ کے ایک مرید نے خرقۂ خلافت کی درخواست کی۔ یہ مرید ایک عرصۂ دراز سے عبادت و ریاضت میں مشغول تھا اور اب اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ شہاب الدین سہروردیؒ کے دوسرے خلفاء کی طرح اس اعزاز سے نوازا جائے۔

مرید کی اس خواہش کے جواب میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔

"آج مجھے معاف کرو، کل کسی وقت آؤ گے تو اس معاملے پر غور کریں گے۔ پھر جو خدا کی مرضی ہو گی، وہی ظاہر ہو جائے گا۔"

پیر و مرشد کا حکم سن کر مرید چلا گیا۔ پھر دوسرے دن واپس آیا تو خانقاہ کے ایک

گوشے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اہلِ مجلس نے دیکھا کہ مرید کے چہرے پر افسردگی کا رنگ نمایاں تھا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے مرید کی طرف نگاہ کی اور فرمایا۔ ''کیا اب بھی تمہیں خرقۂ خلافت کی خواہش ہے؟ رات تم نے خواب میں اپنی آنکھوں سے ایک پیر اور اس کے مرید کا حشر دیکھ لیا۔ فرشتے ان دونوں کو کھینچتے ہوئے دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف لے جا رہے تھے۔ تم نے اپنے اس خواب کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی؟''

مرید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے حس و حرکت سر جھکائے بیٹھا رہا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے دوبارہ اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم سمجھے ہو کہ ان دونوں کا یہ عبرتناک انجام کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وہ خرقے کے نام سے دنیا کمایا کرتے تھے اور ہر وقت اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مصروف رہتے تھے۔'' اس کے بعد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے دیگر حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جب تک انسان کا دل دنیا کی کثافتوں سے پاک نہ ہو جائے اس وقت تک مرشد پر فرض ہے کہ وہ کسی شخص کو خرقہ نہ دے۔ اور مرید کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ خرقہ نہ پہنے۔''

حضرت بابا فریدؒ کچھ دن تک حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے تھے۔ یہ وہی شہاب الدین سہروردیؒ ہیں جو 549 ھ میں بمقام ''سہرورد'' پیدا ہوئے تھے۔ آپؒ نے امام مجد الدین سے فلسفے اور فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپؒ پر فلسفے کا رنگ غالب تھا اس لئے مختلف مذہبی مسائل میں عقل و دانش کے سہارے بحث کرتے تھے جس کا کبھی کبھی خوفناک نتیجہ برآمد ہوتا تھا۔ اس قسم کے بیشتر مناظرے شہر ''حلب'' میں ہوئے۔ بالآخر فقہاء کی ایک جماعت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی مخالف ہو گئی۔ آپؒ کے بعض مریدوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ اپنے نظریات کو اعتدال پر رکھیں مگر شیخؒ کے دل و دماغ مذہب کے ایک خاص زاویے سے متاثر ہو چکے تھے اور آپؒ کے بیان کی شدت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

انجام کار اس دور کے چند مشہور فقیہوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو ایک مشترکہ خط میں تحریر کیا۔

''یہاں شیخ شہاب الدین نامی ایک درویش ہے جس کے اُلجھے ہوئے خیالات سے مسلمان گمراہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ اہلِ ایمان کو فوری طور پر اس فتنے سے نجات دلائی جائے۔''

فقہاء کی اس شکایت کے جواب میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے بیٹے سلطان الظاہر کو جو حلب کا حکمران تھا، ایک خط لکھا جس میں واضح طور پر تحریر کیا گیا تھا۔

''ہماری سلطنت کے مشہور اور معتبر فقہا، شیخ شہاب الدین کے خلاف گواہی دے چکے ہیں۔ اس لئے ایک ایسے درویش کو زندہ نہ چھوڑا جائے جو لاکھوں اہلِ ایمان کی زندگی سے کھیل رہا ہو۔''

سلطان الظاہر نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے خون میں نہا گئے۔ اسی لئے تصوف کی بعض کتابوں میں آپؒ کو شیخ شہاب الدین ''مقتول'' لکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک روایت یہ ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے نہیں بلکہ اس کے بیٹے سلطان الظاہر نے براہِ راست شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے قتل کا حکم جاری کیا تھا۔ جب حضرت شیخؒ کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ فقہائے حلب کفر کے الزام میں آپؒ کے قتل کا فتویٰ دے چکے ہیں تو آپؒ نے سلطان الظاہر سے درخواست کی۔

''مجھے ایک مکان میں قید کر دیا جائے۔ سلطان کی طرف سے کھانے پینے کی چیزوں کا اہتمام کیا جائے مگر میں ذاتی طور پر ایک لقمہ بھی اپنے حلق سے نہیں اتاروں گا یہاں تک کہ وہ دن آ جائے گا جب شدتِ ناتوانی اور بھوک میرے جسم کو فنا کر دے گی۔ اس طرح سلطان کے حکم کی بھی تعمیل ہو جائے گی اور فقہاء کی جماعت کو بھی قرار آ جائے گا۔''

بعض معتبر تاریخ نویسوں کے نزدیک یہ روایت معتبر نہیں ہے۔

دراصل واقعہ یہی ہے کہ اس زمانے کے مشہور فقیہوں نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے بعض اقوال کو کفر کے دائرے میں شامل کر کے آپؒ کے خلاف قتل کا فتویٰ دے دیا تھا۔ پھر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سے درخواست کی تھی کہ اس شخص کے بوجھ سے زمین کو ہلکا کر دیا جائے جس کے افکار و خیالات مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے مزید تحقیق کرائے بغیر اپنے بیٹے سلطان الظاہر کو حکم دیا کہ وہ ملت اسلامیہ کو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے نجات دلا دے۔ الغرض تصوف میں سلسلۂ ''سہروردی'' کے بانی کو قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت بابا فریدؒ بغداد سے رخصت ہو کر سیستان جا چکے تھے۔

✿ ✿ ✿ ✿

کچھ دن بعد حضرت بابا فریدؒ سیستان پہنچے اور مشہور بزرگ حضرت اوحد الدین کرمانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ اوحد الدین کرمانیؒ روحانیت میں ایک بلند درجہ

رکھتے تھے مگر آپؒ کو کرامت دیکھنے اور دکھانے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی کوئی بزرگ آپؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتا تو شیخ کرمانیؒ اپنی کرامت کا اظہار کرتے اور اس بزرگ کو بھی مجبور کرتے کہ وہ اپنی روحانی قوتوں کا مظاہرہ کرے۔

ایک دن حضرت بابا فریدؒ اور دوسرے بزرگ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت اوحد الدین کرمانیؒ نے تمام بزرگوں سے اپنی اپنی کرامات دکھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پھر حاضرین کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی اہلِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

"یہاں کا حاکم میری بہت دل آزاری کرتا ہے۔ آج وہ چوگان کھیلنے کے لئے گیا ہوا ہے۔ اب اللہ ہی ہے کہ وہ حاکم صحیح وسلامت واپس آ جائے۔"

ابھی مجلس میں حضرت شیخ اوحد الدین کرمانیؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ کسی شخص نے باہر سے آ کر اطلاع دی کہ وہ حاکم گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ مجلس میں تمام بزرگ شیخ کرمانیؒ کی یہ کرامت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کے بعد دوسرے بزرگوں نے بھی اپنی اپنی کرامات کا اظہار کیا۔ آخر میں شیخ کرمانیؒ نے حضرت بابا فریدؒ سے کہا۔

"فرید! تم بھی اپنی کوئی کرامت دکھاؤ۔"

بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ بابا فریدؒ نے نہایت عجز وانکسار کے ساتھ عرض کیا۔ "میں تو ایک طالب علم ہوں اور بزرگوں سے کچھ سیکھنے اور ان کی خدمت کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوں۔"

بابا فریدؒ اپنی عاجزی کا اظہار کرتے رہے مگر حضرت شیخ اوحد الدین کرمانیؒ نے آپؒ کے کسی عذر کو تسلیم نہیں کیا۔ بالآخر بابا فریدؒ مجبور ہو گئے۔ آپؒ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں خداوند ذوالجلال سے درخواست گزار ہوئے۔

"اے اپنے بندوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرنے والے! تجھ پر سب باطن وظاہر روشن ہے۔ تُو خوب جانتا ہے کہ میں تیرا ایک گناہ گار بندہ ہوں۔ مگر ان لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوں جو بے شمار کمالاتِ روحانی رکھتے ہیں۔ میری ذات میں نہ کوئی کرامت پوشیدہ ہے اور نہ میں کرامت کے اظہار کو مناسب سمجھتا ہوں۔ پھر بھی میرے سر سے ان کڑے لمحات کو ٹال دے اور مجھ بے ہنر کو ان حضرات کے سامنے سرخرو فرما دے جو اہلِ علم بھی ہیں اور اہلِ کمال بھی۔"

ابھی بابا فریدؒ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے رب کے حضور دست بہ دعا تھے کہ یکایک تصورات کے پردے پر آپؒ کے پیر ومرشد حضرت قطبؒ کا چہرۂ مبارک روشن ہو گیا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ فرما رہے تھے۔

"بابا فرید! آزردہ کیوں ہوتے ہو؟ جس خدا نے تمہیں سلطان الہندؒ کے آستانۂ عالیہ تک پہنچایا ہے، وہی ہر حال میں تمہاری مشکل کشائی کرے گا۔ ان بزرگوں سے کہو کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر انہیں تمہاری کرامت نظر آ جائے گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی حضرت قطبؒ کا پُرنور چہرہ بابا فریدؒ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آپؒ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

شیخ اوحد الدین کرمانیؒ نے بابا فریدؒ کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا۔ "فرید! خاموش کیوں ہو؟ کیا ابھی اس منزل تک نہیں پہنچے ہو؟"

"منزل تو میری بہت دور ہے مگر آپ حضرات اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر دیکھیں کہ خدا کیا ظاہر کرتا ہے؟"

شیخ کرمانیؒ اور دوسرے بزرگوں نے اپنی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یکایک تمام بزرگوں نے دیکھا کہ وہ سیستان کی بجائے خانۂ کعبہ میں موجود ہیں۔ خود بابا فریدؒ بھی ان درویشوں کے ساتھ بیت اللہ میں موجود تھے۔ کچھ دیر بعد جب تمام درویشوں نے آنکھیں کھولیں تو نظروں کے سامنے شیخ کرمانیؒ کی خانقاہ تھی اور حاضرین مجلس خاموش بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

حضرت شیخ اوحد الدین کرمانیؒ نے بے اختیار ہو کر فرمایا۔ "فرید! اس نوعمری میں تمہیں یہ اعلیٰ مقام مبارک ہو۔"

شیخ کرمانیؒ کے ساتھ دوسرے درویش بھی بابا فریدؒ کے روحانی تصرف کا اعتراف کر رہے تھے مگر بابا فریدؒ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آپؒ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آپؒ کیسے بتاتے کہ یہ سب کچھ کیا تھا؟ کس کی دعاؤں کا اثر تھا اور کس کے فضل وکرم کی کرشمہ سازی تھا۔

❀ ..... ❀ ❀ ..... ❀

سیستان سے رخصت ہو کر بابا فریدؒ، بدخشاں تشریف لے گئے۔ یہاں آپؒ کی ملاقات مشہور بزرگ شیخ عبدالواحدؒ سے ہوئی۔ حضرت شیخ عبدالواحدؒ مشہور صوفی حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید تھے۔ حضرت شیخ عبدالواحدؒ عشق خداوندی سے اس قدر سرشار تھے کہ اہلِ دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اسی بے نیازی اور قلندری کے سبب آپؒ شہری حدود سے نکل کر ایک غار میں مقیم ہو گئے تھے۔ جب کوئی دنیا پرست، حضرت شیخ عبدالواحدؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے کسی کام کے لئے آپؒ سے دعا کی درخواست کرتا تو حضرت شیخ نہایت تلخ لہجے میں فرماتے۔

’’تم کب تک اپنی مردار (دنیا) کے پیچھے بھاگتے رہو گے؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرے؟ اور اس بھڑکتی ہوئی آگ سے بچنے کی کوشش کرے جس کا ایندھن انسان ہیں۔ تم میرے پاس اس لئے کیوں نہیں آئے کہ میں تمہارے حق میں اپنے اللہ سے عافیت طلب کروں؟ تم میرے پاس دنیا مانگنے کے لئے آتے ہو تو غور سے سن لو کہ دنیا سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے اس سیاہ کار اور کریہہ المنظر عورت کو طلاق دے دی ہے۔ جاؤ! کسی اور کے دروازے پر جاؤ۔ تمہیں دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

بابا فریدؒ جانتے تھے کہ حضرت شیخ عبدالواحدؒ ملاقاتیوں سے بیزار رہتے ہیں پھر بھی ایک خدا رسیدہ بزرگ کا شوقِ دیدار آپؒ کو اس غار تک لے گیا جہاں سناٹے اور ویرانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی بابا فریدؒ نے ڈرتے ڈرتے غار کے دروازے میں قدم رکھا، ایک تیز آواز گونجی۔

’’اے سوختۂ عشق! اِدھر آ کہ تجھ پر میرے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔‘‘

بابا فریدؒ نے اندازے سے پہچان لیا کہ یہ حضرت شیخ عبدالواحدؒ کی آواز تھی۔ بابا فریدؒ غار کے اندر پہنچے تو آپؒ نے ایک نحیف و نزار شخص کو دیکھا جو بظاہر ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا اور جس کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ بابا فریدؒ آگے بڑھتے رہے مگر جب غار کے درمیان میں پہنچے تو حضرت شیخ عبدالواحدؒ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ آپؒ پُر جلال لہجے میں فرما رہے تھے۔

’’فرید! میرے قریب ہرگز نہ آنا کہ جل کر خاک ہو جائے گا......اور مجھ سے دور بھی نہ رہنا کہ تجھ پر جادو کا اثر ہو جائے گا۔‘‘

بابا فریدؒ پر اس مردِ جاں سوختہ کی اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ’’وہیں خاک پر بیٹھ جا کہ تُو میرا مہمان ہے اور میری میزبانی یہ ہے کہ میں اپنے مہمانوں کو خاک کے سوا کچھ نہیں دیتا......اور میرے پاس خاک کے سوا ہے بھی کیا کہ میں خود ہی خاک ہو چکا ہوں۔‘‘

بابا فریدؒ نے اس مردِ قلندر کی خدمت میں سلام پیش کیا اور بڑی خوش دلی کے ساتھ فرشِ خاک پر بیٹھ گئے۔ غار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد بابا فریدؒ نے عرض کیا۔

’’شیخ! عشقِ خداوندی کیا ہے؟‘‘

’’مجھے دیکھ کہ میں عشق کی ایک ادنیٰ ترین مثال ہوں۔‘‘ حضرت شیخ عبدالواحدؒ نے جواباً فرمایا۔ ’’میرے جسم پر نظر کر کہ یہ آتشِ فراق میں بوند بوند پگھل رہا ہے۔ بس کچھ

دنوں کی بات ہے کہ یہ پگھلتے پگھلتے خاک میں جذب ہو جائے گا۔ میرے پیروں کی جانب دیکھ کہ میں ایک ٹانگ سے محروم ہوں۔ مجھے دنیا کو طلاق دیئے ہوئے پون صدی گزر چکی ہے۔ میں ستر سال سے اس گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوں اور میں نے تمام اسبابِ ظاہری کی نفی کر دی ہے۔ بہت دن پہلے اس غار میں ایک عورت آئی تھی۔ اُس کے حُسنِ فریب کار کو دیکھ کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی غار سے باہر چلا جاؤں۔ مگر جیسے ہی قدم اٹھایا، ایک غیبی آواز نے میرے پیروں میں ہمیشہ کے لئے زنجیر ڈال دی۔‘‘

کہنے والا کہہ رہا تھا۔ ’’کہاں جا رہے ہو؟ محبت کا دعویٰ تو ہم سے کیا تھا۔‘‘

’’میں واپس لوٹ آیا اور فوراً اپنی ایک ٹانگ کاٹ کر پھینک دی۔ اب تیس سال سے شرم و ندامت کی آگ میں جھلس رہا ہوں کہ قیامت کے دن اپنے دوست کو یہ چہرہ کس طرح دکھاؤں گا؟‘‘

حضرت شیخ عبدالواحدؒ کی داستانِ حیات سن کر بابا فریدؒ اس قدر روئے کہ آپؒ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر خود کلامی کے انداز میں فرمانے لگے۔ ’’فرید! تجھے کیا پتہ کہ اس سرزمین پر اس کے کیسے کیسے جاں نثار موجود ہیں۔‘‘

کچھ دن بعد حضرت بابا فریدؒ بدخشاں سے رخصت ہونا چاہتے تھے۔ آپؒ نے حضرت شیخ عبدالواحدؒ سے اجازت طلب کی۔ جواباً حضرت شیخؒ نے سکوت اختیار کیا۔ بابا فریدؒ یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ ابھی شیخؒ کی مرضی نہیں ہے۔ پھر نصف شب گزر جانے کے بعد حضرت شیخ عبدالواحدؒ نے بابا فریدؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

’’فرید! تُو بھی چلا جائے گا؟‘‘ شیخ کے لہجے سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔ ’’ہاں، سب کچھ جانے ہی کے لئے ہے۔ کسی کو دوام نہیں، کسی کو قرار نہیں......اور کسی کو بتاتے نہیں۔ سب کے سب منزل دو منزل کے ساتھی ہیں۔ بس جدائی اور تنہائی ہی اپنے ہمدرد و غمگسار ہیں۔‘‘

’’شیخ محترم! اگر آپ حکم دیں تو کچھ دن اور ٹھہر جاؤں۔‘‘ بابا فریدؒ نے مؤدبانہ عرض کیا۔

’’چند روزہ قیام سے کیا ہوگا؟ جدائی کی منزل تو سر پر کھڑی ہے۔‘‘ حضرت شیخ عبدالواحدؒ بہت اُداس اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ ’’ہر طرف الفراق، الفراق کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ تجھے بھی جانا ہوگا۔ تیرے سفرِ عشق کا تو ابھی آغاز ہوا ہے۔ ابھی اس کا انجام کہاں؟ مجھ اسیرِ غم کی طرف نہ دیکھ کہ میں تو ازل سے قیدی ہوں۔ یہی تاریک غار میرا مکان ہے۔ یہی میری خلوت ہے اور یہی میری انجمن ہے۔ تُو ہرگز گوشہ نشینی اختیار نہ

کرنا کہ بندگانِ خدا کا ہجوم تیرا منتظر ہے۔ میں تجھے اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کروں گا۔ بس ایک رات اور ٹھہر جا۔"

اتنا کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحدؒ مراقبے میں چلے گئے اور بابا فریدؒ ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

صبح سورج طلوع ہوا تو بابا فریدؒ نے حضرت شیخ عبدالواحدؒ سے اجازت طلب کی۔ حضرت شیخؒ نے ایک نظر بابا فریدؒ کی طرف دیکھا اور پھر غم زدہ لہجے میں فرمانے لگے۔

"فرید! تُو مجھے بہت پسند ہے۔ تجھے اپنا دوست بنا لیتا مگر کیا کروں کہ کسی اور کی دوستی کا دم بھر چکا ہوں۔ اپنے اس عہد کو توڑ نہیں سکتا۔ اگر عہد شکنی کروں گا تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ پھر بھی تُو میرے دل سے دور نہیں رہے گا۔ جب تک زندہ رہوں گا اپنے اللہ سے تیرے لئے عافیت طلب کرتا رہوں گا۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحدؒ بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوئے، پھر بابا فریدؒ کو سینے سے لگا لیا۔

اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابا فریدؒ بیان کرتے ہیں۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا پورا جسم جل اُٹھا ہو۔" یہ حضرت شیخ عبدالواحدؒ کا سوزِ عشق تھا جو نزدیک آنے والوں کو بھڑکتے ہوئے شعلوں کی مانند محسوس ہوتا تھا۔

بابا فریدؒ کی عجیب حالت تھی۔ حضرت شیخ عبدالواحدؒ، آپؒ کو سینے سے لگائے ہوئے فرما رہے تھے۔ "فرید! ہم تو خانماں برباد ہیں۔ نہ ہماری کوئی ملکیت ہے اور نہ کوئی جاگیر۔ بس سوزِ نہاں کی ایک میراث ہے جس نے ہمیں جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ ایک چنگاری تیری نذر بھی کئے دیتا ہوں کہ اس چنگاری کے بغیر درویش، درویش نہیں ہوتا، نیکیوں اور عبادتوں کا سوداگر بن جاتا ہے۔ بس اب جا کہ تیری منزل بہت دور ہے۔ اللہ تیرے قدموں کو استقامت بخشے اور تیرے سر پر ہمیشہ اس کی رحمت سایہ فگن رہے۔ اگر کبھی تجھے یہ جاں سوختہ یاد آئے تو اس کے حق میں بھی دعائے خیر کرنا کہ یہ آگ بجھنے نہ پائے۔ یہاں تک کہ تمام اعضاء، دل، دماغ اور روح جل کر خاک ہو جائیں...... اور پھر یہ خاک کوچۂ یار میں بکھر جائے اور اسے تیز ہوائیں دربدر اُڑاتی پھریں۔" اتنا کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحدؒ زمین پر بیٹھ گئے۔

بابا فریدؒ تاریک غار سے نکل آئے مگر اس طرح کہ آپؒ کے قدم تھکے تھکے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بابا فریدؒ کو حضرت شیخ عبدالواحدؒ سے بچھڑنے کا بہت غم تھا مگر مجبور تھے کہ ابھی آپؒ کی منزل بہت دُور تھی۔

بابا فریدؒ نے بدخشاں کو خیرباد کہا اور چشت کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ وہی مقام ہے

جس کی نسبت سے سلسلۂ چشتیہ نے شہرتِ دوام حاصل کی۔ یہاں پہنچ کر بابا فریدؒ نے حضرت یوسف چشتیؒ کے روضۂ مبارک کی زیارت کی۔ حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ کا شمار سلسلۂ چشتی کے نامور بزرگوں میں ہوتا ہے۔ اگر ہم اس موقع پر مختصراً پیرانِ چشت کا شجرہ بیان کر دیں تو یقیناً قارئین کی معلومات میں ایک گراں قدر اضافہ ہو گا۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

سلسلۂ چشتیہ کا آغاز امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوتا ہے۔ مشہور روایات کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو خرقۂ خلافت عطا کیا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو برصغیر پاک و ہند کے بیشتر لوگ محض ایک صوفی بزرگ کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر جن کی نگاہیں تاریخ آشنا ہیں وہ اس راز سے بھی واقف ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ ایک عظیم محدث تھے اور درجۂ امامت پر اس طرح فائز تھے کہ امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ بھی آپؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ کو تمام اولیائے کرام کے درمیان یہ شرف خاص حاصل ہے کہ آپؒ ہی کی والدہ محترمہ اُم المومنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں۔ بچپن میں جب حضرت حسن بصریؒ کی مادرِ گرامی کسی کام میں مصروف ہوتیں اور آپؒ رونے لگتے تو اُم المومنینؓ آپؒ کو گود میں اٹھا کر اپنا دودھ پلا دیتیں۔ حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

"حضرت حسن بصریؒ کے کلام میں جو غیر معمولی وضاحت اور حکمت پائی جاتی ہے وہ سب اسی مقدس شیر خوارگی کا صدقہ تھا۔"

حسن بصریؒ کو حضرت اُم سلمہؓ کے تعلق سے دوسری ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی آنے جانے کا موقع ملتا تھا۔ ولادت کے بعد جب آپؒ کو امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو مسلمانوں کے عظیم و جلیل خلیفہ نے بے اختیار فرمایا۔

"یہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس کا نام حسن رکھو۔"

حضرت حسن بصریؒ کو ایک سو بیس صحابۂ کرام کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل تھا۔

اُم المومنین حضرت سلمہؓ نے آپؒ کی تربیت کی اور ہمیشہ یہی دعا کرتی رہیں۔ "اے اللہ! حسن کو دنیا کا رہنما بنا دے۔"

حضرت امام حسن بصریؒ کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات پیش آئے ہیں جو تاریخ کے اوراق پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک بار حضرت امام حسن بصریؒ کی مجلسِ درس آراستہ تھی۔ آپؒ نہایت شیریں اور پُر جوش لہجے میں معرفت کے رموز و اسرار بیان فرما رہے

تھے کہ اچانک حاضرینِ مجلس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حجاج بن یوسف اپنے سپاہیوں اور شمشیرِ بے نیام کے ساتھ حضرت امام حسن بصریؒ کے مکتب میں داخل ہوا۔ اس ستم پیشہ اور جفا کار انسان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور سانسیں رُکتی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں۔ بیشتر حاضرین مجلس حجاج بن یوسف کے خوف سے کھڑے ہو گئے اور سوچنے لگے کہ آج حسن بصریؒ کا امتحان ہے۔ وہ حجاج کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں یا درس میں مشغول رہتے ہیں، لوگ اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچتے رہے۔ مگر حضرت امام حسن بصریؒ نے والیٔ عراق کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ آپؒ کے سامنے دنیا کا سفاک ترین انسان کھڑا ہے۔ بالآخر جب حضرت امام بصریؒ کا وعظ ختم ہو گیا تو حجاج بن یوسف نے پکار کر کہا۔

''اگر تم کسی مردِ خدا سے ملنا چاہتے ہو تو حسنؒ کا چہرہ دیکھ لو۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تربیت یافتہ یہی وہ حسن بصریؒ ہیں جن سے سلسلۂ چشتیہ کو دنیا میں فروغ حاصل ہوا۔ آپؒ نے زندگی بھر دولت و اقتدار کی نفی کی اور پھر 4 محرم 111ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

جب حضرت امام حسن بصریؒ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپؒ نے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو خرقۂ خلافت عطا کرتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ اس عظیم امانت کی حفاظت کرنا ورنہ بروز حشر اللہ کے سامنے بڑے شرم سار ہو گے۔ واضح رہے کہ یہ وہ شیخ عبدالواحدؒ نہیں ہیں جن سے بدخشاں کے ایک تاریک غار میں حضرت بابا فریدؒ نے ملاقات کی تھی۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ 177ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپؒ نے اس عالم خاکی کو الوداع کہا تو سلسلۂ چشتیہ کی یہ امانت حضرت فضیل بن عیاضؒ کو منتقل ہو گئی۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپؒ فقہ میں امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ روایت ہے کہ آپؒ اپنے عہدِ شباب میں رہزنوں اور قزاقوں کے سردار تھے۔ پھر جب ہدایت غیبی نصیب ہوئی تو اولیاء کی سرداری کے منصب پر فائز ہوئے۔ خلیفہ ہارون رشید تو آپؒ کے بارے میں کہا کرتا تھا۔

''حقیقتاً بادشاہ تو فضیل بن عیاضؒ ہیں۔''

پھر 187ھ میں یہ شہنشاہِ معرفت زیرِ خاک سو گیا مگر جانے سے پہلے خرقۂ خلافت حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو منتقل ہو گیا۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ بلخ کے حکمران تھے مگر جب آتشِ عشق نے آپؒ کے دل و

دماغ کو جلا ڈالا تو تاج و تخت چھوڑ کر قصرِ شاہی سے یہ کہتے ہوئے نکل آئے۔ ''اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔''

بے شمار دلوں کا میل دھو کر اور لاتعداد ذہنوں کی کثافت دور کر کے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ 265 یا 267ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ وفات سے چند روز پہلے آپؒ نے حضرت حذیفہ مرعشیؒ کو خرقۂ خلافت پہنایا اور نہایت پُرسوز لہجے میں تلقین فرمایا۔

''حذیفہ! میں تجھے جو لباس پہنا رہا ہوں وہ بہت حساس اور نازک ہے۔ ریاکاری کے پتھر سے شیشے کی اس قباء کو محفوظ رکھنا ورنہ ایک کنکری سے یہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اسے غلاظت سے بچانا کہ ساری دنیا گناہوں کا تالاب ہے جس کا پانی گلی گلی اور کوچہ کوچہ بہہ رہا ہے۔ بہت احتیاط سے قدم اٹھانا کہ اس کثیف پانی کی ایک چھینٹ پورے لباس کو داغدار کر دے گی۔''

حضرت حذیفہؒ کا خاندانی نام خواجہ شدید الدین تھا۔ آپؒ مرعش کے رہنے والے تھے جو شام کے قریب ایک آباد شہر ہے۔ اسی شہر کی نسبت سے آپؒ مرعشی کہلاتے تھے۔ حضرت حذیفہؒ نے سات سال کی عمر میں نہ صرف قرآن کریم حفظ کر لیا تھا بلکہ ساتوں مشہور ''قراتوں'' میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپؒ کا طریقہ تھا کہ جس درویش سے بھی ملاقات کرتے، اس سے اپنے حق میں دعائے خیر کراتے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت حذیفہ مرعشیؒ کو بچپن میں ایک بار دیکھا تھا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے آپؒ کو دیکھتے ہی فرمایا تھا۔ ''حذیفہ مرادِ خدا ہیں اور جوان ہو کر بہت سے لوگوں کو منزلِ مقصود تک پہنچائیں گے۔''

حضرت حذیفہ مرعشیؒ نے پیرانِ چشت کا خرقہ حضرت ہبیرہ بصریؒ کو منتقل کیا اور عالم خاکی سے عالم بالا کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت ہبیرہ بصریؒ نہایت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپؒ کو ''ناصر شریعت'' اور ''امام طریقت'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرت ہبیرہ بصریؒ نے سلسلۂ چشتیہ کی یہ امانت حضرت شیخ ممشاد علو دینوریؒ کے سپرد کی اور سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

حضرت شیخ ممشادؒ ایک امیر و کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر جب آپؒ درویشی کی طرف راغب ہوئے تو ساری دولت محتاجوں میں تقسیم کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے افطار کے لئے بھی کوئی چیز باقی نہ رہنے دی۔ تمام سرمایہ لٹا دینے کے بعد حضرت شیخ نے دستِ دعا دراز کیا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگے۔

''اے اللہ! میرے اور تیرے درمیان جو ہلاک کر دینے والی شے حائل تھی، میں نے

اسے راستے سے ہٹا دیا۔ اب مجھے تیری رضا کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔"

14 محرم 299ھ کو معرفت کا یہ آفتابِ ضیاء بار بجھ گیا مگر غروب ہونے سے پہلے حضرت شیخ ممشادؒ نے پیرانِ چشت سے حاصل کردہ روشنی حضرت ابو اسحاق چشتیؒ کو منتقل کردی۔

حضرت ابو اسحاق چشتیؒ شام کے رہنے والے تھے اور یہ پہلے بزرگ ہیں کہ جن کے نام کے ساتھ "چشتی" کا لفظ نظر آتا ہے۔ چشت، خراسان کے ایک مشہور قصبے کا نام ہے۔ اس قصبے میں کچھ بزرگانِ دین نے روحانی تربیت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا تھا جسے بعد میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور وہ روحانی نظام اسی مقام کی نسبت سے "چشتیہ" کہلانے لگا۔

حضرت ابو اسحاق چشتیؒ نے وصال سے پہلے حضرت ابو احمد چشتیؒ کو خلافت عطا کرتے ہوئے فرمایا۔ "ابو احمد! مخلوقِ خدا بیمار ہے۔ اس کی مسیحائی کرو۔"

حضرت ابو احمد چشتیؒ 335ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپؒ نے اپنے صاحب زادے حضرت شیخ ابو محمد چشتیؒ کو پیرانِ چشت کی امانت منتقل کی۔

حضرت شیخ ابو محمد چشتیؒ کے بعد حضرت ابو یوسف چشتیؒ اس روحانی خاندان کے وارث قرار پائے۔ آپؒ نے 459ھ میں وفات پائی۔

حضرت ابو یوسف چشتیؒ کے روحانی وارث حضرت حاجی شریف زندنیؒ تھے۔

حضرت حاجی شریف زندنیؒ نے حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کی تربیت فرمائی۔

حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کی بارگاہِ جلال سے وہ خورشیدِ معرفت طلوع ہوا جس کی روشنی سے پوری سرزمینِ ہند جگمگا اُٹھی۔ وہ مردِ باصفا حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ہیں جن کے آستانے پر ایک لاکھ سے زیادہ سرکش راجپوت خم ہوئے۔

حضرت سلطان الہندؒ کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے اور اہلِ کفر کے دلوں کو اس طرح فتح کیا کہ پتھر کے پجاریوں نے "زنار" توڑ کر پھینک دی اور اپنے ہاتھوں سے قشقے کا نشان کھرچ کر پھینک ڈالا۔

اگرچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ابھی بابا فریدؒ کے سر پر دستارِ خلافت نہیں باندھی تھی لیکن اہلِ نظر اس راز سے باخبر تھے کہ خاندانِ چشت کا وارث یہی نوجوان ہوگا جو پیر و مرشد کے حکم سے مختلف ممالک میں سرگرمِ سفر تھا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

بدخشاں سے رخصت ہو کر بابا فریدؒ "چشت" پہنچے اور مشہور بزرگ حضرت ابو یوسف

چشتیؒ کے مزار مبارک پر حاضری دی۔

ایک دن کسی بزرگ کی مجلس میں دیگر صوفیاء کے ساتھ بابا فریدؒ بھی موجود تھے۔ گفتگو کے دوران ایک درویش نے صاحبِ مجلس سے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہا۔

"کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میری موت واقع ہو چکی ہے اور میری روح شدید اضطراب میں مبتلا ہے۔"

صاحبِ مجلس نے درویش کا خواب سنا اور اپنے علم کے مطابق تعبیر بیان کی۔

جب وہ بزرگ خاموش ہو گئے تو حضرت بابا فریدؒ نہایت ادب کے ساتھ صاحبِ مجلس سے مخاطب ہوئے۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اس خواب کے سلسلے میں کچھ عرض کروں؟"

صاحبِ مجلس نے نوجوان کے تابناک چہرے کی طرف دیکھا اور پھر شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"علم کسی کی میراث نہیں۔ اگر تم اس خواب کو کسی اور زاویے سے سمجھ سکے ہو تو بے جھجک ہو کر اپنا مفہوم بیان کرو۔ مقصد تو یہ ہے کہ کسی طرح خواب کی تعبیر حاصل کی جائے۔ ممکن ہے اللہ نے تمہارے ذہنِ رسا پر خواب کی صحیح تعبیر منکشف کر دی ہو۔"

اجازت پاتے ہی بابا فریدؒ ان درویش سے مخاطب ہوئے جنہوں نے یہ خواب دیکھا۔ "اس خواب میں موت سے مراد حقیقی موت نہیں۔ اپنی کم علمی کے باوجود جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپؒ سے فجر کی نماز قضا ہو گئی ہے۔"

تمام مجلس پر سکوت طاری تھا۔ جیسے ہی بابا فریدؒ خاموش ہوئے، ان بزرگ نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"نوجوان! تمہاری پیش کردہ تعبیر بالکل درست ہے۔ واقعتاً آج میری فجر کی نماز قضا ہو گئی ہے۔ جب میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ میں مر چکا ہوں تو شدتِ خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف نگاہ کی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ نمازِ فجر کا وقت گزر چکا ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے۔"

جب درویش نے نمازِ فجر کی قضا کا اعتراف کر لیا تو بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "نماز کا قضا ہو جانا بھی ایک مسلمان کے لئے موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک یہی آپ کے خواب کی تعبیر ہے۔"

بابا فریدؒ کی اس گفتگو سے حاضرین بہت خوش ہوئے۔ پھر صاحبِ مجلس نے بابا فریدؒ

کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ نوجوان بہت جلد افقِ معرفت پر خورشیدِ تابناک بن کر اُبھرے گا۔"

❀ ..... ✿ ✿ ..... ❀

چشت سے رخصت ہونے کے بعد بابا فریدؒ دمشق کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ تاریخی شہر بھی بزرگانِ دین اور اہلِ علم وفن کے بڑے مراکز میں شامل تھا۔ حضرت بابا فریدؒ نے کچھ دن تک یہاں قیام کیا اور کئی نامور اولیائے کرام کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔

اس وقت دمشق کے مشہور بزرگوں میں حضرت شہاب الدین زندوسیؒ کا نام زیادہ نمایاں تھا۔ ایک دن بابا فریدؒ بھی شیخ زندوسیؒ کی مجلس میں شریک تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں معرفت کے طلب گاروں کے لئے بڑا سبق تھا۔

حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ روحانیت کے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور سننے والوں پر ایک وجد سا طاری تھا۔ پھر جیسے ہی حضرت شیخؒ کی تقریر ختم ہوئی تو حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص اپنی نشست پر اٹھ کر کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"شیخ! آپ کا وہ مرید جسے آپ نے کچھ دن پہلے خرقہ عطا کیا ہے، اہلِ دنیا سے بہت زیادہ میل جول رکھتا ہے۔"

حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ نے بڑے صبر وتحمل سے یہ ناخوشگوار خبر سنی۔ جس مرید کے بارے میں اہلِ دنیا سے ربط وضبط رکھنے کی اطلاع دی جارہی تھی دراصل وہ شیخ زندوسیؒ کا محبوب ترین مرید تھا۔ جب آپؒ نے اسے خرقہ (معرفت کا لباس) عطا کیا تو بڑے والہانہ انداز میں فرمایا تھا۔

"فرزند! اس درویش کے پاس جو کچھ تھا وہ سب تجھے بخش دیا۔ اپنی چاہتیں، اپنے جذبے، اپنی محبتیں اور اپنی دعائیں سب تیرے دامن میں ڈال دیں۔ اپنی فغاں نیم شبی۔ اپنی آہِ سحرگاہی، اپنے قلب کا گداز اور اپنی روح کا سوز اس خرقے میں شامل کر دیا ہے۔ اسے محض ایک زرد رنگ کا کپڑا نہ سمجھنا۔ یہ تیرے شیوخ کی وہ نشانی ہے جس کے ایک ایک تار میں ان کا اپنا لہو شامل ہے۔ دنیا کے گرد وغبار اور حرص وہوس کی کثافتوں سے اسے محفوظ رکھنا۔"

آج اسی مرید کے بارے میں شیخ زندوسیؒ کو خبر ملی تھی کہ اس نے تمام نصیحتوں کو فراموش کر کے اہلِ دنیا سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔

"اس کے مزید اعمال کیا ہیں؟" حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ نے کہنے والے شخص سے دریافت کیا۔

"لوگ آپ کے بخشے ہوئے متبرک خرقے کے باعث خاموش رہتے ہیں لیکن وہ مسلسل اس پردے میں دنیاوی مفادات حاصل کر رہا ہے۔" کہنے والے نے مزید وضاحت کی۔

پھر اہلِ مجلس نے دیکھا کہ حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا اور اذیت وکرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ ایک شخص جس نے اپنی زندگی کی ساری لذتوں کو ترک کر کے خانقاہ کا وقار قائم کیا تھا، اس کا ایک نمائندہ کوچہ در کوچہ روحانی نظام کو بدنام کرتا پھر رہا تھا۔ حضرت شیخ زندوسیؒ بہت دیر تک سوگوار بیٹھے رہے جیسے ان کا کوئی محبوب عزیز دنیا سے گزر گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی پوری مجلس کا رنگ بھی بدل کر رہ گیا اور شیخ زندوسیؒ کا اضطراب دیکھ کر حاضرین بھی اُداس نظر آنے لگے۔

پھر ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد حضرت شیخؒ نے اپنے خدمت گاروں سے فرمایا۔

"اسے تلاش کر کے میرے روبرو حاضر کرو۔"

پھر جب وہ نافرمان مرید حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو مجلس کے در ودیوار تک ساکت ہو گئے۔ وہاں موجود ہر شخص خاموش تھا مگر اس کے ذہن میں کئی سوالات اُبھر اُبھر کر ڈوب رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ حضرت شیخ زندوسیؒ اپنے اس مرید کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ بابا فریدؒ بھی حیران تھے۔ کبھی اس سرکش مرید کو دیکھتے اور کبھی حضرت شیخؒ کی طرف نگاہ کرتے۔

مرید سر جھکائے کسی مجرم کی طرح بارگاہِ شیخ میں کھڑا رہا۔ حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ کی چشمِ جلال اُٹھی اور وہ عہد شکن کانپ کر رہ گیا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ تُو نے میرے پہنائے ہوئے خرقے کو نیلام گاہ میں فروخت کر دیا ہے؟" شیخ زندوسیؒ اپنے مرید سے مخاطب ہوئے تو حاضرین کو محسوس ہوا جیسے آپؒ کی نوائے آتشیں سے پوری مجلس جل اُٹھی ہو۔

مرید کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لئے بدستور خاموش کھڑا رہا۔

"آخر تُو نے ایسا کیوں کیا؟" حضرت شیخ شہاب الدین زندوسیؒ کے لہجے کا جلال مزید نمایاں ہو گیا تھا۔

"شیخ محترم! میں اپنے دل سے مجبور ہو گیا تھا۔" مرید کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ "میں نے بہت کوشش کی کہ آخرت کے وعدے پر مطمئن ہو جاؤں مگر میرے دل میں دنیا کی محبت اس طرح موجزن تھی کہ میں اپنی ذات کو

غرقاب ہونے سے نہیں بچا سکا۔ میری ظاہر پرست فطرت مجھے نام و نمود کے کوچہ و بازار میں لے گئی اور پھر صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔" مرید برسرِ مجلس اعتراف جرم کر رہا تھا۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا کہ اس کا گناہ شیخؒ کی نگاہِ کشف سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

"وہ دن یاد کر جب تُو اس خانقاہ میں داخل ہوا تھا اور تُو نے مجھ سے دل کی دولت طلب کی تھی۔" حضرت شیخ شہاب الدین زندویؒ کی پُر جلال آواز گونج رہی تھی اور اہلِ مجلس پر سکوتِ مرگ سا طاری تھا۔ "کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ یہ زندگی کا مشکل ترین راستہ ہے؟ کیا میں نے تجھے خبردار نہیں کر دیا تھا کہ اس ریگزار میں تیرے پاؤں آبلوں سے بھر جائیں گے؟ کیا تجھ پر یہ راز فاش نہیں کیا گیا تھا کہ اس راستے میں لوگ مصلوب بھی کئے جاتے ہیں، حوالۂ زنداں بھی ہوتے ہیں....... زنجیرِ ستم ہڈیوں پر اپنے نشانات بھی چھوڑ جاتی ہے اور جب قتل گاہِ شوق ویران ہونے لگتی ہے تو اسے نذرانۂ جاں دے کر آباد کیا جاتا ہے۔ تجھ پر ایک ایک بات روشن تھی۔ پھر بھی تُو روشنی کے حصار سے نکل کر اندھیروں کے سراغ میں چلا گیا۔ تُو نے آدابِ سفر بھلا دیئے اور رہزن دنیا کی رہنمائی قبول کر لی۔ منزل سے برگشتہ ہو گیا۔ اپنے قول سے انحراف کیا اور سارے عہد و پیمان بھلا دیئے۔ پھر کیا باقی رہا؟ خدا کی قسم! اب غبار ہی غبار ہے۔ گرد ہی گرد ہے اور خاک ہی خاک ہے۔ قبائے بے رنگ پہن کر کچھ دن اور جی لے۔ بہت جلد سانسوں کا شمار ختم ہونے والا ہے۔ پھر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا اور آخرت ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے۔" حضرت شیخ شہاب الدین زندویؒ بول رہے تھے اور خانقاہ میں موجود درویشوں کا یہ حال تھا کہ وہ پتھروں کے ستون کی مانند ہو کر رہ گئے تھے تو مرید کیلئے اب کوئی جائے اماں نہیں تھی، کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ وہ بحرِ ندامت میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

"تُو نے اس رشتۂ اعتبار کو پامال کر ڈالا جو اہلِ وفا کی پہچان ہے۔" حضرت شیخ زندویؒ مختصر سی خاموشی کے بعد اپنے مرید سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔ "جب تیری پہچان ہی گم ہو گئی تو خود بھی میری بارگاہ سے چلا جا اور اپنی ذات کو سرکشی کے غبار میں گم کر دے۔ یہاں تک کہ وقت معلوم سر پر آ پہنچے اور پھر تیرے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے۔" اتنا کہہ کر حضرت شیخ زندویؒ اپنی نشست سے اُٹھے اور آگے بڑھ کر مرید کے جسم سے وہ خرقہ اتار لیا جو خود ہی آپؒ نے اپنے ہاتھوں سے بڑے ناز و محبت کے ساتھ اسے پہنایا تھا۔

پھر جب وہ مرید خانقاہ سے نکل کر چلا گیا تو حضرت شیخ زندویؒ نے اہلِ مجلس کو

مخاطب کر کے فرمایا۔

"جانے والا چلا گیا کہ اسے جانا ہی تھا۔ مقتولِ عشق کا مسافر تھا لیکن اہلِ دنیا اور ان کی تراشی ہوئی رسموں سے ڈرتا تھا۔ اسے ظاہر کر کے خوف نے کھا لیا۔ صد حیف! اس نے باطل کی طرف نہیں دیکھا۔"

"شیخ! وہ سرکش تھا۔ پھر آپ اس کے لئے اتنے آزردہ کیوں ہیں؟" کسی درویش نے سوال کیا۔

"جانے والے کو کیا معلوم کہ وہ میری ریاضت تھا۔ ایسی ریاضت جو رائیگاں گئی۔ وہ میری تمام زندگی کی دعاؤں کا ثمر تھا۔ ایسی دعائیں جو بابِ اثر سے لوٹ آئیں۔" یہ کہتے کہتے حضرت شیخ شہاب الدین زندویؒ کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی۔

بابا فریدؒ اس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ شیخ زندویؒ کی دلی کیفیت کا اندازہ کر کے اُداس نظر آنے لگے تھے۔

پھر گفتگو کے دوران ایک طویل لمحۂ سکوت حائل ہو گیا۔ حضرت شیخ زندویؒ کے چہرۂ مبارک پر اذیت و کرب کے آثار اب تک نمایاں تھے۔

اہلِ مجلس بھی اس واقعہ سے غمزدہ نظر آ رہے تھے کہ یکایک حضرت شیخ زندویؒ عجیب سے لہجے میں فرمانے لگے۔

"مرید بھی پیر کے جسم کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اگر اسے اپنے دل کے اتنے قریب نہ سمجھا جائے تو پھر یہ نظامِ خانقاہی ایک کاروبار ہے۔ جانے والا بھی میرے بدن کا ایک حصہ تھا۔ جب تک وہ دنیا کے ناہموار راستوں پر بھٹکتا رہے گا، میری روح بھی پریشان و مضطرب رہے گی۔ وہ جس راہ سے بھی گزرے گا میری آنکھیں اس کی نگراں ہوں گی۔ میں اس کے تنہا اور کمزور جسم کو وقت کی بے رحم آنکھوں کا ہدف بنتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا ہوں؟ شاید مجھے دیکھنا ہو گا....... مگر اللہ ہی جانتا ہے کہ لوحِ محفوظ پر کیا رقم ہے۔ بس اسی کو خبر ہے کہ مجھے کیا دیکھنا ہو گا؟"

اہلِ مجلس حیران تھے کہ کہاں حضرت شیخ زندویؒ کا وہ قہرِ بے کنار، وہ بے انداز حقیقت اور کہاں یہ سوزِ فراق؟ دونوں میں کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ بڑا تضاد تھا جسے اہلِ مجلس سمجھنے سے قاصر تھے۔

"پھر آپؒ نے اس کے جسم سے خرقۂ خلافت کیوں اتار لیا؟" ایک دوسرے درویش نے ان متضاد کیفیات کا مفہوم سمجھنے کی غرض سے شیخؒ کے حضور عرض کیا۔

"یہ بھی ضروری تھا۔" حضرت شہاب الدین زندویؒ نے فرمایا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا

تو وہ اور بے راہ رو ہو جاتا۔"

بابا فریدؒ کو اس وقت بڑی شدت سے اپنے پیر و مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ یاد آ رہے تھے۔ اب آپؒ کو اندازہ ہوا کہ پیر و مرشد نے سیاحت کا حکم کیوں دیا تھا؟ مجلس میں موجود دوسرے درویش حضرت شیخ شہاب الدینؒ کے فرمودات پر غور کرتے رہے اور بابا فریدؒ نم ناک آنکھوں کے ساتھ دل ہی دل میں اپنے اللہ کی پناہ مانگتے رہے۔

"اے کارساز عالم! اپنے بندے فریدؒ کو دل کی دولت سے محروم نہ رکھ۔ چاہے غربت و افلاس کے سبب اس کا لباسِ ظاہری تار تار ہو جائے......اور کثرتِ فاقہ کشی سے اس کے چہرے کے نقش و نگار بگڑ کر رہ جائیں مگر اس کے دل کو قبرستان نہ بنا کہ ہلاکت کی اس منزل سے زیادہ خوفناک کوئی دوسری منزل نہیں ہے۔"

بابا فریدؒ کچھ دن تک حضرت شہاب الدین ولیؒ کے مہمان رہے اور پھر دمشق سے رخصت ہو کر شام تشریف لے گئے۔ یہاں بھی آپؒ مختلف بزرگوں کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے پھر آپؒ نے کچھ دنوں تک بیت المقدس میں قیام فرمایا۔

معتبر روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابا فریدؒ نے اس پاکیزہ سرزمین پر چلّہ بھی کیا تھا۔ یہ جگہ اب تک "زاویۂ فرید الدین ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔ وقف کے طور پر یہاں ایک عمارت تعمیر کر دی گئی ہے جو کئی کمروں (حجروں) پر مشتمل ہے۔ زائرین جب بھی اس مردِ عظیم کی ایک نشانی کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں تو انہی حجروں میں قیام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زائرین سے کوئی کرایہ وصول نہیں کیا جاتا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

بعض مستند روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ طویل سیاحت کے دوران بابا فریدؒ نے نیشا پور میں بھی قیام فرمایا تھا۔ یہ تاریخی شہر جہاں اور کئی حوالوں سے مشہور ہے، وہاں اس سرزمین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہاں نامور بزرگ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے اپنی خانقاہ تعمیر کی تھی اور بے شمار بھٹکتے ہوئے مسافروں کو ان کی منزلوں کا پتہ دیا تھا۔

جب حضرت بابا فریدؒ، حضرت فرید الدین عطارؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت شیخؒ نے آپؒ کا والہانہ استقبال کیا اور شدتِ جذبات سے سرشار ہو کر فرمایا۔

"لوگو! غور سے دیکھو کہ کون آیا ہے؟ فرید ہندیؒ آیا ہے۔ میرا محبوب فرید ہندیؒ۔"

حضرت بابا فریدؒ، حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کے اس اخلاقِ کریمانہ سے بہت متاثر ہوئے اور جب تک نیشا پور میں آپؒ کا قیام رہا، اس مردِ جلیل کے فیضِ صحبت سے استفادہ کرتے رہے۔

پھر جب حضرت بابا فریدؒ نیشا پور سے رخصت ہو گئے تو چند سال بعد ایک بڑا جانگداز واقعہ پیش آیا جسے پڑھ کر آج بھی اہلِ دل کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

بے عملی اور بے خبری کے سبب جب گردشِ وقت نے مسلمانوں کا احتساب کیا تو یہ آباد شہر آن کی آن میں مقتل بن گیا۔ منگولوں نے ہلاکو خان کی زیرِ قیادت نیشا پور پر حملہ کیا اور جب اہل شہر کو نوشتۂ دیوار صاف نظر آنے لگا تو حاکم نیشا پور چند معززین کے ہمراہ شیخ فرید الدین عطارؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور اپنی قوم کی تباہی و بربادی کا مرثیہ پڑھنے لگا۔

"شیخ! ہماری قوم کا سفینہ گرداب ہلاکت میں اس طرح گھر گیا ہے کہ ساحل کے آثار دور تک نظر نہیں آتے۔ اگر آپ نے ہمارے حق میں دعائے خیر نہیں کی تو یہ موج حوادث سروں سے گزر جائے گی اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ میری دعائیں اس طوفانِ بلا خیز کو روک لیں گی؟" حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے حاکم نیشا پور سے دریافت کیا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔" والئ نیشا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"میں تو اہلِ شہر کے لئے روز ہی دعائیں کرتا ہوں۔ پھر نفرت و قہر کے نمائندوں نے ادھر کا رُخ کیوں کیا؟" حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے حاکم نیشا پور سے پوچھا۔

معززین شہر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ حاکم نیشا پور بھی حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کے اس سوال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

حضرت شیخؒ نے مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد دوبارہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس قوم کا ماتم کرنے سے کیا حاصل جس نے خود کبھی اپنی حالتِ زار کا جائزہ نہیں لیا۔ جب سالہا سال سے تمہاری آنکھیں بند ہیں تو اب بھی انہیں بند ہی رہنے دو کہ آنکھیں کھول کر دیکھنے سے بھی عافیت کی منزل نظر نہیں آئے گی۔ جو دماغ عیش و نشاط کے گہوارے میں سوتے رہتے ہیں، انہیں محوِ خواب ہی رہنے دو کہ اب جشن بیداری بھی بے سود ہے۔ جہاں سے جاگو گے، وہیں سے زندگی کی شام ہو جائے گی۔ تم نے قدرت کی دی ہوئی مہلت سو کر گزار دی۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔"

حاکم نیشا پور کو حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کا یہ جواب پسند نہیں آیا۔ اس نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"آپ خانقاہ کے ایک گوشے میں تشریف فرما ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ ہلاکو نے قتل و

غارت کا کیسا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ہمارے کھیت جل کر سیاہ ہو چکے ہیں۔ دریاؤں کا پانی ہمارے ہی خون سے سرخ ہو گیا ہے۔ منگولوں کی شمشیرِ سفاک نہ عورتوں کا لحاظ کرتی ہے اور نہ بچوں اور بوڑھوں کا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں خانقاہ کے ایک گوشے میں قید ہوں۔ تمہارے خیال میں صوفی کا کردار اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟" حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔ لہجے کی یہ ناخوشگواری ان اعتراضات کے جواب میں تھی جو اہلِ شہر نے صوفیوں کے حق میں روا رکھے تھے۔ بے دریغ کہا جاتا تھا کہ صوفیوں کو گوشہ نشینی کے سوا کیا آتا ہے؟ یہ لوگ انسانی معاشرے کا عضوِ ناکارہ ہیں۔ دن کو گردنیں خم کئے ہوئے حالتِ استغراق میں بیٹھے رہتے ہیں اور راتوں کے سناٹے میں شور مچاتے ہیں۔ راتوں کے شور سے ان کی مراد یہ تھی کہ جب صوفیائے کرام نصف شب کو بلند آواز سے ذکرِ الٰہی کرتے ہیں تو نیند کے متوالوں کو زندگی بخشنے والی یہ آوازیں ناگوار گزرتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حاکم نیشاپور نے حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی گوشہ نشینی اور جنگ سے بے خبری کا ذکر کیا تھا۔ مگر ذکر کرتے وقت اس کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک عظیم بزرگ کی خانقاہ کے آداب بھول گیا تھا اور اس کی گفتگو کسی حد تک گستاخانہ رنگ اختیار کر گئی تھی۔

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے اہلِ نیشاپور کے اسی ناروا سلوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"ہاں، میں خانقاہ کے ایک گوشے میں قید رہتا ہوں مگر اس کے باوجود میرا خدا مجھے سب کچھ دکھاتا ہے۔" اہلِ شہر کو اس کی خبر نہیں تھی مگر حضرت شیخؒ کو ایک گوشۂ خانقاہ سے سب کچھ دکھایا جا رہا تھا۔

حاکم نیشاپور اپنے الفاظ پر نادم ہو گیا اور بڑی شرمساری کے ساتھ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ سے معافی مانگنے لگا۔

"میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ تم شرمندہ و خجل ہو جاؤ۔" حضرت شیخ عطارؒ نے حاکم نیشاپور کو مزید احساسِ ندامت سے بچانے کے لئے فرمایا۔ "یہ حقیقت ہے کہ ایک خرقہ پوش صوفی، ایک فاقہ کش درویش تم لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اور وہ شخص ایک طوفانِ بلاخیز کو روکنے کے لئے کر بھی کیا سکتا ہے جسے دو وقت کی روٹی تک میسر نہیں۔ تم جاؤ اور اپنے تمام تر وسائل سمیٹ کر دشمن کی یلغار کا بھرپور مقابلہ کرو۔ یہی تمہاری بیماری کا علاج ہے اور یہی تمہارے مسئلے کا حل ہے۔"

"یہ باتیں ایک کم فہم انسان بھی جانتا ہے مگر میں اور نیشاپور کے تمام باشندے آپ

کی دعاؤں کے طالب ہیں۔ اب ہر زبان پر یہی الفاظ جاری ہیں کہ کوئی فوج ہلاکو کے لشکرِ قہر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مقابلے کا وقت گزر چکا۔ ہاں! اگر کوئی اسلحہ باقی ہے تو وہ صرف آپ کی دعائیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ اپنا دستِ دعا بلند کر دیں تو ہمارے سروں سے یہ قیامت ٹل سکتی ہے۔"

حاکم نیشاپور کی بات سن کر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ مسکرائے اور نہایت پُرسکون لہجے میں فرمانے لگے۔

"جس طرح تم یہ کہتے ہو کہ جنگ کا وقت گزر گیا، اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ دعاؤں کا وقت گزر گیا۔"

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی بے نیازی دیکھ کر حاکم نیشاپور اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا۔ اگرچہ وہ حضرت شیخؒ کا عقیدت مند تھا لیکن موت کے خوف نے اس کے ذہن سے خانقاہ کے تمام آداب و قوانین محو کر دیئے تھے۔ ایک بار پھر وہ تلخ لہجے میں کہنے لگا۔

"ہمارے گھروں کے دروازوں پر موت رقص کر رہی ہے اور آپ مسکرا رہے ہیں؟"

"اگر میرے رونے سے اہلِ شہر کی موت ٹل جاتی تو میں اپنی عادت کے خلاف پُرسوز گریہ وزاری کرتا۔ یہاں تک کہ میری آہ و فغاں سے نیشاپور کے در و دیوار تک گونجنے لگتے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ آنے والی موت کو کوئی بھی انسانی تدبیر نہیں روک سکتی۔"

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے موت کے آفاقی فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "مسلمان اور کافر میں یہی فرق ہے کہ جب کوئی کافر موت کا چہرہ دیکھتا ہے تو اس کی گناہ گار روح جسم میں گھبراتی ہے اور وہ چیخ چیخ کر مر جاتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان جانتا ہے کہ موت تقدیرِ الٰہی ہے۔ اس لئے وہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اللہ کے فیصلے کا پُرجوش خیر مقدم کرتا ہے۔ اب اگر میرے ہونٹوں پر تمہیں کسی قسم کا عکس نظر آتا ہے تو حیران کیوں ہو؟"

یہ کہہ کر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر فوراً ہی حاکم نیشاپور اور اس کے ہمراہ آئے ہوئے معززینِ شہر کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

"تم لوگ فضول باتوں میں اپنا وقت برباد نہ کرو۔ لوحِ محفوظ میں جو فیصلہ تحریر تھا وہ اب زمین پر نازل ہو چکا ہے۔ اہلِ نیشاپور کو میری طرف سے خبر دو کہ اپنی شمشیریں بے نیام کر لیں اور پُرآسائش بستروں کو چھوڑ کر اپنے گھروں سے نکل آئیں۔ وہ موت جو ان کے دروازوں تک آ پہنچی ہے اس کا اس طرح استقبال کریں کہ مسلمانوں کی تاریخ شرمندہ نہ ہو اور دشمنوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اہلِ اسلام نے ان کی تواضع نہیں کی۔

دشمنِ خدا کی تواضع یہی ہے کہ یا تو وہ خاک و خون میں نہا جائے یا پھر تہ پیوند زمین ہو جاؤ۔ اہلِ نیشاپور سے یہ بھی کہہ دو کہ تم جس کی دعاؤں پر اتنا اعتبار کرتے تھے آج وہ خود بھی کسی کے کرم کا محتاج ہے۔ اور اہلِ نیشاپور کو یہ بھی بتا دو کہ اس سیلاب بلا سے کچھ بھی نہیں بچے گا۔ آج نہ کسی پیر کے لئے جائے اماں ہے اور نہ کسی مرید کے لئے کوئی پناہ گاہ۔ خون کی یہ تند و سرکش موجیں سب کچھ بہا کر لے جائیں گی۔ جاؤ! جلدی کرو......

دعاؤں کا سائبان طلب کرنے والو! اپنی منتشر صفوں کو درست کرو۔ ساعتیں شمار کی جا چکیں اور لمحات گنے جا چکے۔ پھر کس کا انتظار کر رہے ہو؟ اب کوئی نہیں آئے گا۔ صرف موت...... ہلاکت، بربادی، مقتل، زندان، شورِ سلاسل، ماتم زنجیر، بے گور و کفن لاشیں، بے نشان قبریں، سیاہ اعمال نامے، تاریک انجام، اس کے سوا کچھ نہیں...... جاؤ! جلدی کرو! مجھے بھی بہت دور جانا ہے۔"

حاکم نیشاپور جو زندگی کا دلدادہ اور موت کے تصور سے خوف زدہ تھا، بارگاہ شیخ سے مایوس ہو کر اٹھا اور اس کے پیچھے معززین شہر کی وہ جماعت بھی اُٹھی جو حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی دعاؤں کے سہارے موت کے طوفان سے بچنا چاہتی تھی۔

جیسے ہی وہ لوگ خانقاہ سے باہر نکلے، حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ اپنے حجرۂ خاص میں چلے گئے۔ پھر کچھ دیر بعد باہر تشریف لائے تو آپؒ کے ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام تھی۔ اپنے پیر و مرشد کو آج پہلی بار اس رنگ میں دیکھ کر تمام مرید حیرت زدہ رہ گئے۔

حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ اپنے مریدوں کی دلی کیفیات کا اندازہ کر چکے تھے۔ اس لئے آپؒ نے ان کی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کی غرض سے فرمایا۔

"تم لوگ میرے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر حیران کیوں ہو؟ حقیقی صوفی تو وہی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تسبیح ہو اور دوسرے ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام۔ درویش وہ نہیں جو ایک ہی گوشۂ خانقاہ میں ساری زندگی بسر کر دے۔ درویش گوشہ نشین اس لئے ہوتا ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے اللہ کو یاد کر سکے۔ معرفت میں یہ عمل بھی اللہ کی رضامندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب اللہ کی مرضی یہ ہے کہ درویش خانقاہوں کو چھوڑ کر میدانِ کارزار کا رخ کریں۔ گوشہ نشینی بھی اسی کے لئے اختیار کی تھی اور شمشیر بکف بھی اسی کی خاطر ہو رہے ہیں۔ مرضئ محبوب کی تلاش ہی درویشی ہے۔ کل تک تم جس محبوب کو خانقاہ کی تنہائیوں میں ڈھونڈ رہے۔ وہی محبوب تمہیں جنگ کی خون رنگ فضاؤں میں ملے گا۔ اگر تم نے اس وقت اس کی جستجو نہیں کی تو پھر حشر تک سینہ کوبی کرتے رہو گے اور لباس کی دھجیوں کے سوا تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ خوب سمجھ لو کہ درویش کے نزدیک

ضربِ شمشیر بھی ضربِ لا الٰہ ہے۔ جو ان دونوں میں تفریق کرتا ہے، میں اسے درویش نہیں سمجھتا۔"

اتنا کہہ کر حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ اپنی خانقاہ سے باہر نکلے اور تاتاریوں کے ساتھ اس طرح جنگ کی کہ جیسے آپؒ ایک پیشہ ور سپاہی ہوں۔ پھر جب تلوار ٹوٹ گئی اور آپؒ زخموں سے چُور ہو گئے تو گرفتار کر لئے گئے۔ منگول سپاہی اس بات پر حیران تھے کہ اتنا ضعیف العمر انسان آخر کس طرح جنگ کر سکتا ہے؟ اس وقت حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی عمر ایک سو چودہ سال تھی۔ تاتاری حیرت کرتے رہے مگر انہیں کون بتاتا کہ یہ اس بوڑھے شخص کی قوتِ ایمانی تھی جس نے عرصۂ کارزار میں اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھائے تھے۔

پھر جب نیشاپور کے در و دیوار سے دھواں اُٹھنے لگا اور بستیاں جل کر راکھ ہو گئیں تو منگول سپاہی تمام اسیرانِ جنگ کو اپنے ساتھ لے کر جانے لگے۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ بھی ان ہی جنگی قیدیوں میں شامل تھے۔

ہلاکو خان کے سپاہی حضرت شیخ عطارؒ کو کھینچتے ہوئے لئے جا رہے تھے کہ ایک تاتاری نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"یہ بوجھ کہاں اُٹھائے پھرو گے؟ میری رائے ہے کہ اس بوڑھے کو ایک ہزار سکوں کے عوض فروخت کر ڈالو۔"

جیسے ہی حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے اس تاتاری کی بات سنی، آپؒ بے اختیار بول اُٹھے۔ "ہرگز نہیں۔ مجھے ایک ہزار میں فروخت نہ کرنا۔ میری قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

منگول سپاہی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ انہیں گمان ہوا کہ شاید اسیری کے صدمے نے بوڑھے کے حواس چھین لئے ہیں۔ اسی وجہ سے بے معنی گفتگو کر رہا ہے۔ حملہ آور وحشیوں کو کیا معلوم کہ یہ بوڑھا قیدی کون ہے اور سرِ مقتل بھی علم کے کس مقام سے بول رہا ہے؟

جب درندوں کا یہ قافلہ اپنے شکاروں کو جکڑے ہوئے کچھ آگے بڑھا تو ایک دوسرے تاتاری نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اس بوڑھے کا کیا کرو گے؟ یہ تو کسی بھی کام کا نہیں ہے۔ اسے گھاس کی ایک گٹھری کے بدلے میں بیچ ڈالو۔ کم سے کم تمہارے جانوروں کو تھوڑی بہت خوراک تو مل جائے گی۔"

جیسے ہی حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے اس تاتاری کے الفاظ سنے، بے اختیار ہو کر

فرمانے لگے۔

"اب تم مجھے ضرور فروخت کر دو۔ میری قیمت اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

جس تاتاری نے حضرت شیخ عطارؒ کو گرفتار کیا تھا، آپ کی بات سن کر سخت طیش میں آ گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی اپنی تلوار نکالی اور ایک ہی وار میں حضرت شیخؒ کا سر قلم کر دیا۔ بالآخر جانِ مضطرب قرار پا گئی اور مسافرِ عشق منزل شہادت سے سرفراز کر دیا گیا۔

جب حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی شہادت کی خبر حضرت بابا فریدؒ نے سنی تو شدت جذبات میں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر بڑے دل گرفتہ انداز میں فرمایا۔

"اللہ اس مردِ جلیل کی قبر کو نور سے بھر دے۔ وہ ایسا ہی جانباز تھا کہ مقتلِ عشق سے گزرے بغیر اس کے مضطرب قدم ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے۔"

علامہ اقبالؒ نے بھی حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی بارگاہِ جلال میں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

عطار ہوؒ، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے آہ سحر گاہی !!!

❁ ...... ❁❁ ...... ❁

پھر واپسی میں بغداد سے گزرتے ہوئے حضرت بابا فریدالدینؒ بخارا پہنچے۔ یہاں آپؒ نے چند روز تک مشہور بزرگ حضرت شیخ سیف الدین فردوسیہؒ کی خانقاہ میں قیام فرمایا۔ خود حضرت بابا فریدؒ کا بیان ہے کہ جیسے ہی میں شیخ سیف الدین فردوسیہؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا تو مجھے دیکھ کر فرمانے لگے۔

"یہ نوجوان مشائخ روزگار میں سے ہوگا۔ تمام دنیا اس کے مریدوں اور روحانی فرزندوں سے بھر جائے گی۔" اتنا کہہ کر آپؒ نے مجھے ایک سیاہ خرقہ عطا فرمایا۔

حضرت شیخ سیف الدین فردوسیہؒ کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ ہزاروں بھوکے آپؒ کے لنگر خانے سے اپنے شکم کی آگ بجھاتے تھے۔

ایک دن حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے عرض کیا۔ "میں ایک صاحب حیثیت تاجر ہوں مگر مجھے مسلسل نقصان ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف بیماریاں بھی گھیرے رہتی ہیں۔"

اس شخص کی عرضداشت سن کر حضرت شیخ سیف الدین فردوسیہؒ نے فرمایا۔ "مال و زر کا نقصان اس لئے ہوتا ہے کہ جب اپنے فرائض کے سلسلے میں کوتاہی سے کام لے اور زکوٰۃ ادا نہ کرے۔ رہی بیماری تو یہ قدرت کا ایک راز ہے۔ ابنِ آدم پر بیماری اس لئے

مسلط کی جاتی ہے کہ اس کا دل صحت مند ہو جائے۔ دل کی صحت اس طرح ممکن ہے کہ انسان بیماری میں اپنے اللہ کو یاد کرے اور گناہوں سے تائب ہو جائے۔ یہ ایک غیبی تنبیہ ہوتی ہے۔ اگر انسان اس تنبیہ کا مفہوم سمجھ لے تو راہِ راست پر آ جاتا ہے........ ورنہ مسلسل غفلت اسے مزید امراض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ موت سر پر آ جاتی ہے اور انسان توبہ کئے بغیر جہنم کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔"

کچھ دن تک حضرت شیخ فردوسیہؒ کی محبتوں سے فیض یاب ہو کر بابا فریدؒ اپنے وطن ملتان کی جانب روانہ ہو گئے۔

❁ ...... ❁❁ ...... ❁

ملتان پہنچتے ہی حضرت بابا فریدؒ مادر گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی تشنہ لب دریا کے کنارے پہنچ کر پیاس کی شدت سے نڈھال ہو جائے۔ حضرت بابا فریدؒ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ جیسے ہی آپؒ نے والدہ محترمہ کے رُخِ روشن کو دیکھا، بے اختیار آگے بڑھے اور قدموں سے لپٹ کر رونے لگے۔

مادر گرامی بھی فرزند کی جدائی سے بے حال تھیں مگر جب اپنے جسم کے گم شدہ حصے کو اتنے قریب پایا تو فرطِ جذبات سے اشک بار ہو گئیں۔ کچھ دیر تک عجیب سی رقت انگیز حالتِ سکوت طاری رہی۔ پھر جب دلِ بے قرار کی دھڑکنیں متوازن ہو گئیں تو قرسم خاتونؒ نے اپنے سعادت مند بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بے شمار دعاؤں سے سرفراز کیا۔

چند روز آرام کرنے کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے مادر گرامی سے عرض کیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے شیخ محترم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔"

جواباً قرسم خاتونؒ نے فرمایا۔ "فرید! تم ابھی اس قابل تو نہیں ہو کہ اس مردِ پاکباز کی مجلس میں شریک ہو سکو۔ پھر بھی میرے لئے یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ تم نے اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔ اب یہ شیخ جانیں کہ وہ تمہیں قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ پھر بھی میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

جب بابا فریدؒ دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو آپؒ کے دل کی عجیب حالت تھی۔ دورانِ سفر بے قرار ہو کر بار بار فرمایا کرتے تھے۔

"یہ راستہ کبھی تمام بھی ہوگا یا نہیں؟ فرید! تُو اس قابل بھی ہے کہ اس مردِ عظیم کی قدم بوسی سے شرف یاب ہو سکے؟ تُو اپنی منزل تک پہنچ بھی سکے گا یا پھر راستے ہی میں مر جائے گا؟"

اہلِ شہر نے ایک نوجوان کو دیکھا جو نہایت آہستہ روی کے ساتھ چل رہا تھا اور وقفے وقفے سے رک کر راستہ چلنے والوں سے پوچھتا تھا کہ میرے شیخ کی خانقاہ کس طرف ہے؟ لوگ نو واردِ شوق کو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے آستانے کا پتہ بتا دیتے اور یہ جاں سوختہ، حضرت قطبؒ کے جلالِ روحانی سے لرزتا آگے بڑھ جاتا۔

پھر منزل طلب قریب آ گئی۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ''وہ ہے حضرت قطبؒ کا دربارِ روحانی!''

خانقاہِ عالیہ پر نظر پڑتے ہی بابا فریدؒ کی حالت غیر ہوگئی۔ وصال کا غم ساعت فراق سے زیادہ تلاطم خیز ثابت ہوا۔ کچھ دیر کے لئے ہوش و حواس جاتے رہے مگر بے خودی میں بھی اتنا ہوش باقی رہا کہ سرِ عقیدت خم کر دیا اور خانقاہ کے دروازے کے سامنے اس طرح دست بستہ کھڑے رہے جیسے اس راستے سے کسی با جبروت شہنشاہ کا گزر ہونے والا ہو۔

پھر جب گم شدہ حواس لوٹ آئے تو کانپتے قدموں سے خانقاہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت حضرت قطبؒ کی مجلسِ روحانی آراستہ تھی اور دربارِ معرفت میں حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، مولانا شیم الدین ترکؒ، حضرت خواجہ محمودؒ، علاء الدین کرمانیؒ، حضرت بدر الدین غزنویؒ، حضرت برہان الدین بلخیؒ، حضرت نور الدین غزنویؒ، حضرت ضیاء الدین رومیؒ اور حضرت شیخ نظام الدینؒ جیسے بزرگ صوفی موجود تھے۔

جب بابا فریدؒ اس مجلس روحانیت میں پہنچے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ درس دے رہے تھے۔ آپؒ نے ایک نظر بابا فریدؒ کو دیکھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ بابا فریدؒ اس نظر کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ اگر کچھ سمجھے تو بس یہی کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آپؒ کو پہچانا نہیں تھا۔ یہ تصور بابا فریدؒ کے لئے دنیا کی ہر اذیت سے بڑھ کر تھا۔ جس کے حکم کی تعمیل میں کوچہ در کوچہ دامن پھیلایا۔ دروازے دروازے دستک دی۔ قلبِ صحرا کو پامال کر ڈالا۔ خارزاروں میں اس وقت تک سفر جاری رکھا جب تک پیروں کے آبلے پھوٹ کر نہ بہہ گئے۔ جس کی ایک جنبشِ چشم نے گھر سے بے گھر کر رکھا، آج اسی کی نظر میں شناسائی کا دھندلا سا عکس تک نہیں تھا۔ اس خیال نے بابا فریدؒ کے ذہن کو تہہ و بالا کر ڈالا۔

''کیا سب کچھ رائیگاں گیا؟ کیا میں زندگی بھر اس قابل نہیں ہو سکوں گا کہ اس کی بزمِ لطف و کرم میں بیٹھنے کے لئے کوئی نشست حاصل کر سکوں؟'' بابا فریدؒ کا ذہن منتشر خیالات کی زد میں تھا اور دل میں ایک حسرت خوں گشتہ دم توڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس دوران حاضرین مجلس میں سے ایک بزرگ حضرت شمس الدین ترکؒ نے آدابِ محفل کے مطابق بیٹھ جانے کا اشارہ بھی کیا مگر بابا فریدؒ کو کہاں ہوش تھا۔ آپؒ کی نظریں تو ایک ہی چہرے پر مرکوز تھیں اور آپؒ ایک ہی اشارے کے منتظر تھے۔ پھر جب اس چہرے پر آشنائی کا کوئی رنگ نہیں اُبھرا اور اس جانب سے کوئی اشارہ نہیں ہوا تو پھر سب کچھ ہیچ تھا۔ بابا فریدؒ نے دیکھا تک نہیں کہ حضرت شمس الدین ترکؒ کیا کہہ رہے ہیں اور آدابِ مجلس کا تقاضا کیا ہے؟

اپنے گرد و پیش سے بے نیاز حضرت بابا فریدؒ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ حضورِ شیخ کس طرح اپنا تعارف پیش کریں؟ کبھی خیال آتا کہ حضرت قطبؒ کو اس لمحہ ماضی کی یاد دلائیں کہ ''میں ہوں آپ کا غلام، فرید الدین، جسے آپ نے ملتان کی مسجد میں شرفِ ملاقات بخشا تھا۔'' پھر سوچنے لگتے کہ اگر شیخؒ کو یہ واقعہ بھی یاد نہ آئے تو عرض کریں۔ ''میں وہی خادم ہوں جسے آپ نے پہلے ظاہری تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر فرمایا تھا کہ قدم بوسی کے لئے دہلی حاضر ہو جاؤں گا۔''

پھر اچانک ذہن میں یہ تصور اُبھرتا کہ اگر اس کے بعد بھی شیخؒ نے نہ پہچانا تو کیا ہو گا؟ قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی؟ جس نے ایک ہی ذات سے وابستگی کا عہد کیا، وہ کہاں جائے گا؟ کیا مذہبِ عشق میں دوسرا سنگِ در تلاش کرنا جرم نہیں؟ اس خیال سے بابا فریدؒ برگِ خزاں رسیدہ کی مانند لرزنے لگتے اور دل اس طرح ڈوبنے لگتا جیسے گرداب میں کوئی سفینہ غرق ہو رہا ہو۔

ہزار فکریں تھیں، ہزار اندیشے تھے۔ جب بابا فریدؒ کی مایوسی اپنی حدوں سے گزر گئی تو آپؒ نے ایک صدائے جاں نواز سنی۔ چند لمحوں کے لئے کوچۂ عشق کو اپنی ساعت پر شبہ سا ہوا مگر حقیقت اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ روشن ہو چکی تھی۔

درس سے فارغ ہونے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آپؒ سے مخاطب تھے۔ ''بابا فرید! سب کام ختم کر آئے ہو؟''

یہ چند الفاظ کیا تھے، زندگی کی وہ شدید لہر تھی جو تنِ مُردہ میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔ حضرت بابا فریدؒ، شیخؒ کا ارشاد سن کر جی اُٹھے۔ مرشد کی زبان پر آپؒ کا نام کیا آیا کہ ساری کائنات کا سرمایہ مل گیا۔ شیخؒ نے مزاج پرسی کی کہ دولتِ کونین قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

اسی لذتِ آشنائی نے حضرت باباؒ کو وارفتہ کر دیا اور آپؒ آدابِ مجلس سے بے نیاز ہو کر حضرت قطبؒ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ پھر اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بار بار فرماتے تھے۔

"شیخ! اگر آپ مجھے نہ پہچانتے تو میں کہاں جاتا؟ آپ کی نگاہِ کرم ہی میری پہچان ہے......ورنہ فرید کیا اور اس کی حقیقت کیا؟"

حضرت بابا فریدؒ کی آواز اس قدر پُرسوز تھی کہ حاضرینِ مجلس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حضرت قطبؒ کا دستِ مہربان بابا فریدؒ کے سر پر سایہ فگن تھا اور نوائے شیریں اس دل پر شبنم ریز تھی جو آتشِ فراق سے جل رہا تھا۔

اس کے بعد حضرت قطبؒ نے بابا فریدؒ کو اُٹھایا اور اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا۔

پھر اہلِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ "رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے مقام پر کفارِ مکہ سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اسی دوران یہ افواہ عام ہو گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ جب یہ جانگداز خبر مسلمانوں نے سنی تو ان کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کفار کی بدعہدی کا جواب دینے کے لئے ایک درخت کے نیچے تمام صحابہؓ کو جمع کیا۔ پھر ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ تصور کیا اور دوسرا ہاتھ اس پر رکھ کر مسلمانوں سے بیعت لی۔"

یہ مثال پیش کر کے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ "صوفیائے کرام کے نزدیک تجدید بیعت کی بنیاد وہی بیعت رضوان ہے۔"

پھر تمام لوگوں کے سامنے حضرت بابا فریدؒ کو دوبارہ مرید کیا۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت قطبؒ قیامِ ملتان کے دوران بابا فریدؒ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر چکے تھے۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ بظاہر وہ پہلی بیعت ہی کافی تھی......مگر دوبارہ اس لئے مرید کیا گیا کہ حضرت قطب الدین کاکیؒ، بابا فریدؒ سے بے حد محبت کرتے تھے اور اسی محبت کا مظاہرہ تجدید بیعت تھی۔ اس وقت خانقاہ میں اکابر صوفیاء اور نامور بزرگ موجود تھے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

اس موقع پر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ کو "طے کا روزہ" رکھنے کا حکم دیا۔ اس روزے کی خصوصیت یہ ہے کہ تیسرے دن مغرب کے وقت افطار کیا جاتا ہے۔

یہ بھی ایک قسم کا "چلّہ" تھا جس کے لئے گوشۂ تنہائی کی ضرورت تھی۔ روایت ہے کہ غزنی دروازے کے قریب ایک برج تھا۔ حضرت بابا فریدؒ کو اسی برج میں ٹھہرایا گیا تھا۔

پھر جب آپؒ نے روزہ رکھا تو تیسرے دن افطار کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک شخص کو معلوم ہو گیا کہ یہاں کوئی نوجوان درویش چلّہ کش ہے۔ وہ صوفیاء کی خدمت اور حصولِ ثواب کی نیت سے شام کا کھانا لے کر برج میں داخل ہو گیا اور بابا فریدؒ کی خوشامد کرنے لگا کہ اس کے لائے ہوئے کھانے سے افطار کر کے اسے شرف یاب ہونے کا موقع فراہم کریں۔

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مسلک کے تقاضوں کے پیش نظر ایک اجنبی شخص کا دل توڑنا گوارہ نہیں کیا اور بغیر تحقیق کے کھانا لے لیا۔ اجنبی شخص خوشی خوشی واپس چلا گیا۔ پھر جب افطار کا وقت آیا تو حضرت بابا فریدؒ نے اسی کھانے سے افطار کر لیا۔ ابھی مشکل سے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ بابا فریدؒ نے پیٹ میں درد محسوس کیا اور فوراً ہی قے ہو گئی۔ غذا کا ایک ایک ذرّہ نکل گیا۔ حضرت بابا فریدؒ نے پانی پی کر ساری رات عباداتِ الٰہی میں گزار دی۔

جب نمازِ فجر کے بعد حضرت قطبؒ کی مجلسِ درس آراستہ ہوئی تو بابا فریدؒ نے سارا واقعہ حضورِ شیخ بیان کر دیا۔

جواب میں پیر و مرشد نے فرمایا۔ "بابا فرید! میں جانتا ہوں کہ تین دن تک مسلسل روزے رکھنے کے بعد تمہارے جسم کی نقاہت کا کیا حال ہو گا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قے کے بعد جسم کی باقی توانائی بھی سلب ہوتی محسوس ہو رہی ہو گی۔ تمہاری یہ تکلیف اپنی جگہ مگر یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ جو شخص تمہارے لئے کھانا لے کر آیا تھا، وہ ایک شراب نوش اور بدکار انسان ہے۔ بے شک! اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ تمہیں کھانا پیش کیا مگر اللہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک کثیف اور ناپسندیدہ غذا تمہارے شکم میں ٹھہرے اور پھر اس سے بننے والے خون کے قطرے تمہارے جسم میں فساد برپا کر دیں۔ تمہیں اپنے رب کا مزید شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ تمہیں شیطان کے کیسے کیسے حملوں سے بچاتا ہے۔"

حضرت قطبؒ کے اس انکشاف نے بابا فریدؒ اور دوسرے درویشوں پر حیرت طاری کر دی تھی۔ آج پہلی بار حاضرینِ مجلس کو اس نازک حقیقت کا اندازہ ہوا تھا کہ اللہ کے نزدیک صرف حرام روزی ہی ناپسندیدہ نہیں بلکہ اس کا ایک ایک نوالہ بھی ناگوار ہے۔

پھر کچھ دیر بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ کو مخاطب کرتے ہوئے

فرمایا۔ ''مولانا! تمہیں ''طے'' کا ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ شراب نوش کی لائی ہوئی غذا نے تمہاری اس روحانی عبادت کے اثرات زائل کر دیئے۔ اب کی بار کسی انسان کے لائے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ نہ ہونا بلکہ غیب سے جو میسر آئے اسی سے افطار کر لینا۔''

اگرچہ بابا فریدؒ شدید جسمانی نقاہت محسوس کر رہے تھے مگر مرشد کے حکم نے آپؒ کو دوبارہ تازہ دم کر دیا۔ حاضرین مجلس ایک نوجوان کی جرأت و ہمت دیکھ کر حیرت زدہ تھے اور یہ بات واضح طور پر نظر آنے لگی تھی کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اس نو واردِ شوق کی تربیت پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔

بابا فریدؒ نے حضرت قطبؒ کے حکم کے مطابق ''طے'' کا دوسرا روزہ رکھ لیا۔ پھر جب تیسرے روز افطار کا وقت آیا تو آپؒ غیب سے بھیجے جانے والے سامانِ خورد و نوش کا انتظار کرنے لگے۔ مگر ایسی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی۔ آخر جب وقت تنگ ہونے لگا تو آپؒ نے پانی سے روزہ افطار کر لیا اور نماز مغرب میں انتہائی ذوق و شوق سے مشغول ہو گئے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت بابا فریدؒ دوبارہ انتظار کرنے لگے کہ غیب سے کھانے کا کوئی انتظام ہو جائے مگر اس بار کسی غیبی مدد کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ مدت انتظار طویل ہوئی تو عشاء کی نماز کا وقت آ گیا۔ بابا فریدؒ اپنے رب کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ پاؤں کانپ رہے تھے اور کھڑا ہونا مشکل نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی تمام قوتِ ارادی کو ایک نقطے پر مرتکز کر کے آپؒ اللہ کے سامنے ایستادہ رہے اور نماز کے تمام ارکان پوری صحت کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

نمازِ عشاء کے بعد بابا فریدؒ ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ مگر جب بھی شکم کی آگ ستاتی تو آپؒ آنکھیں کھول کر دیکھ لیتے کہ شاید اب غیب سے کچھ ظاہر ہوا ہو...... مگر وہاں سناٹے اور ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آزمائش کی عجیب منزل تھی۔ بابا فریدؒ کو اللہ کی ذات پر بھی پورا یقین تھا کہ وہ اس مرحلے میں اپنے بندے کو تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اور مرشد کی بات پر بھی مکمل اعتبار تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ظہور پذیر ہوگا۔

غرض اسی کشمکش انتظار میں آدھی رات گزر گئی۔ اب یہ کیفیت تھی کہ بھوک کی شدت سے بابا فریدؒ کا شکم جل اٹھا تھا اور آپؒ اس تکلیف کو کم کرنے کے لئے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ بالآخر جب شکم کا درد اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو بابا فریدؒ نے بے قرار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے۔ اچانک آپؒ کو اپنی ہتھیلیوں کی چبھن محسوس ہوئی۔ غور سے دیکھا تو وہ چند سنگریزے تھے جو ہاتھوں سے چپک کر رہ گئے تھے۔

اہلِ نظر اندازہ کریں کہ چھ دن کے مسلسل فاقے کے بعد انسان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ بابا فریدؒ بھی ایک بشر تھے۔ جب قوتِ برداشت جواب دے گئی تو اضطراری طور پر آپؒ نے ان ہی سنگریزوں کو منہ میں رکھ لیا۔ اچانک بابا فریدؒ کو محسوس ہوا کہ کوئی میٹھی چیز آپؒ کے دہن میں موجود ہے۔ فوراً ہی خیال گزرا کہ سنگریزوں کی شیرینی بھی کہیں شرابی کے کھانے کی طرح فریب نہ ہو۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی بابا فریدؒ نے منہ کے تمام سنگریزے زمین پر تھوک دیئے۔

کچھ دیر بعد آپؒ پر دوبارہ وہی کیفیت طاری ہوئی اور آپؒ نے شدید عالم اضطراب میں زمین پر ہاتھ مارے۔ اس مرتبہ بھی وہی واقعہ پیش آیا اور بابا فریدؒ نے سنگریزوں کو اس طرح اُگل دیا جیسے کوئی لقمۂ حرام منہ میں پہنچ گیا ہو۔

پھر جب تیسری بار بھی یہی واقعہ پیش آیا کہ سنگریزے شکر محسوس ہونے لگے تو بابا فریدؒ نے اسے تحفۂ غیب سمجھا اور اس کے ساتھ ہی آپؒ کو حضرت قطبؒ کے الفاظ یاد آنے لگے۔

''مولانا فرید! جو کچھ بھی غیب سے ظاہر ہو، اسی سے افطار کر لینا۔''

جیسے ہی حضرت بابا فریدؒ کی سماعت میں پیر و مرشد کے یہ کلمات گونجے، آپؒ نے سنگریزے حلق میں اتار لئے۔ یہاں تک کہ آپؒ کی بھوک بھی مٹ گئی اور آپؒ کو جسمانی طور پر بھی نئی طاقت کا احساس ہونے لگا۔

دوسرے دن بابا فریدؒ، حضرت قطبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؒ کو دیکھتے ہی پیر و مرشد نے فرمایا۔

''مولانا فرید! روزہ مکمل ہو گیا؟''

جواب میں بابا فریدؒ نے وہ عجیب و غریب واقعہ سنایا اور انتظار کرنے لگے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اس واقعہ کی کیا توجیہہ پیش کرتے ہیں؟

پیر و مرشد نے محبت آمیز نظروں سے اپنے مرید جاں نثار کی طرف دیکھا اور پھر زیرِ لب تبسم کے ساتھ فرمایا۔

''فرزند! اللہ اپنے فرماں بردار بندوں کو ایسی ہی نشانیاں دکھاتا ہے۔ وہ سنگریزے حقیقت میں سنگریزے ہی تھے مگر تمہارے لبوں کو چھو کر اپنی فطرت بدل دیتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ جب روح کثافت کا لباس اتار کر لطافت کی قبا پہن لیتی ہے اور مسلسل ریاضت سے نفس کی سرکشی ختم ہو جاتی ہے تو انسان دائمی حلاوت (ابدی مٹھاس) حاصل کر لیتا ہے۔ سنگریزوں کا شکر بن جانا اسی شیرینی کے سبب

ہے جسے اللہ نے اپنے فضل و کرم سے تمہاری روح میں شامل کر دیا ہے۔ فرید! تمہیں قدرت کا یہ خاص انعام مبارک ہو کہ آج سے تم ''گنج شکر'' بن گئے۔''

ایک بار پیر و مرشد کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوا تو پھر قیامت تک حضرت فرید الدین مسعودؒ ''گنج شکر'' بن گئے۔ اس ذیل میں دیگر روایتیں بھی مشہور ہیں مگر تحقیق کرنے والوں نے اسی روایت کو سب سے معتبر قرار دیا ہے۔

''طے'' کے روزے کے بعد حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے حضرت قطبؒ کے حکم پر کئی چلّے کئے۔ پھر جب چلّہ ختم ہو جاتا تو بابا فریدؒ، پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ مگر حضرت قطبؒ فوراً ہی کوئی دوسرا وظیفہ بتا دیتے۔ کئی بار بابا فریدؒ نے شکایت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

''سیّدی! اب مجھ سے یہ دُوری برداشت نہیں ہوتی۔ میں ہمہ وقت خدمتِ شیخ میں حاضر رہنا چاہتا ہوں۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نہایت شفقت کے ساتھ فرماتے۔ ''بابا! یہ دوری کب ہے؟ یہ تو حضوری ہے۔''

اسی چلّہ کشی کے دوران صوفیائے ہند کی تاریخ کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جو وقت کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ بابا فریدؒ اسی مخصوص برج میں چلّہ کش تھے کہ 612 ھ میں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفۂ اکبر حضرت قطبؒ سے ملنے دہلی تشریف لائے۔ جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی تو پورا شہر زیارت و قدم بوسی کے لئے اُمڈ آیا۔ یہاں تک کہ والئ ہندوستان شمس الدین التمش بھی عام نیاز مندوں کی طرح حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر جب تمام لوگ دیدار کی سعادت سے شرف یاب ہو کر واپس چلے گئے تو حضرت سلطان الہندؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے دریافت کیا۔

''قطب! تم نے خطوط میں اپنے ایک نئے مرید فرید الدین مسعودؒ کے متعلق اطلاع دی تھی مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں نے ملاقاتوں کے درمیان اسے نہیں دیکھا۔ کیا وہ حاضر تھا؟''

''بابا فریدؒ بھی آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہوتا۔ وہ چلّہ کشی کے سبب اس نعمت عظیم سے سرفراز نہ ہو سکا۔'' حضرت قطبؒ نے اپنے مرید کی طرف سے معذرت پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

حضرت قطبؒ کی وضاحت سن کر سلطان الہندؒ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر آپؒ نے فرمایا۔ ''اگر وہ یہاں آنے سے قاصر ہے تو ہمیں خود وہاں چلنا چاہئے۔ ہم تو اس حجرے تک جانے سے عاجز نہیں۔''

حضرت سلطان الہندؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر حضرت قطبؒ کے چہرے پر کیف و مسرت کا عجیب سا رنگ اُبھر آیا اور آپؒ بے اختیار ہو کر عرض کرنے لگے۔

''فرید بھی کیا خوش نصیب ہے کہ اولیائے ہند کا شہنشاہ خود ایک غلام کی خاطر تشریف لئے جا رہا ہے۔''

''نہیں قطب! فرید اس کا مستحق ہے۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے فرمایا۔ ''تم میرے ہو۔ اس لئے تمہارا ہر رشتہ میری ذات کا حوالہ ہے۔ تمہاری نسبت سے فرید بھی میرا ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے کوچے سے گزرنے والا ہر شخص میرا ہے۔''

اس کے بعد حضرت سلطان الہندؒ اپنے خلیفۂ اکبر کے ہمراہ اس برج کی طرف روانہ ہوئے جہاں بابا فریدؒ کئی ہفتوں سے چلّہ کش تھے۔

حضرت سلطان الہندؒ اور قطبؒ دروازے میں کھڑے اس جاں سوختہ کو دیکھ رہے تھے جس نے اپنی جوانی سخت ریاضتوں کی نذر کر دی تھی۔ یکایک بابا فریدؒ نے محسوس کیا کہ ایک مسحور کن خوشبو حجرے میں چاروں طرف پھیل گئی ہے۔ آپؒ کے حواس دنیا کی بہترین خوشبوؤں سے آشنا تھے مگر آج جو خوشبو حجرے میں بکھری ہوئی تھی وہ سب سے منفرد اور جدا تھی۔ بابا فریدؒ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''مولانا فرید! اپنی خوش بختی پر ناز کرو کہ تم سے ملنے کے لئے میرے پیر و مرشد حضرت سلطان الہندؒ تشریف لائے ہیں۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

پیر و مرشد کی زبان سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اسمِ گرامی سن کر بابا فریدؒ کی حالت غیر ہو گئی۔ احتراماً کھڑا ہونے کی کوشش کی تو پاؤں لڑکھڑائے اور آپؒ زمین پر گر پڑے۔ دوبارہ پوری طاقت کے ساتھ بابا فریدؒ نے اُٹھنے کی کوشش لیکن اس بار بھی لرزتے قدموں نے آپؒ کا ساتھ نہیں دیا۔ عاجز ہو کر بابا فریدؒ نے زمین پر سر رکھ دیا اور بے اختیار رونے لگے۔

سلطان الہندؒ، بابا فریدؒ کی دلی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ جب اپنی بے کسی پر نوجوان سالک کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے تو آپؒ نے حضرت قطبؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"قطب! آخر کب تک اس نوجوان کو مجاہدات کی آگ میں جلاتے رہو گے؟ آؤ ہم دونوں مل کر بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں کہ ہمارے اس فرزند کو شرفِ قبولیت بخش دیا جائے۔"

یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آگے بڑھے۔ بابا فریدؒ بدستور زمین پر اپنا سر رکھے رو رہے تھے۔ قریب پہنچ کر پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ خم ہوئے اور بابا فریدؒ کا دایاں بازو پکڑ لیا۔ پھر اشارے سے حضرت قطبؒ کو حکم دیا کہ وہ دوسرے بازو کو سہارا دیں۔ پھر جیسے ہی حضرت سلطان الہندؒ نے بابا فریدؒ کے جسم کو ہلکی سی جنبش دی، آپ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

پھر سلطان الہندؒ نے بارگاہِ ذوالجلال میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "اے سلسلۂ چشتیہ کو عظمت و بزرگی عطا کرنے والے! تیرے سامنے یہ فقیر اس اُمید پر دامن پھیلاتا ہے کہ تُو اسے کبھی مایوس نہیں کرتا۔ آج بھی تیرے سامنے دستِ سوال دراز ہے کہ ہمارے خاندان کے اس وارث کو اپنی بے مثال رحمت سے محروم نہ رکھ۔ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرما کہ تیرے فضل کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں۔ یہ سراسر عاجز ہے اور تُو اوّل و آخر قادر...... اپنی اسی قدرتِ لازوال کے صدقے میں فرید کی دستگیری کر اور اسے درویشی کے کامل درجے تک پہنچا دے۔"

اس دعا کے بعد حضرت سلطان الہندؒ نے بابا فریدؒ کو سینے سے لگا لیا۔ آپؒ کو محسوس ہوا کہ پورا جسم آگ کے شعلوں میں جل اٹھا ہو۔

پھر یہی تپش آہستہ آہستہ گل و شبنم کی ٹھنڈک میں تبدیل ہو گئی۔ بابا فریدؒ نے محسوس کیا آپؒ کی آنکھوں کے سامنے کئی حجابات اٹھ گئے ہیں اور معرفت کے کئی پوشیدہ راز سورج کی طرح روشن نظر آ رہے ہیں۔ طویل سیاحت اور سخت ریاضت کے بعد جو دولتِ عرفان حاصل نہ ہو سکی تھی، وہ سلطان الہندؒ کی ایک نظرِ کرم نے بابا فریدؒ کے دامن میں ڈال دی۔

ایک روایت کے مطابق اسی سال حضرت بابا فریدؒ کو خاندانِ چشتیہ کی خلافت بھی بخشی گئی۔ یہ واقعہ 612ھ میں پیش آیا۔ اس وقت بابا فریدؒ کی عمر تیس سال تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عین عالم شباب میں بابا فریدؒ نے بزرگی کا وہ اعزاز حاصل کر لیا جو بہت سے لوگوں کو عمر تمام ہونے کے بعد بھی میسر نہیں آتا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حصولِ خلافت کے بعد بابا فریدؒ نے دس سال تک دہلی میں اور پھر بارہ سال تک شہر ہانسی میں طویل مجاہدات کئے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ خلافت کے بعد سالک مطمئن ہو

جاتا ہے...... لیکن وہ درویش جو کسی منزل کو منزلِ آخر نہیں سمجھتا، اس کا روحانی سفر آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ یہی کیفیت حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی بھی تھی۔ حضرت سلطان الہندؒ سے فیض یاب ہونے کے باوجود آپؒ کے مجاہدات جاری رہے۔ ان مجاہدات کا ایک ہی مقصد تھا کہ انسانی کردار میں استقامت پیدا ہو اور معرفت کے ان مقاماتِ بلند کا مشاہدہ کیا جا سکے جو عام انسانی آنکھ سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

اب ہم بابا فریدؒ کے ان مشاہدات کا ذکر کریں گے جو تصوف کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے مشاہدے سے اہلِ نظر کو اندازہ ہو گا کہ خدا کے ان برگزیدہ بندوں کا اخلاقِ کریمانہ کیا ہے اور انہیں غیب سے کیسی کیسی روحانی قوتیں بخشی گئی ہیں۔

یہ 614ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت بابا فریدؒ فرماتے ہیں۔ "اس وقت حضرت نور الدین غزنوی سہروردیؒ دہلی کے قاضی تھے۔ اور انہیں "شیخ الاسلام" کا لقب حاصل تھا۔ فرمانروائے ہند سلطان شمس الدین بھی حضرت نور الدین غزنویؒ کا بہت احترام کرتا تھا۔ خود نور الدین غزنویؒ کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ بعض مواقع پر آپؒ سلطان کو بھی سخت جواب دے دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن حضرت نور الدین غزنویؒ اور سلطان العارفین حضرت شیخ شاہی بدایونیؒ میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا۔ پھر صورتِ حال یہاں تک بگڑی کہ دونوں بزرگوں میں گفتگو تک بند ہو گئی۔ دہلی کے صوفیاء اور معززین شہر نے بہت کوشش کی کہ آپس میں مصالحت ہو جائے مگر کسی طرح بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ پھر کسی شخص نے اس فقیر کو اطلاع دی کہ حضرت نور الدین غزنویؒ اور شیخ شاہیؒ کے درمیان کشیدگی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ دونوں کے درمیان گفتگو بھی بند ہے۔ مجھے یہ سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ بالآخر میں نے دونوں درویشوں میں صلح کرانے کے لئے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا۔ میں نے حضرت نور الدین غزنویؒ کو اپنے کمبل میں چھپایا اور حضرت شیخ شاہیؒ کے مقام پر پہنچ گیا۔ شیخ شاہیؒ کو جیسے ہی میری آمد کی خبر ہوئی، وہ والہانہ انداز میں گھر سے باہر نکل آئے اور آتے ہی میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ رات کا وقت تھا۔ اس لئے حضرت شیخ شاہی بدایونیؒ صورتِ حال کو نہیں سمجھ سکے۔ مگر جیسے ہی مصافحے کی رسم ادا ہوئی، میں نے شیخ شاہیؒ سے صاف صاف کہہ دیا۔

"آپ نے جس شخص سے مصافحہ کیا ہے وہ میں نہیں ہوں بلکہ حضرت نور الدین غزنویؒ ہیں۔"

"نور الدین غزنوی؟" حضرت سلطان العارفین شیخ شاہیؒ نے شدید حیرت و

استعجاب کے عالم میں کہا۔ ''نور الدین کہاں ہیں؟''

''شیخ میرے کمبل میں موجود ہیں۔'' میں نے کہا اور حضرت نور الدین غزنویؒ کے سر سے کمبل کھینچ لیا۔

حضرت شیخ شاہی بدایونیؒ کچھ دیر تک بڑے تعجب سے حضرت نور الدین غزنویؒ کو دیکھتے رہے اور پھر آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئے۔ اس طرح ایک لطیفے کے ذریعے دونوں بزرگوں کے درمیان کشیدگی ختم ہوگئی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

یہ 618ھ کا واقعہ ہے جب مشہور بزرگ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بدایوں میں مقیم تھے اور بابا فریدؒ آپؒ سے ملنے کے لئے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ایک دن بابا فریدؒ، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت شیخؒ اچانک اٹھے اور مکان سے نکل کر اپنے دروازے پر بیٹھ گئے۔ بابا فریدؒ نے بھی آپؒ کی تقلید کی۔ پھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور حضرت بابا فریدؒ آپؒ کی گفتگو بہت غور سے سنتے رہے۔

بات کرتے کرتے یکایک حضرت شیخ تبریزیؒ خاموش ہو گئے اور سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ حضرت بابا فریدؒ نے بھی اسی طرف دیکھنا شروع کر دیا جدھر حضرت جلال الدین تبریزیؒ کسی خاص چیز کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ بس ایک دہی بیچنے والا دیہاتی نما انسان تھا جو آوازیں لگا لگا کر اپنا دہی بیچ رہا تھا۔

پھر جب وہ دہی بیچنے والا حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قریب سے گزرا تو آپؒ نے بلند آواز میں اسے مخاطب کر کے فرمایا۔ ''کیا بیچ رہے ہو؟''

''دہی بیچ رہا ہوں۔ خریدو گے؟'' اس شخص نے بڑی بے نیازی کے ساتھ تلخ لہجے میں کہا۔

حضرت بابا فریدؒ کو اس دیہاتی انسان کا یہ گستاخانہ لہجہ بہت ناگوار گزرا مگر آپؒ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے احترام میں خاموش رہے۔

دراصل دہی فروخت کرنے والا وہ شخص بدایوں کا مشہور ڈاکو ''مولا'' تھا۔ اس نے چوروں کی ایک جماعت بنائی تھی جو دن کے وقت مزدور پیشہ لوگوں کے لباس میں محلہ در محلہ مختلف چیزیں بیچتے پھرتے تھے اور رات کے اندھیرے میں ڈاکے ڈالتے تھے۔ اگرچہ ''مولا'' ان کا سردار تھا لیکن اس نے بھی ایک دہی فروش کا روپ دھار رکھا تھا اور اس وقت حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے سامنے سے آوازیں لگاتا ہوا گزر رہا تھا۔

ڈاکوؤں کا سردار ہونے کی وجہ سے ''مولا'' کے لہجے میں تلخی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا مخاطب بدایوں کی گلیوں میں گھومنے والا کوئی عام فقیر ہے۔ اس لئے اس کے طرزِ گفتار سے اکھڑ پن جھلکنے لگا تھا۔

''ہاں! ہاں! خریدیں گے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''تیرا سب کچھ خرید لیں گے۔''

مولا جیسا ڈاکو اور جابر و سفاک انسان ان الفاظ کا متحمل کس طرح ہو سکتا تھا۔ حضرت شیخ تبریزیؒ کی بات سن کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور اس نے سر پر رکھے ہوئے دہی کے مٹکے کو ذرا سا ترچھا کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اُس سے اس لہجے میں بات کرنے والا آخر کون شخص ہے؟ مگر جیسے ہی ''مولا'' کی نظر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے رُخِ روشن پر پڑی، وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس کے جسم کی لرزش اتنی تیز تھی کہ ''مولا'' اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور مٹکا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے ہی لمحے حضرت بابا فریدؒ نے دیکھا کہ سارا دہی مٹی میں مل چکا ہے اور ٹھیکرے اِدھر اُدھر بکھر گئے ہیں۔

''اب کیا بیچو گے؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اسی تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''اپنی ساری متاع تو خاک میں ملا دی۔ اب تمہارے پاس فروخت کرنے کو کیا باقی بچا ہے؟''

''مولا'' شدید عالمِ تحیر میں کسی بے جان مجسمے کی مانند کھڑا تھا۔ پھر جب اس کی حیرت کا طلسم ٹوٹا تو بے اختیار کہنے لگا۔ ''دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں؟''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ''مولا'' کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اس کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھتے رہے۔

چند لمحوں کے بعد مولا دوبارہ کہنے لگا۔ ''ابھی میرے پاس بیچنے کو بہت کچھ ہے۔ میں اپنے رسم و رواج بیچوں گا، مذہب بیچوں گا، یہاں تک کہ تمہارے ہاتھ اپنے دل و جان بھی بیچ ڈالوں گا۔ خدا کے لئے واپس نہ لوٹاؤ۔ مجھے خرید لو، بے مول خرید لو۔'' یہ کہہ کر مولا آگے بڑھا اور حضرت شیخ جلال الدینؒ کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگا۔

حضرت شیخؒ نے بدایوں کے سنگ دل ڈاکو کے لرزتے ہوئے جسم پر ایک نظر ڈالی اور پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''اُٹھو! تم نے سب کچھ بیچ دیا اور ہم نے سب کچھ خرید لیا۔''

پھر اہلِ بدایوں نے دیکھا کہ ایک سفاک ہندو اپنا آبائی مذہب تبدیل کر کے حلقۂ

اسلام میں داخل ہو رہا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد "مولا" نے لُوٹا ہوا تمام سرمایہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ روایت ہے کہ مولا کے پاس ایک لاکھ جیتل موجود تھے۔ جیتل ہندوستان کا قدیم سکہ تھا۔

جب مولا نے اپنی تمام دولت حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو نذر کرنی چاہی تو آپؒ نے فرمایا۔ "اسے اپنے پاس رکھو۔ جس طرح ہم کہیں گے اس طرح خرچ کرتے رہنا۔"

قبولِ اسلام کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے "مولا" کا ہندوانی نام بدل کر "علی" رکھ دیا تھا۔ علی کا بیان ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت مند شخص حضرت شیخؒ کے پاس آتا تو آپؒ اسے میرے پاس بھیج دیتے اور میں حکم کے مطابق اتنی ہی رقم سائل کو دے دیتا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ جب بھی کسی سوالی کو علی کے پاس بھیجتے تو پانچ جیتل سے کم نہیں دیتے تھے اور موجودہ صورتِ حال یہ تھی کہ علی کے پاس ایک ہی جیتل بچا تھا۔

ابھی علی ذہنی انتشار میں مبتلا تھا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی آواز گونجی۔
"علی! خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ یہ صاحب آ رہے ہیں۔ انہیں ایک جیتل دے دو۔"

علی نے وہ آخری سکہ تو دے دیا مگر اُسے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ شیخؒ عجیب و غریب حساب داں ہیں۔ ایک ایک کوڑی کا حساب دل میں رکھتے ہیں۔

جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بدایوں سے بنگال جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو علی کو تصورِ فراق نے مضطرب کر دیا۔ "شیخ! مجھے یہاں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہیں؟ میں نے تو اپنا سب کچھ آپ کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ کیا میں دوبارہ اس دنیا کے بازار میں بکوں گا؟ میرا نیلام ہوگا اور لوگ میری بولیاں لگائیں گے؟" شیخؒ کی جدائی کے خیال سے علی زار و قطار رو رہا تھا۔

"نہیں علی! دنیا میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ تمہاری قیمت لگا سکے۔ تم اللہ کے بندے ہو اور تم نے اللہ ہی کے ہاتھوں اپنی جان فروخت کی ہے۔ میں تو ایک ظاہری سبب ہوں اور درمیان کا کچھ حصہ ہوں۔ اسی نے تمہیں ہدایت بخشی ہے اور وہی تمہاری کفالت کرے گا۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، علی کو سمجھا رہے تھے۔ "بدایوں میں میرا کام ختم ہو چکا۔ تم ان آوازوں کو نہیں سن سکتے۔ ارضِ بنگال ہمیں پکار رہی ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ لوحِ محفوظ پر یہی رقم ہو چکا ہے۔ آسمانی تحریریں مٹائی نہیں جا سکتیں۔ جس طرح سرزمینِ بنگال میرا مقدر ہے اسی طرح خاکِ بدایوں تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ میں بحکم

خدا یہ علاقہ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ تم اس بت کدے میں اذان دو۔ اتنی پُر جلال آواز میں اذان دو کہ مندروں کے ناقوس ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور برہمن اپنے گلے سے زنار توڑ کر پھینک دیں۔ اللہ تمہاری نگہبانی کرے۔" یہ آخری الفاظ تھے جو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے اور پھر آپؒ بنگال کی جانب روانہ ہو گئے۔

بعد میں یہی علیؒ درجۂ ولایت تک پہنچے اور تاریخ میں علی مولاؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ وہی علیؒ ہیں جنہوں نے بدایوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی تھی۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

بعض مستند تذکرہ نویس حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے حوالے سے ایک اور اہم واقعے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حضرت بابا فریدؒ نوعمر تھے اور ملتان کی مسجد میں علمِ ظاہری حاصل کر رہے تھے۔ اسی مسجد میں ایک دن حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بھی تشریف لائے تھے۔ ملتان کی اس تاریخی عبادت گاہ میں داخل ہونے سے پہلے حضرت شیخؒ نے اہلِ شہر سے دریافت کیا تھا۔

"یہاں کون کون اللہ کے دوست ہیں؟"

جواب میں مقامی لوگوں نے تمام بزرگوں کے نام بتا دیئے تھے اور پھر یوں ہی سرسری انداز میں کہہ دیا تھا۔

"یہاں ایک قاضی بچہ بھی ہے مگر دیوانہ ہے۔" حضرت بابا فریدؒ، قاضی شعیبؒ کی نسل سے تھے، اس لئے بچہ قاضی کہلاتے تھے۔ دیوانہ مشہور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپؒ دن رات کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے اور کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے اہلِ دنیا نے سمجھ لیا تھا کہ حضرت بابا فریدؒ کسی خللِ دماغی کا شکار ہیں۔ پھر اپنی اسی غیر معمولی محویت کے سبب آپؒ دیوانے مشہور ہو گئے۔

جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بابا فریدؒ کا نام سنا تو بے اختیار فرمایا۔ "ہم اس دیوانے بچے سے ضرور ملیں گے۔"

پھر حضرت شیخؒ اسی مسجد میں تشریف لے گئے جہاں حضرت بابا فریدؒ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ، بابا فریدؒ کے قریب پہنچے تو آپؒ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

حضرت شیخؒ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ فرزند! اور اپنا کام جاری

رکھو۔"

حضرت بابا فریدؒ، حضرت شیخؒ کے حکم سے مسجد کے فرش پر بیٹھ گئے مگر کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپؒ کچھ عجیب سے اضطراب میں مبتلا تھے۔ نتیجتاً دوبارہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت شیخؒ نے اس کا سبب پوچھا تو عرض کرنے لگے۔ ''آپ کی موجودگی میں بیٹھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، بابا فریدؒ کا جواب سن کر بہت مسرور ہوئے۔ پھر آپؒ نے ایک انار نکال کر نوجوان طالب علم کو دیا اور فرمایا۔ ''بچے! اسے رکھ لو۔ درویش کے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ اور نہیں ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ اس دن روزے سے تھے اس لئے انار توڑ کر اس کے سارے دانے حاضرینِ مسجد میں تقسیم کر دیئے۔

''فرزند! تم نے اپنے لئے کچھ نہیں رکھا؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بابا فریدؒ سے دریافت کیا۔

''بس! مجھے یہ کافی ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے اس دانے کو اٹھاتے ہوئے کہا جو تقسیم کے دوران مسجد کے فرش پر گر پڑا تھا۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بابا فریدؒ کا جواب سنا، عجیب نظروں سے آپؒ کی طرف دیکھا اور پھر مسجد سے تشریف لے گئے۔

جب بابا فریدؒ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے پیر و مرشد کے پاس دہلی پہنچے اور ایک دن گفتگو کے دوران آپؒ کو اپنے لڑکپن کا وہ واقعہ یاد آیا تو حضرت قطبؒ کو تمام روداد سنانے کے بعد عرض کرنے لگے۔

''پتہ نہیں وہ کون درویش تھے؟ پھر بھی میں نے انار کے اسی دانے سے روزہ افطار کیا تھا۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے پورا واقعہ سننے کے بعد فرمایا۔ ''بابا! وہ بزرگ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ تھے۔ تم بہت خوش نصیب ہو فرید! حضرت شیخؒ تمہیں انار دینے ہی کے لئے مسجد تشریف لائے تھے۔''

''مگر میں نے تو سارا انار حاضرین مسجد میں تقسیم کر دیا تھا۔'' حضرت قطبؒ کے انکشاف کے بعد بابا فریدؒ کو اس بات پر افسوس ہونے لگا تھا کہ آپؒ نے پورا انار خود کیوں نہیں کھایا۔

''مولانا فرید! اُداس نہ ہو۔ تمہاری یہی ادا تو شیخؒ کو پسند آئی تھی۔ وہ تمہارے دل

کی کشادگی دیکھنا چاہتے تھے۔ تم نے حاضرین مسجد میں انار تقسیم کر کے شیخؒ کو خوش کر دیا۔ پھر جب تم نے زمین پر گرا ہوا دانہ اُٹھایا اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ پر ظاہر کیا کہ تمہارے لئے یہی دانہ کافی ہے تو شیخؒ تمہارے اس انکسار اور قناعت پر راضی ہو گئے۔ یہ دل کی باتیں ہیں۔ شیخؒ نے تمہیں سب کچھ دے دیا۔ اسی ایک دانے میں تمہارے لئے تمام نعمتیں موجود تھیں۔ باقی سارے دانے خالی تھے۔

اس کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ دہلی تشریف لائے تو بابا فریدؒ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس عظیم بزرگ کے ساتھ آپؒ کی ملاقاتیں بہت طویل ہوئیں مگر شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی مسلسل سازشوں نے دہلی کی روحانی مجلسوں کو درہم برہم کر دیا اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ خفا ہو کر بدایوں تشریف لے گئے۔

618ھ میں حضرت بابا فریدؒ، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے نیاز حاصل کرنے کے لئے بدایوں حاضر ہوئے۔ بعض تاریخی حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ نے کم و بیش ایک سال بدایوں میں قیام کیا تھا اور آپؒ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی طویل صحبتوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ قیامِ دہلی کے دوران جو تشنگی اور خلل باقی رہ گیا تھا، اس کی تکمیل کسی حد تک بدایوں میں ہوئی۔

619ھ میں حضرت بابا فریدؒ دوبارہ دہلی تشریف لائے۔ ایک دن بابا فریدؒ حاضرین مجلس کو درویشی کے آداب سکھا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران آپؒ نے فرمایا۔

''ایک بار میں پیر و مرشد حضرت قطبؒ کی مجلس عرفانی میں حاضر تھا۔ حضرت قطبؒ اپنے علم معرفت سے تشنہ لبوں کو سیراب کر رہے تھے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ حضرت قطبؒ اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر بعد دوبارہ بیٹھ کر درس دینے لگے۔ یہ واقعہ کئی بار پیش آیا تو لوگ حیرت زدہ ہوئے مگر احترامِ شیخؒ کے پیش نظر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حضرت قطبؒ سے اس عمل کا سبب دریافت کرتا۔

پھر جب مجلسِ درس تمام ہوئی تو حضرت قطبؒ کے کسی دوست نے پوچھا۔ ''شیخ! آپ درس کے دوران کئی بار کھڑے ہوئے اور کئی مرتبہ بیٹھے۔ آخر اس کا کیا سبب تھا؟''

جواب میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔

''خانقاہ کے دروازے پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ جب بھی میری نظر اس کے سفید بالوں پر پڑتی تھی تو میں برائے تعظیم کھڑا ہو جاتا تھا۔''

''آپ اسے بلا کر خانقاہ کے اندر بھی بٹھا سکتے تھے۔ پھر اس طرح آپ کو بار بار یہ زحمت نہ اُٹھانی پڑتی۔'' دوست نے حضرت شیخؒ کی وضاحت سن کر عرض کیا۔

"مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ میں اپنے آرام کی خاطر کسی دوسرے انسان کو زحمت دوں۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ "شاید بوڑھا شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ خانقاہ کے اندر آنے کے لائق نہیں تھا۔ اس لئے میزبان کی حیثیت سے میرا یہ فرض تھا کہ میں اسے بھی دوسرے مہمانوں کی طرح اہمیت دوں اور اپنے قریب تصور کروں۔"

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے حاضرین مجلس سے فرمایا۔ "درویشی بہت نازک شے ہے۔ اس راستے میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ایک عام شخص ان مناظر سے چشم پوشی کر سکتا ہے مگر درویش کسی بھی حال میں انہیں نظرانداز نہیں کر سکتا۔"

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

اسی سال ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے حضرت بابا فریدؒ کو تمام زندگی شدید اضطراب میں مبتلا رکھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روایت کے مطابق ایک بار حضرت بابا فریدؒ نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"ایک دن میں پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر تھا۔ جب تمام لوگ حضرت شیخؒ کے روبرو اپنی اپنی خواہشات کا اظہار کر چکے تو میں نے بھی عرض کیا کہ مجھے ایک چلّے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

جواب میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ "اب تمہیں کسی چلّے کی ضرورت نہیں۔ خواجگانِ چشت نے شہرت کے لئے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔"

اس وقت نہ جانے کیسی بدبختی میرے سر پر سایہ فگن تھی کہ بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ "میں شہرت کے لئے چلّہ نہیں کر رہا ہوں۔"

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے پھر کچھ نہیں فرمایا اور خاموشی اختیار کر لی۔ پیر و مرشد کا یہ سکوت میرے لئے کسی اذیت ناک سزا سے کم نہیں تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں حضورِ شیخؒ گستاخی جیسے سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ اس واقعے کو زمانہ گزر گیا مگر میں آج بھی اپنے اس عمل پر شرمسار ہوں کہ مجھے حضرت شیخؒ کے سامنے جواب نہیں دینا چاہئے تھا۔ اللہ میرے اس گناہ کو معاف کرے۔"

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" میں تحریر کرتے ہیں کہ ایک بار چند سوداگر اونٹوں پر شکر لادے جا رہے

تھے۔ اتفاق سے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ بھی وہاں موجود تھے۔ آپؒ نے شکر کے سوداگروں سے دریافت کیا۔

"ان اونٹوں پر کیا ہے؟"

سادہ لباس کی وجہ سے سوداگروں نے حضرت بابا فریدؒ کو کوئی ضرورت مند انسان سمجھا۔ اس لئے ازراہِ مذاق کہا۔

"یہ نمک کی بوریاں ہیں۔ تمہیں کیا چاہئے؟"

حضرت بابا فریدؒ نے سوداگروں کی اس طنزیہ گفتگو کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا اور نہایت خوش دلی کے ساتھ فرمایا۔ "تم کہتے ہو تو پھر نمک ہی ہوگا۔"

شکر کے سوداگر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور حضرت بابا فریدؒ خانقاہ واپس تشریف لائے۔

پھر جب وہ سوداگر اپنی شکر فروخت کرنے کے لئے بازار پہنچے اور بوریاں کھولی گئیں تو سب کے سب حیرت زدہ رہ گئے۔ بوریوں میں شکر کے بجائے نمک بھرا ہوا تھا۔ تمام خریدار ان سوداگروں کو برا بھلا کہنے لگے۔

"شکر کہتے ہو اور نمک بیچتے ہو؟ کیسا فریب ہے اور کیسا اندھیر ہے؟"

سوداگر بھرے بازار میں تماشا بن کر رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شکر نمک میں کیسے تبدیل ہو گئی۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد ایک سوداگر کو راستہ کا واقعہ یاد آ گیا۔

"یقیناً وہ کوئی مردِ نیک تھا جس کے ساتھ ہم نے شرارت کی تھی۔" ایک سوداگر نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اسی کی بددعا سے، ہماری ساری شکر نمک کا ڈھیر بن گئی ہے۔"

اس خیال کے آتے ہی تمام سوداگر واپس لوٹے اور حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"ہمیں معاف کر دیا جائے۔" شکر کے سوداگر بڑی عاجزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"تم لوگوں نے کیا، کیا ہے؟" حضرت بابا فریدؒ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آخر تم کس جرم کی معافی مانگ رہے ہو؟" حضرت بابا فریدؒ اس واقعے کو فراموش کر چکے تھے۔ اس لئے آپؒ کو اجنبی لوگوں کی معافی پر حیرت ہو رہی تھی۔

"آپ کی بددعا سے ہماری شکر کا سارا ذخیرہ نمک میں تبدیل ہو گیا۔" سوداگروں نے بیک زبان عرض کیا۔

"مسلمان کسی کو بددعا نہیں دیتا۔" حضرت بابا فریدؒ نے بتایا۔ "تم نے اپنے دینی

بھائی سے مذاق کیا تھا۔ اللہ نے تمہیں اس کی سزا دے دی۔ ہمیشہ اپنی زبان سے کلمۂ خیر ادا کیا کرو۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب قبولیت کی ساعت آ جائے۔"

شکر کے سوداگر اپنی اس حرکت پر سخت نادم تھے۔ آخر بابا فریدؒ نے انہیں معاف کر دیا۔ "جاؤ دوبارہ اپنے اسبابِ تجارت کو دیکھو، اللہ فضل کرے گا۔"

جب سوداگر واپس آئے اور ڈرتے ڈرتے بوریوں کے منہ کھولے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ تمام بوریاں شکر سے بھری ہوئی تھیں۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

620ھ میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جو اہلِ معرفت کو ہمیشہ والہانہ محبت کا سبق دیتا رہے گا۔ قیامِ دہلی کے آخری دور میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ کو اپنے وضو کی خدمت پر مامور فرما دیا تھا۔ ایک دن عجیب اتفاق ہوا کہ سردی کا موسم تھا اور رات کو آگ ختم ہو گئی تھی۔ نمازِ فجر میں پیر و مرشد کے وضو کے لئے پانی گرم کرنا تھا، اس لئے بابا فریدؒ آگ کی تلاش میں خانقاہ سے نکل کر بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سوچ کر دروازے دروازے پھرتے رہے کہ کہیں کسی مکان میں کوئی جاگ رہا ہو تو آگ کا سوال کریں۔

خوش قسمتی سے بابا فریدؒ کو ایک گھر میں کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آپؒ تیزی سے آگے بڑھے اور دروازے پر دستک دی۔ مکان کی مالکہ ایک جوان اور شریر عورت تھی۔ اس نے پردے سے جھانک کر دیکھا تو اپنے دروازے پر ایک خوبصورت نوجوان کو کھڑے دیکھا۔

"تمہیں کسی سے ملنا ہے؟" عورت نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

حضرت بابا فریدؒ عورت کے لہجے کی شرارت کو محسوس کر کے لرز گئے مگر مجبوراً آپؒ کو جواب دینا پڑا۔ "مجھے کسی سے ملاقات نہیں کرنی خاتون! میں تو ایک ضرورت مند شخص ہوں اور آپ کے دروازے پر آگ لینے کے لئے آیا ہوں۔"

عورت آپؒ کے مزاج اور مسلک سے واقف نہیں تھی، اس لئے دل بستگی کی باتیں کرتی رہی۔

حضرت بابا فریدؒ نے اپنا سوال دہرایا اور درخواست کی کہ انہیں تھوڑی سی آگ دے دی جائے۔

عورت شرارت سے باز نہیں آئی۔ کہنے لگی کہ آگ بلا معاوضہ نہیں دی جاتی۔

حضرت بابا فریدؒ نے معاوضہ دریافت کیا تو بڑی بے باکی سے بولی۔ "اپنی ایک آنکھ

نکال کر دے دو اور آگ لے جاؤ۔"

وقت گزرتا جا رہا تھا اور بابا فریدؒ کو یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ اگر آگ نہیں ملی تو حضرت شیخؒ وضو کس طرح کریں گے؟ اور اس شریر عورت کا یہ حال تھا کہ آگ کے بدلے آنکھ طلب کر رہی تھی۔

بالآخر آپؒ نے مجبور ہو کر اس فتنہ گر عورت سے کہا۔ "میں آنکھ تو نہیں نکال کر دے سکتا مگر اسے پھوڑ سکتا ہوں۔ آپ آگ لے کر آئیں۔"

بابا فریدؒ نے اتنا کہا اور آنکھ کے حلقے میں اپنی اُنگلیاں پیوست کر دیں۔ عورت ابھی تک اپنی شرارت کو ایک دلچسپ کھیل سمجھ رہی تھی۔ مگر جب اس نے بابا فریدؒ کی اضطراری حالت دیکھی تو خوف زدہ ہو کر کہنے لگی۔

"تم آنکھ رہنے دو۔ میں آگ لے کر آتی ہوں۔"

عورت اپنی شرارت اور ضد سے باز آ گئی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے پتہ بھی نہ چل سکا کہ اس کشمکش میں بابا فریدؒ کی آنکھ بری طرح زخمی ہو گئی ہے۔ پھر جب وہ آگ لے کر آئی تو بابا فریدؒ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیز رفتاری کے ساتھ خانقاہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ کی طرف دیکھا تو آپؒ کی آنکھ پر رومال بندھا ہوا تھا۔

"بابا! تمہاری آنکھ کو کیا ہوا؟" حضرت قطبؒ نے وضو کرتے ہوئے اپنے مرید خاص سے پوچھا۔

"کچھ نہیں شیخ محترم! آنکھ آئی ہے۔" حضرت بابا فریدؒ نے صورتِ حال کو چھپاتے ہوئے عرض کیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ مسکرائے اور پھر فرمایا۔ "بابا! اگر آنکھ آئی ہے تو کھول دو، سوائی ہے۔"

پیر و مرشد کا حکم سن کر حضرت بابا فریدؒ نے زخمی آنکھ سے رومال ہٹا دیا۔ اس وقت آپؒ کو شدید حیرت ہوئی کہ آنکھ میں برائے نام بھی تکلیف باقی نہیں تھی۔

حضرت قطبؒ کی اس کرامت کا آج بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بابا فریدؒ کی نسل کے جتنے لوگ بھی پاک و ہند میں موجود ہیں، ان کی دائیں آنکھ چھوٹی اور بائیں قدرے بڑی ہوتی ہے۔ یہ فرق کسی دوسرے خاندان کے لوگوں میں بھی پایا جا سکتا ہے مگر ہم اسے اتفاق ہی کہیں گے۔ اس کے برعکس جس قدر بھی فریدی نظر آتے ہیں، ان کی آنکھوں

میں یہ علامت یقینی طور پر پائی جاتی ہے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

621 ہجری کا سال حضرت بابا فریدؒ کی زندگی کا ایک اور انقلابی سال تھا۔ اس سال آپؒ کی شادی ہوئی اور ایک عارف نے راہِ سلوک میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ادا کی۔

اپنی شادی کے سلسلے میں خود بابا فریدؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز آپؒ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر تھے۔ دیگر خدمت گار، عقیدت مند اور مرید بھی موجود تھے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سب کے سامنے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''مولانا فرید! اب تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ جب تک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک ایک سنت مبارکہ پر عمل نہ کیا جائے، اس وقت تک درویشی کی تکمیل نہیں ہوتی۔''

حضرت بابا فریدؒ نے شیخ کا حکم سن کر فرطِ حیاء سے سر جھکا لیا۔

پھر یہ واقعہ کئی بار پیش آیا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ وقفے وقفے سے بابا فریدؒ کو شادی کی تلقین فرماتے رہتے مگر آپؒ ہر مرتبہ شرم و حیا کی وجہ سے خاموش رہتے۔

بالآخر ایک دن تنہائی میں حضرت قطبؒ نے آپؒ سے دریافت کیا۔ ''بابا فرید! میں تم سے کتنی بار شادی کے متعلق کہہ چکا ہوں مگر تم ہر مرتبہ خاموشی اختیار کر لیتے ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

اب حضرت بابا فریدؒ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ حضورِ شیخؒ اپنے دل کی بات کہہ ڈالیں۔ ''سیّدی! میں اس تصور سے خائف رہتا ہوں اگر اولاد غیر سعادت مند نکلی تو سرِ محشر اللہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔''

''مولانا! تم نے اپنے اللہ سے حُسنِ ظن کیوں نہیں رکھا؟'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے تنبیہہ کے لہجے میں فرمایا۔ ''کسی کو نہیں معلوم کہ کسی آغاز کا انجام کیا ہو گا؟ ایک مسلمان کو ہر حال میں اپنے اللہ سے خیر کی توقع رکھنی چاہیے۔ پھر بھی اگر تمہیں اپنی ہونے والی اولاد کی طرف سے فکر لاحق ہے تو ہم سے ایک معاہدہ کر لو۔''

بابا فریدؒ، حضرت شیخؒ کی زبان مبارک سے معاہدے کا لفظ سن کر حیرت زدہ رہ گئے اور اس طرح پیر و مرشد کی طرف دیکھنے لگے جیسے آپؒ بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔

''وہ معاہدہ یہ ہے کہ جو اولاد سعادت مند ہو، وہ تمہاری...... اور جو نالائق نکلے اسے

ہمارے نام پر چھوڑ دو۔ پھر اللہ جانے اور ہم جانیں۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس معاہدے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا جسے سن کر بابا فریدؒ پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔

اب گریز کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ بالآخر حضرت شیخؒ کے حکم سے مجبور ہو کر حضرت بابا فریدؒ نے نجیب النساء نامی ایک خاتون سے شادی کر لی۔

حضرت بابا فریدؒ کی شادی کے سلسلے میں بعض بڑی عجیب روایات مشہور ہیں جنہیں پڑھ کر ایک عام انسان کا ذہن بری طرح اُلجھ جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس اہم موضوع پر معتبر تاریخی شہادتیں جمع کی جائیں۔ یہ بات بہت زیادہ شہرت پا گئی ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کی شادی 634 ھ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اگر ہم اس روایت کو درست تسلیم کر لیں تو پھر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ پیر و مرشد کے بے حد اصرار کے باوجود حضرت بابا فریدؒ شادی سے دامن بچاتے رہے۔ اور پھر جب حضرت قطبؒ کا وصال ہو گیا تو آپؒ نے خود کو رشتۂ ازدواج سے منسلک کر لیا۔ اس روایت کی درستگی کا سب سے خوف ناک پہلو یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ نے حضرت قطبؒ کے حکم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ممکن ہے کہ اہل دنیا اس سلسلے میں کوئی عذر تراش لیں مگر بابا فریدؒ حکم شیخ سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے ثابت ہو جاتا ہے کہ آپؒ کی شادی حضرت قطبؒ کی حیاتِ مبارک میں ہوئی تھی اور وہ 621 ھ کا سال تھا۔

634 ھ کی روایت کے مطابق حضرت بابا فریدؒ نے خاتون بیگم نامی ایک دوشیزہ سے شادی کی اور وہ لڑکی والیٔ ہندوستان سلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی تھی۔ اس روایت کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی اولادوں میں اس نام کی کسی لڑکی کا ذکر نہیں ملتا۔ بالفرض ہم یہ تسلیم کر لیں کہ تذکرہ نویسوں سے نام کے سلسلے میں غلطی سرزد ہو گئی تب بھی تاریخی حقائق کی روشنی میں اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر سلطان غیاث الدین بلبن کے بارے میں تحقیق کی جائے تو یہ بات درست ثابت ہو جاتی ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے اسے بخارا کے تاجروں سے 628 ھ کے بعد خریدا تھا...... اور خریداری کے وقت وہ غیر شادی شدہ تھا۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ التمش نے مرنے سے پہلے اپنی ایک لڑکی کی شادی بلبن کے ساتھ کر دی تھی۔ اگر شادی کی اس تقریب کو جلد از جلد صورت پذیر کیا جائے تو وہ 629 ھ کا زمانہ ہو سکتا ہے۔ اس قیاس آرائی کے بعد اگر بلبن کی کوئی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ 634 ھ میں شادی کے قابل نہیں ہو سکتی

تھی۔ اس طرح حضرت بابا فریدؒ کے ساتھ بلبن کی لڑکی کا نکاح تحقیق کے کسی زاویے سے بھی درست نہیں۔ یہ محض ایک افسانہ ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ لوگوں نے ایسا بے سروپا افسانہ کیوں تراشا؟

اس روایت کا دوسرا تاریخی پہلو یہ ہے کہ غیاث الدین بلبن 643 ھ میں اوچ جاتے ہوئے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں اجودھن (پاک پتن) حاضر ہوا تھا۔ اس وقت تک خاتون بیگم کے بطن سے کئی اولادیں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگر خاتون بیگم، غیاث الدین بلبن کی صاحب زادی ہوتیں تو اس ملاقات میں ضرور کوئی اشارہ ملتا۔ اگرچہ اس زمانے میں بلبن براہِ راست ہندوستان کا حکمراں نہیں تھا لیکن تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ درپردہ مملکتِ ہند پر بلبن ہی کی حکومت تھی۔ کہنے کو سلطان ناصر الدین محمود ایک نیک سیرت بادشاہ تھا لیکن سیاست کی بساط پر بلبن کی گرفت مضبوط تھی۔ اس طرح جب غیاث الدین بلبن، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت وہ ہندوستان کا طاقت ور ترین آدمی تھا۔ پھر اگر خاتونِ بیگم اس کی صاحب زادی ہوتیں تو بلبن ایک اجنبی کی طرح اجودھن میں حاضر نہ ہوتا۔ حضرت بابا فریدؒ بھی خسر کی حیثیت سے ضرور اس کا احترام کرتے اور بلبن خود بھی اپنی بیٹی نواسوں سے ملنے کے لئے بہت زیادہ پُرجوش نظر آتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ تاریخ اس اہم ترین رشتے کے سلسلے میں خاموش رہتی.... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ نے اس بات میں مکمل سکوت اختیار کر لیا ہے۔ واضح رہے کہ غیاث الدین بلبن، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں ایک بزرگ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سوالی کا لباس پہن کر حاضر ہوا تھا۔

اس حاضری کی باقی تفصیلات یہ ہیں کہ سلطان ناصر الدین محمود بذاتِ خود حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ کے دیدار سے شرف یاب ہونا چاہتا تھا مگر الغ خان نے اسے مختلف بہانوں سے باز رکھا۔ (اس وقت بلبن کا نام الغ خان تھا۔ تختِ ہندوستان پر متمکن ہونے کے بعد اس نے سلطان غیاث الدین بلبن کا لقب اختیار کیا) الغ خان نے سلطان ناصر الدین محمود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ حضرت بابا فریدؒ، حضرت قطبؒ کے خلیفۂ اکبر ہیں۔ اس لئے ان کی خدمت میں کسی اہتمام کے بغیر حاضر ہونا گستاخی تصور کیا جائے گا۔ الغ خان نے سلطان کو یہ بات بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پہلے خود بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوگا اور پھر سلطان کی ملاقات کے لئے راہ ہموار کر دے گا۔ ناصر الدین محمود، الغ خان (بلبن) کی باتوں سے مطمئن ہو گیا اور پھر والئ ہند نے اسے اجودھن جانے کی اجازت دے دی۔

الغ خان اسی موقع کا منتظر تھا۔ سلطان ناصر الدین محمود کی طرف سے یہ اجازت پاتے ہی اس نے سب سے پہلے اجودھن اور اس کے گردونواح کے دیہاتوں کی معافی کا پروانہ حاصل کیا۔ پھر دیگر قیمتی تحائف اور زرِ کثیر لے کر ایک لشکر کے ہمراہ اجودھن کی جانب روانہ ہوا۔

جب حضرت بابا فریدؒ کو الغ خان اور ہزاروں عقیدت مند فوجیوں کے آنے کی خبر ہوئی تو آپؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا۔ ”درویش کو ان لوگوں سے ملاقات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں۔ فقیر آنے والوں کے حق میں دُعائے خیر کرتا رہے گا۔“

جب الغ خان (بلبن) کو معلوم ہوا کہ حضرت بابا فریدؒ تمام لشکر سے ملنے سے گریزاں ہیں تو اس نے بابا فریدؒ کے مریدوں سے عرض کیا۔

”یہ سپاہی اپنے دل میں حضرت شیخؒ کے دیدار کی تمنا لے کر آئے ہیں اور ان لوگوں نے اس بارگاہ تک پہنچنے کے لئے راستے کی بڑی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ حضرت شیخؒ کی خدمت میں میری طرف سے ایک بار اور درخواست کی جائے کہ یہ طالبانِ دیدار چہرۂ مبارک دیکھے بغیر واپس جانا نہیں چاہتے۔“

مریدوں نے اپنے شیخؒ کے حضور میں الغ خان کی درخواست پیش کر دی۔ حضرت بابا فریدؒ کچھ دیر تک غور کرتے رہے۔ اسی دوران ایک مرید نے عرض کیا کہ ہزاروں سپاہیوں کو شرف باریابی عطا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ حضرت شیخؒ خانقاہ کے ایک بلند مقام پر جلوہ افروز ہوں اور اپنی چادر گلی کی طرف لٹکا دیں۔ اس طرح ہر سپاہی باری باری اس چادر کو بوسہ دیتا ہوا گزر جائے گا اور خانقاہ کے اندر کوئی انتشار پیدا نہیں ہوگا۔

پھر جب حضرت بابا فریدؒ کے مریدوں نے الغ خان کو اس تجویز سے آگاہ کیا تو تمام لشکری بے ساختہ پکار اٹھے۔

”ہمارے لئے یہی سعادت کافی ہے کہ ہم حضرت شیخؒ کی متبرک چادر کو بوسہ دیتے ہوئے گزر جائیں۔“

پھر حضرت بابا فریدؒ خانقاہ کے ایک بلند مقام پر تشریف فرما ہوئے اور آپؒ نے اپنی چادر گلی کی طرف لٹکا دی۔ سپاہی ایک ایک کر کے آتے رہے اور حضرت شیخؒ کی چادر کو بوسہ دیتے ہوئے گزرتے رہے۔ عقیدت کے مظاہرے میں ہر شخص کا مختلف انداز ہوتا ہے۔ کوئی شخص زیادہ پُرجوش نظر آتا ہے اور کوئی اعتدال کی منزل میں رہتا ہے مگر حضرت بابا فریدؒ کے سلسلے میں ہر شخص کی عقیدت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ

دیر بعد چادر کی دھجیاں اُڑ گئیں......اور پھر جس کے حصے میں چادر کا جو ٹکڑا آیا وہ اس نے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

کئی گھنٹے تک مسلسل ایک جگہ بیٹھے رہنے سے حضرت بابا فریدؒ بھی تھکن محسوس کرنے لگے تھے۔ مجبوراً آپؒ خانقاہ سے نکل کر ملحقہ مسجد میں تشریف لے آئے اور خدمت گاروں سے فرمانے لگے۔

”میرے گرد حلقہ باندھ لو اور کسی سپاہی کو قریب نہ آنے دو۔ پھر بھی اگر کوئی شخص اس فقیر کو دیکھنا چاہتا ہے تو دور سے سلام کرتا ہوا گزر جائے۔“

الغ خان کے سپاہی اس پر رضامند ہو چکے تھے مگر اچانک ایک بوڑھے شخص نے حلقہ توڑ دیا اور حضرت بابا فریدؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ پھر جوشِ عقیدت میں اس نے بوسہ دینے کے لئے پائے مبارک کھینچا۔ حضرت بابا فریدؒ کو بوڑھے کا یہ عمل سخت ناگوار گزرا۔ جواباً اس نے نہایت پُرسوز لہجے میں عرض کیا۔

”شیخ المشائخ حضرت شیخ فرید الدینؒ! آپ کیوں تنگ آتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اس سے بھی اچھا شکر ادا کرو۔“

بوڑھے کی بات سن کر حضرت بابا فریدؒ نے نعرہ مارا۔ پھر بوڑھے کے حال پر نوازش فرمائی اور اس سے معافی مانگی۔

بوڑھے شخص کے طفیل الغ خان کے سپاہیوں کو بھی اجازت مل گئی۔ ایک ایک لشکری نظم و ضبط کے دائرے میں حضرت بابا فریدؒ کے قریب آتا اور اس مردِ جلیل کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر آگے بڑھ جاتا۔

جب تمام سپاہی دست بوسی سے شرف یاب ہو گئے تو الغ خان دست بستہ کھڑا ہوا اور اس نے نقد رقم کے ساتھ جاگیر کا پروانہ پیش کیا۔

حضرت بابا فریدؒ نے نقد رقم اور تحائف قبول کر لئے اور فوراً ہی اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ یہ تمام چیزیں اسی وقت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس کے بعد آپؒ الغ خان کے لائے ہوئے پروانۂ جاگیر کو بہت غور سے دیکھنے لگے۔

الغ خان درمیان ہی میں بول اٹھا۔ ”حضور! جاگیر کا یہ حکم نامہ صرف آپ کے لئے ہے۔“

جیسے ہی الغ خان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت بابا فریدؒ نے وہ تمام کاغذات واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ ”مجھے ان کی حاجت نہیں۔ تمہاری سلطنت میں بے شمار ضرورت مند ہیں۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے ان لوگوں میں تقسیم کر دو۔“

حضرت بابا فریدؒ نے جاگیر کا پروانہ واپس کیا تو الغ خان کے چہرے کا رنگ اُتر گیا۔ اجودھن آنے سے پہلے الغ خان نے اپنے ذہن میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جب حضرت بابا فریدؒ جاگیر کے کاغذات قبول کر لیں گے تو پھر وہ اپنے اقتدار کے لئے دعا کی درخواست کرے گا۔ اس کے سینے میں برسوں سے یہ آرزو دفن تھی کہ وہ کسی طرح حکومتِ ہند کا مطلق العنان فرمانروا بن جائے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے دور میں یہ خواہش اس قدر شدت سے بیدار ہوئی تھی کہ الغ خان، حضرت بابا فریدؒ کے در تک آ پہنچا تھا۔ نذر قبول کرنے کے بعد اسے یقین ہو چلا تھا کہ بابا فریدؒ جاگیر کا پروانہ بھی قبول کر لیں گے اور پھر اس کی منزل آسان ہو جائے گی......مگر جب ایک درویش خدا مست نے شاہی عطیے کو ٹھکرا دیا تو الغ خان کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا ہوا نظر آیا۔ پھر بھی وہ دل ہی دل میں یہ دعا مانگتا رہا کہ کاش بابا فریدؒ اس کے اقتدار کے لئے دعا فرما دیں۔

ابھی الغ خان کی آرزوؤں کا سفینہ ڈوب کر اُبھر رہا تھا کہ حضرت بابا فریدؒ نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے فارسی زبان کی ایک رباعی پڑھی جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

”شہنشاہ ایران فریدوں کوئی آسمانی فرشتہ نہیں تھا اور نہ اسے آرام و آسائش سے کوئی نسبت تھی......مگر جب اس نے سخاوت سے کام لیا تو اس درجے تک پہنچ گیا۔ تُو بھی داد و دہش (سخاوت و بخشش) سے کام لے۔ تُو بھی ایک دن فریدوں ہو جائے گا۔“

الغ خان کچھ دیر تک سناٹے میں بیٹھا رہا۔ اس نے بابا فریدؒ کی روحانی قوتوں کے بے شمار تذکرے سنے تھے لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اجودھن کا یہ درویش کتنا بڑا روشن ضمیر ہے۔ جو تمنائیں الغ خان کے دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لے رہی تھیں، وہ حضرت بابا فریدؒ کے سامنے اس طرح بے نقاب تھیں جیسے آسمان پر چمکتا ہوا سورج۔ الغ خان، حضرت بابا فریدؒ کے اس روحانی جلال کو برداشت نہ کر سکا اور اپنے ہزاروں سپاہیوں کی موجودگی میں اس نے حضرت بابا فریدؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ پھر بڑے عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔

”شیخ! میں کیا کروں؟ اپنے دل سے مجبور ہوں۔ ہر شخص سینے میں آرزوئے اقتدار رکھتا ہے اور میں بھی اپنے نفس کا اسیر ہوں۔ کاش! ایسا ہو کہ یہ غلام زادہ ایک دن تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز ہو......اور یہ کارِ عظیم آپ کی دعاؤں کے بغیر ممکن نہیں۔ بس یہی التجا ہے کہ میری جانب ایک بار نگاہِ خاص سے دیکھ لیجئے کہ آپ کی ایک نظر میرا مقدر سنوار دے گی۔“

حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ”الغ خان! اُٹھو۔ دنیا کا کوئی درویش کسی انسان کے

مقدر پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر کوئی فقیر کسی وجہ سے یہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے تو وہ ہذیان کا شکار ہے۔ میں بھی تمہارے لئے دعا تو کر سکتا ہوں مگر اقتدار کی خوشخبری نہیں سنا سکتا۔ پھر بھی سخاوت اور رحم سے کام لو۔ عجب نہیں کہ یہ فیاضی تمہارے کام آجائے۔"

الغ خان، حضرت شیخؒ کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ بارگاہِ فریدی سے اٹھا اور اجودھن کے درویش کے ہاتھوں کو طویل بوسہ دے کر واپس چلا گیا۔

حضرت بابا فریدؒ کی ملاقات سے فیض یاب ہونے کے بعد الغ خان میں ایک خاص تبدیلی آگئی تھی۔ دوسرے وزیر و امیر اس کی بدلی ہوئی عادت کو بہت حیرت سے دیکھتے تھے مگر الغ خان اپنے امرائے سلطنت کے اس ردِعمل سے بے نیاز محتاجوں اور ضرورت مندوں میں دولت تقسیم کرتا رہتا تھا۔ جب بھی کوئی حاجت منداس کے سامنے آکر دستِ سوال دراز کرتا اور الغ خان کی یہ خواہش ہوتی کہ کسی بہانے سے اسے ٹال دے تو اسی وقت حیرت انگیز طور پر اجودھن کا واقعہ یاد آجاتا اور ایسا محسوس ہوتا جیسے حضرت بابا فریدؒ سرگوشی میں کہہ رہے ہوں۔

"شہنشاہِ ایران فریدوں، بادشاہ بن کر آسمان سے نہیں اُترا تھا۔"

حضرت بابا فریدؒ کے الفاظ کی بازگشت الغ خان کو پُرجوش بنا دیتی اور پھر وہ جی کھول کر سرکاری خزانہ لٹاتا رہتا۔

غرض اس طرح حضرت بابا فریدؒ سے ملاقات کئے ہوئے تقریباً پچیس سال گزر گئے مگر ابھی الغ خان کی خواہشِ اقتدار تکمیل تک نہیں پہنچی تھی۔ کبھی کبھی وہ شدید مایوس ہو جاتا اور مطلق العنان حکمرانی کے خواب بکھرنے لگتے مگر یہ عجیب بات تھی کہ جب بھی الغ خان نااُمیدی کا شکار ہوتا، حضرت بابا فریدؒ کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجنے لگتے۔

"سخاوت و کرم سے کام لے۔ تُو بھی فریدوں ہو جائے گا۔"

ان الفاظ کے یاد آتے ہی الغ خان ایک بار پھر پُر اُمید نظر آنے لگتا اور ضرورت مندوں کی جماعت سے نہایت فراخ دلانہ سلوک کرتا۔

پھر وہ وقت معلوم آپہنچا۔ 664ھ میں سلطان ناصر الدین محمود نے انتقال کیا اور متفقہ طور پر الغ خان کو ہندوستان کا فرماں روا منتخب کر لیا گیا۔ خواہشِ اقتدار ایک طویل انتظار کے بعد تکمیل کے مراحل تک پہنچی۔

الغ خان برسرِ عام کہا کرتا تھا کہ میرے اس منصب عظیم پر فائز ہونے میں حضرت بابا فریدؒ کی دعاؤں کا بہت زیادہ دخل ہے۔ آپؒ مجھے فریدوں ہونے کی دعا دیتے تھے اور

میں فریدوں شہنشاہ ہو گیا۔

رسمِ تاج پوشی کے بعد الغ خان نے سلطان غیاث الدین بلبن کا لقب اختیار کیا اور نہایت جاہ و جلال کے ساتھ طویل و عریض ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کی داستانِ اقتدار بیان کرنے کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ بے شک! خاتون بیگم نام کی ایک دوشیزہ سے حضرت بابا فریدؒ نے 634ھ میں شادی کی تھی مگر وہ فرمانروائے ہندوستان بلبن کی صاحب زادی نہیں تھی۔ خاتون بیگم خاندانِ سادات سے تعلق رکھنے والی ایک پاکباز عورت تھیں۔ اللہ نے انہیں یہ شرف بخشا تھا کہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والی اولادیں نہ صرف زندہ رہیں بلکہ ان ہی کے ذریعے حضرت بابا فریدؒ کی نسل کو فروغ حاصل ہوا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت قطبؒ کے اصرارِ مسلسل کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے عملی طور پر کیا قدم اٹھایا تھا؟ عام تاریخ نویس تو یہی لکھتے ہیں کہ حضرت بابا فریدؒ نے اپنے پیر و مرشد کے وصال کے بعد 634ھ میں خاتون بیگم سے شادی کی تھی...... مگر اہلِ دل اس تاریخی روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر بابا فریدؒ، شیخؒ کی وفات کے بعد شادی کرتے تو معرفت کے قانون میں آپؒ کا یہ عمل حکم عدولی کے مترادف قرار پاتا........ اور حضرت بابا فریدؒ وہ بزرگ تھے جو حکمِ شیخ پر جان تو دے سکتے تھے مگر سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں حضرت بابا فریدؒ نے حکمِ شیخؒ کے مطابق 621ھ یا 622ھ میں نجیب النساء سے شادی کی۔ ان خاتون کے بارے میں زیادہ تفصیلات تو موجود نہیں پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ نجیب النساء ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں........ اور یہ خاندان غالباً ہانسی میں آباد تھا۔ اپنی ان ہی زوجہ محترمہ کی وجہ سے حضرت بابا فریدؒ نے شہر ہانسی میں طویل قیام کیا۔

بیشتر تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ حضرت بابا فریدؒ، حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی وجہ سے اس شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ، حضرت بابا فریدؒ کے انتہائی لاڈلے اور چہیتے مرید تھے۔ حضرت بابا فریدؒ کو آپؒ سے اس قدر محبت تھی کہ بعض مواقع پر دوسرے مرید حضرت جمال الدین ہانسویؒ سے حسد کرنے لگتے تھے۔

حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپؒ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ تک پہنچ جاتا ہے۔ آپؒ کا خاندانی نام جلال الدین تھا۔

سلسلۂ چشتیہ میں داخل ہونے سے پہلے حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ ایک اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ آپؒ جس محفل میں بھی تقریر کرتے، سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو الفاظ پر وہ قدرت حاصل تھی کہ آپؒ جب چاہتے اہلِ مجلس کو رُلا دیتے اور جب چاہتے حاضرین کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے چراغ جل اُٹھتے۔

حضرت بابا فریدؒ نے آپؒ کی اس صفت کے بارے میں سنا تو فرمایا۔ "جمال زبان کا امیر ہے مگر اس کا دل دولتِ عرفان سے خالی ہے۔"

جب حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو یہ معلوم ہوا تو آپؒ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ "مجھے اپنی غلامی کا شرف عطا کر دیجئے کہ میں اب تک اس دولت سے محروم ہوں۔"

شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی درخواست سن کر حضرت بابا فریدؒ فرمانے لگے۔ "تم تو خود ایک عالم و فاضل شخص ہو۔ اپنی تقریروں سے محفلوں میں آگ لگا دیتے ہو۔ پھر میں تمہاری رہنمائی کس طرح کر سکوں گا؟" حضرت بابا فریدؒ، شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی آزمائش کے لئے گریز اختیار کر رہے تھے۔

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر آج میں اپنے دل میں آگ لگانا چاہتا ہوں۔ میرا سینہ اب تک ایک سرد خانے کی مانند ہے۔ شیخ! اسے عشق کی حرارت عطا کیجئے۔ ورنہ پتھر بن کر رہ جاؤں گا۔" شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی آواز سے رقت جھلک رہی تھی۔

آزمائش کا مختصر مرحلہ گزر چکا تھا۔ جیسے ہی شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت بابا فریدؒ نے آگے بڑھ کے فاضل نوجوان کو سینے سے لگا لیا اور پھر والہانہ انداز میں فرمایا۔

"میرا جمال۔"

عجیب الفاظ تھے اور عجیب لمحہ تھا۔ اسی وقت اہلِ نظر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نو وارد کوچۂ معرفت کو نگاہِ شیخ میں کیا مقام حاصل ہے؟ حضرت بابا فریدؒ نے شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو سلوک کی منزلیں اس طرح طے کرائیں کہ اس کا تصور ہی کر کے دوسرے عارف حیران رہ جاتے تھے۔ پھر جلد ہی وہ مقام آ گیا جب حضرت بابا فریدؒ نے شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو خرقۂ خلافت عطا کر دیا۔ ظاہری اعتبار سے بھی حضرت شیخ جمالؒ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ آپؒ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ "ملہمات" آپؒ کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ بلند مرتبہ شاعر بھی تھے۔ آپؒ کا صوفیانہ کلام

اس قدر دلنشیں ہوتا تھا کہ جسے سن کر صوفیائے کرام بھی وجد میں آ جاتے تھے۔

ایک دن حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ سنی۔ "قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے......اور دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔"

اس حدیث مقدس کے سنتے ہی حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی حالت غیر ہو گئی۔ اور پھر آپؒ پر مسلسل ایک اضطرابی کیفیت طاری رہنے لگی۔ دل میں جو کچھ بھی خواہشِ دنیا باقی رہ گئی تھی وہ اس حدیث مبارکہ کے سنتے ہی فنا ہو گئی اور پھر ہر وقت آپؒ کی آنکھوں کے سامنے قبر کا ہولناک منظر اُبھرنے لگا۔

حضرت بابا فریدؒ، حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ پیرو مرشد کا یہ انداز دیکھ کر بعض مرید رشک کا شکار ہو گئے تھے اور کچھ لوگ آتشِ حسد میں جل اُٹھے تھے۔ حضرت بابا فریدؒ اکثر آپؒ کے بارے میں فرماتے تھے۔

"جمال، جمال ماست" (جمال ہمارا جمال ہے) ایک بار حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے حضرت بابا فریدؒ کو تحریر کیا کہ میرے تمام مریدوں اور خلفاء کو لے لیجئے اور ان کے بدلے میں صرف جمال الدین کو مجھے دے دیجئے۔

جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے لکھا۔ "جمال میرا جمال ہے۔ معاوضہ مال میں ہو سکتا ہے نہ کہ جمال میں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے کچھ دن بعد پھر اسی مضمون کا خط لکھا۔ "مستقل نہیں تو کچھ دن کے لئے مجھے جمال کو دیجئے۔"

جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے تحریر فرمایا۔

"شیخ! کوئی اپنا جمال بھی کسی کو دیتا ہے۔ آپ چند روز کے لئے کہتے ہیں، میں چند لمحوں کے لئے بھی جمال کو خود سے جدا نہیں کر سکتا۔"

کچھ عرصے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے پھر اسی خواہش کا اظہار کیا۔

جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "شیخ! بار بار درخواست کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ جمال کے سلسلے میں نہ کوئی سودا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مفاہمت۔"

شیخ الہدیہؒ نے اپنی مشہور تصنیف "سیر الاقطاب" میں اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کی طرف سے مایوس ہو کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے روحانی طاقتوں کے ذریعے شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ایک دن شیخ جمالؒ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

''سیّدی! مجھے ملتان جانے کی اجازت مرحمت فرمایئے۔''

''جمال! تم ملتان جا کر کیا کرو گے؟'' حضرت بابا فریدؒ نے حیرت زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا وہاں تمہیں کوئی ضروری کام ہے؟''

''میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔'' شیخ جمالؒ کی گفتگو سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ آپؒ چند روز کے لئے ملتان جانے کی خواہش رکھتے ہیں یا پھر حضرت شیخ زکریاؒ سے فیضِ روحانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

''کیا کہا؟'' حضرت بابا فریدؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ''اگر تمہیں وہاں بھیجنا ہوتا تو میں حضرت شیخؒ کے خطوط کے جواب میں انکار کیوں کرتا؟''

شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے حضرت بابا فریدؒ کی اس ناگواری کو محسوس نہیں کیا اور خاموش کھڑے رہے۔

''کیا تم اپنا ارادہ نہیں بدل سکتے؟'' شیخ جمالؒ کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت دیکھ کر حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

''میں کچھ دنوں کے لئے ملتان جانا چاہتا ہوں۔'' شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے اپنی اسی خواہش کا اظہار کیا۔

شیخ الہدیہؒ نے اپنی کتاب ''سیر الاقطاب'' میں تحریر کیا ہے کہ یہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا روحانی تصرف تھا اور اس کے زیرِ اثر شیخ جمال ہانسویؒ ملتان جانے کے لئے بے قرار و مضطرب تھے۔

''جاؤ! چلے جاؤ!'' اچانک حضرت بابا فریدؒ غضب ناک ہو گئے تھے۔ اہلِ مجلس کا یہ بیان ہے کہ ان لوگوں نے اس سے پہلے حضرت بابا فریدؒ کو اس قدر غیظ کے عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ چہرۂ مبارک بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا اور لہجے سے بھی قہر کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

ہم نے بابا فریدؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ کو محتاط انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ شیخ الہدیہؒ نے تو مذکورہ واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جیسے ہی شیخ جمال ہانسویؒ نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی تھی تو حضرت بابا فریدؒ نے انتہائی برہم لہجے میں فرمایا تھا۔

''جاؤ اور اپنا منہ کالا کرو۔'' یہ محبت کی انتہا تھی کہ شیخ جمالؒ کی جدائی کے تصور ہی سے حضرت بابا فریدؒ جیسے شیریں دہن انسان کا لہجہ شرر بار ہو گیا تھا۔

ابھی فضا میں حضرت بابا فریدؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا تمام علمِ روحانی سلب ہو گیا۔ اب شیخ جمالؒ کی حیثیت اس شخص کی سی تھی جس نے محنت شاقہ کے بعد ایک بڑا سرمایہ جمع کیا ہو...... اور اچانک کسی نظر نہ آنے والے ہاتھ نے اس کی ساری دولت چھین لی ہو۔

حضرت شیخ الہدیہؒ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کے اظہارِ ناراضگی کے بعد شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے چہرے کا رنگ بگڑنے لگا تھا۔ شاید منہ کالا کرنے کا یہی مفہوم ہو۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت بابا فریدؒ کا چہیتا اور لاڈلا ''جمال'' خانقاہ کے دروازے سے اس طرح نکلا تھا کہ جیسے وہ رُوئے زمین پر دنیا کا سب سے زیادہ مفلس اور بدنصیب انسان ہو۔ شیخ جمالؒ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان کے لئے اس زمین پر کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ بعض روایات سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کے اظہارِ غضب کے بعد شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے خانقاہ میں ٹھہرنے کی کوشش کی تھی مگر پیر و مرشد بار بار یہی فرما رہے تھے۔

''میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔ اپنے سینے میں ملتان جانے کی آرزو رکھتے ہو تو پھر وہیں چلے جاؤ۔''

شیخ جمالؒ اس آتشِ جلال کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت بابا فریدؒ کے سینے میں اذیت و کرب کی جو آگ بھڑکی تھی، اسے بجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر شیخ جمال الدین ہانسویؒ ان شعلوں کو سرد کرنے کے لئے کچھ دیر ٹھہر جاتے تو خود بھی جل کر خاکستر ہو جاتے۔ وہ آگ تو اپنے وقت پر ہی بجھتی اور وقت ابھی بہت دور تھا۔ شیخ جمالؒ کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ حضرت بابا فریدؒ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

پھر وہ جمال مجلس سے نکل کر چلا گیا جس کے بارے میں حضرت بابا فریدؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''کوئی اپنا جمال بھی کسی کو دیتا ہے؟'' بڑی عجیب بات تھی کہ آج بابا فریدؒ نے اپنے اسی جمال کو وقت کے حوالے کر دیا تھا۔

شیخ الہدیہؒ کا بیان ہے کہ پیر و مرشد کی خانقاہ سے اٹھ کر شیخ جمال الدین ہانسویؒ اتنے بارفتہ ہوئے کہ گریبان چاک کر دیا اور دشتِ الم میں تنہا بھٹکنے لگے۔ پورا جسم زخموں سے بھر گیا اور زخم خون دینے لگے۔ کبھی جس کے رُخِ تابناک سے پوری بزم روشن تھی، اب اسی کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔

شیخ جمال کیا گئے کہ پوری خانقاہ اُداسیوں میں ڈوب گئی۔ اگرچہ روز و شب بھی وہی

تھے...... مسافرانِ عشق بھی وہی تھے...... اور منزلِ عرفاں بھی وہی تھی...... لیکن خود میرِ مجلس شکستہ تھا...... رہنمائے شوق دل گرفتہ تھا...... اس لئے ہر شے بجھی بجھی سی لگتی تھی۔

حضرت بابا فریدؒ کے سامنے جب بھی کوئی شیخ جمالؒ کا ذکر کرتا تو آپؒ انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرماتے۔

"جانے والے چلے گئے تو اس مجلس سے ان کا نام بھی اُٹھ گیا۔"

اس کے بعد پھر کسی کی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ بابا فریدؒ کے حضور میں شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی سفارش کرنے کے متعلق سوچتا...... اور سفارش کر بھی کون سکتا تھا کہ جانے والا تو خود محبوب تھا۔ جب محبوب ہی زیرِ عتاب آ گیا تو کس میں اتنا حوصلہ تھا کہ لب کشائی کرتا۔

ظاہری آنکھ رکھنے والے بس اتنا جانتے تھے کہ شیخ جمالؒ پر مسلسل غضب نازل ہو رہا ہے اور بابا فریدؒ ان سے اس حد تک خفا ہیں کہ راضی ہونے کا کوئی امکان بھی باقی نہیں...... مگر جنہیں درویشی کے مزاج کا اندازہ تھا اور جو اہلِ دل کی فطرت سے آگہی رکھتے تھے، انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ جب حضرت بابا فریدؒ، شیخ جمالؒ کا نام لینے پر پابندی عائد کرتے ہیں تو پس پردہ ایک خلش، ایک اذیت اور ایک کرب کی آہٹیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے اپنی ایک لغزش پہ عذاب کب تک برداشت کیا، تاریخ سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہاں! اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ مدتِ فراق کئی ماہ تک طول کھینچ گئی تھی...... اور کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ جمالؒ کی ظاہری حالت بہت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ جو بھی دیکھتا تھا بے اختیار اس کے منہ سے آہِ سرد نکل جاتی تھی۔

"یہ گردشِ روز و شب کا کیسا ہدف ہے کہ پہچانا بھی نہیں جاتا۔ اللہ اس پہ اپنا رحم کرے۔"

شیخ جمال الدین ہانسویؒ چپ چاپ لوگوں کی باتیں سنتے رہتے۔ کہتے بھی تو کیا کہتے کہ اس منزل میں کچھ کہنے کا یارا ہی کہاں تھا؟ پھر جب ضبطِ سخن سے سینہ جل اُٹھتا تو آسمان کی طرف دیکھ کر چیخنے لگتے۔

"لوگو! تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں؟ جب میری پہچان کھو گئی تو مجھ سے میرا تعارف چاہتے ہو؟ کسے خبر کہ میں کس محفل سے اُٹھایا گیا ہوں؟"

پھر اسی زمانۂ فراق میں شیخ جمالؒ کی ملاقات عالم نامی ایک شخص سے ہوئی۔ عالم ایک بڑا سوداگر تھا اور حضرت بابا فریدؒ کا مرید بھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ پیر و مرشد کے

محبوب ترین مرید شیخ جمال الدین ہانسویؒ ہیں تو وہ شدتِ الم سے رونے لگا۔

"جمال! یہ تم ہو؟ بابا فریدؒ کے جمال؟" عالم سوداگر شدتِ غم سے کانپ رہا تھا۔

"ہاں! یہ میں ہی ہوں، راندۂ درگاہِ شیخ۔" حضرت جمال الدین ہانسویؒ نے اس طرح کہا کہ آپؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ حسرت و آرزو کا مرثیہ تھا اور ماضی و حال کا نوحہ تھا۔

"میں کیا کروں؟ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" عالم سوداگر ناقابلِ بیان اضطراب میں مبتلا تھا۔ "جس کی سفارش سے دوسرے لوگ شیخؒ کی حضوری حاصل کیا کرتے تھے، آج وہ خود سفارش کا محتاج ہے۔ یہ کیسے فاصلے ہیں اور کیسی دوری ہے؟ اور یہ کیسی فرقت ہے اور یہ کیسی مجبوری ہے؟"

"میں کسی سے کچھ نہیں کہتا۔" حضرت شیخ جمالؒ کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ "جس کی بارگاہ سے محروم ہوا ہوں، وہ میرے حال سے بے خبر نہیں۔ کون ہے جو اس کی جناب میں زبان بھی کھول سکے۔ ہاں! اگر کبھی تم قربتِ شیخؒ سے شرف یاب ہو جاؤ تو اس غلام کی حالتِ زار بیان کر دینا۔"

ز جاناں تا بکے مہجور باشم
ہمی بہتر کہ از خود دور باشم

(دوست کی یہ جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ اب تو یہی بہتر ہے کہ اپنے آپ سے دُور ہو جاؤ)

پھر جب عالم سوداگر حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دوسرے خدمت گاروں سے شیخ جمال ہانسویؒ کے بارے میں دریافت کیا۔ خدام نے اسے بتایا کہ پیر و مرشد کے حضور شیخ جمالؒ کا نام لینا بھی انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ عالم سوداگر کو اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اس قدر نازک ہو چکی ہے۔ ایک طرف اسے شیخ جمالؒ کی حالتِ زار یاد آتی تو دل بھر آتا...... اور دوسری طرف پیر و مرشد کے غضب کا احساس ہوتا تو اس پر دہشت طاری ہو جاتی کہ کہیں وہ ایک معتوب کا ذکر چھیڑ کر خود بھی راندۂ درگاہ نہ ہو جائے۔ عالم سوداگر بڑی عجیب اذیت میں مبتلا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ شیخ جمالؒ کو فراموش کر دے اور اپنے آپ کو پیر و مرشد کے عتاب سے محفوظ رکھے...... مگر جب اس کے خیالوں میں شیخ جمالؒ کا چہرہ اُبھرتا تو ارادوں میں لرزش پیدا ہو جاتی اور وہ سوچنے لگتا کہ اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر اس شخص کی کیفیت بیان کر دے جو فراق کے صحرا میں سر سے پاؤں تک جھلس چکا ہے اور ایک لمحۂ وصال کی بھیک مانگ رہا ہے۔

پھر وہ ساعت بھی آ گئی جب عالم سوداگر کا دلِ مضطرب ٹھہر گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ حضرت شیخؒ کے قدموں پر سر رکھ دے گا اور اس وقت تک گریہ و زاری کرتا رہے گا جب تک پیر و مرشد، جمال ہانسویؒ کو معاف نہیں فرما دیں گے۔ اس فیصلے کے بعد عالم سوداگر تنہائی کے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

پھر اسے قدرت نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ حضرت بابا فریدؒ نے رات کے وقت عالم سوداگر کو خلوت میں طلب کیا اور اس کے حالات دریافت کرنے لگے۔

عالم سوداگر کو پیر و مرشد سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا تو وہ کچھ کہنے کی بجائے رونے لگا۔ اس کی اشک ریزی بابا فریدؒ کے لئے باعثِ تشویش تھی۔ اپنے مرید کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو فرمانے لگے۔

"عالم! تم اپنے دل کی بات کہو۔ وہ کون سا غم ہے جو تمہیں رُلا رہا ہے؟"

بس یہی وہ ایک لمحہ تھا جس کے انتظار میں اس کی آنکھیں کئی دن سے بے خواب تھیں۔ حضرت بابا فریدؒ کا التفات پا کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پیر و مرشد کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "سیّدی! میں تو آپ کی دعاؤں کے سائے میں ہوں...... مگر جمال کو اس جدائی کی تیز دھوپ نے جلا ڈالا۔ اب اس سے صدمۂ فراق برداشت نہیں ہوتا۔" عالم سوداگر اس مجبور شخص کا حال بیان کر رہا تھا جس کی خاطر حضرت بابا فریدؒ نے دہلی کی سکونت ترک کر دی تھی۔

عالم سوداگر نے دیکھا کہ شیخ جمالؒ کا نام سن کر حضرت بابا فریدؒ اُداس ہو گئے تھے۔ پھر جب ماضی کے نقوش تازہ ہونے لگے تو یہ اُداسیاں بھی لحظہ بہ لحظہ گہری ہونے لگیں...... اور پھر صاف نظر آنے لگا کہ حضرت بابا فریدؒ بھی شیخ جمالؒ کے فراق میں بہت دل شکستہ تھے۔ آپؒ نے بظاہر غضب کا مظاہرہ کر کے اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کو شیخ جمالؒ کا نام لینے سے روک دیا...... مگر یہ راز کسی کو معلوم نہیں تھا کہ خود حضرت بابا فریدؒ بھی اپنے محبوب مرید کی جدائی میں ہمہ وقت بے قرار رہتے تھے۔

"سیّدی! اب جمال کے لئے کیا حکم ہے؟" بابا فریدؒ کو سوگوار دیکھ کر عالم سوداگر نے عرض کیا۔

"اُس نے بہت تکلیف برداشت کر لی۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "اب اس پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہو گی کہ اس نے کیا جرم کیا تھا؟ یہ کوئی دنیا پرستی کی منزل ہے کہ آج ایک مکان میں قیام کیا، کل دوسری جگہ ڈیرا ڈال لیا۔ یہ تو خانہ بدوشوں کی رسم ہے...... اور خانہ بدوشوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کوئی مرکز نہیں رکھتے۔ جمال بھی اپنے مرکز

سے بچھڑنا چاہتا تھا تو پھر اسے چلا ہی جانا چاہئے تھا۔ اس نے خواجگانِ چشت کی محبتوں کو کافی نہیں سمجھا تو پھر خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ ہم سے زیادہ محبت کرنے والے ڈھونڈ لے۔"

"نہیں سیّدی! جمال خانہ بدوش نہیں ہے۔ خانہ بدوش ہوتا تو ملتان چلا جاتا۔ وہ تو بس ایک لہر تھی۔ اگر شیخ محترم اپنی آنکھوں سے اس کی ندامت دیکھ لیں تو پھر اعتبار آ جائے گا کہ وہ اپنے مرکز سے نہیں بچھڑا ہے۔" عالم سوداگر بڑے عجیب انداز سے حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی وکالت کر رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنے مرکز سے نہیں بچھڑ سکتا۔ اگر جمال بچھڑنے والا ہوتا تو پھر فرید اس کی خاطر یہاں کیوں آتا؟ میں جانتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہے؟ کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی بارگاہ سے اٹھا کر میں نے اُسے دل سے بھی نکال دیا ہے؟ وہ میرا جمال ہے اور روزِ اوّل کی طرح مجھ میں شامل ہے۔"

پھر ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے عالم سوداگر سے فرمایا۔

"جمال سے کہہ دو کہ وہ واپس چلا آئے۔ اس کے لئے میرے دروازے کھلے ہیں...... اور دروازے بند ہی کب ہوئے تھے۔ اس نے میرے چہرے پر نمایاں ہونے والے غیظ وغضب کو دیکھا۔ افسوس! دل کی جانب نہیں دیکھا۔ اس راستے پر نظر نہیں ڈالی جہاں درد تھا، خلش تھی، داغِ فراق تھا اور سوزشِ بے کنار تھی۔ اگر وہ ایک بار بھی ادھر دیکھ لیتا تو پھر خود بھی صحرا نوردی نہ کرتا اور میرے دل کو بھی اذیت و کرب کے حوالے نہ کر جاتا۔"

یہ کہہ کر حضرت بابا فریدؒ اپنے حجرۂ خاص سے چلے گئے۔ اس وقت عالم سوداگر کو محسوس ہوا کہ غیظ و جلال کا یہ پیکر، گل و شبنم سے زیادہ نرمی اور شمع سے زیادہ گداز رکھتا ہے۔

پھر جب شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو پیر و مرشد کی رضامندی کا پیغام دیا گیا تو کچھ دیر کے لئے ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر سینے سے ایک آہ جگر گداز کھینچی اور اسی خاردار زمین پر سر رکھ دیا۔ پیشانی سے خون کے قطرے نمودار ہونے لگے مگر شیخ جمالؒ نے سر نہیں اُٹھایا۔ اہلِ دل کے نزدیک رسمِ شکر گزاری اسی طرح ادا ہوتی ہے کہ تشنہ آرزوئیں لو دے اُٹھیں اور زخموں سے خون جاری ہو جائے۔ حضرت شیخ جمال ہانسویؒ کا جسم ہی نہیں، ان کی روح تک زخموں سے چُور تھی۔

پھر ان زخموں کے اندمال کا وقت بھی آ گیا۔ جب شیخ جمال ہانسویؒ عالم سوداگر کے ساتھ پیر و مرشد کے حضور پہنچے تو حضرت بابا فریدؒ کی مجلسِ درس آراستہ تھی۔ شیخ جمالؒ کے

داخل ہوتے ہی بام و در ساکت ہو کر رہ گئے۔

''جمال! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' جیسے ہی حضرت بابا فریدؒ کی نظر شیخ جمالؒ کے زخم آلود چہرے پر پڑی، آپؒ بے اختیار کہہ اُٹھے۔ ''کوئی اپنا جمال اس طرح بھی برباد کرتا ہے؟'' حضرت بابا فریدؒ کا لہجہ اس قدر رقت آمیز تھا کہ حاضرینِ مجلس بھی رونے لگے۔

''سیّدی! یہ تو بہت کم ہے۔'' شیخ جمالؒ کی زبان سے الفاظ بمشکل ادا ہو رہے تھے۔ ''سایۂ شیخ سے جدا ہونے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ مجھے فراق کی دھوپ نے جلا ڈالا مگر قربت کے ان لمحوں نے زندہ رکھا جو کبھی میرا مقدر بنائے گئے تھے۔''

''بس جتنا جلنا تھا، جل چکے۔ اب آزمائش کی کوئی دھوپ تمہارے جسم کو چھو کر بھی نہیں گزرے گی۔ اے جانبازِ شوق! میری طرف آ کہ خواجگانِ چشت کی محبتوں کے سائے تیرے منتظر ہیں۔''

جیسے ہی حضرت بابا فریدؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، شیخ جمالؒ اس بچے کی طرح دیوانہ وار آگے بڑھے جو اپنی ماں کی آغوش سے بچھڑ کر ایک زمانۂ دراز تک وقت کی گردشوں کا شکار رہا ہو۔

حضرت بابا فریدؒ بھی اپنی نشست سے اُٹھے، شیخ جمالؒ نے پیر و مرشد کے قدموں پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگے۔

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے محبوب مرید کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور انتہائی جذب کے عالم میں فرمایا۔ ''آج سے میرا جمال قطبِ عالم ہے۔''

''سیر الاقطاب'' کے مصنف شیخ الہدایہ کی روایت ہے کہ جب حضرت بابا فریدؒ نے شیخ جمالؒ کو ''قطبِ عالم'' کہہ کر پکارا تو حاضرینِ مجلس کو یوں محسوس ہوا جیسے خانقاہ کے در و دیوار روشن ہو گئے ہیں اور ایک عجیب سی خوشبو نے پوری مجلس کا احاطہ کر لیا ہے۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا چہرہ جو مسخ ہونے کی حد تک بگڑ گیا تھا، نہ صرف اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا بلکہ نقش و نگار کی تابناکی اس حد تک بڑھ گئی کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں...... اور روحانی مدارج کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسی دن سے حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ قطبِ عالم ٹھہرے تھے۔

حضرت بابا فریدؒ کے یہاں ایک کنیز تھیں۔ ان کی پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ حضرت بابا فریدؒ اُنہیں ''مادرِ مومناں'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک بار وہ ہانسی تشریف لے گئیں اور پھر جب واپس آ کر حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو شیخ نے بے اختیار ہو کر ان سے پہلا سوال یہی کیا۔

''مادر مومناں! جمال ما چی می کند؟''

(مادر مومناں! ہمارا جمال کیا کرتا ہے؟)

جواب میں ان پاک باز خاتون نے عرض کیا۔ ''جس روز سے وہ آپ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوئے ہیں انہوں نے گاؤں، اسباب، جائیداد، سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی پسندیدہ شے خطابت بھی ترک کر دی ہے۔ اب تو محنت و جفاکشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں...... اور کبھی کبھی تو فاقے کی حالت میں راتیں گزارنی پڑتی ہیں۔''

یہ سن کر حضرت بابا فریدؒ بہت خوش ہوئے اور انتہائی جذب کے عالم میں فرمانے لگے۔ ''خدا میرے جمال کو خوش رکھے کہ اب اس نے صحیح روش اختیار کی ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ جب اپنے کسی مرید کو خلافت نامہ عطا کرتے تو اسے حکم دیتے کہ ہانسی جا کر شیخ جمالؒ سے اس پر مہر لگوا لو۔ اگر جمال الدین ہانسویؒ اس مرید کے خلافت نامے پر اپنی مہر ثبت کر دیتے تو وہ خلافت نامہ مستند سمجھا جاتا...... اور خود حضرت بابا فریدؒ بھی فرما دیتے۔

''اب یہ خلافت نامہ معتبر ہے۔''

اور اگر حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ اس خلافت نامے پر اپنی مہر ثبت نہ کرتے تو حضرت بابا فریدؒ بھی اسے قبول نہ فرماتے اور اپنے مرید سے صاف صاف کہہ دیتے۔

''اے شخص! جمال کے پارہ کئے ہوئے کو میں نہیں سی سکتا۔''

یہ حضرت بابا فریدؒ کی محبت کی انتہا تھی...... اور یہی محبت آپؒ کو کھینچ کر ہانسی لے گئی تھی۔ اور پھر آپؒ نے وہاں مسلسل بارہ سال تک قیام فرمایا تھا۔

حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ 569ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس وقت حضرت بابا فریدؒ حیات تھے۔ شیخ جمالؒ کے انتقال کی خبر سن کر آپؒ کے دل پر کیا گزری ہو گی، اس کیفیت کا نہ اندازہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔

حضرت بابا فریدؒ کے جلال کا ایک اور واقعہ بھی تاریخ میں محفوظ ہے...... مگر اس جلال کا انداز مختلف تھا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپؒ شہر ہانسی چھوڑ کر مستقل طور پر اجودھن (پاک پتن) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور مخلوقِ خدا کا ایک اژدھام آپؒ کی خانقاہ کے سامنے دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔ دن رات بے شمار ضرورت مند آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوتے تھے اور بحکم خدا فیض ظاہری و باطنی حاصل کر کے اپنے اپنے گھروں کو بامراد لوٹ جاتے تھے۔ یہ واقعہ تحقیق کی روشنی میں درجۂ اعتبار رکھتا ہے...... اور اس واقعے کے راوی بھی دنیا کے ان چند معتبر انسانوں میں سے ایک ہیں جن کے دم سے اس دنیا

میں روایت کا اعتبار قائم ہے۔

حضرت نظیر الدین چراغ دہلویؒ کا بیان ہے کہ ایک روز آپؒ پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ موضوعِ گفتگو تھا کہ کچھ لوگ مصنوعی خرقہ پہن کر مخلوقِ خدا کو دھوکا دیتے رہتے ہیں...... اور پھر یہی فریب کاریاں انہیں ایک دن حقیقی درویشوں کے مقابل لے جاتی ہیں...... مگر وہ مصنوعی خرقہ پوش جھوٹ اور نمائش کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے انہیں خیال نہیں رہتا کہ وہ کس کے رُوبرو کھڑے ہیں اور کس انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس ندامت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہے اور محرومی انہیں گداگروں کے مانند در بدر پھراتی ہے۔

ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے پیر و مرشد حضرت بابا گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک ملنگ اجازت کے بغیر خانقاہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت حضرت شیخؒ اپنے مریدوں کو درس دے رہے تھے۔ ملنگ کے اچانک داخلے نے مجلسِ درس کے آداب کو مجروح کر ڈالا تھا مگر حضرت بابا فریدؒ نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہے۔

وہ ملنگ درویشی کا دعوے دار تھا، اس لئے بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی نعرہ زن ہوا۔ "فرید! تُو بھی درویش، میں بھی درویش۔ میری خاطر مدارات کر اور میرے ساتھ احترام سے پیش آ۔"

اس ملنگ کا طرزِ کلام نہایت گستاخانہ تھا۔ اہلِ مجلس اسے برداشت نہ کر سکے...... اور جب ایک خدمت گار نے اسے سخت لہجے میں ٹوکا تو حضرت بابا فریدؒ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم اپنی زبان کو تلخیوں سے کیوں آلودہ کرتے ہو؟ جس کے اندر جو کچھ ہے، وہی اس کی زبان تک آئے گا۔" یہ اپنے مریدوں کو نصیحت تھی اور ملنگ کو در پردہ تنبیہہ۔

مگر وہ ملنگ نہ جانے دیوانگی کی کون سی منزل پر کھڑا تھا...... اور غلط فہمی کے کس خمار میں ڈوبا ہوا تھا کہ مسلسل نعرۂ مستانہ بلند کرتا رہا۔

حضرت بابا فریدؒ نے ملنگ کو ٹالنے کے لئے اپنے مریدوں سے فرمایا کہ اسے کچھ رقم وغیرہ دے کر رخصت کر دیا جائے۔

خدمت گاروں نے فوراً حکمِ شیخؒ پر عمل کیا اور جو نذر آئی تھی اس میں سے کچھ حصہ اُس گستاخ فقیر کو دے دیا۔ ملنگ نے حضرت بابا فریدؒ کا عطیہ لے کر اپنی گدڑی کی جیب

میں ڈال لیا۔ حاضرینِ مجلس کا خیال تھا کہ ملنگ حضرت بابا فریدؒ کی اس کرم نوازی سے مطمئن ہو کر چلا جائے گا مگر وہ بدستور نعرہ زنی کرتا رہا۔

"ان سکوں کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ بس تیری خاطر انہیں قبول کر لیا۔ اگر اپنی جھولی اُلٹ دوں تو ساری دنیا سونے چاندی سے بھر جائے۔"

خدمت گاروں کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹا جا رہا تھا مگر وہ سب کے سب پیر و مرشد کے احترام میں خاموش تھے۔

"بس اب آپ تشریف لے جائیں اور جہاں چاہیں اپنی جھولی کو اُلٹ دیں۔ اس درویش کی جھونپڑی کو اپنے کمالات کے مظاہرے سے محفوظ ہی رکھیں تو زیادہ مناسب ہے۔" حضرت بابا فریدؒ کی تواضع اور لہجے کی شائستگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

جو کچھ کہنا تھا، اشاروں میں کہہ دیا گیا تھا اور جو حقیقت ظاہر کرنی تھی، وہ ظاہر کر دی گئی تھی...... مگر خود ساختہ فقیر کی درویشی کا نشہ نہیں ٹوٹا۔ وہ انتہائی وحشت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اس کی متجسس آنکھیں کسی شے کو تلاش کر رہی تھیں۔ بالآخر اس کی نگاہ حضرت بابا فریدؒ کے مصلے پر جم گئی۔

"مجھے وہ دیدے جس سے تُو اپنے بالوں کو آراستہ کرتا ہے۔" ملنگ نے حضرت بابا فریدؒ کی اس کنگھی کی طرف اشارہ کیا جو آپؒ کے قریب ہی مصلے پر رکھی ہوئی تھی۔

حضرت بابا فریدؒ نے ملنگ کی بے سرو پا باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آپؒ ناپسندیدگی کا اظہار کئے بغیر خاموش بیٹھے رہے۔

"میں کہتا ہوں کہ کنگھی اُٹھا کر مجھے دیدے۔" ملنگ کا ہذیان جاری تھا۔ "مجھے خوش کر دے۔ پھر میری وجہ سے تجھے بڑی برکتیں حاصل ہوں گی۔"

اب بابا فریدؒ خاموش نہ رہ سکے۔ "میری قسمت میں جو برکت لکھی تھی، وہ میرے مرشد مجھے عطا کر چکے۔ اب اگر دستِ غیر میں تمام سعادتیں سمٹ آئیں تو میں ادھر آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔"

اپنے پیر و مرشد سے حضرت بابا فریدؒ کا یہ جوشِ عقیدت دیکھ کر ملنگ نے ایک اور نعرہ بلند کیا۔ "تیرا مرشد تجھے کیا دے گا؟ برکتیں تو میں بانٹتا ہوں، سعادتیں تو میرے در سے تقسیم ہوتی ہیں۔" ملنگ کی زبان درازی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

جب تک اپنی ذات کا تعلق تھا تو حضرت بابا فریدؒ خاموش تھے مگر جیسے ہی اس بیہودہ ملنگ کے ہونٹوں پر آپؒ کے پیر و مرشد کے لئے تحقیر آمیز کلمات اُبھرے، حضرت بابا فریدؒ پر وہی جلالی کیفیت طاری ہو گئی جس کا ہلکا سا مظاہرہ لوگوں نے شیخ جمال الدین ہانسویؒ

کے معاملے میں دیکھا تھا۔ آپؒ نے قہر آلود نظروں سے ملنگ کی طرف دیکھا اور پھر شرر بار لہجے میں فرمایا۔

''میں نے تجھے اور تیری برکتوں کو غرق کر دیا۔'' یہ کہہ کر حضرت بابا فریدؒ اپنے حجرۂ خاص میں تشریف لے گئے۔

ملنگ اسی طرح نعرہ زنی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بابا فریدؒ کے خدمت گاروں نے اسے زبردستی خانقاہ سے نکال دیا۔

خانقاہ سے نکل کر وہ گستاخ ملنگ دریا کی طرف چلا گیا۔ یہ دریا قصبہ اجودھن کے قریب بہہ رہا تھا۔ ملنگ کو اچانک گرمی محسوس ہوئی تو اس نے تازہ دم ہونے کے لئے غسل کا ارادہ کیا اور اپنی گدڑی اتار کر دریا میں اُتر گیا۔ اگرچہ اس مقام پر دریا پایاب تھا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے بچے بھی نہایا کرتے تھے......لیکن جب ملنگ نے غوطہ مارا تو دوبارہ نہیں اُبھرا۔ پانی کی ایک سرکش موج نہ جانے کدھر سے آئی اور ملنگ کو بہا کر نہ جانے کہاں لے گئی؟ وہ خود بھی دریا میں غرق ہو گیا اور اس کی برکتیں بھی۔

تاریخوں میں ایک اور قلندر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ قلندر بھی درویشی کا دعویٰ کرتا تھا مگر اس کے دعوے کی حقیقت کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی روایت کے مطابق ایک روز حضرت بابا فریدؒ اپنے حجرۂ خاص کے اندر ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ خانقاہ کے دیگر خدام مختلف کاموں میں مصروف تھے اور ایک مرید دروازے پر مستعد کھڑا تھا کہ کب پیر و مرشد اسے آواز دیں اور وہ شیخؒ کا حکم بجا لائے۔

اسی دوران خدمت گار نے ایک اجنبی شخص کو خانقاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ آنے والا اپنے لباس اور وضع قطع سے کوئی قلندر معلوم ہوتا تھا۔ خانقاہ کے خدام فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت مولانا بدر الدین اسحاقؒ جو حضرت بابا فریدؒ کے خلیفہ بھی تھے اور داماد بھی، اس وقت حجرے کے دروازے پر موجود تھے۔ قلندر کو دیکھ کر آگے بڑھے، استقبال کیا اور اس کے بیٹھنے کے لئے وہ کمبل بچھا دیا جس پر حضرت بابا فریدؒ تشریف فرما ہوتے تھے۔ جب قلندر بیٹھ گیا تو مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے اُس سے کھانے کے لئے پوچھا۔ قلندر نے اثبات میں جواب دیا اور پھر کچھ دیر بعد اس کے سامنے کھانا پیش کر دیا گیا۔

کھانے کے بعد قلندر نے مولانا بدر الدین اسحاقؒ سے کہا۔ ''میں بہت دور سے آیا ہوں۔ کھانا یا آرام کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔ بھوک تو یقیناً تھی مگر غذا کی نہیں۔ دراصل میں حضرت شیخؒ سے ملاقات کی تمنا رکھتا ہوں اور اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لئے میں نے

بہت طویل سفر طے کیا ہے۔''

جواباً مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے فرمایا۔ ''پیر و مرشد ذکرِ الٰہی میں مشغول ہیں، کسی کی یہ مجال نہیں کہ اس وقت کوئی خدمت گار حجرے میں داخل ہو اور حضرت شیخؒ کو مطلع کر سکے۔''

قلندر نے مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی بات سنی اور بڑے بے نیازانہ انداز میں بولا۔

''کچھ بھی ہو، شیخؒ کا دیدار کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر قلندر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکالنے لگا۔

مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی نظریں قلندر پر مرکوز تھیں۔ اس نے اپنی گدڑی کی جیب سے ایک سبز گھاس نکالی اور کشکول میں ڈال دی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ گھاس ''انبان'' تھی۔ انبان کے متعلق مشہور ہے کہ اس گھاس میں نشہ ہوتا ہے اور اکثر جوگی یا ملنگ اسے پی کر سرور حاصل کرتے ہیں۔ مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے بھی یہی تصور کیا مگر وضع داری کے سبب خاموش رہے۔ پھر بھی یہ دیکھتے رہے کہ قلندر اس گھاس کو کس طرح استعمال کرتا ہے؟

قلندر خاموشی سے گھاس کو پیستا رہا۔ پھر جب وہ گھاس عرق میں تبدیل ہو گئی تو قلندر کے ہاتھوں کی لرزش کے سبب کچھ عرق کمبل پر گر گیا۔ اب مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ مولانا تیزی سے آگے بڑھے اور نہایت تند و تیز لہجے میں قلندر سے کہنے لگے۔

''تجھے نہیں معلوم کہ جس کمبل پر تُو بیٹھا ہے اس پر حضرت بابا فریدؒ تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے تو صرف مہمان نوازی کے خیال سے تجھے پیر و مرشد کا کمبل پیش کر دیا تھا مگر افسوس کہ تُو نے اس متبرک شے کی قدر نہیں کی......اور ادب و احترام کی ساری حدوں سے گزر گیا۔ اسی وقت یہاں سے اُٹھ اور اپنا چہرہ گم کر دے۔ تُو نے ہماری مدارات کا بہت برا صلہ دیا ہے۔''

جیسے ہی مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی بات ختم ہوئی، قلندر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، اس کے چلتے ہوئے ہاتھ یکایک رک گئے۔ پھر قلندر نے ناگہاں ایک ایسی چیخ ماری کہ خانقاہ کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ قلندر کی چیخ میں بڑی ہیبت تھی، بڑا جلال تھا۔ پھر وہ کشکول لے کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔

خانقاہ کے خدمت گار دیکھ رہے تھے کہ قلندر کے جس ہاتھ میں کشکول تھا، وہ آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ قلندر اپنا کشکول مولانا بدر الدین

اسحاقؒ کے سر پر مارنا چاہتا ہے۔ اسی دوران حجرے کا دروازہ کھلا اور حضرت بابا فریدؒ باہر تشریف لے آئے۔ قلندر کے تیور بہت بگڑے ہوئے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا کشکول مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے چہرے پر مار دیتا، حضرت بابا فریدؒ تیزی سے قلندر کی طرف بڑھے اور قلندر کا اُٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے۔

''مولانا بدرالدین کو میری وجہ سے معاف کر دو۔ یہ تمہیں پہچانتے نہیں تھے۔''

جب حضرت بابا فریدؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تو تمام مرید اور خدمت گار سکتے میں آ گئے۔ اب انہیں اندازہ ہوا کہ وہ قلندر کس مرتبے کا مالک ہے۔ ورنہ ''انبان'' گھاس کے پیتے وقت حاضرین خانقاہ نے سمجھ لیا تھا کہ وہ بھی قلندری کے لباس میں نشہ کرنے والا کوئی ملنگ ہے۔

''فرید! میں تمہاری بات نہیں ٹال سکتا۔'' قلندر کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ''میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں مگر تمہیں یہ راز بھی معلوم ہے کہ پہلے تو فقیر ہاتھ اٹھاتے ہی نہیں مگر جب اٹھا لیتے ہیں تو پھر اسے نیچا نہیں کرتے۔ بہتر ہے کہ اب اس ہاتھ کو بلند ہی رہنے دو۔''

''میں جانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''تم اپنا ہاتھ اونچا ہی رکھو اور اس کشکول کو دیوار پر مار دو۔''

قلندر ایک درویش کی بات کا مفہوم سمجھ گیا اور حضرت بابا فریدؒ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر جیسے ہی قلندر کا ہاتھ حضرت بابا فریدؒ کی گرفت سے آزاد ہوا، اس نے پوری طاقت سے اپنا کشکول دیوار پر مار دیا۔

اس وقت خانقاہ میں موجود تمام لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کشکول کی معمولی ضرب سے ایک پختہ اور مضبوط دیوار آن کی آن میں زمین بوس ہو گئی۔

دیوار کے گرتے ہی قلندر نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر تک سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر بابا فریدؒ سے کہتا ہوا چلا گیا۔ ''اچھا اب ہم جاتے ہیں۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔''

جب قلندر خانقاہ سے نکل کر چلا گیا تو حضرت بابا فریدؒ نے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''سب لوگوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتے۔ کبھی کبھی عام انسانوں کے لباس میں خاص ہستیاں بھی ہوتی ہیں۔''

''میں نے تو اس گھاس کی وجہ سے قلندر کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ وہ آپ کے متبرک کمبل پر بیٹھ کر نشہ کرنا چاہتا تھا۔'' مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے عرض کیا۔

''نہیں! یہ وہ گھاس نہیں تھی جسے ملنگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ صاحبِ حال انسان تھا

اور شاید ہماری آزمائش کے لئے آیا تھا۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''آئندہ احتیاط رکھنا کہ پھر کبھی تمہاری نظر دھوکا نہ کھا جائے۔''

حضرت بابا فریدؒ تقریباً بارہ سال تک ہانسی میں مقیم رہے۔ یہیں بی بی نجیب النساء سے آپؒ کی سات اولادیں ہوئیں۔ چھ بچے صغر سنی میں انتقال کر گئے۔ صرف ایک صاحب زادی شرف النساء زندہ رہیں جنہیں حضرت بابا فریدؒ کے حقیقی بھانجے اور مشہور بزرگ حضرت علاء الدین صابر کلیریؒ کی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ربیع الاوّل کا مہینہ تھا۔ حضرت بابا فریدؒ، حضرت قطبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دہلی میں چار روز قیام کیا۔ پھر محفلِ سماع میں شرکت کے بعد ہانسی جانے کی اجازت طلب کی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بڑی محبت سے آپؒ کو گلے لگایا۔ پھر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''مولانا فرید! دنیا اور آخرت میں تم ہی میرے رفیق ہو......اور میرا مقام درحقیقت تمہارا ہی مقام ہے۔''

اس عنایت خاص پر حضرت بابا فریدؒ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر جب آپؒ ہانسی کی طرف روانہ ہوئے تو دل و دماغ پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔

آخر اسی اضطراب میں کئی دن گزر گئے۔ پھر ایک روز آپؒ کو پیر و مرشد کے وہ الفاظ یاد آئے جو حضرت قطبؒ نے دہلی سے رخصت کرتے وقت ادا فرمائے تھے۔ ''مولانا! میں تمہاری امانت قاضی حمید الدین ناگوری کو دے دوں گا۔''

اسی رات حضرت بابا فریدؒ نے خواب میں دیکھا کہ پیر و مرشد یاد فرما رہے ہیں۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا، آپؒ کی آنکھ کھلی تو بے چین ہو گئے۔ بی بی نجیب النساء سے فرمایا کہ سفر کا سامان تیار کریں۔

''آپ کہاں تشریف لے جانا چاہتے ہیں؟'' بی بی نجیب النساء نے عرض کیا۔ جب آپؒ نے دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو زوجہ محترمہ بے اختیار بول اُٹھیں۔ ''ابھی تو دہلی سے آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا ہے۔''

''پیر و مرشد کا یہی حکم ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

''کم سے کم صبح ہونے کا تو انتظار کر لیجئے۔'' بی بی نجیب النساء نے آپؒ کی عجلت پر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میرے لئے ایک ایک لمحہ گراں ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہے تھے۔ ''جب تک پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر نہ ہو جاؤں اس وقت تک مجھے

قرار نہیں آئے گا۔"

پھر رات کے اندھیرے ہی میں آپؒ دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چوتھے دن دہلی پہنچے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ پورا شہر ایک ماتم کدہ نظر آ رہا تھا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

آفتاب زیر خاک سو رہا تھا۔ پیر و مرشد کی قبر پر نظر پڑی تو ایسے وارفتہ ہوئے کہ ہوش و حواس جاتے رہے۔ جس شخص کا شمار صابرین میں ہوتا تھا، فراق کی اس منزل سے گزرا تو صبر و قرار کھو بیٹھا۔ حضرت بابا فریدؒ بچوں کی طرح حضرت قطبؒ کے مرقد سے لپٹ کر رونے لگے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

دوسرے دن حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے حضرت بابا فریدؒ کو وہ جامہ (خرقہ) پیش کیا جسے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پہنا کرتے تھے اور جو پیرانِ چشت کی امانت تھی۔ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسی جامے کو برسوں اپنے جسم کی خوشبو سے مہکایا تھا........ اور پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اسی جامے کو زیب تن کر کے خاندانِ چشتیہ کی روایات کو فروغ بخشا تھا، اور آج یہی خرقہ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت قطبؒ کے حکم سے بابا فریدؒ کو پیش کر رہے تھے۔ جب حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے خرقہ آگے بڑھایا تو حضرت بابا فریدؒ کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"مولانا! یہ خواجگانِ چشت کی امانت ہے۔ اس کا بارِ گراں آپ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ اسے قبول فرمائیے۔" حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے حضرت بابا فریدؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"شیخ! میں اسے کیسے قبول کروں؟" حضرت بابا فریدؒ پر ایک بار پھر گریہ طاری ہو گیا۔ "کل تک اس پاک لباس کو میرے پیر و مرشد زیب تن فرماتے تھے۔ آج یہ غلام اس خرقۂ عظیم کو پہنے گا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اس قابل کہاں ہوں؟"

"نہیں مولانا! آپ ہی اس خرقے کے حق دار ہیں۔" حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے فرمایا۔ "حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بہتر جانتے تھے کہ یہ خرقہ کس جسم کے لئے بنایا گیا ہے؟ شیخؒ نے رخصت ہونے سے پہلے اہلِ مجلس کے سامنے فرمایا تھا کہ جب مولانا فرید آئیں تو خواجگانِ چشت کے تبرکات ان کے حوالے کر دیئے جائیں کہ میرے بعد وہی پیرانِ چشت کی امانتوں کے امین ہیں۔"

خرقے کے ساتھ ہی حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے حضرت قطبؒ کا عصا اور

چوبی نعلین (کھڑاؤں) بھی حضرت بابا فریدؒ کو پیش کئے تھے۔

خواجگانِ چشت کے تبرکات حاصل کرنے کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے دو رکعت نماز ادا کی اور پھر اس مسندِ خلافت پر بیٹھے جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تشریف فرما ہوتے تھے۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سجادے پر بیٹھتے ہی حضرت بابا فریدؒ کا جسم لرزنے لگا تھا اور آنکھیں ایک بار پھر اشک برسانے لگی تھیں۔ اسی کیفیت میں بابا فریدؒ نے اہلِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"برادرانِ عزیز! جب میں آخری بار پیر و مرشد سے مل کر ہانسی جا رہا تھا تو شیخؒ نے مجھ سے فرمایا تھا۔

"فرید! میرا مقام درحقیقت تمہارا ہی مقام ہے۔"

"لوگو! غور سے سنو۔ یہ سیّدی کا ظرف تھا کہ میرے اور اپنے مقام کو یکساں قرار دیا........ ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں فرید الدین مسعود ہوں۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ادنیٰ غلام۔ تم سب میرے لئے دعا کرو کہ میں اس آزمائش پر پورا اُتروں اور پیر و مرشد کی تابندہ روایات کو گم نام نہ ہونے دوں۔"

حضرت بابا فریدؒ کا لہجہ اس قدر پُرسوز تھا کہ اہلِ مجلس بھی بے اختیار رونے لگے پھر تمام حاضرین خانقاہ نے بیک زبان کہا۔

"آپ پیر و مرشد کی روشن نشانی ہیں۔ اس لئے اب آپ ہی ہمارے شیخ ہیں اور آپ ہی ہمارے رہنما ہیں۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

روایت ہے کہ حضرت بابا فریدؒ نے تین دن حضرت قطبؒ کے دولت کدے پر گزارے اور سات دن تک مسندِ خلافت پر جلوہ افروز رہے پھر اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ آپؒ دوبارہ ہانسی تشریف لے گئے۔

جمعہ کا دن تھا۔ حضرت بابا فریدؒ گھر سے باہر تشریف لائے تو "سرہنگا" نامی ایک مجذوب دروازے پر کھڑا تھا۔ سرہنگا وہ شخص ہے جو حضرت بابا فریدؒ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا۔ جدھر سے آپؒ گزرتے تھے، اس راستے کی خاک اٹھا کر اپنے سر اور چہرے پر ملتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ یہ میرے پیر و مرشد کے قدموں کا غبار ہے جو سرہنگا کے لئے کہکشاں سے روشن تر ہے۔ خود حضرت بابا فریدؒ بھی سرہنگا کا بہت خیال رکھتے تھے اور ہر طرح اپنے دیوانے خادم کی ناز برداری کرتے تھے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے

کہ سرہنگا، حضرت بابا فریدؒ کا منہ چڑھا خادم تھا۔ اگر حضرت بابا فریدؒ کسی سے ناراض ہو جاتے تو سرہنگا ہی کو آپؒ کی خدمت میں بھیجا جاتا تھا یہاں تک کہ سرہنگا اس شخص کی سفارش کرتا اور حضرت بابا فریدؒ معاف فرما دیتے۔ آج وہی سرہنگا اس طرح دروازے پر کھڑا تھا کہ اس کے سر پر خاک تھی اور پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''سرہنگا! تم؟'' حضرت بابا فریدؒ نے اپنے اس دیوانے معتقد کو دیکھتے ہوئے حیرت سے فرمایا۔

''ہاں سرکار! یہ میں ہوں، آپ کا غلام سرہنگا'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھا اور حضرت بابا فریدؒ کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ''سرکار! میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ میں یہیں آپ کے قدموں میں تمام ہو جاؤں۔ اب مجھ سے یہ جدائی برداشت نہیں ہوتی۔''

''میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ پھر تمہیں یہ شکایت کیوں ہے؟'' حضرت بابا فریدؒ نے سرہنگا سے فرمایا۔

''یہ قربت تو مجھے اتفاق سے حاصل ہو گئی ہے۔'' سرہنگا مجذوب عرض کرنے لگا۔ ''ہانسی میں تو مجھ پر یہ پابندیاں نہیں تھیں۔ جب چاہتا تھا، خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو جاتا تھا...... مگر دہلی میں کسی نے اجازت نہیں دی کہ آپ کی قدم بوسی کر سکوں۔''

حضرت بابا فریدؒ نے سرہنگا کو اُٹھایا اور فرمانے لگے۔ ''تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔ یہ فاصلے بہت عارضی تھے جو عنقریب ختم ہو جائیں گے۔''

اس کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے نمازِ جمعہ ادا کی اور ہانسی جانے کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان کیا تھا، ایک برق تھی جو اہلِ دل کی ساعتوں پر گری۔ لوگوں نے بہت منت و ساجت کی کہ حضرت اس شہر کو ویران کر کے ہانسی تشریف نہ لے جائیں مگر حضرت بابا فریدؒ اپنے ارادے پر قائم رہے۔

آخر میں حضرت قطبؒ کے خاص خاص مریدوں اور خدمت گاروں نے عرض کیا۔ ''حضرت شیخؒ کی مسند کو اس طرح خالی چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔ جبکہ حضرت شیخؒ خود ہی فرما گئے ہیں کہ ان کا مقام آپؒ کا مقام ہے۔''

جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''میرے پیر و مرشد نے جو نعمت مجھے عطا کی ہے کہ وہ محدود نہیں ہے۔ شہر میں بھی وہی ہے، جنگل اور بیابان میں بھی وہی۔'' یہ کہہ کر آپؒ سرہنگا مجذوب کے ساتھ ہانسی روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت بابا فریدؒ وقفے وقفے سے ایک دو دن کے لئے دہلی تشریف لاتے، پیر و مرشد کی قبر پر حاضری دیتے، صوفیوں اور درویشوں سے مختصر ملاقاتیں کرتے

اور پھر واپس ہانسی چلے جاتے۔ بیشتر تذکرہ نویسوں نے سرہنگا مجذوب کی آمد اور فریاد و فغاں کو دہلی چھوڑنے کا سبب قرار دیا ہے لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ اگر سرہنگا مجذوب، حضرت بابا فریدؒ کی جدائی کے باعث بے قرار تھا تو دہلی میں رہ کر بھی اسے آپؒ کی قربت میسر آ سکتی تھی۔ اب رہی سرہنگا کی یہ شکایت کہ دہلی میں اسے لوگوں نے حضرت بابا فریدؒ تک پہنچنے نہیں دیا تو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے حضرت بابا فریدؒ کو بمشکل ایک ہفتہ گزرا تھا۔ لوگ دیدار کی غرض سے قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔ خلقت کا اس قدر ہجوم تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ اسی لئے سرہنگا شرفِ باریابی نہ پا سکا تھا۔

کچھ اہلِ نظر نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ نے سرہنگا کی شکایت کو غیب کی تنبیہہ سمجھا اور آپؒ کی دُور بین نظروں نے یہ اندازہ کر لیا کہ دہلی میں رہ کر عوام سے تعلق بھی کم ہو جائے گا اور دارالحکومت کا ماحول بھی سلسلۂ چشتیہ کی تبلیغ و ترویج میں حائل رہے گا۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ حضرت بابا فریدؒ کے اندیشے درست تھے۔ سلطان التمش کی وفات کے بعد ایک طویل عرصے تک دہلی کے حالات خراب رہے۔ التمش جیسے نیک سیرت حکمراں کا بیٹا سلطان رکن الدین فیروز شاہ انتہائی ناکارہ ثابت ہوا۔ عیش کوشی اس کی فطرت تھی۔ وہ دن رات شراب کے نشے میں غرق رہتا۔ سلطان قطب الدین ایبک اور التمش کے خزانوں کو طوائفوں اور میراثیوں پر لٹاتا رہتا۔ پھر ایک دن اس کی سفاک ماں ترکان شاہ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ سلطان رکن الدین فیروز شاہ پازیب کی جھنکار اور شراب کی بوتلوں میں قید ہو کر رہ گیا تھا اور ترکان شاہ التمش کی اولادوں، بیویوں اور نمک خواروں کا قتلِ عام کر رہی تھی۔

دوسری طرف علماء اور صوفیاء کا مزاج بھی بدل گیا۔ سیاست کی ایسی ہوا چلی کہ حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ، قاضی منہاج سراج، مولانا نور ترک، شیخ الاسلام سیّد قطب الدین اور دوسرے سینکڑوں بزرگ اپنے مرکز سے ہٹ گئے۔ خانقاہوں اور مدرسوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کا رخ سیاست کی طرف تھا۔ حضرت بابا فریدؒ کو علماء اور صوفیاء کے کردار نے شدید مایوس کیا۔ نتیجتاً آپؒ نے ہانسی کو گوشۂ عافیت سمجھا اور اسی شہر میں پوری یکسوئی کے ساتھ رشد و ہدایت کا کام جاری رکھا۔

15 رجب 634ھ کو حضرت بابا فریدؒ نے خاتون بیگم کے ساتھ عقدِ ثانی کیا۔ دوسری شادی کے کچھ دن بعد حضرت بابا فریدؒ، سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے اجمیر حاضر ہوئے اور آپؒ نے اعتکاف کیا۔ ''صندل مسجد'' کے عقب میں ایک زینہ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خام مزار کو جاتا ہے۔ حضرت بابا فریدؒ نے اسی جگہ اعتکاف (چلّہ) کیا تھا۔ وہ کھڑکی اب بند کر دی گئی ہے۔ 6 محرم الحرام کو اس زینے کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور بے شمار زائرین اس متبرک مقام کی زیارت کرتے ہیں جہاں خاندانِ چشتیہ کا یہ عظیم فرزند چلّہ کش ہوا تھا۔

دوسرے دن حضرت بابا فریدؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کے روضۂ مبارک پر ایک مخصوص نماز ادا کی تھی اور طویل سجود و قیام کئے تھے۔ اس کے بعد آپؒ جب تک اجمیر شریف میں قیام پذیر رہے، بار بار یہی خیال آتا تھا۔

''خدا جانے میرا کیا حشر ہو اور قیامت کے دن میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

حضرت بابا فریدؒ کو اس اضطراب میں کئی دن گزر گئے تھے کہ ایک رات جب آپؒ سوئے تو حضرت سلطان الہندؒ کو خواب میں دیکھا۔ خواجہ خواجگان فرما رہے تھے۔

''مولانا فرید! اتنے آزردہ کیوں ہوتے ہو؟ اس نماز کے پڑھنے والے کا شمار بخشے ہوئے انسانوں میں ہوتا ہے۔ انشاء اللہ تم بھی سرِ محشر رحمتِ باری سے محروم نہیں رہو گے۔''

اس خواب کے بعد حضرت بابا فریدؒ کو اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ بعض روایات میں درج ہے کہ حضرت سلطان الہندؒ کے مزار مبارک پر اعتکاف کرنے کے بعد حضرت بابا فریدؒ دولتِ روحانی سے مالا مال ہو گئے...... اور پھر جب واپسی میں دہلی تشریف لائے تو کیف و جذب کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ جس مسلمان پر نظر پڑ جاتی تھی اس کے دل سے دنیا داری کا غبار دُھل جاتا تھا......

لوگوں کا خیال تھا کہ اجمیر سے واپسی کے بعد حضرت بابا فریدؒ مستقل طور پر دہلی تشریف لے آئے ہیں۔ اس لئے مقامی عقیدت مندوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پورے شہر میں ایک جشن کا سا سماں تھا مگر کوئی بھی اس راز سے باخبر نہیں تھا کہ حضرت بابا فریدؒ اچانک دہلی کیوں تشریف لائے ہیں۔

پیر و مرشد کے انتقال کے بعد حضرت بابا فریدؒ ہانسی میں مقیم تھے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصال سے پہلے وصیت فرمائی تھی کہ آپؒ کی قبر کی سطح زمین کے برابر رکھی جائے۔ جب خدمت گاروں نے اس کا سبب پوچھا تو حضرت قطبؒ نے فرمایا۔ ''میرا مزار سطحِ زمین کے برابر رکھنا کہ شاید کسی بزرگ کا قدم میرے سینے پر پڑے اور میں برکت و سعادت حاصل کر سکوں۔''

حضرت بابا فریدؒ اجمیر سے واپسی پر دہلی اس لئے تشریف لائے تھے کہ پیر و مرشد کی

قبر مبارک کو کوئی ایسا نمایاں نشان دے دیں جسے دیکھ کر آنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آرام فرما ہیں۔ حضرت بابا فریدؒ بھی دوسرے مریدین کی طرح حکمِ شیخؒ سے مجبور تھے۔ اس لئے ذاتی طور پر قبر مبارک کی تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی ایک اُمید پر پیر و مرشد کے قدموں میں پڑے رہتے تھے۔

جب تمام زائرین اور عقیدت مند اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے یا تھک کر وہیں سو جاتے تو حضرت بابا فریدؒ اپنے پیر و مرشد کے پائین مزار بیٹھ کر رونے لگتے۔

''سیّدی! اب مجھ سے مزار مبارک کی یہ بے نشانی نہیں دیکھی جاتی۔ جن لوگوں نے آپ کے قدموں کا غبار اپنے چہروں پر ملا وہ بڑے نشان والے بن گئے...... اور جو خود صاحبِ نشان تھا وہ اس طرح زیر خاک سو گیا کہ قبر کی حدود کا بھی پتہ نہیں۔ بس اب اس غلام پر نظرِ کرم فرمایئے اور اجازت دیجئے کہ کم سے کم مرقد کو سطح زمین سے بلند کر دیا جائے۔''

یہ التجائے نیم شب اور گریہ و زاری کئی دن تک جاری رہی۔

بالآخر یہ گریہ و زاری رنگ لائی۔ ایک رات حضرت بابا فریدؒ سوئے تو آپؒ نے خواب میں حضرت قطبؒ کو دیکھا۔ پیر و مرشد فرما رہے تھے۔

''مولانا! تمہاری ضدوں نے مجبور کر دیا۔ اب تم نہیں مانتے تو کل عصر و مغرب کے درمیان میری قبر پر مٹی ڈال کر اس کی سطح زمین سے کچھ بلند کر دو۔''

حضرت بابا فریدؒ کی آنکھ کھلی تو چہرے پر اطمینان اور سرشاری کا ایسا رنگ تھا جیسے دولتِ کونین میسر آ گئی ہو۔ صبح سے عصر تک کا وقت بمشکل گزارا اور پھر عصر کی نماز ادا کرتے ہی حضرت بابا فریدؒ نے مٹی لا کر پیر و مرشد کی قبر پر ڈالنا شروع کر دی۔ تمام مرید اور خدمت گار حیران و پریشان تھے۔ سینکڑوں جاں نثاروں نے بیک زبان عرض کیا۔

''مخدوم! یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ غلاموں کو حکم دیں تو پہاڑوں کے سر تراش دیں۔''

''نہیں!'' حضرت بابا فریدؒ نے عجلت میں فرمایا۔ ''یہ میرا ہی کام ہے۔ مجھے باتوں میں نہ اُلجھاؤ۔ اگر وقت گزر گیا تو ساری التجائیں اور دعائیں رائیگاں جائیں گی۔''

حاضرین اس گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکے...... اور حضرت بابا فریدؒ اپنے گرد و پیش سے بے نیاز، مٹی لا لا کر پیر و مرشد کی قبر پر ڈالتے رہے۔ شام ہونے تک آپؒ کے کاندھے زخمی ہو گئے تھے اور پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ پھر بھی آپؒ نے اس کام میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے سوچا کہ کل کسی وقت مٹی کو

ہموار کر دیں گے۔ مگر اسی رات آپؒ نے پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ فرما رہے تھے۔

"مولانا! ہم نے تمہاری خاطر یہ نشان گوارہ کر لیا۔ بس اب قبر کو اسی طرح چھوڑ دو۔"

حضرت بابا فریدؒ نے حکم شیخ کے مطابق مٹی کو ناہموار رہنے دیا۔ بعد میں دیگر بزرگانِ چشت کے مشورے سے قبر مبارک پر ایک پختہ سائبان بنا دیا گیا تا کہ بارش سے یہ مٹی محفوظ رہ سکے۔

آٹھ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مزار مبارک نہ صرف کچا ہے بلکہ کھلا ہوا بھی ہے۔ زائرین دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت بابا فریدؒ نے جس طرح قبر مبارک کو ناہموار چھوڑ رکھا، وہی صورتِ حال آج بھی برقرار ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ سادگی کسی بزرگ کے مزار پر نظر نہیں آئے گی۔ بعد میں نواز خورشید جاہ حیدر آبادی نے قبر کے چاروں طرف سنگِ مرمر کا جالی دار کٹہرا تعمیر کرا دیا تھا جسے 1947ء کے فسادات میں شر پسند ہندوؤں نے توڑ دیا تھا۔ جب ہلاکت و بربادی کا یہ طوفان تھما تو جدید ہندوستان کے سیاسی دیوتا مہاتما گاندھی نے اظہارِ عقیدت کے طور پر اس جنگلے کو دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ ایک پتھر پر گاندھی جی کا نام بھی کندہ ہے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ 635ھ میں ہانسی سے اجودھن تشریف لے گئے۔ اکثر تذکرہ نگاروں کا خیال تھا کہ ہانسی میں خلق خدا کا ہجوم رہنے لگا تھا اس لئے بابا فریدؒ گوشۂ تنہائی کی تلاش میں اجودھن چلے گئے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ہانسی اور اس کے قریبی علاقوں میں رشد و ہدایت کا کام مکمل ہو چکا تھا اس لئے حضرت بابا فریدؒ نے اس علاقے کا انتخاب کیا جہاں کفر و ظلمت کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے یا اسلام کی روشنی برائے نام پہنچی تھی۔ اجودھن روانہ ہونے سے پہلے حضرت بابا فریدؒ نے اپنے محبوب ترین مرید شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو خلافت دی۔

جب حضرت بابا فریدؒ نے ہانسی کو خیر باد کہا تو اس سفر میں دو بیویاں نجیب النساء اور خاتون بیگم...... کم سن بچے...... حقیقی چھوٹے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ...... بھانجے حضرت علی احمد صابر کلیریؒ...... سرہنگا مجذوب اور چند عقیدت مند آپؒ کے ہمراہ تھے۔ عارفوں کا یہ مختصر سا قافلہ بظاہر بڑی بے سرو سامانی کے عالم میں ہانسی سے نکلا تھا۔ مگر ان کا سالارِ جماعت صابرین کا سرخیل تھا۔ اس لئے ہر مسافر کا دل غنی تھا اور آنکھ

مادی اسباب سے بے نیاز۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

برصغیر پاک و ہند کے بیشتر صوفیاء میں اجودھن کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب حضرت بابا فریدؒ نے ادھر کا رخ کیا تو یہ علاقہ اہلِ ہنود سے بھرا ہوا تھا اور ہندوستان کے نقشے میں کفرستان کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی لئے حضرت بابا فریدؒ نے تبلیغ و ہدایت کی غرض سے اجودھن کو اپنا مرکز قرار دیا۔ آج یہی جگہ "پاک پتن" کے نام سے مشہور ہے۔

472ھ سے 635ھ تک یہ علاقہ مسلسل تاجدارانِ دہلی کے تصرف میں رہا۔ اس طرح تاریخی حوالوں کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کی ہانسی سے روانگی کے وقت یہ علاقہ کفرستان کا درجہ رکھتا تھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کے باوجود یہاں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

الغرض عارفوں کا یہ مختصر سا قافلہ جب اجودھن پہنچا تو حضرت بابا فریدؒ نے آبادی سے دور مغرب کی جانب سایہ دار درختوں کے نیچے قیام فرمایا۔ یہاں قریب ہی ایک ویران سی مسجد تھی جس میں کبھی کبھی ایک خدا کے نام لیوا سجدۂ بندگی ادا کیا کرتے تھے۔ اس قافلے کے سامانِ رسد کا یہ حال تھا کہ ہانسی سے جس قدر اشیائے خوردنی لے کر چلے تھے وہ سب کی سب اجودھن پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئی تھیں۔ اگر کچھ غذا بچ گئی تھی تو اسے بچوں کے لئے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ قافلے کے باقی افراد نے درخت کے پتوں کو اپنی غذا بنا لیا۔ کچھ فاصلے پر جنگلی پھل بھی موجود تھے مگر سالارِ قافلہ کا حکم تھا کہ جب حق کے راستے میں خیمہ زن ہو گئے تو پھر یہ اضطراب کیا اور ضروریاتِ شکم سے مجبور ہو کر یہ جستجو کیسی؟

خدا خود میر سامان است اربابِ توکل را

(جو خدا پر بھروسہ کرتے ہیں، خدا ان کے لئے خود ہی میر سامان بن جاتا ہے)

گزرنے والے ادھر سے گزرتے اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ یہ اجنبی کیسے عجیب لوگ ہیں؟ نہ ان کے یہاں چولہوں سے دھواں اُٹھتا ہے...... نہ ان کے دستِ طلب کسی کے سامنے دراز ہوتے ہیں...... نہ ان کے چہروں پر ملال و افسردگی کا رنگ نمایاں ہوتا ہے اور نہ ان کی آنکھوں میں بھوک اور طلب کا کوئی ہلکا سا عکس اُبھرتا ہے۔

دیکھنے والے دیکھتے کہ فقراء کی یہ جماعت دنیا کی ہر ضرورت سے بے نیاز ہو کر تلاوت قرآن حکیم میں مشغول رہتی ہے، نماز پڑھتی ہے اور پھر جو وقت سجدۂ شکر ادا کرنے سے بچ جاتا ہے اس میں اپنے بوسیدہ لباسوں کو پیوندوں سے سجاتی ہے۔

آخر یہ گراں وقت گزر گیا اور خدا نے چند اہلِ ثروت کو اس طرف متوجہ کیا۔ اجودھن کے صاحب حیثیت افراد حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔

''اگر ہماری یہ حقیر نذر قبول کر لی جائے تو ہم اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھیں گے۔''

آخر اہلِ ثروت کی بہت منت و سماجت کے بعد حضرت بابا فریدؒ صرف اتنی نذر قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے جو درویشوں کو زندہ رکھ سکے........اگرچہ اللہ نے غیب سے رزق کے دروازے کھول دیئے تھے لیکن خود حضرت بابا فریدؒ کا یہ حال تھا کہ اُبلی ہوئی ترکاریاں استعمال کرتے تھے جن میں نمک تک نہیں ہوتا تھا۔ اس واقعے کے بعد اجودھن کے عام لوگ بھی حضرت بابا فریدؒ کی موجودگی کو محسوس کرنے لگے تھے اور انہیں اس بات پر اعتبار آ گیا تھا کہ یہ وہ خرقہ پوش نہیں ہیں جو درویشی کے پردے میں دنیا کمانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ نتیجتاً اجودھن کے باشندے آہستہ آہستہ مرکزِ چشتیہ کے گرد جمع ہونے لگے۔

ایک دن حضرت بابا فریدؒ درخت کے نیچے اپنے ساتھیوں اور مریدوں سے محوِ گفتگو تھے کہ ایک ہندو عورت اپنے سر پر دودھ کا برتن رکھے ہوئے ادھر آ نکلی۔ حضرت بابا فریدؒ نے رسمِ درویشی کے مطابق اس بت پرست عورت کی خیر و عافیت دریافت کی۔ ہندوؤں کی نظر میں وہ ایک نیچ ذات سے تعلق رکھنے والی عورت تھی اس لئے کوئی شخص بھی اس سے انسانی لہجے میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔ آج جب اس نے ایک دوسرے مذہب کے ماننے والے بزرگ شخص کی طرف سے برابری کا سلوک دیکھا تو اپنی حالتِ زار بیان کرنے لگی۔

''میرا تعلق اجودھن میں بسنے والے ''گوالوں'' کے خاندان سے ہے۔ باپ دادا دودھ فروخت کر کے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے۔ میرا شوہر مر چکا ہے اور میں برسوں سے دودھ فروخت کر کے اپنے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں۔ پہلے زندگی پُرسکون تھی مگر کچھ دنوں سے ایک عجیب و غریب مصیبت کا شکار ہوں۔'' یہ کہہ کر گوالن اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے وہ کسی سے خوف زدہ ہو۔

حضرت بابا فریدؒ نے عورت کی ذہنی کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم بے خوف و خطر اپنے دل کی بات کہہ ڈالو۔ ہم لوگ مسلمان ہوتے ہوئے بھی تمہارے غم گسار ہیں۔ ہمارا مذہب دنیا کے ہر مظلوم کی حمایت کرتا ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ کی شفقت و محبت کا مظاہرہ دیکھ کر ہندو عورت نے وہ راز کہہ ڈالا

جسے بیان کرتے ہوئے اس کی زبان کانپ رہی تھی۔

''کچھ دن سے ایسا ہو رہا ہے کہ یہاں کے چند جوگی اور جادوگر مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ وہ روزانہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سارا دودھ انہیں دے دیا جائے۔ کچھ دن تک تو میں نے ایسا ہی کیا مگر جب ان سے دودھ کی قیمت طلب کی تو جوگیوں نے بڑی بے رحمی سے جواب دیا کہ وہ لوگ جو چیز خریدتے ہیں اس کی قیمت ادا نہیں کرتے۔ میں نے آئندہ دودھ دینے سے انکار کیا تو وہ لوگ شراپ (بددُعا) دینے لگے۔

''اگر تُو ہمیں دودھ نہیں دے گی تو تیرا دودھ اس قابل نہیں رہے گا کہ کوئی دوسرا خرید سکے۔''

میں نے جادوگروں کی اس دھمکی کو کوئی اہمیت نہیں دی اور واپس چلی آئی۔ پھر جب دوسرے دن دودھ فروخت کرنے گاؤں پہنچی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ دودھ کے تمام برتن کیڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اتفاق سمجھا مگر دوسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ مجبور ہو کر میں دوبارہ ان جوگیوں کے پاس گئی اور ان سے رو رو کر التجا کی کہ نصف دودھ وہ لے لیں اور باقی میرے بچوں کے لئے چھوڑ دیں۔ مگر ان ظالموں پر میری گریہ و زاری کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر ایک دن ان جادوگروں کے چیلے میرے گھر آئے اور بڑے سفاکانہ انداز میں کہنے لگے۔

''گرو کا حکم ہے کہ اگر تُو ہمیں دودھ فراہم نہیں کرے گی تو پہلے تیرے سارے جانور مر جائیں گے۔ پھر ہم تیرے بچوں کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنائیں گے۔ تُو جن بچوں کی خاطر دربدر بھٹکتی ہے وہ کچھ دن بعد اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔''

آخر بچوں کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں کئی ماہ سے ان ظالموں کو دودھ فراہم کر رہی ہوں اور گاؤں والوں سے قرض لے کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ آخر گاؤں والے بھی کہاں تک قرض دیں گے؟''

یہ کہہ کر دودھ فروش عورت اپنے دامن سے آنسو خشک کرنے لگی۔

حضرت بابا فریدؒ نے ایک مظلوم عورت کے دکھوں کی داستان سن کر فرمایا۔ ''صبر کرو! تمہاری مصیبت کے یہ دن گزرنے ہی والے ہیں۔''

اچانک دودھ فروش عورت گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''خیر! میری تو جس طرح گزرے گزر جائے گی مگر تم لوگ بہت شریف ہو۔ آج تمہیں ان درختوں کے نیچے دیکھا تو چلی آئی۔ میری طرح تم لوگ بھی غریب ہو۔ میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی کہ کہیں وہ ظالم جادوگر ادھر کا رخ نہ کریں اور پھر تم ان کی جفا

کاریوں کا نشانہ بن جاؤ۔"

عورت کی سادہ دلی قابلِ دید تھی۔ وہ اپنی پریشانیوں کو بھول کر درویشوں کو جادوگروں کے ممکنہ اقدام سے بچانے آئی تھی۔ حضرت بابا فریدؒ اس دودھ فروش عورت کے خلوص سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور فرمانے لگے۔

"تم ایک سادہ دل عورت ہو۔ ہم فقیرانِ بے نوا تمہارے اس خلوص کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ویسے تم بھی یاد رکھو کہ جب تک اللہ کی طرف سے کوئی مصیبت انسان کا مقدر نہ بن جائے، اس وقت تک دنیا کی کوئی طاقت اسے ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر تم جوگیوں اور جادوگروں کے بجائے اپنے دل میں خدا کا خوف پیدا کرلو تو تم خود بھی محفوظ رہو گی، تمہارے بچے بھی اور تمہارے جانور بھی۔"

"تم بھگوان کی بات کر رہے ہو؟" دودھ فروش عورت نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "میں تو اسے روز ہی یاد کرتی ہوں مگر میرے دُکھوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔"

"تم جس بھگوان کی پوجا کرتی ہو، وہ تو خود پتھر کا ایک بے جان مجسمہ ہے۔ جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرسکتا وہ کسی انسان کے کیا کام آئے گا؟ میں جس خدا کی بات کر رہا ہوں وہ اپنی ذات میں تنہا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں .... اور اس قدر قدرت والا ہے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کے فیصلے کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ تم اسی خدا کو پکارو۔ وہ تمہیں ان دو چار شر پسند جوگیوں سے نہیں، دنیا بھر کے ستم گروں سے نجات دیدے گا۔"

ابھی حضرت بابا فریدؒ اس ہندو عورت سے یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ سامنے سے عجیب حلیے کے لوگ آتے ہوئے نظر آئے۔ جیسے ہی آنے والوں پر عورت کی نظر پڑی، وہ دہشت زدہ ہو کر حضرت بابا فریدؒ سے کہنے لگی۔

"یہ انہی جادوگروں کے چیلے ہیں۔ آج مجھے تمہارے پاس کچھ دیر ہو گئی تو یہ میری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے۔"

حضرت بابا فریدؒ نے عورت کو خوف زدہ دیکھ کر فرمایا۔

"تم میری مہمان ہو۔ اس لئے تمہیں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ان لوگوں کو جواب دے لوں گا۔"

جادوگروں کے چیلوں نے آتے ہی غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا اور قہرناک لہجے میں عورت سے کہنے لگے۔

"تُو یہاں آرام سے بیٹھی باتیں کر رہی ہے اور گرو جی دودھ کا انتظار کر رہے ہیں۔

آج تیری خیر نہیں۔"

"اسے میں نے روک لیا تھا۔" حضرت بابا فریدؒ نے جوگیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم بھی بیٹھو۔"

ابھی فضا میں ایک مردِ خدا کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ جوگیوں پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ اس طرح زمین پر بیٹھ گئے جیسے کسی غیبی ہاتھ نے انہیں زنجیریں پہنا دی ہوں۔

کچھ دیر بعد جوگیوں کی دوسری ٹولی آئی۔ حضرت بابا فریدؒ نے ان سے بھی وہی فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ!" اور وہ بھی سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ الغرض گرو نے اپنے تمام چیلوں کو بھیجا اور وہ سب کے سب اس طرح بابا فریدؒ کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئے جیسے انہیں کسی طاقت ور مقناطیس نے جکڑ لیا ہو۔

آخر میں جوگیوں کا گرو اپنے چیلوں کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا۔ "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟" گرو نے غضب ناک ہو کر اپنے شاگردوں کی طرف دیکھا۔

"انہیں میں نے قید کر لیا ہے۔ اب یہ کہیں نہیں جا سکتے۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

"کون ہے اس دنیا میں جو میرے چیلوں کو قید کر سکے؟" گرو نے انتہائی غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور پھر بلند آواز میں اپنے منتر پڑھنے لگا۔

"اب تیرا کوئی منتر نہیں چلے گا۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "کفر کے دن پورے ہو چکے۔"

گرو پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ چیخ چیخ کر منتر پڑھنے لگا .... بدی کی تمام طاقتوں کو پکارتا رہا .... مگر آج کوئی اس کا مددگار نہیں تھا۔ آخر گرو نے حضرت بابا فریدؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اپنے چیلوں کی رہائی کے لئے التجا کرنے لگا۔

"تیرے شاگردوں کو صرف ایک شرط پر رہائی مل سکتی ہے کہ تُو انہیں لے کر یہاں سے دور چلا جا۔" حضرت بابا فریدؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ "اگر آئندہ تُو نے مخلوقِ خدا کو تنگ کیا تو پھر تجھ پر خدا کی زمین تنگ ہو جائے گی۔"

گرو بہت دیر تک حضرت بابا فریدؒ سے معافی مانگتا رہا اور پھر اپنے چیلوں کو لے کر اجودھن کی حدود سے نکل گیا۔

گرو کے جانے کے بعد حضرت بابا فریدؒ اس کی جگہ پر اقامت گزیں ہو گئے اور پورا قصبہ آپؒ کی اس کرامت کے شور سے گونجنے لگا۔ نتیجتاً سینکڑوں بت پرست حلقۂ اسلام

میں داخل ہو گئے۔ اجودھن میں یہ آپؒ کی پہلی روحانی فتح تھی۔

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

اس واقعے کی شہرت ہوئی تو اجودھن اور گرد و پیش کے ضرورت مند حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ آپؒ محتاجوں کے لئے دعا کرتے، اللہ اُن کی محتاجگی دُور کر دیتا۔ بیمار شفایاب ہوتے اور پریشاں حال لوگوں کو آسودگی حاصل ہو جاتی۔ ایک دن ایک غریب بوڑھی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور رو رو کر عرض کرنے لگی۔

''میں بیوہ ہوں اور میری تین جوان بیٹیاں ہیں۔ آپؒ دعا فرما دیں کہ ان کی شادی کا بندوبست ہو جائے۔''

بوڑھی عورت کا سوال سن کر حضرت بابا فریدؒ نے اپنے خادم سے فرمایا۔ ''آج جس قدر نذریں آئی ہوں وہ ان خاتون کے حوالے کر دو۔''

خادم نے شرم سار ہو کر سر جھکا لیا۔

''سیدی! آج تو کوئی بھی نذر لے کر حاضر نہیں ہوا۔''

حضرت بابا فریدؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ اس دوران بوڑھی عورت گریہ و زاری کرنے لگی۔

''میں نے تو آپ کی سخاوت کے بڑے چرچے سنے تھے۔ اب میں کہاں جاؤں؟ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔''

''سہارا تو اللہ کا ہوتا ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے عورت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ''اس فقیر کو بھی اسی کا سہارا ہے۔''

عورت اپنی ضرورتوں کی اسیر تھی۔ اس لئے حضرت بابا فریدؒ کی مجبوریوں کو نہ سمجھ سکی اور ایک ہی ضد کرتی رہی کہ اس کی بیٹیوں کی شادی کا انتظام ہو جائے۔

آخر بابا فریدؒ نے مجبور ہو کر فرمایا۔ ''بی بی! مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھا لاؤ۔''

عورت نے حیران ہو کر حضرت بابا فریدؒ کی طرف دیکھا اور بادلِ ناخواستہ خانقاہ سے باہر جا کر مٹی کا ڈھیلا اُٹھا لائی۔

حضرت بابا فریدؒ نے با آواز بلند تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی اور مٹی کے ڈھیلے پر دم کر دیا۔ اہل مجلس حیران رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا وہ حقیر ٹکڑا سونے کی ڈلی میں تبدیل ہو گیا۔

''تمہاری بیٹیوں کی شادی کے لئے یہ کافی رہے گا؟'' حضرت بابا فریدؒ نے سونے کا ٹکڑا عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

''ہاں! یہ بہت ہے۔'' عورت نے گھبرا کر سونے کا ٹکڑا لے لیا اور یہ کہتی ہوئی خانقاہ سے چلی گئی۔ ''خدا تمہارا بھلا کرے۔ میری مشکل آسان ہو گئی۔''

گھر پہنچ کر عورت کی نیت بدل گئی۔ سونا بنانے کا نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ حریص عورت نے غسل کیا۔ صاف کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔ پھر بڑے بڑے پتھر سامنے رکھ کر سورۂ اخلاص کا وِرد کرنے لگی۔ حضرت بابا فریدؒ نے سورۂ اخلاص صرف تین مرتبہ پڑھی تھی مگر اس عورت نے اپنے عمل میں شدت پیدا کرنے کے لئے تین سو بار پڑھی اور پتھروں پر دم کر دیا۔ عورت کا خیال تھا کہ یہ سارے پتھر آن کی آن میں سونے کا ڈھیر بن جائیں گے...... مگر بار بار دم کرنے کے باوجود پتھروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وہ حریص عورت تین دن تک مسلسل یہی عمل کرتی رہی اور پتھروں پر پھونکتی رہی۔ پھر جب وہ پتھر سونے میں تبدیل نہ ہو سکے تو مجبوراً حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگی۔

''آپ نے غسل کیا اور نہ خوشبو لگائی۔ بس تین بار سورۂ اخلاص پڑھی اور مٹی سونا بن گئی۔ میں نے پورے گھر کو خوشبوؤں سے مہکا دیا۔ کلامِ الٰہی کا وِرد کرتے کرتے اپنی زبان گھس ڈالی مگر پتھر، پتھر ہی رہے۔ آخر کیوں؟''

بوڑھی عورت کی بات سن کر حضرت بابا فریدؒ مسکرا دیئے۔ ''اللہ نے تمہاری بیٹیوں کی شادی کا بندوبست کر دیا۔ اس کا شکر ادا کرو اور اپنے ذہن کو دوسرے معاملات میں نہ اُلجھاؤ۔''

نادان عورت پر بابا فریدؒ کی اس نصیحت کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ ایک ہی ضد کرتی رہی۔ ''آخر میرے عمل میں کیا کمی رہ گئی کہ پتھر سونا نہ بن سکے۔''

''تیرے عمل میں کوئی کمی نہیں رہ گئی تھی۔'' حضرت بابا فریدؒ نے پُر سوز لہجے میں فرمایا۔ ''غسل کا اہتمام تھا...... خوشبو کی کثرت تھی...... محنت و ریاضت تھی...... غرض تیرے پاس سب کچھ تھا۔ بس تیرے منہ میں فرید کی زبان نہیں تھی۔''

یہ کہتے کہتے حضرت بابا فریدؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ اظہارِ تشکر کے آنسو تھے کہ ربِ عز و جلال نے اپنے ایک بندے کی زبان میں کیمیائی تاثیر پیدا کر دی تھی۔

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

حضرت بابا فریدؒ کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے سینوں میں تمناؤں اور مرادوں کا ہجوم لئے دور دراز کے لوگ بھی اجودھن کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ دہلی میں ایک آسودہ حال شخص تھا جس کی زندگی لہو و لعب میں گزر رہی تھی۔ آخر ایک دن

ہدایت غیبی ملی اور اس نے اجودھن کا رُخ کیا تا کہ حضرت بابا فریدؒ کے دستِ حق پرست پر توبہ کرے۔ راستے میں اتفاق سے ایک خوب صورت گانے والی اس کے ساتھ ہو گئی۔ کچھ دور تک تو حالات پُرسکون رہے مگر مطربہ کی نیت میں خرابی تھی۔ اس نے ناز و ادا کے مظاہرے شروع کر دیئے۔ وہ چاہتی تھی کہ دہلی کا یہ مالدار شخص اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مطربہ بڑے بے تکلفانہ قہقہے لگا رہی تھی لیکن اجودھن جانے والا مرد اس فاحشہ کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں ہوا۔ آخر دورانِ سفر ایک مقام ایسا آ گیا کہ دونوں کو ایک ہی بیل گاڑی میں سوار ہونا پڑا۔ مطربہ اتنے قریب آ گئی کہ مرد کے لئے دامن بچانا مشکل ہو گیا۔ گانے والی برابر چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ آخر مرد بھی اس کی طرف راغب ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مطربہ کی شرارتوں کا جواب دیتا، اچانک ایک دراز قامت شخص سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔

”گاڑی روکو!“ اجنبی شخص نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

گاڑی بان نے گاڑی روک لی۔ اجنبی شخص قریب آیا اور مرد کے منہ پر زوردار طمانچہ مارتے ہوئے بولا۔ ”افسوس ہے کہ تُو اتنے بڑے بزرگ کے پاس توبہ کی نیت سے جا رہا ہے اور تیری یہ حرکتیں ہیں؟“ یہ کہہ کر وہ اجنبی غائب ہو گیا۔

مرد نے اس فاحشہ کو گاڑی سے اُتار دیا اور تنہا اجودھن کی طرف روانہ ہو گیا۔

پھر جب وہ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو سب سے پہلے آپؒ نے یہی فرمایا۔ ”اُس روز اللہ تعالیٰ نے تمہاری حفاظت کی۔“

یہ سنتے ہی اس شخص نے حضرت بابا فریدؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ”یہ سب شیخ کی توجہ کا صدقہ ہے۔“

۞ ...... ۞ ۞ ...... ۞

حضرت بابا فریدؒ کی محبتوں کا دروازہ ہر خاص و عام کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ آپؒ کی بخشش و عطا کے بڑے عجیب انداز تھے۔ ملتان کا ایک زمیندار حضرت بابا فریدؒ سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا۔ مولانا عارف اسی شہر کی ایک مسجد میں امامت کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے انہیں اجودھن میں کوئی کام تھا۔ جب وہ سفر پر روانہ ہونے لگے تو زمیندار نے انہیں دو سو سفید تنکے (چاندی کے سکے) دیتے ہوئے کہا۔

”جب آپ اجودھن پہنچیں تو حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں یہ حقیر نذر پیش کر دینا اور عرض کرنا کہ یہ گناہ گار دعاؤں کا طالب ہے۔“

جب مولانا عارف اجودھن پہنچے تو شیطانی فریب میں مبتلا ہو گئے۔ خیال آیا کہ

زمیندار نے کوئی تحریر تو دی نہیں ہے پھر بابا فریدؒ کو کیسے پتہ چلے گا کہ نذرانے کی رقم کتنی ہے؟ یہ سوچ کر مولانا عارف نے سو تنکے اپنے پاس رکھ لئے اور باقی حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

”مولانا! یہ کیا ہے؟“ چاندی کے سکے دیکھ کر حضرت بابا فریدؒ نے پوچھا۔

”ملتان میں ایک زمیندار آپ کا عقیدت مند ہے۔ اسی نے یہ رقم بطور نذر بھیجی ہے اور دعا کی درخواست کی ہے۔“

مولانا عارف کی بات سن کر حضرت بابا فریدؒ مسکرانے لگے۔ ”خدا اس زمیندار کا بھی بھلا کرے اور آپ کا بھی کہ آپ نے حق برادری ادا کر دیا۔“

مولانا عارف حضرت بابا فریدؒ کے اشارے کو سمجھنے سے قاصر رہے اور رسمی انداز میں کہنے لگے۔ ”میں ذاتی کام سے اجودھن آ رہا تھا اس لئے مجھے آپ کی خانقاہ تک پہنچنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔“

”مولانا! زحمت تو ہوئی کہ آپ نے نذرانے کی رقم کو آدھا آدھا کر لیا۔“ حضرت بابا فریدؒ بدستور مسکراتے رہے۔ ”حق برادری اسی کو کہتے ہیں۔“

اس انکشاف پر مولانا عارف شرم و ندامت کے پسینے میں نہا گئے۔ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر اپنے پیرہن کی جیب سے سو تنکے نکالے اور حضرت بابا فریدؒ کے سامنے رکھتے ہوئے عرض کرنے لگے۔

”شیخ! مولویوں کی ہمت اہلِ سلوک کی ہمت کے برابر نہیں ہے۔“

حضرت بابا فرید نے تمام رقم لوٹاتے ہوئے فرمایا۔ ”مولانا! یہ بھی تمہارا ہے تا کہ بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

مولانا عارف نے یہ کشف و سلوک دیکھا تو اپنا سارا سامان اور نقدی خانقاہ کے درویشوں میں تقسیم کر دی۔ پھر حضرت بابا فریدؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے۔

”شیخ! جب محبت کی نظر کی ہے تو اس دل کی کثافتیں بھی دھو ڈالیے۔“

پھر اہلِ دنیا نے دیکھا کہ سونکوں کی خیانت کرنے والا روحانی دولت سے مالا مال تھا۔ مولانا عارف کا شمار حضرت بابا فریدؒ کے خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپؒ پیر و مرشد کے حکم پر سیستان تشریف لے گئے تھے۔

حضرت بابا فریدؒ کی دعاؤں سے لاکھوں انسان فیض یاب ہو چکے تھے۔ کسی کی خاطر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تو اللہ کے کرم سے اس پر سیم و زر کی بارش ہو گئی، کسی پتھر پر اللہ کا کلام دم کر دیا تو سونا بن گیا۔ مگر خود حضرت بابا فریدؒ کی زندگی بڑی عسرت میں گزر

رہی تھی...... اور یہی حال ان درویشوں کا بھی تھا جو آپؒ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ مولانا بدر الدین اسحاق "لنگر خانے کے لئے لکڑیاں جمع کر کے لایا کرتے تھے۔ جنگل سے "دیلہ" کی ذمہ داری حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے سپرد کی گئی تھی۔ (دیلہ ایک قسم کا پھل ہے جس پر نمک اور سرکہ لگا کر اچار بنایا جاتا تھا اور اسے سالن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا) حضرت حسام الدین کابلیؒ پانی بھر کر لایا کرتے تھے اور وہی برتنوں کی صفائی بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ترکاری پکایا کرتے تھے...... یہ تھی اس مردِ جلیل کی معاشرتی زندگی جس کے بارے میں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا تھا۔

"قطب! اس شاہین کو زیرِ دام لائے ہو جس کا مقام (آشیانہ) آسمان کی انتہائی بلندیوں پر ہے۔"

حضرت بابا فریدؒ کثیر الاولاد تھے۔ تین بیویاں تھیں۔ سیّد قیام الحق کے انتقال کے بعد ان کی بہو سے حضرت بابا فریدؒ نے عقد کر لیا تھا تاکہ اس نیک خاتون کی کفالت ہو سکے۔" ہمشیرہ بی بی ہاجرہ اور ان کے صاحب زادے علی احمد صابر کلیریؒ بھی حضرت بابا فریدؒ کے ہی زیرِ کفالت تھے۔ ان حضرات کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد بھی اس درویش کی کٹیا میں آ پڑے تھے۔ وسائل ناپید تھے اور مسائل بے شمار۔ پھر بھی اتنے بڑے خاندان کا ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا ایک عجوبۂ روزگار کرامت ہے۔

ایک بار خاتون بیگم حاضر ہوئیں۔ ان کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

"بی بی! کیوں روتی ہو؟" حضرت بابا فریدؒ نے شریکِ حیات سے پوچھا۔

"بھوک کی شدت سے میرا بچہ قریب المرگ ہے۔" خاتون بیگم کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک پر ایک لمحے کے لئے عکسِ ملال اُبھرا، پھر فرمانے لگے۔ "یہاں سب بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ مرضیٔ مولا یہی ہے کہ اسے لے جا کر دفن کر دو۔"

خاتون بیگم سنبھل گئیں۔ "مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو صرف اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئی تھی۔"

"مجھے خبر ہے۔" حضرت بابا فریدؒ نے اہلِ صبر کے لہجے میں فرمایا۔ "میں بیماری کے متعلق جانتا ہوں مگر علاج میرے پاس نہیں ہے۔ مسیحا کے دروازے پر دامن پھیلاؤ۔ وہ چاہے گا تو اپنے بندوں کو شفا بخش دے گا۔"

حضرت بابا فریدؒ عام باپوں کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر باپ تھے مگر اولاد کی محبت میں آپؒ نے اپنی درویشانہ روش ترک نہیں کی۔ آپؒ کسی سے قرض لے کر بھی بچے کی بھوک مٹا سکتے تھے اور اپنی روحانی طاقت سے پتھر کے ٹکڑے کو بھی سونے میں تبدیل کر سکتے تھے۔ مگر آپؒ نے قرض کے لئے ہاتھ بھی نہیں پھیلایا اور روحانی طاقت کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ یہ صبر اور شکر کا اعلیٰ مقام ہے جس پر حضرت بابا فریدؒ اپنی روحانی عظمتوں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ بعد میں یہ گراں وقت بھی گزر گیا مگر آزمائش میں حضرت بابا فریدؒ ثابت قدم رہے اور ازواج و اولاد کو بھی صبر کی تلقین فرماتے رہے۔

اولاد کے سلسلے میں حضرت بابا فریدؒ پر اس سے بھی زیادہ مشکل وقت وہ تھا جب آپؒ کے گیارہ بارہ سالہ فرزند حضرت عبداللہؒ کو شہید کر دیا گیا۔ اجودھن کا حاکم حضرت بابا فریدؒ سے پرخاش رکھتا تھا اور اس پُرخاش کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اجودھن کے عوام حضرت بابا فریدؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ حاکم اجودھن کو یہ بات سخت ناگوار تھی۔ وہ حضرت بابا فریدؒ اور آپؒ کے متعلقین کو کسی نہ کسی بہانے اذیتیں پہنچاتا رہتا تھا۔ پھر ایک دن چند فسادیوں نے حضرت بابا فریدؒ کے نوعمر صاحب زادے حضرت عبداللہؒ کو قتل کر دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ حاکم اجودھن کے کہنے پر یہ قتل کیا گیا تھا اور اس اندوہ ناک واقعے پر حضرت بابا فریدؒ کا دل خون ہو گیا مگر آپؒ نے دنیا داروں کی طرح گریہ و زاری نہیں کی۔ بس خاموشی سے چند آنسو بہائے اور بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قبر میں اتار دیا۔

تدفین کے بعد اہالیانِ خاندان اور مریدین نے عرض کیا۔ "آپ حاکم اجودھن کے حق میں بددعا کر دیجئے کہ یہ سب اسی کی سازشوں کا نتیجہ ہے۔"

"میں نے تو اسے کوئی دکھ نہیں پہنچایا۔" حضرت بابا فریدؒ کے لہجے سے سوگواری جھلک رہی تھی۔

"وہ تو آپ کو مسلسل اذیتیں دے رہا ہے۔" اہالیانِ خاندان نے شکوہ کیا۔

"ایک انسان دوسرے انسان کو وہی کچھ تو دے سکتا ہے جو اس کے پاس ہے۔" حضرت بابا فریدؒ کا صبر قابلِ دید تھا۔ "میں بھی اسے وہی دے رہا ہوں جو میرے پاس ہے۔"

متعلقین نے بہت کوشش کی کہ حضرت بابا فریدؒ حاکم اجودھن کے لئے بددعا کر دیں مگر آپؒ یہی فرماتے رہے۔ "میں نے اپنے لئے صبر مانگا ہے۔ خدا مجھے صبر دیدے۔"

حضرت بابا فریدؒ مسلسل صبر کرتے رہے اور حاکم اجودھن آپؒ کو مسلسل اذیتیں پہنچاتا

رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ حضرت بابا فریدؒ اجودھن چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں یا دوسرے دنیادار علماء کی طرح اس کے دربار میں حاضری دیا کریں۔

حضرت بابا فریدؒ مردِ حق پرست تھے۔ ایک کے آگے جھکے تو ساری دنیا کی نفی کر دی۔ آپؒ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہؒ کی موت کا صدمہ برداشت کر لیا مگر حاکم اجودھن کی طرف دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا۔ آخر اس بدنہاد حاکم نے ایک عجیب چال چلی۔ اس نے ایک سوال نامہ ترتیب دیا اور اسے لے کر ملتان کے علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سوال نامہ یہ تھا۔

''ایک شخص خود کو عالم کہتا ہے، ہمیشہ مسجد میں رہتا ہے، وہاں گانا سنتا ہے اور رقص کرتا ہے۔''

اگرچہ حضرت بابا فریدؒ نہایت عالم و فاضل انسان تھے لیکن آپؒ نے کبھی خود کو عالم نہیں کہا۔ سماع سنتے تھے مگر اپنی خانقاہ میں۔ آپؒ نے کبھی عامیانہ انداز میں رقص نہیں کیا۔ کبھی کبھی وجد اور حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اسی کیفیت کو اس دروغ گو حاکم نے رقص کا نام دے دیا تھا۔

یہ سوال نامہ ترتیب کر کے حاکم اجودھن نے علمائے ملتان سے دریافت کیا تھا کہ ایسے شخص کے بارے میں اسلام کا کیا فیصلہ ہے؟

علماء نے سوال نامہ پڑھا اور حاکم اجودھن سے پوچھا۔ ''یہ کون شخص ہے جس سے اس قسم کی حرکات سرزد ہوتی ہیں؟ تم نے اپنے سوال نامے میں اس کا نام نہیں لکھا۔''

''وہ اجودھن میں رہنے والا ایک شخص فرید الدین مسعودؒ ہے۔'' حاکم کا لہجہ گستاخانہ تھا۔

''ادب سے ان کا نام لے۔'' ایک عالم نے حاکم اجودھن کو جھڑک دیا۔

''تُو جھوٹ بولتا ہے۔'' دوسرے عالم غضب ناک ہو گئے۔ ''اس تہمت طرازی پر خدا سے ڈر۔'' یہ کہہ کر ان عالم نے حاکم اجودھن کا ترتیب دیا ہوا سوال نامہ پھاڑ دیا۔

دراصل اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب علمائے ملتان حضرت بابا فریدؒ کے خلاف فتویٰ دے دیں گے تو وہ آسانی کے ساتھ انہیں اس علاقے سے بےدخل کر دے گا....... مگر یہ تدبیر کارگر نہ ہو سکی اور وہ ناکام و نامراد لوٹ آیا۔

پھر اس نے ایک اور ناپاک منصوبہ بنایا۔ حاکم اجودھن ایک ملنگ سے ملا اور اسے بڑی رقم کا لالچ دے کر حضرت بابا فریدؒ کے قتل پر آمادہ کر لیا۔

حضرت بابا فریدؒ کی عادت تھی کہ نماز کے بعد اپنا سر خاک پر رکھ دیتے تھے اور کئی گھنٹے

تک اسی حالت میں رہا کرتے تھے۔ اگر سردی کا موسم ہوتا تو ایک چادر آپؒ کے سر مبارک پر ڈال دی جاتی تھی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن پیر و مرشد سجدے کی حالت میں تھے اور میرے سوا وہاں کوئی دوسرا خدمت گار موجود نہیں تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک دراز قامت ملنگ وہاں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر چمڑے کا لباس تھا اور وہ دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں پہنے ہوئے تھا۔ مجھے اس شخص کی آمد سخت ناگوار گزری۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کچھ نہیں بولا کہ اگر میں بات کروں گا تو حضرت شیخ کی عبادت میں خلل پڑے گا۔ وہ ملنگ تیزی سے آگے بڑھا اور پیر و مرشد کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ پھر اس نے بہت زور سے آواز دی۔ ملنگ کی چیخ سن کر حضرت شیخ کے جذب کی کیفیت جاتی رہی لیکن آپؒ نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔

''کیا یہاں کوئی نہیں ہے؟'' پیر و مرشد نے اسی حالت میں فرمایا۔

''سیّدی! آپ کا غلام نظام الدین حاضر ہے۔'' میں نے عرض کیا۔

''تم اس ملنگ کو دیکھ رہے ہو جو میرے قریب کھڑا ہے؟'' حضرت شیخ نے فرمایا۔

''جی ہاں! غلام اس ملنگ کو دیکھ رہا ہے۔'' میں نے عرض کیا۔

''مولانا نظام الدین! اس کی بغل میں ننگی چھری موجود ہے اور وہ مجھے قتل کرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہے۔'' پیر و مرشد نے فرمایا۔

اس انکشاف نے مجھ پر لرزہ طاری کر دیا۔ میں نے گھبرا کر ملنگ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی خوف و دہشت سے زرد ہو رہا تھا۔

''مولانا نظام الدین! اس سے کہہ دو کہ وہ مجھے قتل تو نہیں کر سکتا۔ یہاں سے فوراً بھاگ جائے۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔''

ابھی حضرت بابا فریدؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ وہ ملنگ بھاگ کھڑا ہوا۔

پھر وہ ملنگ حاکم اجودھن کے پاس پہنچا اور اپنا خنجر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس فقیر کو قتل نہیں کر سکتا۔ شاید ساری دنیا کے قاتل مل کر بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

کچھ دن بعد وہ حاکم کسی معاملے میں ماخوذ ہو کر اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا۔ یہ خبر سن کر حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''دل آزاریوں کا انجام تو یہی ہوتا ہے مگر اللہ نے میری زبان کو آلودہ ہونے سے بچا لیا۔''

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اجودھن کا قاضی عبداللہ ایک جھگڑالو اور ضدی انسان تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کو ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ اس کی نظر میں کسی کی عزت نہیں تھی یہاں تک کہ وہ حضرت بابا فریدؒ کے بارے میں بھی گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اکثر لوگ حضرت بابا فریدؒ سے اس کی شکایت کیا کرتے تھے مگر آپؒ ہمیشہ یہی فرماتے۔ ''صبر کرو۔ شاید اللہ اسے ہدایت دیدے۔''

ایک بار حضرت بابا فریدؒ نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے اجودھن کی جامع مسجد گئے۔ مسجد کا امام بھی قاضی عبداللہ کا مقرر کردہ تھا۔ اسی امام نے نماز پڑھائی جس میں اس سے غلطی سرزد ہوگئی۔

نماز ختم ہوتے ہی حضرت بابا فریدؒ نے حاضرین مسجد کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''نماز فاسد ہوگئی۔ اس لئے دوبارہ پڑھی جائے۔''

امام اپنی غلطی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا مگر لوگوں کے اصرار پر اسے دوبارہ نماز کا اہتمام کرنا پڑا۔

قاضی عبداللہ جو پہلے ہی حضرت بابا فریدؒ سے پُرخاش رکھتا تھا، اس موقع پر خاموش نہ رہ سکا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

''خدا جانے یہ بے کار قسم کے لوگ کہاں کہاں سے آ کر اجودھن میں جمع ہو گئے ہیں۔'' قاضی عبداللہ کا اشارہ حضرت بابا فریدؒ کی طرف تھا۔

جاں نثاروں نے قاضی عبداللہ کی بات کا جواب دینا چاہا مگر حضرت بابا فریدؒ نے انہیں روک دیا اور خاموشی سے واپس تشریف لے آئے۔

خدمت گاروں نے محسوس کیا کہ چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار نمایاں ہیں۔ کسی مرید نے دریافت کیا تو فرمایا۔ ''اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرتا ہے اور وہ اسے برداشت کر لیتا ہے تو یہ ایک الگ بات ہے........ لیکن اگر مظلوم شخص ظالم کے ظلم کا جواب دینا چاہے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔''

جیسے ہی یہ الفاظ حضرت بابا فریدؒ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، قاضی عبداللہ پر فالج گرا اور اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا۔ پھر وہ اسی عالم میں شکر، آٹا اور ایک بکری لے کر حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''شیخ! مجھے معاف کر دیجئے۔'' قاضی عبداللہ نے حضرت بابا فریدؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور گڑگڑانے لگا۔

''قاضی! تم نے میرا کیا قصور کیا ہے جو اس طرح معافی مانگ رہے ہو؟'' حضرت

بابا فریدؒ نے عبداللہ سے دریافت کیا۔

''میں نے آپ کی شان میں بہت گستاخیاں کی ہیں۔'' قاضی عبداللہ نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

''تمہاری زبان ہے، جس طرح چاہو استعمال کرو۔'' حضرت بابا فریدؒ اسے ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے، میں اس وقت تک گھر نہیں جاؤں گا۔'' قاضی عبداللہ بدستور حضرت بابا فریدؒ کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔

''قاضی! تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ واپس چلے جاؤ۔'' اچانک حضرت بابا فریدؒ کا لہجہ بدل گیا۔

قاضی عبداللہ معافی کے لئے اصرار کرتا رہا۔

''اٹھارہ سال کی مدت میں جو کچھ لوگوں نے تمہارے بارے میں کہا ہے، میں اس پر صبر کرتا رہا ہوں۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''اب میں تمہارے متعلق قرآن حکیم سے فال نکال لیتا ہوں۔ جو کچھ فال میں نکلے گا، وہی اللہ کا حکم ہوگا۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے قرآن مجید کھولا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ سامنے تھا۔ جس آیت مقدسہ سے فال لی گئی وہ یہ تھی۔

''فرمایا اے نوحؑ! یہ تیری اولاد سے نہیں۔ اس کے عمل غیر صالح ہیں'' (ترجمہ)

''بس یہی حکم الٰہی ہے۔ فیصلہ ہو چکا۔'' حضرت بابا فریدؒ نے قرآن کریم بند کرتے ہوئے فرمایا۔

قاضی عبداللہ بہت رویا، بہت گڑگڑایا مگر حضرت بابا فریدؒ اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

قاضی عبداللہ ناکام و نامراد واپس لوٹا اور گھر پہنچتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ کا شمار ان بزرگانِ دین میں ہوتا ہے جنہیں اہل زمانہ کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑی ہیں۔ آزار پہنچانے والوں میں اپنے بھی تھے اور پرائے بھی۔ ایک خدا کے نام لیوا بھی تھے اور ان گنت دیوتاؤں کے پجاری بھی۔ بت پرستوں کی ایذا رسانی کا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ کی تبلیغ و ہدایت سے ان کے ''دھرم'' کو شدید خطرہ لاحق تھا اس لئے وہ اپنے عقائد اور رسم و رواج کے دفاع میں ہر قسم کے حربے استعمال کر رہے تھے........ مگر حاکم اجودھن تو مسلمان ہونے کا دعویدار تھا۔ پھر

وہ حضرت بابا فریدؒ کے درپے آزار کیوں تھا؟ دراصل یہ قدرت کا ایک راز ہے۔ اولیائے کرام اس لئے ستائے جاتے ہیں کہ ان کے درجات بلند ہوں اور قدرت انسانوں کے درمیان یہ محبت قائم کر سکے کہ اس پر ایمان لانے والے ہر حال میں راضی بہ رضا رہتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت بابا فریدؒ اچانک بیمار ہو گئے۔ سخت بے چینی لاحق ہوئی مگر ظاہری طور پر کسی بیماری کی علامت موجود نہیں تھی۔ پھر کئی دن اسی اضطراب میں گزر گئے۔ بھوک بالکل جاتی رہی۔ بمشکل چند گھونٹ پانی پی سکتے تھے۔ علاقے کے تمام قابل ذکر طبیبوں کو بلایا گیا۔ یہ لائق حکیم بہت دیر تک حضرت بابا فریدؒ کا معائنہ کرتے رہے۔ آخر تمام طبیبوں نے بیک زبان کہا۔

"شیخ! ہم نے آپ کی نبض بھی دیکھی اور قارورہ بھی۔ کسی بیماری کے آثار نظر نہیں آتے۔ ہمارے اپنے علم کے مطابق آپ کسی جسمانی مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر تمام حکیم چلے گئے۔

مریدین اور خدمت گار پیر و مرشد کی تکلیف کے خیال سے بہت پریشان تھے۔ دوسرے دن حضرت بابا فریدؒ کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپؒ نے اپنے تمام دوستوں اور مریدانِ خاص کو طلب کر کے فرمایا۔ "تم لوگ جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے میری صحت کے لئے دعا کرو۔"

حضرت بابا فریدؒ نے جن درویشوں سے دعا کی تھی درخواست کی ان میں آپؒ کے صاحبزادے شیخ بدر الدین سلیمانؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی شامل تھے۔ الغرض تمام مریدین اور خدمت گار دعا میں مشغول ہو گئے۔

اسی رات کو پچھلے پہر شیخ بدر الدین سلیمانؒ نے دیکھا کہ ایک بزرگ ان سے فرما رہے تھے۔

"تمہارے والد پر شہاب ساحر کے لڑکے نے جادو کر دیا ہے۔"

بابا فریدؒ کی آمد سے پہلے اجودھن میں شہاب نام کا ایک ساحر تھا جسے جادوگری کے فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ شہاب ساحر کے نام سے مقامی اور غیر مقامی لوگ بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ اس نے حصولِ دولت اور ذاتی دشمنی کے لئے بہت سے لوگوں کو تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ پھر وہ اسی حالت میں مر گیا۔ جب حضرت بابا فریدؒ اجودھن تشریف لائے تو مخلوقِ خدا کو آزار پہنچانے والا وہ جادوگر زیرِ خاک سو چکا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنا سارا ہنر اپنے بیٹے کو سکھا دیا تھا۔ اب بیٹے نے باپ کی جگہ لے لی تھی اور حضرت

بابا فریدؒ جیسے بزرگ بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں رہتے تھے۔ کسی تاریخی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شہاب ساحر نے لڑکے نے کس کے کہنے سے حضرت بابا فریدؒ پر جادو کیا تھا یا پھر اس قبیح اور ناپاک فعل میں اس کی ذاتی رنجش شامل تھی۔

"اگر میرے والد محترم پر جادو کیا گیا ہے تو اس کا رد کیا ہے؟" شیخ بدر الدین سلیمانؒ نے خواب میں نظر آنے والے بزرگ سے پوچھا۔

بزرگ نے چند کلمات پڑھے اور شیخ بدر الدین سلیمانؒ سے فرمایا۔ "ان کلمات کو اچھی طرح یاد کر لو اور پھر شہاب ساحر کی قبر پر جا کر پڑھو۔ انشاء اللہ سحر باطل ہو جائے گا۔"

شیخ بدر الدین سلیمانؒ نے بزرگ کے بتائے ہوئے کلمات حفظ کر لئے۔ وہ کلمات اس طرح تھے۔

"اے وہ شخص! جو قبر میں رکھ دیا گیا ہے اور آزما لیا گیا ہے، جان لے کہ درحقیقت تیرے لڑکے نے جادو کیا ہے اور تکلیف پہنچائی ہے لہٰذا اس سے کہہ دے کہ وہ باز آ جائے اور اس سحر کو ہم سے دور کر دے۔ اگر تُو نہیں کہے گا تو اس چیز سے قریب ہو جائے گا جو چیز ہمارے قریب ہے۔" (ترجمہ)

صبح ہوئی تو شیخ بدر الدین سلیمانؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دوسرے درویشوں سے رات کا خواب بیان کیا پھر کسی مرید نے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں اس خواب کی تفصیل پیش کی۔ حضرت بابا فریدؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو طلب کر کے فرمایا۔

"مولانا نظام الدین! ان کلمات کو اچھی طرح یاد کر لو اور حسب ہدایت شہاب ساحر کی قبر پر جا کر ان کلمات کو پڑھو۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ خانقاہ سے باہر آئے اور مقامی لوگوں سے شہاب ساحر کی قبر کے بارے میں پوچھا۔ وہ ایک بدنام شخص تھا۔ تمام لوگوں نے اس کی قبر کی نشاندہی کر دی۔ حضرت نظام الدین اولیاء قبرستان پہنچے اور شہاب ساحر کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر بزرگ کے بتائے ہوئے کلمات کا ورد کرنے لگے۔ اگرچہ شہاب ساحر کی قبر پختہ کر دی گئی تھی لیکن سرہانے پر کچھ مٹی پڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک کلمات کا ورد کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مٹی پر ہاتھ مارا۔ مٹی نرم تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے کریدا۔ آپؒ کو محسوس ہوا کہ اس مٹی کے نیچے ایک اور مٹی کی تہہ ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مٹی کو مزید کریدا۔ یہاں تک کہ آپؒ کا ہاتھ کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے باہر نکال لیا۔ وہ آٹے کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا

مجسمہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس پتلے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چاروں طرف سُوئیاں چبھی ہوئی تھیں اور گھوڑے کے بال مضبوطی سے باندھ دیئے گئے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ آٹے کے اس پتلے کو پیر و مرشد کے حضور لے گئے اور عرض کیا۔ "سیّدی! یہی ہے سارے فساد کی جڑ۔"

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مرید خاص کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "تمام سُوئیاں نکال لو اور سارے بال کھول ڈالو۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایک ایک سُوئی نکالتے رہے۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ حضرت بابا فریدؒ کو سکون محسوس ہو رہا تھا۔ پھر جب ساری سُوئیاں نکال دی گئیں اور بال کھول دیئے گئے تو چہرۂ مبارک سے بیماری کے سارے آثار غائب ہو گئے۔

پھر حضرت بابا فریدؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حکم دیا کہ اس مجسمے کو توڑ دو اور اس کے ساتھ تمام چیزیں دریا میں ڈال دو۔"

جب یہ بات حاکم اجودھن کو معلوم ہوئی تو اس نے شہاب ساحر کے لڑکے کو گرفتار کیا اور خود اسے لے کر حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"شیخ! آپ کا مجرم موجود ہے اور میری نظر میں یہ شخص واجب القتل ہے۔"

شہاب ساحر کا لڑکا موت کے خوف سے کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"شیخ کا حکم ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔" حاکم اجودھن نے دوبارہ عرض کیا۔

"ہرگز نہیں۔" حضرت بابا فریدؒ نے شہاب ساحر کے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "حق تعالیٰ نے مجھے صحت بخش دی اس لئے میں نے بھی اسے شکرانے کے طور پر معاف کر دیا۔ اب اسے کوئی کچھ نہ کہے۔"

دریا دلی کا یہ مظاہرہ دیکھا تو وہ جادوگر لڑکا حضرت بابا فریدؒ کے قدموں پر گر کر معافی مانگنے لگا اور ہمیشہ کے لئے اس کافرانہ فعل سے تائب ہو گیا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

خدمتِ خلق حضرت بابا فریدؒ کی زندگی کا مقصد عظیم تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آپؒ کا مشہور قول ہے کہ دشمنوں کو نیک مشورے سے شکست دو اور دوستوں کو تواضع سے اپنا گرویدہ بناؤ۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ اجودھن میں ایک منشی تھا جو حاکم کی ایذا رسانیوں کے سبب اپنی زندگی سے بیزار رہتا تھا۔ ایک بار وہ منشی حضرت بابا فریدؒ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور حاکم اجودھن کے مظالم کی داستان سنا کر عرض کرنے لگا۔

"شیخ! وہ مجھے ناحق ستاتا ہے۔ میں اس کے آگے ہاتھ جوڑتے جوڑتے تھک گیا مگر وہ باز نہیں آتا۔ میں اس سے جس قدر رحم کی بھیک مانگتا ہوں وہ اسی قدر ظلم میں اضافہ کر دیتا ہے۔ آپ اس سے میری سفارش کر دیجئے۔"

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے ایک خادم کو حاکم اجودھن کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔

"میں نہیں جانتا کہ اس شخص کا کیا معاملہ ہے مگر پھر بھی تم میری خاطر منشی پر رحم کرو۔"

حاکم اجودھن نے حضرت بابا فریدؒ کے خادم کی گفتگو سنی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دن بعد وہ منشی پھر حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور گریہ و زاری کرنے لگا۔

"شیخ! حاکم اجودھن پر آپ کی سفارش کا ذرّہ برابر بھی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مجھے پہلے سے زیادہ ستانے لگا ہے۔"

حضرت بابا فریدؒ نے منشی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "میں نے حاکم اجودھن سے تیری سفارش کی مگر اس نے نہیں سنی۔ ایسا لگتا ہے کہ کبھی کسی نے تجھ سے کسی مظلوم کی سفارش کی ہو گی اور تُو نے اپنے کان بند کر لئے ہوں گے۔"

منشی حیرت زدہ رہ گیا اور پھر یہ کہتا ہوا حضرت بابا فریدؒ کی بارگاہ سے اُٹھ گیا۔

"میرے لئے دعا فرمایئے۔ آج کے بعد سے کسی کو رنج نہیں پہنچاؤں گا اور جہاں تک ممکن ہو گا، مخلوقِ خدا کی خدمت کروں گا۔ خواہ وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ میں اس کی دلجوئی سے بھی منہ نہیں موڑوں گا۔"

دوسرے دن حاکم اجودھن نے منشی کو طلب کیا۔ منشی کو یقین تھا کہ اس ظالم نے ایذا رسانی کا کوئی نیا زاویہ تلاش کیا ہو گا مگر اس بار وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ بے باکی کے ساتھ حاکم اجودھن کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ستم گر خلافِ عادت مسکرا رہا تھا۔

"آؤ! میرے بھائی آؤ!" حاکم اجودھن نے ایک معمولی منشی کو اس طرح خوش آمدید کہا جیسے وہ اپنے کسی ہم مرتبہ امیر کا استقبال کر رہا ہو۔

منشی حیرت و پریشانی کے عالم میں حاکم اجودھن کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ!" ظالم کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

منشی حاکم اجودھن کے اس سلوک کو ظلم کی نئی چال سمجھ رہا تھا...... مگر جب حاکم کی طرف سے اصرار ہوا تو وہ ڈرتے ڈرتے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پہلے حاکم نے منشی کی مزاج پرسی کی، پھر آہستہ سے بولا۔ "تمہیں شیخ کے پاس جانے

کی کیا ضرورت تھی؟"

"شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے بغیر یہ بگڑا ہوا کام کس طرح بنتا؟" منشی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تم یہ تو سچ کہتے ہو کہ شیخ کی توجہ کے بغیر بات بنتی نہیں۔" حاکم اجودھن نے اعتراف کیا اور پھر منشی کو گھوڑے کے ساتھ ایک قیمتی خلعت پیش کرتے ہوئے بولا۔

"اب تم میری طرف سے اپنا دل صاف کرلو۔"

اس کے بعد حاکم اجودھن، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپؒ کے دستِ حق پرست پر توبہ کرلی۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اکبر حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی روایت ہے کہ اجودھن کے اطراف میں ایک گاؤں تھا، جہاں ایک مسلمان روغن گر (تیلی) رہتا تھا۔ سیاسی اغراض کے پیش نظر دیپال پور کے حاکم نے اس گاؤں کو تباہ کر دیا۔ مقامی باشندوں کے گھر جلا دیئے گئے اور ان کا مال ومتاع لوٹ لیا گیا۔ روغن گر کی بیوی نہایت حسین وجمیل عورت تھی۔ وہ اپنی شریکِ حیات سے بے اندازہ محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے اس پر کسی فسادی کی نظر پڑ گئی اور وہ عورت کو مالِ غنیمت سمجھ کر لے گیا۔ روغن گر نے بستی بستی اور کوچہ کوچہ بیوی کو تلاش کیا مگر ناکام رہا یہاں تک کہ بیوی کے غم میں اس کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ آخر گاؤں والوں نے رحم کھا کر اسے مشورہ دیا۔

"تیرے دُکھ کا علاج بس ایک شخص کے پاس ہے۔"

"مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔" روغن گر زار و قطار رونے لگا۔ "میں اس کے پیروں پر سر رکھ دوں گا اور اس سے اپنے کھوئے ہوئے صبر وقرار کی بھیک مانگوں گا۔"

"تُو بابا کے پاس چلا جا۔ وہی تیرے درد کی دوا دے سکتے ہیں۔" گاؤں والوں نے حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

روغن گر اس حالت میں حضرت بابا فریدؒ کے حضور پہنچا کہ اس کی آنکھیں ویران تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ خانقاہ کے خادموں نے اسے پاگل ہی سمجھا مگر حضرت بابا فریدؒ کا حکم تھا کہ جو شخص زیادہ پریشان نظر آئے اسے زیادہ اہمیت دی جائے۔ نتیجتاً اسے فوراً ہی حضرت شیخؒ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

حضرت بابا فریدؒ کا اصول تھا کہ جب بھی کوئی پریشان حال شخص آتا، آپؒ سب سے پہلے اس کے لئے کھانا منگواتے۔ روغن گر کی حاضری کے وقت بھی ایسا ہی کیا گیا۔ خادم

نے آپؒ کے سامنے کھانا لا کر رکھا تو وہ نہایت شکستہ لہجے میں کہنے لگا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ زمانہ ہوا کہ میں نے کھانا چھوڑ دیا ہے۔" روغن گر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

حضرت بابا فریدؒ کو اس کی شدتِ غم کا احساس ہوا تو آپؒ نے فرمایا۔ "تُو اس حالت تک کس طرح پہنچا؟"

روغن گر نے اپنی بیوی کے بچھڑنے کا پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "اس کے بغیر یہ زندگی ایک عذاب ہے۔ اگر آپ کے پاس بھی میرے غموں کا علاج نہیں ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"تم کھانا تو کھاؤ۔" حضرت بابا فریدؒ نے اس کا حالِ زار سن کر فرمایا۔ "عجب نہیں کہ حق تعالیٰ تمہاری ساری پریشانیاں دور فرما دیں۔"

روغن گر نے حضرت بابا فریدؒ کے اصرار پر دو چار لقمے حلق سے اُتارے مگر اس طرح کہ جیسے وہ کانٹے نگل رہا ہو۔ کھانے کے بعد اس نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟"

"صبر کرو!" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

"بابا! اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔" روغن گر، حضرت شیخؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔

"صبر تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔" حضرت بابا فریدؒ نے اسے تسلی دی۔ "کچھ دن تک میرے پاس رہو۔"

روغن گر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجبوراً خانقاہ کے ایک گوشے میں جا پڑا مگر اس طرح کہ ہر گھنٹے کے بعد حضرت بابا فریدؒ کے پاس آتا اور فریاد کرتا کہ ابھی تک اس کی بیوی نہیں ملی۔

حضرت بابا فریدؒ ہر بار خندہ پیشانی کے ساتھ اس وارفتۂ شوق کو تسلی دیتے اور پھر اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرماتے۔ "تم لوگ دیکھ رہے ہو کہ عشق کی آگ کس انداز سے بھڑک رہی ہے۔ بے چارے کی روح تک جلی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ دنیا کے عشق میں مبتلا ہے لیکن اس کا عشق سچا ہے۔"

آخر اسی کشمکش میں دو دن گزر گئے۔ روغن گر کی مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ پھر تیسرے دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دیپال پور کے حاکم نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اجودھن کے منشی کو پکڑ کر اس کے سامنے پیش کریں۔ اگرچہ منشی بے قصور تھا لیکن کچھ

مخبروں نے حاکم دیپال پور کو اطلاع دی تھی کہ وہ اس کے خلاف سازشیں کر رہا ہے نتیجتاً منشی کو گرفتار کر لیا گیا پھر جب اسے دیپال پور لے جایا جانے لگا تو اس نے سپاہیوں سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم لوگ مجھے کچھ دیر کے لئے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں لے چلو تو میں تمہیں ایک قیمتی چیز پیش کروں گا۔“

”تُو وہاں جا کر کیا کرے گا؟“ حاکم دیپال پور کے سپاہیوں نے پوچھا۔

”بس چند لمحوں کی بات ہے۔“ منشی نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ”میں حضرت شیخؒ کی خدمت میں سلام پیش کروں گا اور پھر تم لوگوں کے ساتھ دیپال پور روانہ ہو جاؤں گا۔“

سپاہی ویسے تو شاید انکار کر دیتے مگر بڑی رقم کے لالچ نے انہیں منشی کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔

پھر اجودھن کا منشی اس حالت میں حضرت بابا فریدؒ کے پاس پہنچا کہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

”اے شخص! یہ کیا ماجرا ہے؟“ حضرت بابا فریدؒ نے منشی سے دریافت کیا۔

”سرکار! میں بے قصور ہوں۔ مگر حاکم دیپال پور کے سپاہی مجھے گرفتار کر کے لئے جا رہے ہیں۔“ منشی رونے لگا۔ ”میرے پاس کسی اعلیٰ افسر کی سفارش نہیں۔ اگر کچھ ہے تو بس آپ کی دعاؤں کا سہارا ہے۔“

حضرت بابا فریدؒ چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے، پھر منشی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اگر وہ حاکم جس نے تیری گرفتاری کا حکم جاری کیا ہے تجھ پر مہربان ہو جائے تو کیا شکرانہ پیش کرے گا؟“

”میرے پاس جس قدر مال و اسباب ہے، وہ سب آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“ منشی نے دست بستہ عرض کیا۔

”وہ شکرانہ بھی میں نے تجھے بخش دیا۔“ حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ”مجھے اپنے اللہ کے کرم پر یقین ہے کہ وہ فتنہ پرداز حاکم تجھے آزاد کر دے گا۔ خلعتِ فاخرہ سے نوازے گا اور تحفے کے طور پر تجھے ایک کنیز بھی دے گا۔ مجھ سے وعدہ کر کہ تُو اس کنیز کو روغن گر کے حوالے کر دے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ایک ایک حکم پر دل و جان سے عمل کروں گا۔“ منشی نے عرض کیا۔

پھر حضرت بابا فریدؒ نے روغن گر کو اپنی خدمت میں طلب کیا اور منشی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”حسبِ وعدہ تم کنیز کو اس شخص کے حوالے کر دو گے۔“

منشی نے روغن گر سے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو کہ یہی حکمِ شیخ ہے۔“

روغن گر، منشی کی بات سن کر رونے لگا۔ ”شیخ! میرے پاس اتنی دولت ہے کہ آٹھ خوبصورت کنیزیں خرید سکتا ہوں......... مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے صرف اپنی بیوی سے عشق ہے۔ اس کے سوا کسی عورت کی رفاقت گوارہ نہیں۔“

حضرت بابا فریدؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”تُو اللہ کا نام لے کر منشی کے ساتھ دیپال پور جا۔ پھر دیکھ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

مجبوراً وہ روغن گر منشی کے ساتھ چلا گیا مگر اسے اپنی بیوی کے ملنے کی اُمید نہیں تھی۔

سپاہیوں نے منشی کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیا اور روغن گر شدید مایوسی کے عالم میں قید خانے کے باہر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن منشی کو حاکم دیپال پور کے سامنے پیش کیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اجودھن کا منشی حاکم کے قہر و غضب سے محفوظ نہیں رہے گا اور اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔ خود حاکم دیپال پور کا یہ حال تھا کہ وہ منشی کے آنے سے پہلے سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی منشی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا، صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ حاکم دیپال پور نے اپنے قیدی کی طرف دیکھا اور بے اختیار کہنے لگا۔

”تُو سازشی نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔“

پھر حاکم نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ منشی کی زنجیریں کھول دی جائیں۔ وہاں موجود تمام لوگ حیرت زدہ تھے کہ ایک معتوب شخص چند لمحوں میں بے قصور کیسے ثابت ہو گیا؟ حاکم نے منشی کے لئے کرسی منگوائی اور اسے اپنے قریب بٹھایا۔ کچھ دیر تک معذرت کرتا رہا۔ پھر اس نے منشی کو قیمتی خلعت سے نوازا اور ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیا۔ جب منشی انعام لے کر جانے لگا تو حاکم دیپال پور نے ایک برقع پوش خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور یہ کنیز تیری خدمت کے لئے ہے۔“

منشی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ پتھر کے کسی ستون کی مانند ساکت کھڑ تھا مگر اس کا ذہن ایک درویش کے کوچے میں بھٹک رہا تھا۔ حضرت بابا فریدؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ مجسم ہو گئے تھے۔

”کیا کچھ اور چاہتا ہے؟“ منشی کو گم صم پا کر حاکم دیپال پور نے پوچھا۔

منشی اپنے تصورات کے حصار سے باہر نکل آیا اور شکر گزاری کے لہجے میں کہنے لگا۔ ''میرے لئے آپ کی یہی عنایت بہت ہے۔''

اب وہ کیسے بتاتا کہ حاکم دیپال پور کی نفرت، محبت میں کیسے بدل گئی...... اور یہ کس کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔

منشی حاکم کے دربار سے باہر آیا۔ برقع پوش کنیز اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ پھر جب منشی حوالات کے قریب پہنچا تو روغن گر سر جھکائے اُداس بیٹھا تھا۔ یکایک کنیز دوڑی اور روغن گر سے جا کر لپٹ گئی۔

روغن گر نے ایک نامحرم عورت کو اتنے قریب پایا تو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''دُور ہو جا مجھ سے۔ مجھے اپنی بیوی کے سوا کسی عورت کی طلب نہیں۔''

''میں ہی تو تمہاری بیوی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کنیز نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا۔

روغن گر کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ چیخیں مار کر رونے لگا۔ ''بابا!...... بابا!'' روغن گر، حضرت بابا فریدؒ کو یاد کر رہا تھا۔

''تم کسے پکار رہے ہو؟'' بیوی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''اسے آوازیں دے رہا ہوں جس کی دعاؤں کے طفیل مجھے تیرا دیدار نصیب ہوا ہے۔'' روغن گر زار و قطار رو رہا تھا۔ ''اگر اس کی نگاہِ کرم نہ ہوتی تو میں آتشِ فراق میں جل کر راکھ ہو چکا ہوتا۔''

منشی نے پورا واقعہ سنا تو اس کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''خدا شیخ کو سلامت رکھے کہ انہیں دیکھ کر ہمارے بے قرار دل سکون پاتے ہیں۔''

اجودھن پہنچ کر روغن گر، حضرت بابا فریدؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''اب کیا چاہتا ہے؟'' حضرت بابا فریدؒ نے پوچھا۔

''عشق کی وہ آگ چاہتا ہوں جو کبھی نہ بجھے۔'' روغن گر حضرت بابا فریدؒ کی ایک نظر خاص کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''اللہ تیرے شعلۂ عشق کو اور بھڑکا دے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے دعا دی۔

پھر وہ روغن گر، حضرت بابا فریدؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر عشق مجازی سے عشق حقیقی تک جا پہنچا۔

❁ ...... ✡ ✡ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلسِ وعظ آراستہ تھی۔ آپؒ الہام اور خبر کے موضوع پر

تقریر فرما رہے تھے۔ پھر جب درس ختم ہوا تو ایک مرید نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر عرض کیا۔

''بہاء الدین خالد کہا کرتا تھا کہ وہ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے شیخ العالم کے دیدار کا بہت شوق تھا۔ اس وقت حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اجودھن کی جامع مسجد میں تشریف فرما تھے۔ بہاء الدین خالد نے آگے جانے کی بہت کوشش کی مگر لوگوں نے اسے راستہ نہیں دیا۔ مجبوراً وہ محراب کے سامنے بیٹھ گیا۔ محراب میں ایک شگاف تھا۔ اچانک بہاء الدین خالد کی نظر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ اس نے وہ کاغذ اٹھا لیا۔ کاغذ پر واضح حروف میں یہ عبارت تحریر تھی۔

''خالد کو فرید کی طرف سے سلام پہنچے۔''

یہ واقعہ سن کر دوسرے مرید نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے عرض کیا۔ ''یہ کاغذ کوئی لکھتا ہے یا بارگاہِ الٰہی سے آتا ہے؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''ملہم نامی ایک فرشتہ ہے۔ جب وہ نقش دل میں لکھتا ہے تو الہام ہوتا ہے۔''

''شاید یہ کاغذ بھی وہی فرشتہ تحریر کرتا ہے۔'' مرید نے عرض کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''ملہم کے تین کام ہیں۔ ایک یہ کہ دل میں کسی بات کا خیال لاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہاتف غیب سے آواز دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ کاغذ پر لکھ کر ظاہر کرتا ہے۔ اولیاء صرف نقش کو دیکھتے ہیں، نقاش کو نہیں...... مگر انبیائے کرام نقش کو بھی دیکھتے ہیں اور نقاش کو بھی۔ جس وقت نقش ظاہر ہو اور دل میں نور پیدا ہو تو وہ رحمانی ہے جسے فرشتے نے تحریر کیا ہے۔ اگر تاریکی پیدا ہو تو شیطانی ہے۔ کیونکہ شیطان بھی دل میں القا کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ خاموش ہو گئے۔

پھر ایک مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد فرمایا۔

''یہاں پر فرشتے کا کیا کام اور شیطان کی کیا مجال۔ کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔''

❁ ...... ✡ ✡ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روایت ہے کہ ایک دن حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ مریدوں اور خدمت گاروں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ آپؒ کے رعب و جلال کا یہ عالم ہوتا کہ لوگ دو زانو اور دست بستہ بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوتی تھیں

اور کبھی کبھی اس قدر سکوت ہوتا تھا کہ حاضرین مجلس کی سانسوں کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک دن ایک قلندر حضرت بابا فریدؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوا۔ اس وقت بھی حاضرین کی یہی کیفیت تھی۔ اگر نیا آنے والا یہ منظر دیکھتا تو یہی تاثر قبول کرتا کہ وہ کسی باجبروت شہنشاہ کے دربار میں داخل ہو گیا ہے۔

قلندر نے خانقاہ میں داخل ہوتے ہی حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور نہایت گستاخانہ لہجے میں حضرت شیخؒ سے مخاطب ہوا۔ ''فرید! یہ کیا تماشا ہے؟''

اگرچہ قلندر کی آواز نہایت کرخت تھی لیکن حضرت بابا فریدؒ نے اپنی روایتی شیریں کلامی کے ساتھ فرمایا۔ ''مہمان! تم کس تماشے کی بات کر رہے ہو؟''

''یہی کہ تُو نے اپنے آپ کو بت بنا ڈالا ہے اور لوگوں سے اپنی پرستش کراتا ہے۔'' اس بار بھی قلندر کے لہجے سے گستاخی کا وہی رنگ نمایاں تھا۔

''میں تو ایک عاجز بندہ ہوں۔ جو کچھ بنایا ہے، خدا نے بنایا ہے۔'' قلندر کے سوال کے جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

''نہیں! تُو نے خود اپنے آپ کو بت بنایا ہے۔'' قلندر کے لہجے کی کرختگی کا وہی عالم تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' حضرت بابا فریدؒ نے کمال انکسار کے ساتھ فرمایا۔ ''دنیا کا کوئی شخص اپنے آپ کو کچھ نہیں بنا سکتا۔ مگر حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سرفراز کر دیتا ہے۔''

قلندر نے ایک نظر حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر با آواز بلند کہنے لگا۔ ''شیخ! آپ کے صبر و تحمل پر ہزار آفرین۔ جب تک دنیا باقی ہے، یہ تحمل باعزت رہے۔'' یہ کہہ کر وہ قلندر چلا گیا۔

اہلِ نظر کا خیال ہے کہ وہ قلندر مردانِ غیب میں سے تھا۔ آٹھ صدیاں گزر گئیں مگر وہ تحمل آج بھی باعزت ہے اور اس عزت میں قیامت تک اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ نے دنیا داروں کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے...... مگر جب کسی نے بزرگوں کے طریقے کی خلاف ورزی کی تو آپؒ خاموش نہ رہ سکے۔ حضرت بدر الدین غزنویؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ اس رشتے سے حضرت بابا فرید، حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ کو برادرِ محترم کہا کرتے تھے۔ جب بھی حضرت شیخؒ سے ملاقات ہوتی تو آپؒ بڑے

والہانہ انداز میں فرماتے۔

''میرے پیر و مرشد کی نشانی! میرے شیخ کی یادگار۔''

حضرت قطبؒ کے وصال کے بعد حضرت بابا فریدؒ کچھ دن ہانسی میں مقیم رہے تھے اور پھر اجودھن تشریف لے آئے تھے۔ حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ دہلی میں تھے اس لئے مرکزِ نگاہ بن گئے۔ حکومت کا ایک اعلیٰ عہدیدار ملک نظام الدین خریطہ دار حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ کے عقیدت مندوں میں تھا۔ اس نے شیخؒ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک عالی شان خانقاہ تعمیر کرائی اور پھر حضرت بدر الدین غزنویؒ سے عرض کیا۔

''کسی شکستہ مکان یا جھونپڑی میں بیٹھنا آپ جیسے بزرگوں کے شایانِ شان نہیں۔ اس خانقاہ میں جلوہ افروز ہو کر مخلوقِ خدا کو مستفیض فرمایئے۔''

حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ نے ملک نظام الدین کی تعمیر کردہ خانقاہ دیکھی تو نفس کے فریب میں آ گئے۔ عمارت کے دلکش نقش و نگار، خوبصورت حجرے اور طویل و عریض لنگر خانے...... اور سب سے بڑھ کر آرام و آسائش کے سارے اسباب۔ حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ اس اظہارِ عقیدت سے بہت خوش ہوئے اور ملک نظام الدین کی بہت تعریف کی۔

ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ ملک نظام الدین حکومت کے زیرِ عتاب آ گیا اور اس سے حساب طلب کر لیا گیا۔ شاہی خزانے کی ایک بڑی رقم نظام الدین کے ذمے نکلتی تھی۔ پھر جب حکومت نے اپنی تفتیش کا دائرہ وسیع کیا تو حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ کو بھی یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ معاملہ خانقاہ کی تعمیر سے گزر کر کہیں ان کی ذات تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ نے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کو ایک خط تحریر کیا۔

''میرے بزرگ دوست! واضح ہو کہ ملک نظام الدین عدالت کے اعلیٰ عہدیداروں میں سے ہے اور اس فقیر سے عقیدت رکھتا ہے۔ اسی شخص نے میرے لئے خانقاہ تعمیر کرائی اور درویشوں کی خدمت کے لئے نعمت و دعوت کے سامان فراہم کئے۔ اب اچانک ملک نظام الدین سے حساب طلب کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے میری طبیعت سخت پریشان ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ تمہاری پوری زندگی ایک کرامت ہے۔ اس لئے تم سے درخواست گزار ہوں کہ ملک نظام الدین کی رہائی کے لئے دعا فرمائیں تاکہ درویشوں کا کاروبار درست رہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس سلسلے میں فوری توجہ فرمائیں گے۔ والسلام۔''

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے پیر بھائی اور بزرگ دوست کے خط کو کئی بار پڑھا۔ ہر مرتبہ آپؒ کے چہرے پر اُداسی کا رنگ نمایاں ہو جاتا تھا۔ پھر آپؒ نے خط کے جواب میں لکھا۔

''عزیز الوجود کا رقعہ ملا جسے پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی اس لئے کہ ایک مدت دراز کے بعد میرے پیر و مرشد کی نشانی نے مجھے یاد کیا......اور افسوس اس لئے کہ میرا بزرگ دوست اس وقت پریشانی کے دور سے گزر رہا ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے وہ خلاف توقع نہیں ہے۔ جو لوگ اپنے بزرگوں کے طریقے پر کاربند نہیں ہوتے، انہیں ایسی ہی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ ہمارے بزرگوں میں سے کون ایسا تھا جس نے اپنے لئے ایک محل نما خانقاہ تعمیر کرائی ہو اور اس میں اس شان سے جلوہ افروز ہوا ہو۔''

حضرت بابا فریدؒ کا اشارہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی طرف تھا۔ شاہانِ وقت ان دونوں بزرگوں کے عقیدت مند تھے۔ اگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ اور حضرت قطبؒ ہلکا سا بھی اشارہ کر دیتے تو سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین التمش ایسی خانقاہیں تعمیر کرا دیتے کہ ان کے آگے قصرِ شاہی کی رونق و دلکشی بھی ہیچ ہوتی۔ حضرت بابا فریدؒ بھی بزرگوں کی اسی روش پر قائم رہے اور جب حضرت شیخ بدرالدین غزنویؒ نے اپنا راستہ تبدیل کیا تو آپؒ نے کسی رعایت کے بغیر کہہ دیا کہ بزرگوں کے طریقے سے انحراف کرنے والے ہمیشہ اسی قسم کی پریشانیوں کا شکار رہتے ہیں۔

یہی وہ صفاتِ عالیہ تھیں کہ جن کے اثر سے حضرت بابا فریدؒ کی ایک ایک سانس نے کرامت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اولیائے کرام کے بارے میں خود باری تعالیٰ کا ارشاد مقدس ہے کہ......''اس دن اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔''

کرامت کے منکرین کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا یہ وعدہ آخرت کے لئے ہے۔ مگر یاد رہے کہ خالق کائنات نے اس مادی دنیا میں بھی اپنے دوستوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر مومن ہو تو پھر تم ہی غالب رہو گے۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ ہم بندۂ مومن کی آنکھ بن جاتے ہیں، اس کا ہاتھ بن جاتے

ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی آیت مقدسہ کی تفسیر پیش کی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا، کار ساز

علامہ اقبال نے اپنے ایک اور شعر میں بندۂ مومن کے اعلیٰ مقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

بے شک! حضرت بابا فریدؒ بھی یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے......اور اسی یقین نے آپؒ کے ہر حوالے اور تعلق کو سربلندی بخشی تھی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں۔ ''میں ایک دن پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپؒ کی ریش مبارک سے ایک بال گر گیا۔ میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو اسے تعویذ بنا لوں؟''

جواباً حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ ''مولانا نظام الدین! تمہارے لئے مناسب ہوگا۔''

میں نے پیر و مرشد کی اس نشانی کو کاغذ میں لپیٹ کر اپنی دستار میں محفوظ کر لیا۔ پھر جب میں اجودھن سے دہلی پہنچا تو میرا یہ دستور تھا کہ جب بھی کوئی بیمار شخص طبیبوں اور حکیموں سے مایوس ہو کر میرے پاس دعا کرانے کے لئے آتا تو میں اُسے یہ تعویذ دے دیتا اور ساتھ ہی ہدایت کر دیتا کہ جب وہ صحت یاب ہو جائے تو تعویذ مجھے واپس کر دے۔ بفضل خدا اس تعویذ کی برکت سے بے شمار لوگ شفایاب ہوئے۔ ان میں بہت سے مریض ایسے بھی تھے جن کی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔

دہلی میں میرا ایک صالح اور صادق دوست تھا جسے تاج الدین مینائی کہتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ میں نے تاج الدین مینائی سے پریشانی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا۔

''مولانا! میرا چھوٹا بیٹا شدید پریشان ہے۔ مجھے وہ تعویذ عنایت کر دو۔''

میں فوراً ہی اپنے حجرے میں گیا اور اس طاق کی طرف بڑھا جو تعویذ کے لئے مخصوص تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ تعویذ وہاں موجود نہیں تھا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بھولے سے کسی دوسرے طاق میں نہ رکھ دیا ہو۔ یہ سوچ کر میں نے حجرے کے سارے طاق دیکھ ڈالے مگر مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پھر حجرے کا ایک ایک گوشہ چھان مارا لیکن تعویذ نہیں ملا۔ میں نے تاج الدین مینائی سے معذرت کر لی۔ وہ بے چارہ رنجیدہ خاطر چلا گیا

پھر کئی دن بعد تاج الدین مینائی نے مجھے بتایا کہ اس کا محبوب بیٹا انتقال کر گیا۔ یہ خبر سن کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں بہت دیر تک اپنے دوست کو صبر کی تلقین کرتا رہا۔

کچھ عرصے بعد ایک اور شخص آیا جو کسی پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس نے مجھ سے وہ تعویذ مانگا۔ میں نے اسے اپنے دوست تاج الدین مینائی کا واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ اس وقت تعویذ نہیں مل سکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کہیں گم ہو گیا۔ میری بات سن کر اس شخص کا چہرہ اُتر گیا۔ میں نے اس کی تسلی کے لئے کہا کہ ایک نظر دیکھ لیتا ہوں۔ پھر جب میں حجرے میں پہنچا تو حیرت انگیز طور پر تعویذ اسی مخصوص طاق میں موجود تھا۔ میں نے تعویذ اس شخص کو دے دیا اور اللہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

جب وہ شخص تعویذ واپس کر کے چلا گیا تو مجھے خیال آیا کہ تاج الدین مینائی کے بیٹے کی موت مقدر ہو چکی تھی اس لئے تعویذ نہیں مل سکا تھا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی خود بیمار ہوتے تو مریدوں سے اپنے حق میں دعا کراتے۔ ایک بار آپؒ کے پورے جسم مبارک میں شدید درد اُٹھا۔ فوراً ہی حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت مولانا بدر الدین اسحاقؒ، حضرت شیخ جمال ہانسویؒ اور شیخ علی بہاریؒ کو طلب کیا گیا پھر فرمایا۔

"میری صحت کے لئے آپ حضرات دعا کریں۔"

تمام درویش حیرت کے عالم میں سوچ کر خاموش کھڑے رہے کہ گناہ گار لوگ اس شخص کے لئے کس طرح دعا کر سکتے ہیں جسے اللہ نے اندازِ مسیحائی بخشا ہو۔

حضرت بابا فریدؒ اپنے مریدوں کی ذہنی کشمکش سے واقف تھے۔ اس لئے آپؒ نے دوبارہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔

"تم لوگ اسی وقت جاؤ اور فلاں قبرستان میں میری صحت کے لئے دعا کرو۔"

تمام درویش حضرت شیخؒ کے حکم کے مطابق ساری رات قبرستان میں دعا کرتے رہے۔ پھر جب صبح کے وقت پیر و مرشد کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے تو حضرت بابا فریدؒ ایک پرانے کالے کمبل پر تشریف فرما تھے اور قریب ہی وہ عصا رکھا ہوا تھا جو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آپؒ کو مرحمت فرمایا تھا۔ حضرت بابا فریدؒ بار بار اس عصا پر ہاتھ پھیرتے تھے اور پھر اپنے چہرے پر مل لیتے تھے۔ درویشوں کو دیکھ کر حضرت بابا فریدؒ ان سے مخاطب ہوئے۔

"کیا تم لوگ کل رات قبرستان میں مشغولِ دعا ہوئے تھے؟"

حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے عرض کیا۔ "سیّدی! ہم سب رب العزت کی بارگاہ میں رات بھر آپ کی صحت کے لئے دعا کرتے رہے۔"

"تمہاری دعاؤں نے مطلق اثر نہیں کیا۔ میری تکلیف کا وہی عالم ہے۔" حضرت بابا فریدؒ نے درویشوں کی بات سن کر فرمایا۔

مریدانِ خاص نے سر جھکا لئے۔

حضرت شیخ علی بہاریؒ سب سے آگے کھڑے تھے۔ انہوں نے بصد احترام عرض کیا۔ "سیّدی! ہم لوگ ناقص ہیں اور ایک ناقص کی دعا کسی کامل کے حق میں اثر نہیں کرتی۔"

شیخ علی بہاریؒ کا لہجہ مدھم تھا، اس لئے حضرت بابا فریدؒ ان کی بات نہ سن سکے۔ مجبوراً حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے قدرے بلند آواز سے شیخ علی بہاریؒ کے الفاظ دہرائے۔

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مریدوں کی معذرت سنی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو قریب بلا کر وہ عصا عطا کیا جو حضرت قطبؒ کی نشانی تھا پھر فرمایا۔

"مولانا نظام الدین! میں نے تمہارے حق میں دعا کی تھی کہ تم اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو وہ تمہیں عطا کرے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اظہارِ شکر گزاری کے لئے اپنا سر جھکا دیا پھر جب حضرت شیخؒ کی بارگاہ سے اُٹھے تو تمام درویش دوستوں نے آپ کو مبارک باد پیش کی۔

اسی رات حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو خیال آیا کہ پیر و مرشد نے ان کے حق میں دعا کی ہے جو یقیناً قبول ہو گئی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ حضرت شیخؒ کی صحت کے لئے دعا کی جائے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

"میں ساری رات پیر و مرشد کی صحت کے لئے دعا کرتا رہا یہاں تک کہ آخر شب میں مجھے اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ پھر صبح ہوتے ہی میں حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؒ مُصلّے پر قبلہ رُخ بیٹھے تھے اور چہرۂ مبارک پر فرحت کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

"درویش نظام الدین! میں نے تمہارے حق میں جو دعا کی تھی، وہ قبول ہوئی ہے۔ پھر جب تم نے گزشتہ شب میری صحت کے لئے دعا کی، وہ بھی قبول ہوئی۔" اس کے بعد حضرت شیخؒ نے مجھے وہ مصلّٰی عنایت کر دیا جس پر جلوہ افروز تھے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اسی زمانے میں حضرت بابا فریدؒ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایک عجیب و غریب

واقعہ ہے۔ بڑے بڑے بزرگانِ دین اور تاریخ انسانی کے ماہرین بھی اس واقعے کی کوئی توجیہہ پیش نہ کر سکے۔

اس وقت حضرت بابا فریدؒ اجودھن میں مقیم تھے اور آپؒ کی والدہ قرسم خاتون کھوتوال میں سکونت پذیر تھیں۔ دونوں قصبوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ جنگل وسیع ہے اور پانی نایاب ہے۔ حضرت بابا فریدؒ نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو بھیجا کہ وہ والدہ محترمہ کو لے آئیں۔ ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ مادر گرامی کو ہمراہ لے کر آ رہے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے آپؒ نے جنگل کے کنارے ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ اتفاق سے پانی کی ضرورت پیش آئی۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ گھوڑے پر سوار ہو کر پانی کی تلاش میں نکلے۔ پھر جب واپس آئے تو والدہ محترمہ وہاں موجود نہیں تھیں۔ آپؒ بہت دیر تک حیرت و پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوڑا دوڑاتے رہے اور آوازیں دیتے رہے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ والدہ ماجدہ کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ حیران تھے کہ ایک بوڑھی خاتون مختصر سے وقت میں اتنی دور کیسے جا سکتی ہیں کہ انہیں تلاش نہ کیا جا سکے۔

آخر شیخ نجیب الدین متوکلؒ اس حالت میں حضرت بابا فریدؒ کے پاس پہنچے کہ آپؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حضرت بابا فریدؒ نے چھوٹے بھائی کی زبانی والدہ ماجدہ کی گم شدگی کا احوال سنا تو خود بھی بے قرار ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ کھانا پکاؤ اور صدقہ دو۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے خدمت گاروں کو بھی اس طرف روانہ کیا گیا مگر ساری تدبیریں لاحاصل رہیں۔

پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کا گزر اسی راستے سے ہوا۔ غیر ارادی طور پر شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے قدم اسی درخت کے نیچے ٹھہر گئے جہاں والدہ محترمہ کو بٹھا کر آپؒ پانی کی تلاش میں نکلے تھے۔ ماں کی محبت نے جوش مارا۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے سوچا کہ ایک بار پھر جستجو کی جائے۔ شاید مادر گرامی کا کوئی نشان مل جائے۔ اسی خیال کے تحت شیخ نجیب الدین متوکلؒ بہت دور تک چلے گئے۔ پھر ایک تاریک اور سنسان مقام پر درختوں کے نیچے آپؒ کو کچھ انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے دل میں سوچا ممکن ہے کسی درندے نے والدہ محترمہ کو اپنی خوراک بنا لیا ہو۔ اسی خیال کے تحت آپؒ نے وہ تمام ہڈیاں ایک تھیلے میں جمع کر لیں اور حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''وہ تھیلا میرے سامنے لاؤ۔'' والدہ محترمہ کا ذکر سن کر حضرت بابا فریدؒ ایک بار پھر

آزردہ ہو گئے تھے۔

شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے تھیلا لا کر جھاڑا مگر اس میں سے ایک ہڈی بھی برآمد نہیں ہوئی۔

حضرت بابا فریدؒ نے چھوٹے بھائی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سیّدی! میں نے اپنے ہاتھوں سے تمام ہڈیاں اس تھیلے میں بند کی تھیں۔'' شیخ نجیب الدین متوکلؒ حیرت زدہ تھے اور بار بار خالی تھیلے کو دیکھ رہے تھے۔

یہ واقعہ سناتے وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ پھر آپؒ حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہ واقعہ عجائباتِ زمانہ میں سے ہے۔''

ایک روایت کے مطابق بعد میں حضرت بابا فریدؒ کی والدہ محترمہ واپس آ گئی تھیں۔ مگر وہی روایت زیادہ مشہور ہے جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے منسوب ہے۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

حضرت بابا فریدؒ کو والدہ محترمہ کی جدائی بہت شاق تھی۔ مگر آپؒ نے اس غم میں کبھی گریہ وزاری نہیں کی۔ آپؒ صبر و رضا کی منزل کے مسافر تھے۔ جب آپؒ کو بارہ سالہ فرزند حضرت عبداللہؒ کی شہادت کی خبر دی گئی اس وقت بھی آپؒ کے چہرۂ مبارک پر عکسِ ملال ضرور اُبھرا تھا مگر زبان کو ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوئی تھی۔ بس یہی فرمایا تھا۔

''جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ فارسی زبان کی اس رباعی کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔

میری خواہش ہے کہ میں تیری وفا میں ہمیشہ زندہ رہوں
خاک ہو جاؤں اور پھر تیرے قدموں کے نیچے زندہ رہوں
میں تیرا بندہ ہوں اور اس کائنات میں سے بس تجھی کو چاہوں
تیرے لئے مر جاؤں اور تیری خاطر زندہ رہوں

(ترجمہ)

غالباً یہ اس آیت مقدسہ کا ترجمہ ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میری نماز، میرا جینا اور مرنا تیرے ہی لئے ہے۔

جب کسی بندے کا جینا اور مرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو پھر کون اس کے روحانی مراتب کا اندازہ کر سکتا ہے؟ ایک خاص موقع پر حضرت بابا فریدؒ نے اپنے متعلق

فرمایا تھا۔

''چالیس سال تک اللہ جل شانہٗ نے جو کچھ فرمایا وہ اس بندے مسعود نے کیا۔ اب چند سالوں سے مسعود جس کام کے بارے میں اس سے درخواست کرتا ہے، باری تعالیٰ اسے پورا کر دیتا ہے۔''

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

ایک شخص پیر کامل کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا۔ مرشد کی جستجو اسے بیت المقدس لے گئی۔ وہاں اس نے کچھ عارفوں کی زبانی سنا کہ برصغیر میں ایک مردِ کامل فرید الدین مسعود گنج شکرؒ ہیں۔ اس کے دل میں آپؒ کے دیدار کا اس قدر شوق پیدا ہوا کہ ہمہ وقت مضطرب رہنے لگا۔ آخر وہ چند صوفیوں کے ہمراہ طویل سفر طے کر کے اجودھن پہنچا اور حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آپؒ نے مہمانوں کا والہانہ استقبال کیا اور خادموں کو حکم دیا کہ وہ درویشوں کی خاطر مدارات کریں۔ اس دوران اس شخص کے ساتھیوں نے حضرت بابا فریدؒ کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا۔ آپؒ نے ان لوگوں کی متجسس نظروں سے بچنے کے لئے سر جھکا لیا۔

اچانک وہ شخص اپنی جگہ سے اُٹھا اور حضرت بابا فریدؒ کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے عرض کرنے لگا۔

''حضرت! آپ کو تو میں نے بیت المقدس میں دیکھا تھا بلکہ آپ کا نام بھی پوچھا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ میں شیخ اجودھنی ہوں۔''

حضرت بابا فریدؒ نے جواباً فرمایا۔ ''یہ بات درست ہے مگر تم نے بھی تو وعدہ کیا تھا کہ یہ بات کسی سے نہ کہو گے۔''

اس شخص نے عرض کیا۔ ''بے شک! یہ میرا وعدہ تھا مگر اس وقت حضور کی ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔''

حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''اے عزیز! اللہ کے بندے جہاں بھی رہیں۔ بیت المقدس، خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کی نظروں کے سامنے رہتا ہے۔''

وہ شخص خاموش رہا۔

''کیا تمہیں یقین نہیں؟'' حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مہمان سے دریافت کیا۔

اس بار بھی اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تو پھر اپنی آنکھیں بند کر لو۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

پھر جیسے ہی اس نے آنکھیں بند کیں تو بیت المقدس کے نقش و نگار روشن ہو گئے اور وہ

شخص نعرہ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

پھر ہوش میں آیا تو ہمیشہ کے لئے حلقۂ غلامی میں شامل ہو گیا۔ آپؒ نے اُسے بہت تھوڑی سی مدت میں خلافت عطا کی اور سیوستان میں خدمتِ اسلام کے لئے مقرر فرما دیا۔

جو لوگ حضرت بابا فریدؒ کی اس کرامت پر اعتبار نہیں کرتے، انہیں چاہئے کہ وہ قرآن حکیم میں ملکۂ سبا (بلقیس) کے واقعے کا بغور مطالعہ کریں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف ابن برخیاہ نے پلک جھپکتے ہی ملکہ بلقیس کو دربار میں حاضر کر دیا تھا۔ باری تعالیٰ کا ارشادِ مقدس ہے کہ:

''ہم نے اسے کتاب کا علم دیا تھا۔''

اب اگر اس شخص سے حضرت بابا فریدؒ کی ملاقات بیت المقدس میں ہوئی تھی تو لوگوں کو حیرت کیوں ہے؟

ولایت، بادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہے فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

ریاضت، صبر، قناعت، توکل اور خدمتِ خلق .... یہ درویش کے عناصر خمسہ ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی رہ جائے تو پھر درویش کامل نہیں ہوتا۔

ایک بار حضرت بابا فریدؒ بیمار تھے اور لکڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ مریدانِ خاص بھی ہمراہ تھے۔ یکایک حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا اور آپؒ چلتے چلتے ٹھہر گئے۔ مریدوں نے سوچا کہ شاید پیر و مرشد پر مرض کا غلبہ ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی مرید حضرت شیخؒ کے چہرے کے تغیر کا سبب پوچھتا یا مزاج پُرسی کرتا، بابا صاحبؒ نے اپنے ہاتھ کا عصا دور پھینک دیا۔ پھر مریدانِ خاص کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''میرے دل میں چند لمحوں کے لئے خیال آ گیا تھا کہ میں اس لکڑی کے سہارے چل رہا ہوں۔ اس لئے میں نے عصا کو دور پھینک دیا۔ انسان کا بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہئے۔''

پھر مریدانِ خاص نے دیکھا کہ پیر و مرشد بہت دیر تک چہل قدمی فرماتے رہے مگر چہرۂ مبارک سے کسی تکلیف کا اظہار نہیں ہوا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ کا مشہور قول ہے کہ فقیر کے لئے سب سے مضر شے دولت مند کی محبت ہے۔

ایک بار ایک ضرورت مند شخص آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

"والیٔ ہندوستان غیاث الدین بلبن بڑا سخت گیر حکمراں ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں سنتا۔"

"اگر سفارش کسی غلط کام کے لئے ہو تو پھر اس کا نہ سننا ہی بہتر ہے۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

"میں حضرت شیخ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا کام ناجائز نہیں۔" سوالی نے عرض کیا۔

"تو پھر امید رکھو کہ تمہارا کام ہو جائے گا۔" حضرت بابا فریدؒ نے اس کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔

"مگر شیخ! وہاں میرا گزر ممکن نہیں۔" سوالی نے شکستہ لہجے میں عرض کیا۔ "میں کوشش کر چکا ہوں مگر دربانوں کی فوج نے مجھے سلطان تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔ اسی لئے سرکار کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا ہوں۔ کہنے والوں نے مجھ سے کہا ہے کہ غیاث الدین بلبن حضور سے بے حد عقیدت رکھتا ہے۔"

"بلبن کی عقیدت اپنی جگہ مگر میں سلاطین اور امراء سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

"تو پھر میں کہاں جاؤں؟" سوالی غم زدہ نظر آنے لگا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ بات مزاجِ شیخ پر گراں ہے مگر ایک ضرورت مند کی خاطر یہ زحمت گوارہ کر لیجئے۔"

حضرت بابا فریدؒ نے ایک خادم سے قلم دوات منگوایا اور والیٔ ہند سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سفارشی خط تحریر فرمانے لگے۔ عبارت عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔

"میں نے اس شخص کی ضرورت کو اللہ کے سامنے پیش کیا۔ پھر تیرے پاس بھیجا۔ اگر تُو اسے کچھ دے گا تو یہ دین اللہ کی طرف سے ہو گی اور یہ شخص تیرا شکر گزار ہو گا...... اور اگر کچھ نہیں دے گا تو یہ بندش بھی اللہ کی طرف سے ہو گی اور تُو معذور سمجھا جائے گا۔" (ترجمہ)

یہ دنیا کا عجیب ترین سفارش نامہ تھا جسے حضرت بابا فریدؒ جیسے مردِ خدا پرست ہی تحریر کر سکتے تھے۔ یہ مختصر ترین خط فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ ترین مثال ہے جس سے ایک طرف حضرت بابا فریدؒ کی علمیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے پڑھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطبؒ کی یاد آ جاتی ہے کہ یہ دونوں بزرگ بھی سلاطینِ وقت سے بے نیاز نظر آتے تھے اور یہی پیرانِ چشت کا طریقہ تھا۔

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

سلطان غیاث الدین بلبن کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی بہت زیادہ شہرت رکھتا

ہے۔ ایک بار والیٔ ہندوستان نے سرخ سکوں سے بھرے ہوئے دو طشت حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں بھیجے۔ آپؒ نے مولانا بدر الدین اسحاقؒ کو طلب کر کے فرمایا۔

"آج لنگر خانے میں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے عرض کیا۔ "صرف ایک سکہ درکار ہے۔"

"ایک سکہ لے لو۔ باقی فقراء میں تقسیم کر دو۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

مولانا بدر الدین اسحاقؒ کچھ سوچنے لگے۔ پھر عرض کیا۔ "ایک سکہ قرض بھی ہے۔" دراصل یہ وہ رقم تھی جو مولانا نے ان غریبوں کے لئے قرض لی تھی جو کھانا کھانے لنگر آتے تھے۔

"وہ قرض بھی لے لو اور باقی سکے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دو۔" پیر و مرشد کا حکم تھا۔

مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے رات کے اندھیرے میں تمام سکے محتاجوں اور مسکینوں کے درمیان تقسیم کر دیئے۔ بعد میں مولانا کو احساس ہوا کہ رقم بانٹتے ہوئے کوئی سکہ راستے میں گر گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی مولانا بدر الدین اسحاقؒ چراغ لے کر نکلے۔ آخر وہ سکہ راستے میں پڑا ہوا مل گیا۔ مولانا نے اسے اٹھا کر اپنے پیرہن کی جیب میں رکھ لیا اور کہا کہ کل کام آئے گا۔

پھر عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت بابا فریدؒ نے نماز کی نیت باندھی۔ ابھی سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی تھی کہ اچانک نیت توڑ دی۔ حاضرین مسجد کو پیر و مرشد کے اس عمل پر حیرت ہوئی۔ حضرت بابا فریدؒ نے دوبارہ نیت باندھی۔ ابھی نصف نماز بھی ادا نہیں ہوئی تھی کہ نیت توڑ دی۔ پھر آپؒ نے کئی بار یہی عمل دہرایا۔ مریدوں اور خدمت گاروں کی حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر حضرت بابا فریدؒ اپنی نماز نامکمل چھوڑ کر مصلّے پر بیٹھ گئے۔ کسی مرید اور خدمت گار میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ پیر و مرشد کے اس عمل کی وجہ دریافت کر سکے۔ مگر تمام حاضرین محسوس کر رہے تھے کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔

آخر حضرت بابا فریدؒ خود ہی شیخ بدر الدین اسحاقؒ سے مخاطب ہوئے۔ "مولانا! مجھے نماز میں حضوری حاصل نہیں ہوتی۔"

شیخ بدر الدین اسحاقؒ دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ "سیّدی! اس سلسلے میں یہ ناقص کیا عرض کر سکتا ہے؟"

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطان کی پیش کردہ نذر میں سے کچھ باقی رہ گیا

ہے۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "مولانا! کیا تم نے ساری رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی تھی؟"

یہ سنتے ہی مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے سر جھکا لیا۔ "سیدی! کل کے خرچ کے لئے ایک سکہ بچا ہے۔" مولانا بدر الدین اسحاقؒ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے پیر و مرشد کی خفگی کے خیال سے آپؒ کی آواز لرز رہی تھی۔

"کہاں ہے وہ سکہ؟" حضرت بابا فریدؒ نے حضرت بدر الدین اسحاقؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ آپؒ کے لہجے سے ناگواری کا رنگ نمایاں تھا۔

مولانا بدر الدین اسحاقؒ اُٹھے اور اپنے پیرہن کی جیب سے سکہ نکال کر پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حضرت بابا فریدؒ چند لمحوں تک اس سکے کو دیکھتے رہے اور پھر اسے دُور پھینکتے ہوئے فرمایا۔ "یہی دھات کا ٹکڑا بندے اور اللہ کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔" تمام حاضرین پر سکتہ سا طاری تھا۔ پھر شیخ بدر الدین اسحاقؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اور مولانا! آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ درویش ہو کر مادی اسباب پر بھروسہ کرتے ہو؟ اس کی رزاقی پر یقین نہیں ہے؟ عمر گزری جا رہی ہے اور اب تک توکل کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکے۔"

مولانا بدر الدین اسحاقؒ کا برا حال تھا۔ شرم و ندامت سے سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مولانا اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔

"پوری زندگی میں وہ رات مجھ پر سب سے بھاری گزری ہے۔ شدتِ غم کا یہ عالم تھا کہ میں کئی راتیں سو نہ سکا۔ بار بار ذہن میں ایک ہی اذیت ناک خیال اُبھرتا تھا کہ کاش! میں اپنے ہاتھ کو آلودہ نہ کرتا۔"

❁ ❁ ❁ ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روایت ہے کہ دہلی میں ایتم نامی ایک مالدار بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور اس کی امامت حضرت بابا فریدؒ کے چھوٹے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے سپرد کی۔ پھر کچھ دن بعد ان ہی بزرگ نے اپنی بیٹی کی شادی بہت دھوم دھام سے کی۔ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو بزرگ کے اس عمل پر بڑی حیرت ہوئی۔ ایک طرف شریعت کا دعویٰ اور دوسری طرف دنیا داری کا یہ مظاہرہ؟ آخر شیخ نجیب الدین متوکلؒ خاموش نہ رہ سکے اور شیخ ایتم سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"آخر اس میں کیا مضائقہ ہے؟" شیخ ایتم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے

کسی کے حقوق تو غصب نہیں کئے۔ میرا اپنا مال تھا جسے میں نے اپنی بیٹی پر خرچ کر دیا۔ پھر تمہیں اعتراض کیوں ہے؟"

"شیخ! آپ کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔" حضرت نجیب الدین متوکلؒ نے فرمایا۔ "اگر کوئی دنیا دار شخص اس طرح اپنی دولت کی نمائش کرتا تو یہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا کہ وہ آدابِ شریعت سے واقف نہیں مگر آپ تو جانتے ہیں کہ اسلام میں اصراف بے جا کی گنجائش نہیں۔"

شیخ ایتم کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا مگر آپؒ حق بات کہنے سے باز نہ رہ سکے۔ "شیخ! آپ مومن کامل کی تلاش میں رہتے ہیں اور اکثر اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں، تو آج بغور سن لیجئے کہ مومن کامل وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اولاد کی محبت پر غالب ہو۔ اگر آپ اللہ کی راہ میں اس سے دوگنا خرچ کریں جتنا آپ نے اپنی بیٹی کی شادی پر صرف کیا ہے تو آپ مومن کامل ہو سکتے ہیں۔"

شیخ ایتم، حضرت نجیب الدین متوکلؒ کی حق گوئی کو برداشت نہ کر سکے اور آپؒ کو اپنی مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دیا۔

پھر جب حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ اجودھن تشریف لائے اور حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا تو آپؒ نے جواب میں قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ تلاوت کی۔

"ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم سے کم ویسی ہی۔"

اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ "تم تو متوکل ہو میرے بھائی! پھر کیوں کسی بات کا غم کرتے ہو؟ اگر "ایتم" گیا ہے تو "ہتگری" آ جائے گا۔"

پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ دن بعد ہتگر نامی ایک امیر و کبیر شخص ہندوستان آیا اور اس نے حضرت بابا فریدؒ کے خانوادے کی بہت خدمت انجام دی۔

❁ ❁ ❁ ❁

ایک بار گدڑی پوش درویشوں کی ایک جماعت حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپؒ نے حسبِ روایت مہمانوں کی تواضع کی اور کچھ دیر آرام کرنے کے لئے کہا۔ پھر جب وہ درویش آرام کر چکے تو دوبارہ حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت بابا فریدؒ نے ان کے حالات دریافت کئے۔

جواب میں درویشوں نے کہا۔ ''ہم لوگ مسافر ہیں اور ہمارے پاس سفرخرچ کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی بندہ نواز ہے اور وہی مسافر نواز۔''

درویشوں کو اطمینان ہوگیا اور انہوں نے ایک رات خانقاہ میں گزار دی۔ پھر دوسرے دن وہ گدڑی پوش حضرت بابا فریدؒ سے رخصت کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوئے۔ ''شیخ! اب ہم جاتے ہیں۔''

حضرت بابا فریدؒ نے ان کی سلامتی کے لئے دعائیں کیں پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی کھجور کی گٹھلیاں اُٹھائیں اور ایک ایک ہر درویش کو دیتے گئے۔ ''یہی تمہارا زادِ راہ ہے۔''

درویشوں کو حضرت بابا فریدؒ کے اس عمل پر بڑی حیرت ہوئی۔ ہر گدڑی پوش اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ ''یہ کیسا سامانِ سفر ہے؟'' ان کے چہروں پر ناخوشگواری کا رنگ نمایاں تھا مگر حضرت بابا فریدؒ کے احترام کے پیشِ نظر زبانیں خاموش تھیں۔

پھر وہ تمام گدڑی پوش خانقاہ سے باہر نکلے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ''بابا نے ہمارے ساتھ یہ کیسا مذاق کیا ہے؟ کہیں کھجور کی ایک گٹھلی بھی سامانِ سفر ہوسکتی ہے؟'' یہ کہہ کر ان لوگوں نے حضرت بابا فریدؒ کے عطا کردہ زادِ راہ کو زمین پر پھینک دینا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ہر گدڑی پوش کے ہاتھ میں کھجور کی گٹھلی کی بجائے سونے کی ایک ڈلی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر گدڑی پوشوں نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

''بے شک! یہ بہترین سامانِ سفر ہے اور بابا صاحبؒ کا عارفانہ مقام ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔''

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

گدڑی پوش درویشوں کی طرح ایک ہندو جوگی بھی حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ہمیشہ کے لئے اسی در کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت بابا فریدؒ کی شہرت عام ہوتی جارہی تھی اور آپؒ کے عارفانہ کمالات نے اہلِ ہنود پر ایسی ہیبت طاری کردی تھی کہ بے شمار بت پرست اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ اس نظریاتی انقلاب پر برہمنوں کو بڑی تشویش تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بابا فریدؒ کی تسخیر کا یہی عالم رہا تو بہت سے صنم خانے ویران ہوجائیں گے۔ آخر ایک ایسے جوگی کا انتخاب کیا گیا جو اپنے فن میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔ برہمنوں کی طرف

سے جوگی کو بڑی رقم کا لالچ دیا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جوگی، حضرت بابا فریدؒ کے سامنے ایسے کمالات کا مظاہرہ کرے گا جس سے ہندو دھرم کی برتری ثابت ہوجائے۔

الغرض ہندوستان کا سب سے بڑا شعبدہ باز، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی مذہبی رسم کے مطابق ڈنڈوت کیا (دونوں ہاتھ جوڑ دیئے) پھر زمین پر سر رکھ دیا۔ حاضرینِ مجلس انتظار میں تھے کہ جوگی چند لمحوں بعد سر اٹھائے گا اور پھر اپنا مدعا بیان کرے گا...... مگر انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی چلی گئیں۔

آخر حضرت بابا فریدؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''مہمان! سر اٹھاؤ اور اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔''

جوگی بدستور سجدے کی حالت میں پڑا رہا۔ حضرت بابا فریدؒ نے کئی بار اُٹھنے کے لئے کہا مگر جوگی اپنے جسم کو ہلکی سی جنبش بھی نہ دے سکا۔

حاضرینِ مجلس حیران تھے کہ جوگی کو کیا ہوگیا ہے؟ آخر حضرت بابا فریدؒ اپنی نشست سے اُٹھے اور دستِ مبارک کا سہارا دے کر جوگی کو کھڑا کیا پھر اس شعبدہ باز سے فرمایا۔

''جو نیت لے کر یہاں آئے تھے، اس پر بے خوف و خطر عمل کرو۔ تمہیں یہاں روکنے والا کوئی نہیں۔''

جوگی نے لرزتے جسم اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے حضرت بابا فریدؒ کی طرف دیکھا۔ پھر گڑگڑانے لگا۔ ''آپ کے سامنے جو سر نہیں اُٹھا سکتا وہ اپنے ارادوں پر عمل کیا کرے گا؟'' پھر دوبارہ زمین پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ''بابا! میرا تو سارا سرمایہ لٹ گیا۔ اب تو میں ایک بھکاری کے مانند ہوں جس کے ہاتھ بھی خالی ہیں اور دامن بھی۔''

''پھر کیا چاہتا ہے؟'' حضرت بابا فریدؒ نے شفقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''بھکاری ہی رہنا چاہتا ہوں...... مگر آپ کے در کا بھکاری۔'' جوگی کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔

حضرت بابا فریدؒ نے اسے کلمۂ طیبہ کی تلقین کی اور وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔

پھر جوگی یہ کہہ کر چلا گیا۔ ''بابا! میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ میرے ذمے کسی کا قرض باقی ہے۔ اس بوجھ کو اتار دوں۔''

جب وہ جوگی چلا گیا تو حضرت بابا فریدؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''اس شخص کو اہلِ ہنود نے میرے مقابلے کے لئے بھیجا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے زمین پر سر رکھا، میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یہ سر اُٹھنے نہ پائے اور ہمیشہ اس کی بارگاہ میں جھکا رہے۔ اللہ جل شانہ نے اس عاجز کی دعا سن لی اور ایک گم کردہ راہ کو منزل کا راستہ

دکھا دیا۔"

خانقاہ سے نکل کر وہ جوگی برہمنوں کے پاس پہنچا اور ان کی دی ہوئی رقم واپس کر دی۔

برہمن حیرت زدہ تھے۔ "کیا تُو بھی اس فقیر سے مات کھا گیا؟"

"میرا اور بابا کا مقابلہ ہی کیا؟" جوگی بڑے والہانہ انداز میں حضرت بابا فریدؒ کی تعریف کر رہا تھا۔ "بس ایک نادان دیا (چراغ) تھا جو سورج کے مقابل چلا گیا اور اپنی روشنی کھو بیٹھا۔"

یہ برہمنوں کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ اسے رائیگاں جاتے دیکھ کر کہنے لگے۔ "بس ایک بار اس مسلمان فقیر کو شکست دے دے، ہم تیرے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیں گے۔"

"اگر تم ساری دنیا کے خزانے بھی میرے قدموں میں ڈھیر کر دو تو میں باباؒ کی غلامی نہیں چھوڑوں گا۔ ان ہی کے صدقے میں مجھے اس کائنات کی سب سے بڑی دولت حاصل ہوئی ہے۔"

"آخر وہ کون سی دولت ہے؟" برہمنوں کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

"وہ ایک سجدہ جو میں نے اللہ کی ذات کو کیا۔" جوگی سرشاری کے عالم میں بول رہا تھا۔ "ساری زندگی اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے جان بتوں کو پوجتا رہا۔ افسوس! کیسی گمراہی اور ہلاکت تھی۔ بس اس کے کرم نے بچا لیا۔" یہ کہہ کر جوگی چلا گیا اور برہمن پیچ و تاب کھاتے رہے۔

پھر وہ جوگی ایک بھکاری کی طرح حضرت بابا فریدؒ کے آستانہ عالیہ پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اسے نجات حاصل ہو گئی اور وہ واصلانِ حق میں شامل ہوا۔

اسلام میں دل آزاری گناہِ عظیم ہے۔ یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے مگر اکثریت اس بات پر عمل نہیں کرتی۔ درویش اسے اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہے اور اسی مروت و تواضع کے سبب اسے حق تعالیٰ کی قربت حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک بار ایک بوڑھا شخص اپنے بیٹے کے ساتھ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران لڑکے نے مداخلت کی اور اونچی آواز میں بحث کرنے لگا۔ حضرت بابا فریدؒ کو یہ بات ناگوار گزری مگر آپؒ رسم میزبانی ادا کر رہے تھے اس لئے خاموش رہے۔ زبان دراز لڑکے کی گستاخیاں بڑھتی گئیں اور وہ پورے زور و شور سے بحث کرتا رہا۔

حضرت بابا فریدؒ کے چھوٹے صاحب زادے حضرت شیخ شہاب الدینؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ حجرۂ مبارک کے دروازے پر بیٹھے تھے۔ شور کی آواز سنی تو حضرت شیخ شہاب الدینؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور حجرے میں داخل ہو گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی شیخ زادے کے پیچھے پیچھے تھے۔

حضرت شیخ شہاب الدینؒ نے اندر داخل ہو کر دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا چیخ چیخ کر نہایت گستاخانہ لہجے میں حضرت بابا فریدؒ سے گفتگو کر رہا ہے۔ شیخ زادے سے برداشت نہ ہو سکا۔ آپؒ تیزی کے ساتھ آگے بڑھے اور لڑکے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"بے ادب! تجھے نہیں معلوم کہ تُو کس سے ہم کلام ہے؟"

لڑکا بھی مقابلے کے لئے کھڑا ہو گیا اور اس نے حضرت شیخ شہاب الدینؒ کو مارنا چاہا مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دونوں باہم صفائی کرو۔" حضرت بابا فریدؒ نے اپنے فرزند شیخ شہاب الدینؒ اور اس لڑکے کو مخاطب کر کے فرمایا۔

آخر شیخ زادے کو اس گستاخ لڑکے سے معافی مانگنی پڑی۔ مزید یہ کہ شیخ شہاب الدینؒ نے اسے کچھ رقم بھی دی۔ پھر وہ باپ بیٹے ہنسی خوشی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے اپنے فرزند سے پوچھا۔

"شہاب الدین! تم اتنے طیش میں کیوں آ گئے تھے کہ آدابِ میزبانی بھی فراموش کر بیٹھے"

"بابا! مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ کوئی آپ کی شان میں گستاخی کرے۔" شیخ شہاب الدینؒ نے سر جھکا لیا۔

"اس نے زبان کا ناجائز استعمال کیا کہ وہ بے خبر تھا مگر تم نے ہاتھ کا غلط استعمال کیوں کیا کہ تم تو باخبر تھے۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "فرزند! راہِ سلوک میں تو اس سے کہیں زیادہ نازک اور اذیت ناک مقام آتے ہیں۔ اس وقت تم کیا کرو گے؟"

حضرت شیخ شہاب الدینؒ سر جھکائے کھڑے رہے۔ آپؒ کے چہرۂ مبارک پر ندامت کے آثار نمایاں تھے۔

پھر حضرت بابا فریدؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے مخاطب ہوئے۔ "اور مولانا نظام الدین! تم نے اس لڑکے کا ہاتھ کیوں پکڑا؟"

"سیّدی! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شیخ زادے پر ہاتھ اٹھائے اور یہ غلام خاموش کھڑا

دیکھتا رہے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔

حضرت بابا فریدؒ مسکرائے اور فرمایا۔ "نیک نے نیک کام کیا۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں ایک دانش مند فصیح الدین دہلی آیا۔ اس کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ دہلی کے بڑے بڑے علماء اس کے سوالات کا جواب دینے سے عاجز رہتے تھے۔ پھر فصیح الدین کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ ایک بار اس کی مجلس میں بیک وقت پانچ عالم موجود تھے اور فصیح الدین سے بحث کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں پانچوں عالم لاجواب ہو گئے۔

"کیا دہلی اور اس کے نواح میں ایسا کوئی عالم موجود ہے جس نے مجھ سے بحث نہ کی ہو؟" فصیح الدین نے فخریہ لہجے میں کہا۔ اسے اپنی علمی فتوحات پر بڑا غرور تھا۔

"ہاں! ایک بزرگ فرید الدین مسعود ہیں جو اجودھن میں رہتے ہیں۔" علماء نے جواب دیا۔

"میں ان سے بھی ملاقات کروں گا۔" فصیح الدین نے اس طرح کہا جیسے وہ اس مردِ درویش کو بھی عاجز کر دے گا۔

پھر کچھ دن بعد فصیح الدین، اجودھن پہنچ کر حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاء اور دوسرے درویش بھی موجود تھے۔

فصیح الدین نے بظاہر عاجزی کا مظاہرہ کیا مگر در پردہ وہ حضرت بابا فریدؒ کی علمیت کا امتحان لے رہا تھا۔ "شیخ! میرے ذہن میں کچھ مسائل اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ میں اس سلسلے میں بہت دن سے حیران و پریشان پھر رہا ہوں۔ دہلی کے کچھ علماء کا خیال ہے کہ آپ ان مسائل کی گرہ کشائی کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر فصیح الدین نے وہ سوالات حضرت بابا فریدؒ کے سامنے پیش کر دیئے جنہیں وہ راستے بھر تراشتا رہا تھا۔

حضرت بابا فریدؒ نے فصیح الدین کے مسائل سنے مگر فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ آپؒ کے چہرۂ مبارک سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

سکوت اور خاموشی کا یہ منظر دیکھ کر فصیح الدین کو محسوس ہوا کہ حضرت بابا فریدؒ بھی اس کے سوالات کا جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ مگر فصیح الدین کی یہ خوشی بہت عارضی تھی۔

"تمہارے سوالات تو بہت آسان ہیں۔" حضرت بابا فریدؒ کے بجائے حضرت نظام الدین اولیاءؒ، فصیح الدین سے مخاطب ہوئے پھر آپؒ نے اس طرح سارے مسائل حل

کر دیئے کہ حاضرین مجلس حیران رہ گئے۔

فصیح الدین کا چہرہ اُتر گیا اور وہ دل میں سوچنے لگا کہ جب شاگرد کا یہ حال ہے تو پھر استاد کا کیا عالم ہوگا؟ فصیح الدین کچھ دیر تک نادم و شرمسار بیٹھا رہا پھر حضرت بابا فریدؒ کا شکریہ ادا کر کے مجلس سے اٹھ گیا۔

اس کے جاتے ہی حضرت بابا فریدؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر سخت ناراض ہوئے۔ "تم درمیان میں کیوں بول اُٹھے؟"

پیر و مرشد کے چہرۂ مبارک کا بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ آپؒ نے فوراً ندامت سے سر جھکا دیا۔

"کیا میں فصیح الدین کے مسائل کا حل نہیں جانتا تھا؟" حضرت بابا فریدؒ نے غضب ناک لہجے میں فرمایا۔ "میں نے تو اس لئے خاموشی اختیار کی تھی کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ تُو نے نہیں دیکھا کہ وہ بھری محفل میں کیسا نادم و شرم سار بیٹھا تھا اور جب اُٹھا تو اس کی حالت کیسی شکستہ تھی۔ میں تجھ سے اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک فصیح الدین خوش نہیں ہوگا۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فوراً اُٹھے اور فصیح الدین کی تلاش میں نکلے۔ پھر پتہ پوچھتے پوچھتے اس سرائے میں پہنچے جہاں وہ دانشمند ٹھہرا ہوا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دیکھ کر فصیح الدین کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے اور پھر وہ بہت دیر تک آپؒ کے علم و فضل کی تعریف کرتا رہا۔

"تمہاری وجہ سے حضرت شیخؒ مجھ پر بہت ناراض ہوئے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"اس میں تمہاری کیا غلطی تھی؟" فصیح الدین حیران ہوا۔

"پیر و مرشد اس لئے ناراض ہوئے کہ میں نے تمہارے سوالوں کے جوابات کیوں دیئے؟ اگر میں خاموش رہتا تو تم خوش ہو جاتے اور اہلِ مجلس جان لیتے کہ تم بڑے عالم ہو۔"

یہ سن کر کچھ دیر کے لئے فصیح الدین کو سکتہ سا ہو گیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "سبحان اللہ! ایسا علم اور ایسا تحمل کہ کسی کا دل توڑنا گوارہ نہیں۔ چاہے اپنی ذات پر حرف آ جائے۔"

"میرے بھائی! مجھے معاف کر دو تا کہ پیر و مرشد کا غصہ دور ہو اور میری زندگی برباد ہونے سے بچ جائے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے درخواست کی۔

"میں تم سے خوش ہوں۔ تمہاری طرف سے میرے دل میں ذرّہ برابر بھی کدورت نہیں۔" فصیح الدین نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"تم یہی بات حضرت شیخؒ کے سامنے کہہ دو۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے التجا کی۔ "میری خاطر یہ زحمت گوارہ کرلو۔"

"چلو! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" فصیح الدین نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اب مجھے اور کہاں جانا ہے؟"

پھر ہندوستان کا سب سے بڑا دانشمند، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ خانقاہ میں داخل ہوا اور مؤدبانہ بولا۔ "شیخ! مجھے بھی غلامی کا شرف عطا کیجئے۔"

"میں تمہیں کس طرح بیعت کروں کہ تم علم ظاہری میں بہت مبالغہ کرتے ہو۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

"میں اس علم سے تائب ہوتا ہوں جس نے مجھے حیرت و پریشانی کے سوا کچھ نہیں دیا۔"

اس اعتراف کے بعد فصیح الدینؒ حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور ساری زندگی حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں گزار دی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت بابا فریدؒ کا مشہور قول ہے۔ "حق تعالیٰ سے اپنی بندگی کے رشتے کو مضبوط کر کہ سب اس سے لیتے ہیں اور وہ سب کو دیتا ہے۔ جب وہ کسی کو دیتا ہے تو پھر کوئی اس سے چھیننے والا نہیں۔"

اس ذیل میں حضرت بابا فریدؒ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ایک بار میں اور میرے دوست قاضی حمید الدین ناگوری دریا کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ چلتے چلتے تھک گئے تو ایک جگہ بیٹھ گئے۔ پھر ہمیں شدت سے بھوک کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ دریا کے کنارے روٹی کہاں؟ ابھی ہم دونوں سوچ ہی رہے تھے کہ یکایک ایک بھیڑ نمودار ہوئی۔ اس کے منہ میں دو روٹیاں تھیں۔ وہ بھیڑ ہمارے نزدیک آئی اور روٹیاں رکھ کر چلی گئی۔ ہم نے کھانا کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر میں نے قاضی حمید الدین ناگوری سے کہا کہ یہ روٹیاں غیب سے آئی ہیں اس لئے ان کا لانے والا بھی مردانِ غیب میں سے تھا۔ قاضی صاحب نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ بظاہر وہ بھیڑ تھا مگر حقیقتاً کچھ اور۔ ابھی ہم دونوں اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ایک بچھو ظاہر ہوا جو اپنی جسامت میں شترمرغ کے

برابر تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ بچھو بہت تیز چل رہا تھا۔ دریا کے قریب پہنچ کر وہ پانی میں اُتر گیا۔ قاضی صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا کہ بچھو تو پانی میں نہیں تیرتے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے کہا کہ چلو دیکھتے ہیں یقیناً اس میں حق تعالیٰ کی کوئی حکمت ہے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ یہاں کوئی کشتی نہیں ہے۔ پھر ہم دریا کیسے عبور کریں گے؟ آخر ہم دونوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے کہ اے قادرِ مطلق! جب تُو نے اپنی محبت بخشی ہے تو اتنا کرم اور فرما کہ دریا کو پایاب کر دے۔ ابھی ہماری دعا کی گونج باقی تھی کہ دریا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور درمیان میں خشک راستہ ظاہر ہو گیا۔ ہم نے اس ذاتِ بے نیاز کا شکر ادا کیا اور بچھو کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ بچھو دریا سے نکل کر ایک درخت کی طرف بڑھا جس کے نیچے کوئی شخص سو رہا تھا۔ ناگہاں درخت سے ایک سانپ اُترا۔ وہ سوئے ہوئے مسافر کو ڈسنا چاہتا تھا کہ بچھو سانپ پر جھپٹا اور اسے ہلاک کر دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے بچھو ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ یقیناً یہ کوئی بزرگ ہے جس کی اللہ نے اس طرح حفاظت کی ہے۔ اس شخص سے ملاقات کا شوق ہوا مگر جب ہم اس کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی رند خراباتی ہے۔ قریب ہی اس نے قے کر دی تھی اور فضا میں شراب کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہم نے ایک ناگوار منظر دیکھنے کے لئے اپنا قیمتی وقت برباد کر دیا۔ پھر بھی یہ خیال ضرور آتا کہ اللہ نے ایک شراب نوش کی اس طرح حفاظت کی؟ ابھی ہم دونوں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ایک صدائے غیبی سنائی دی۔

"عزیزو! اگر اللہ صرف پارساؤں پر نظر رکھے تو پھر ان گناہ گاروں کی حفاظت کون کرے گا؟"

اسی دوران وہ شرابی شخص نیند سے بیدار ہو گیا۔ پھر جب اس نے اپنے قریب مُردہ سانپ کو دیکھا تو حیران و پریشان نظر آنے لگا۔ ہم نے پورا واقعہ بیان کر دیا جسے سن کر اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا پھر اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے اپنے مالک کو پکارا۔

"بے شک! تو کریم ہے۔ میرے گناہوں کو بخش دے کہ تیری رحمت کے سوا میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

پھر اس شراب نوش نے اس طرح توبہ کی کہ گناہوں کے کوچے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ستر حج کئے اور واصلانِ حق میں اس کا شمار ہوا۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "جب اس کے کرم کی نسیم چلتی ہے

تو ایک خراباتی کو پارسا بنا دیتی ہے......اور جب اس کے قہر کی آندھی چلتی ہے تو ہزاروں جبّہ و دستار اُڑتے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ گناہوں کی کیچڑ اُنہیں آلودہ کر دیتی ہے۔ اس لئے ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔"

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

حضرت بابا فریدؒ کی ظاہری شخصیت بھی دل نشیں تھی۔ دراز قامت، خوبصورت نقش و نگار۔ جو بھی ایک بار دیکھتا اس پر آپؒ کا ہیبت و جلال نقش ہو جاتا۔ کثرتِ فاقہ کشی اور کم خوراکی کے سبب جسم مبارک بہت کمزور نظر آتا تھا۔ ہمیشہ پیوند لگا ہوا لباس استعمال فرماتے تھے جبکہ والئ ہندوستان سلطان غیاث الدین بلبن آپؒ کے عقیدت مندوں میں شامل تھا اور اس نے کئی بار قیمتی لباسوں کے انبار خدمتِ عالیہ میں پیش کئے تھے۔

ایک بار کسی عقیدت مند نے ایک نیا پیرہن نذر کیا۔ آپؒ نے اُس کی دلجوئی کی خاطر بھری مجلس میں سب کے سامنے پہن لیا۔ پھر جب وہ شخص چلا گیا تو آپؒ نے کُرتہ اُتار کر اپنے چھوٹے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو دے دیا اور فرمایا۔

"ذوق تو پھٹے پرانے کپڑوں ہی میں ملتا ہے۔"

لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے کے پاس ایک پرانی گدڑی تھی۔ دن میں اس پر بیٹھ کر احکامِ شریعت سنائے جاتے اور رات میں اسی گدڑی کو چادر کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ اگر معرفت کا شہنشاہ اسے ذرا اوپر سر کا لیتا تو پاؤں کھل جاتے۔ پھر پیروں کو چھپانے کے لئے الگ سے پیوند لگا ایک کپڑا ڈال دیا جاتا۔

مرشد کا عصا تکیے کا کام دیتا تھا۔ جب دربارِ معرفت میں جلوہ افروز ہوتے تو ایک مختصر سی چادر جسم مبارک کی لاغری کو چھپانے کے لئے پردے کا کام دیتی......مگر دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوتا کہ اس پیوند زدہ لباس کے آگے دارا و سکندر کی قبائے زرنگار بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

خوراک مختصر اور سادہ تھی۔ اجودھن تشریف لائے تو برسوں "پیلو" کے پھلوں پر گزارا کیا پھر جب فتوحات کا دروازہ کھلا تو لنگر خانے کا دروازہ بھی نصف شب تک کھلا رہنے لگا۔ جماعت خانے میں تمام ضروری سامان موجود رہتا۔ مسافر اور خدمت گار سیر ہو کر کھاتے۔ ان میں قرآن کریم حفظ کرنے والوں کی کثرت ہوتی۔

حضرت بابا فریدؒ نے اس وقت تک روزے رکھے جب تک کہ آپؒ پر ناتوانی غالب نہ آگئی۔ اگر ہم اس مدت کا شمار کریں تو کم و بیش پچھتّر سال تک آپؒ کا یہ عمل جاری رہا۔

بعض معتبر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ "صوم دوام" کے عادی تھے۔ اس قسم کے روزے میں تیسرے دن افطار کیا جاتا ہے۔ آپؒ اکثر شربت سے افطار کرتے۔ کبھی کبھی اس میں کچھ منقّٰی ڈال دیئے جاتے تھے۔ آپؒ شربت میں سے تین تہائی حاضرین میں تقسیم کر دیتے اور ایک تہائی خود نوش فرماتے۔ نمازِ عشاء سے پہلے ایک سیر جوار کے آٹے کی دو روٹیاں پکائی جاتیں جن پر تھوڑا سا گھی مل دیا جاتا تھا۔ روٹی کے تین حصے بھی حاضرین میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح تین دن میں پاؤ سیر اناج آپؒ کے شکم مبارک میں پہنچتا تھا تاکہ ظاہری زندگی کا سلسلہ برقرار رہ سکے۔ پچانوے سال تک سخت ترین عبادتوں اور ریاضتوں میں مشغول رہنا، یہ آپؒ کی روحانی طاقت کا روشن ثبوت ہے......اور یہی آپؒ کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ اگر لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔

* * *

ہمیشہ سے علمائے ظاہر کا یہ مزاج رہا ہے کہ وہ مختلف انداز سے صوفیاء کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف سے درویشوں پر بے خبری اور کم علمی کا الزام عائد کیا جاتا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جب بھی علمائے ظاہر، صوفیاء کے مقابل ہوئے ہیں، انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہم آج کے زمانے کی بات نہیں کرتے کہ اب تو خانقاہ کی رسمیں ہی بدل گئی ہیں۔ لیکن جہاں تک اکابر صوفیاء کا سوال ہے تو کسی ایک صوفی کا دامن بھی دولتِ علم سے خالی نہیں تھا۔ ایک بزرگ کا مشہور قول ہے۔

"جاہل صوفی شیطان کا شکار ہوتا ہے۔ وہ جہاں چاہے اسے ہلاک کر ڈالے۔"

گزشتہ اوراق میں حضرت بابا فریدؒ کے علم کی مثالیں پیش کی جا چکیں۔ ہندوستان کے جن علماء کو اپنے عقل و ہوش اور کثرتِ مطالعہ پر ناز تھا وہ یا تو شکست کھا کر صوفیاء سے بحث کرنے کے قابل ہی نہیں رہے یا پھر حضرت بابا فریدؒ کی غلامی پر اس طرح رضامند ہو گئے کہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ جنگل سے لکڑیاں اپنے سر پر رکھ کر لاتے تھے......خواجہ احمدؒ پیر و مرشد کے کپڑے دھویا کرتے تھے......اور مولانا فصیح الدینؒ خانقاہ میں جھاڑو دیا کرتے تھے۔ خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ جو علم کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے اور جن کا لقب "بحاث شکن" تھا، حضرت شیخؒ اور دوسرے مریدوں کے لئے کھانا پکایا کرتے تھے۔

حضرت بابا فریدؒ صرف عالم و فاضل بزرگ ہی نہ تھے بلکہ اپنے علم کے اظہار پر بھی بے پناہ قدرت رکھتے تھے۔ ایک شخص بہت بڑا عالم ہو سکتا ہے مگر اچھا مقرر اور ادیب

نہیں ہو سکتا۔ حضرت بابا فریدؒ کی تقریروں میں ادیبانہ شان ہوتی تھی۔ آپؒ شاعری کا بھی نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔

ایک بار حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے جوشِ اشتیاق میں حضرت بابا فریدؒ کو خط لکھا۔

''میرے اور آپ کے درمیان عشق بازی ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ نے جواب میں تحریر فرمایا۔ ''میرے اور آپ کے درمیان عشق ہے، بازی نہیں۔''

کسی عقیدت مند نے ایک قینچی حضرت بابا فریدؒ کی نذر کی۔ آپؒ نے فرمایا۔

''مجھے قینچی کے بجائے سُوئی دو۔ میں جوڑتا ہوں، کاٹتا نہیں۔''

علم و فضل اور فصاحت و بلاغت کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ اگر انہیں یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ، مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اجودھن کے قریب ایک ملّا صاحب رہتے تھے۔ انہیں اپنے علمِ ظاہری پر بہت ناز تھا۔ درویشوں کو بے علم سمجھ کر ہمیشہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن ملّا صاحب، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مجلسِ روحانی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ملّا صاحب نے بیٹھتے ہی اپنی علمیت اور ہمہ دانی کے قصے شروع کر دیئے۔ حضرت بابا فریدؒ نہایت دلجمعی کے ساتھ ملّا صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ اہلِ مجلس کو ان کا یہ انداز بہت گراں گزر رہا تھا مگر حضرت شیخؒ کے احترام میں سب لوگ بھی خاموش بیٹھے رہے۔ ملّا صاحب کی طرف سے نمائشِ ذات کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔

پھر چند لمحوں کے لئے ملّا صاحب خاموش ہوئے تو حضرت بابا فریدؒ نے ان سے پوچھا۔ ''مولانا! یہ تو بتایئے کہ اسلام کے کتنے رُکن ہیں؟''

ملّا صاحب نے استہزائیہ نظروں سے حضرت بابا فریدؒ کی طرف دیکھا۔ ''یہ بھی کوئی سوال ہے؟ اس کا جواب تو معمولی علم رکھنے والا مسلمان بھی جانتا ہے۔ شیخ! کوئی عالمانہ سوال پوچھیے۔''

''مولانا! مجھے تو صرف اسلام کے رُکن بتایئے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے اپنا سوال دوہرا دیا۔

''اسلام کے پانچ رُکن ہیں۔'' ملّا صاحب کے چہرے سے ناگواری کا رنگ نمایاں ہوا جیسے وہ جبراً اس سوال کا جواب دے رہے ہوں۔ ''ایک کلمہ، دوسرا نماز، تیسرا روزہ، چوتھا زکوٰۃ اور پانچواں حج۔''

''مگر میں نے تو چھٹے رُکن کے بارے میں بھی سنا ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

''چھٹا رُکن کوئی نہیں ہے۔'' یکایک ملّا صاحب بھڑک اُٹھے۔ ''آپ نے جو کچھ سنا ہے، غلط ہے۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے تحمل کے ساتھ فرمایا۔ ''میں نے معتبر اہلِ علم سے سنا ہے کہ اسلام کا چھٹا رُکن روٹی ہے۔''

یہ سن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور نہایت تند و تیز لہجے میں حضرت بابا فریدؒ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''نصیحت کرنے کے بعد ظالم قوم کے پاس نہ بیٹھ۔' (ترجمہ) اسی لئے میں یہاں سے جاتا ہوں۔''

حضرت بابا فریدؒ بھی کھڑے ہو گئے اور بڑی محبت سے ملّا صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مولانا! اختلافِ رائے اپنی جگہ مگر آپ اس طرح ناراض ہو کر تو نہ جائیں۔''

حضرت بابا فریدؒ کچھ دیر تک ملّا صاحب کو منانے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ درویشوں کو ان کی جہالت کا طعنہ دے کر برا کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ملّا صاحب نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے ہوئے خانقاہ سے چلے گئے۔

ملّا صاحب کے جانے کے بعد مریدوں اور خدمت گاروں نے ان کے نازیبا طرزِ عمل کی شکایت کی تو حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''مہمان کیسا بھی تند خو ہو، مگر مہمان ہی ہوتا ہے۔ درویش پر مہمانوں کی تواضع فرض ہوتی ہے۔ سو ہم نے بھی مولانا کی تواضع کی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ملّا صاحب نے ہماری تواضع قبول نہیں کی۔ خیر! اللہ ان کا بھلا کرے۔''

ملّا صاحب، حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ سے اُٹھ کر گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔ کئی ماہ بعد انہوں نے حج کے سفر کا ارادہ کیا اور پوری تیاری کے ساتھ بیت اللہ کی زیارت کے لئے ہندوستان سے روانہ ہوئے۔ پھر مکہ معظمہ پہنچ کر حج کی سعادت سے مشرف ہوئے اور سات سال تک وہیں قیام کیا۔ اس کے بعد وطن واپسی کے خیال سے جہاز میں سوار ہوئے۔ موسم صاف اور خوش گوار تھا۔ جہاز بڑی سبک رفتاری کے ساتھ سمندر کی سطح پر چلا جاتا تھا کہ اچانک سخت طوفان آیا اور پورا جہاز تباہ ہو گیا۔ ملّا صاحب ایک تختے پر بہتے ہوئے کنارے تک پہنچے۔ پھر پانی سے نکل کر خشکی میں آئے۔ عجیب ویرانی کا عالم تھا۔

ملّا صاحب جہاں اُترے تھے، وہاں خشک پہاڑوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ نہ درخت تھے، نہ گھاس تھی اور نہ پانی کا کوئی چشمہ تھا۔

ملّا صاحب تین دن بھوک اور پیاس کی حالت میں پہاڑ کے ایک غار میں بیٹھے رہے۔ اچھے دنوں کو یاد کر کے روتے رہتے۔ پھر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

''میرے پالنے والے! میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے اس آفت سے نجات دے۔''

تین دن بعد یکایک وہاں ایک شخص آیا جس کے سر پر خوان تھا۔ اس نے آواز لگائی۔

''میں روٹی فروخت کرتا ہوں۔ یہاں کوئی ضرورت مند ہے؟''

آدم زاد کی آواز سن کر ملّا صاحب کی جان میں جان آئی۔ تین دن کے فاقوں نے ملّا صاحب کو بہت کمزور کر دیا تھا پھر بھی انہوں نے اپنے جسم و جاں کی تمام طاقتیں سمیٹ کر اس اجنبی شخص کو پکارا۔

''بھائی! میری طرف آؤ......آج اس دنیا میں مجھ سے زیادہ ضرورت مند انسان کوئی دوسرا نہیں۔''

روٹیاں فروخت کرنے والا غار میں داخل ہو گیا اور ملّا صاحب سے مخاطب ہوا۔

''آپ کو کتنی روٹیاں درکار ہیں؟''

ملّا صاحب نے بڑی حریصانہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ''بھائی! میں ہندوستان کا بہت بڑا عالم ہوں۔ میں نے سات حج کئے ہیں مگر اچانک مجھ پر یہ مصیبت نازل ہو گئی کہ میرا جہاز تباہ ہو گیا۔ میں تین دن سے بھوکا اور پیاسا ہوں۔''

''میرے پاس روٹی بھی ہے اور پانی بھی۔'' اس شخص نے کہا۔

''مگر میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔'' اپنی مجبوریوں کا احساس کر کے ملّا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ کی مجبوری یہ ہے کہ روٹی خریدنے کے لئے پیسے نہیں......اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں ایک دُکاندار ہوں۔ قرض کا کاروبار نہیں کرتا۔'' اس شخص نے کسی رعایت کے بغیر صاف صاف کہہ دیا۔

ملّا صاحب چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے، پھر اجنبی دکاندار سے بولے۔ ''کیا تم مسلمان ہو؟''

''الحمدللہ!'' دکاندار نے جواب دیا۔ ''میں ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہوں۔''

ملّا صاحب نے فوراً بھوکوں کو کھانا کھلانے کی فضیلت پر وعظ شروع کر دیا۔

دُکاندار کچھ دیر تک ملّا صاحب کی تقریر سنتا رہا، پھر بڑی صاف گوئی سے کہنے لگا۔

''میں بھوکوں کو کھانا کھلانے کے ثواب سے واقف ہوں مگر فی الحال آپ کو قیمت کے بغیر غذا اور پانی فراہم نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ دکاندار جانے لگا۔

ملّا صاحب نے چیخ کر کہا۔ ''تو کیا بے رحم مسلمان ہے کہ ایک بے یار و مددگار انسان کی مجبوریوں کا مذاق اُڑا رہا ہے۔''

یہ سن کر دُکاندار پلٹ آیا اور ملّا صاحب کے طنز کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر میں اسی طرح ضرورت مند لوگوں پر رحم کھاؤں تو چند روز میں میرا کاروبار ختم ہو جائے گا اور پھر میں خود لوگوں سے رحم کی بھیک مانگنے لگوں گا۔''

ملّا صاحب نئے انداز سے اس کی خوشامد کرنے لگے۔

آخر دکاندار نے کہا۔ ''چلئے! میں آپ پر رحم کھاتا ہوں۔ آپ مجھے اپنے ساتوں حجوں کا ثواب بخش دیں، میں اس کے بدلے میں آپ کو پانی اور روٹی دے دوں گا۔''

ملّا صاحب نے سوچا کہ زبانی طور پر کہہ دینے سے ثواب ختم نہیں ہوتا۔ میرے ساتوں حج برقرار رہیں گے اور مجھے بھوک اور پیاس سے نجات بھی مل جائے گی۔ یہ سوچ کر ملّا صاحب نے دکاندار سے کہا۔ ''میں نے تجھے اپنے ساتوں حجوں کا ثواب دیا۔''

دکاندار نے خوان ملّا صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ملّا صاحب نے جی بھر کے کھانا کھایا اور سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو انہوں نے دکاندار سے پوچھا۔ ''تم کہاں رہتے ہو؟ اور کیا یہاں کوئی آبادی بھی ہے؟''

''میں صرف روٹی فروخت کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔'' یہ کہہ کر دُکاندار نے خالی برتن اُٹھائے اور غار سے نکل گیا۔

ملّا صاحب اس کے تعاقب میں بھاگے تا کہ کسی آبادی تک نہ پہنچ سکیں......مگر ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ دکاندار پہاڑوں کے پیچ و خم میں کہیں غائب ہو گیا۔ ملّا صاحب کچھ دیر تک اسے ڈھونڈتے رہے اور پھر اس خیال سے غار میں واپس آ گئے کہ کہیں راستہ نہ بھول جائیں اور اس اجنبی علاقے میں کوئی نئی آفت نازل نہ ہو جائے۔

ملّا صاحب ایک اُمیدِ موہوم پر اجنبی کا انتظار کرنے لگے مگر تین دن تک وہ نہیں آیا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے ایک بار پھر ملّا صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ آخر چوتھے دن وہی دکاندار سر پر خوان رکھے نمودار ہوا۔ ملّا صاحب کسی بھکاری کے مانند اس کے سامنے گڑگڑانے لگے۔

"آپ تو آج بھی تہی دست اور تہی دامن ہیں۔" دکاندار نے ملّا صاحب سے کہا۔

"اب آپ کے پاس فروخت کرنے کے لئے کیا باقی رہ گیا ہے؟"

"میرے روزے باقی ہیں۔" ملّا صاحب نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

دکاندار نے اُنہیں کھانا کھلا دیا اور ملّا صاحب کے تمام روزوں کا ثواب لے کر چلا گیا۔

تین دن بعد جب ملّا صاحب بھوک اور پیاس کی شدت سے چیخنے لگے تو وہ دکاندار سر پر خوان رکھے غار میں داخل ہوا اور ملّا صاحب کی زکوٰۃ کا ثواب لے کر واپس چلا گیا۔

ملّا صاحب پھر بھوک اور پیاس کا شکار ہو گئے۔ چوتھے دن وہی شخص اسی انداز سے آیا اور تمام عمر کی نمازوں کے ثواب کے بدلے میں ایک وقت کی روٹی اور پانی دے کر چلا گیا۔

تین دن کے وقفے کے بعد پانچویں بار وہ شخص غار میں داخل ہوا تو ملّا صاحب اُسے دیکھتے ہی چیخ چیخ کر رونے لگے۔ "میں اپنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تیرے ہاتھوں فروخت کر چکا۔ اب تجھے دینے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اب تک آپ نے سارے وعدے زبانی کئے ہیں۔" یہ کہہ کر اجنبی شخص نے خوان زمین پر رکھ دیا۔ "میں کاغذ، قلم اور دوات لے کر آیا ہوں۔ آپ نے جو کچھ بیچا ہے، اس کی تحریری سند مجھے دے دیجئے۔"

ملّا صاحب نے یہ عبارت کاغذ پر درج کر دی۔ "میں نے ایک وقت کی روٹی اور پانی کے بدلے میں اس شخص کے ہاتھوں اپنے ساتوں حجوں کا ثواب فروخت کیا۔ پھر زندگی بھر کے روزوں کا ثواب فروخت کیا۔ پھر ساری عمر کی زکوٰۃ کا ثواب فروخت کیا اور آخر میں تمام نمازوں کا ثواب فروخت کر دیا...... اور آج میں ایک وقت کی روٹی اور پانی کے بدلے میں یہ تحریر لکھ کر دے رہا ہوں۔" آخر میں ملّا صاحب نے اپنا نام اور مکمل پتہ درج کر دیا۔

جب دستاویز مکمل ہو گئی تو اجنبی شخص نے خوان ملّا صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ملّا صاحب کھانے کے دوران یہ سوچ کر مضطرب ہو رہے تھے کہ آج کے بعد اجنبی شخص یہاں نہیں آئے گا۔ پھر چوتھے دن ملنے والی روٹی اور پانی کا آسرا بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ خیال ملّا صاحب کے لئے نہایت تکلیف دہ تھا۔ اُن کے ذہن میں مختلف خیالات اُبھر رہے تھے اور وہ اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی تدبیر سوچ رہے تھے۔

آخر کھانا ختم ہوا تو ملّا صاحب نے ہاتھ جوڑ کر اس اجنبی شخص سے کہا۔ "خدا کے

واسطے مجھے بتا دو کہ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟ تاکہ میں تمہارے ساتھ وہاں چلوں اور دو وقت کی روٹی کے لئے محنت مزدوری کروں۔ اب میرے پاس فروخت کرنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔"

دکاندار نے ملّا صاحب کا تحریر کردہ کاغذ جیب میں رکھا اور اپنے برتن اُٹھا کر جانے لگا۔

ملّا صاحب تازہ دم تھے۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ وہ بھاگ کر اجنبی کو پکڑ لیں گے۔ پھر جب وہ دوڑے تو دکاندار بھی بھاگنے لگا۔ کچھ دور جا کر ایک جگہ اجنبی نے ٹھوکر کھائی اور زمین پر گر گیا۔ ملّا صاحب پیچھے تھے۔ انہوں نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کی مگر اتفاق سے انہوں نے بھی ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ اجنبی شخص نے برتن سمیٹے اور اس سے پہلے کہ ملّا صاحب سنبھلنے کی کوشش کرتے، وہ بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ملّا صاحب اپنی ناکامی پر افسوس کرنے لگے۔ پھر جب انہوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو سامنے سمندر تھا۔ مجبوراً کنارے پر بیٹھ کر کسی کشتی یا جہاز کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک جہاز نظر آیا۔ ملّا صاحب نے اپنا عمامہ اُتار کر دیوانہ وار ہوا میں لہرایا اور چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکارنے لگے۔

اتفاق سے جہاز کے کسی مسافر کی نظر ملّا صاحب پر پڑی اور پھر ناخدا نے اپنے سفینے کا رُخ ساحل کی طرف موڑ دیا۔ خوش قسمتی سے یہ جہاز ہندوستان کی طرف جا رہا تھا اور اس میں ہندوستانی حاجی سوار تھے۔ جہاز کے مسافروں نے ملّا صاحب کی خوب خاطر مدارات کی۔ یہاں تک کہ ملّا صاحب بخیر و عافیت گھر پہنچ گئے اور بیوی بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

پھر ایک دن ملّا صاحب اپنی ریاضت و عبادت کا احوال سنانے کے لئے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت شیخؒ کی خانقاہ میں بڑے بڑے علماء اور مشائخ موجود تھے۔ ملّا صاحب کو دیکھتے ہی حضرت بابا فریدؒ اُن کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور مزاج پُرسی کرتے ہوئے فرمایا۔

"آئیے ملّا صاحب! بہت دنوں میں تشریف لائے۔ ہم تو ہمیشہ آپ کو یاد کیا کرتے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اتنے عرصے تک آپ کا دیدار نہیں ہو سکا۔"

ملّا صاحب نے حضرت بابا فریدؒ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی بے دلی اور ناگواری کے ساتھ مصافحہ کیا اور حضرت بابا فریدؒ کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کا

انداز بڑا متکبرانہ تھا۔ حاضرین مجلس کو ملاّ صاحب کی یہ ادا سخت ناگوار گزری۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ جیسے ملاّ صاحب حضرت بابا فریدؒ کے ہمسر ہیں یا ان سے بھی زیادہ مرتبہ رکھتے ہیں۔ کئی علماء اور مشائخ نے چاہا کہ وہ ملاّ صاحب کو ٹوکیں اور ان سے کہیں کہ مسند سے اُٹھ کر حضرت شیخؒ کے سامنے دست بستہ بیٹھیں...... مگر حضرت بابا فریدؒ کے رعب و جلال کے باعث کسی کو اظہار کی جرأت نہ ہو سکی۔

''ہاں، ملاّ صاحب! آپ نے بتایا نہیں کہ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟ ہم تو آپؒ کے دیدار کو ترس گئے تھے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔

''میں یہاں ہوتا تو آتا۔'' ملاّ صاحب نے انتہائی خشک لہجے میں جواب دیا۔

''آخر پتہ تو چلے کہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟'' حضرت بابا فریدؒ کے ہونٹوں پر وہی جانفزا تبسم نمایاں تھا۔

''میں ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔'' ملاّ صاحب کے چہرے سے نخوت وغرور کا رنگ جھلک رہا تھا۔ ''حج کرنے گیا تھا۔ سات سال تک مکہ معظمہ میں مقیم رہا۔ سات بار مدینہ منورہ کی زیارت کی اور سات حج ادا کیے۔ حرمین شریفین میں نمازوں اور روزوں کا جو زیادہ ثواب ملتا ہے، وہ سب میں نے حاصل کیا۔ سات سال بعد وطن لوٹا ہوں۔ واپسی میں جہاز کی تباہی کا صدمہ بھی اُٹھایا مگر حق تعالیٰ کے کرم سے راستے کی مصیبتیں ختم ہوئیں اور میں بخیر و عافیت گھر پہنچ گیا۔ اہل و عیال کو خوش و خرم اور سلامت پا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔''

ملاّ صاحب کی روداد سن کر حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''ملاّ صاحب! واقعی آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ سات حج کیے، سات بار مدینہ منورہ کی زیارت کی، سات سال تک حرمین شریفین میں نمازیں پڑھیں، سات رمضانوں کے روزے رکھے۔ سبحان اللہ! آپ نے بڑی سعادتیں حاصل کیں۔ اب تو آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں؟''

''میں آپ سے خفا ہی کب ہوا تھا؟'' ملاّ صاحب نے اسی خشکی اور بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

''سات سال پہلے آپ یہاں سے ناراض ہو کر گئے تھے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''میں اسی خفگی کا ذکر کر رہا ہوں۔''

ملاّ صاحب نے حضرت بابا فریدؒ کا عاجزانہ طرزِ عمل دیکھا تو کچھ اور مغرور ہو گئے۔ بڑی بے نیازی کے ساتھ کہنے لگے۔ ''مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ آپ یاد دلائیں گے تو شاید یاد آ جائے۔''

حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ اسلام کے کتنے رُکن ہوتے ہیں؟ جواب میں آپ نے پانچ معروف ارکان کا ذکر کیا تھا مگر میرا اصرار تھا کہ چھٹا رکن روٹی ہے۔ آپ اسی بات پر خفا ہو کر چلے گئے تھے اور جاتے وقت آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ بھی پڑھی تھی کہ 'نصیحت کرنے کے بعد ظالموں کے پاس نہ بیٹھو۔' (ترجمہ) گویا اب اس طرح آپ نے ہمیں ظالم قرار دے دیا تھا۔ اس بات کا ہمیں بڑا صدمہ تھا۔ پھر بھی ہم آپ کو روزانہ یاد کرتے رہتے تھے۔''

یہ سن کر ملاّ صاحب زور سے ہنسے۔ ان کی ہنسی کا انداز بھی مذاق اُڑانے والا تھا۔ ''ہاں! مجھے یاد آیا۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ درویش لوگ اپنی کم علمی کے سبب ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ اسلام میں کوئی چھٹا رُکن نہیں ہے۔''

''مولانا! اگرچہ میں بے علم یا کم علم ہوں مگر میں نے یہ بات لکھی ہوئی دیکھی ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے حاضرین مجلس سے کہا۔ ''میں کچھ دیر کے لئے تنہائی چاہتا ہوں۔''

خلوت ہوتے ہی حضرت بابا فریدؒ نے وہ کتاب ملاّ صاحب کے حوالے کر دی۔ ''ملاحظہ فرمایئے۔''

ملاّ صاحب کی پیشانی پر بل نمایاں تھے۔ انہوں نے حضرت بابا فریدؒ کے ہاتھ سے کتاب لے کر ورق گردانی شروع کر دی پھر انتہائی ناگوار لہجے میں بولے۔ ''یہ کیا مذاق ہے؟ آپ نے مجھے کتاب دی ہے یا سادہ اوراق کا دفتر؟ اس میں کوئی تحریر تو کجا، کسی حرف کا بھی نشان نہیں ہے۔''

''مولانا! آگے دیکھئے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

ملاّ صاحب کتاب کی ورق گردانی کرتے رہے۔ ہر ورق سادہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ملاّ صاحب پھر کسی مذاق کا ذکر کرتے، یکایک ان کی نظر ایک عبارت پر پڑی۔ یہ وہی تحریر تھی جس میں ملاّ صاحب نے اپنی زندگی بھر کی عبادتوں کا ثواب ایک نان فروش کے ہاتھوں فروخت کر ڈالا تھا۔ ملاّ صاحب چند لمحوں تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے پھر ایک زور کی چیخ ماری اور حضرت بابا فریدؒ کے قدموں میں گر پڑے۔

''شیخ! میں نے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے۔'' ملاّ صاحب رو رو کر اپنی زیادتیوں کا اعتراف کر رہے تھے۔

''اُٹھیں ملاّ صاحب! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' حضرت بابا فریدؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''ایک معمولی سا اختلاف تھا، وہ آج دور ہو گیا۔''

ملاّ صاحب اپنے غرور، تکبر، جھوٹی شان اور جارحانہ روش سے تائب ہوئے اور حضرت بابا فریدؒ کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ مرید ہونے کے بعد کسی نے انہیں بولتے نہیں دیکھا۔ جب تک زندہ رہے، ہر وقت روتے رہتے تھے۔

اس بزرگانہ شان کے باوجود حضرت بابا فریدؒ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ اپنی مجالس میں عام لوگوں کے ساتھ چٹائی پر بیٹھتے تھے۔ کسی کرسی یا مسند پر کبھی جلوہ افروز نہ ہوتے۔ آپؒ کی محفل روحانی میں ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی معزز ترین فرد معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کسی فاجر و فاسق کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی جلیل القدر ہستی سے مخاطب ہے۔

ایک بار حضرت والا کے پاؤں میں تکلیف تھی جس کے سبب زمین پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ مجبوراً مجلس میں ایک چارپائی پر تشریف فرما ہوئے۔ مگر آپؒ کو نشست کا یہ انداز پسند نہیں تھا اس لئے درس کے دوران بار بار حاضرین سے معذرت کرتے ہوئے فرماتے تھے۔

''اگر مجھے یہ مجبوری لاحق نہ ہوتی تو میں ہرگز اس اونچی جگہ پر نہ بیٹھتا۔''

آپؒ کے خلوص و انکسار کا یہ مظاہرہ دیکھ کر حاضرین مجلس رونے لگے۔ ''اللہ آپ کو صحت بخشے کہ ہماری زندگی تو آپ ہی کے دم سے وابستہ ہے۔''

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

حضرت بابا فریدؒ کی عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔ ہر رات دو قرآن شریف ختم فرماتے تھے۔ نماز کے علاوہ طویل سجدے ادا کرتے تھے۔ رمضان المبارک میں ہر رات تراویح کے دوران دو قرآن شریف سنایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں تراویح بیٹھ کر پڑھتے تھے مگر فرض نماز کھڑے ہو کر ادا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر استغراق اور جذب کی کیفیت طاری رہتی۔ اسی حالت میں کسی خدمت گار نے عرض کیا۔

''شیخ زادہ نظام الدینؒ نے فلاں شخص کی معرفت آپ کو سلام بھیجا ہے۔''

شیخ زادہ نظام الدینؒ، حضرت بابا فریدؒ کے سب سے محبوب صاحبزادے تھے اور پٹیالی میں رہتے تھے۔

''کون نظام الدین؟'' حضرت بابا فریدؒ نے خدمت گار کی بات سن کر عرض کیا۔

خدمت گار حیران و پریشان کھڑا رہا۔ ''آپ کے محبوب فرزند۔''

''کون فرزند؟'' حضرت بابا فریدؒ نے خادم سے دریافت کیا۔

آخر کئی بار کے سمجھانے پر آپؒ نے اپنے صاحبزادے کو پہچانا، پھر فرمایا۔ ''نظام

الدین خیریت سے تو ہیں؟''

پھر یہی استغراق و جذب کی کیفیت آپؒ کو راہِ فنا سے منزلِ بقاء کی طرف لے گئی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ پیر و مرشد کو ''خلّہ'' کا مرض لاحق ہوا اور پھر اسی مرض میں آپؒ نے انتقال فرمایا۔ خلّہ ایک ایسی بیماری ہے جس میں پہلو اور جوڑوں کا درد یکایک حملہ آور ہوتا ہے۔

حاضرین مجلس میں سے کسی شخص نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے پوچھا کہ کیا آپ پیر و مرشد کی وفات کے وقت موجود تھے؟

اس سوال پر حضرت نظام الدین اولیاء کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر اسی اشک ریزی کے دوران آپؒ نے فرمایا۔

''حضرت شیخؒ نے مجھے شوال کے مہینے میں دہلی روانہ کیا تھا اور آپؒ کی وفات پانچ محرم کو ہوئی تھی۔ وصال کے وقت پیر و مرشد نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ تو دہلی میں ہے۔ یہ سن کر آپؒ نے فرمایا کہ میں بھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے انتقال کے وقت ہانسی میں تھا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ یہ واقعہ بیان کرتے وقت روتے جاتے تھے۔ آپؒ کی یہ کیفیت دیکھ کر حاضرین مجلس پر بھی گریہ طاری ہو گیا تھ۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو فراقِ شیخؒ کا ذکر سن کر بھیگ نہ گئی ہو۔

مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''پانچویں محرم کو مرض کی شدت بڑھ گئی۔ حضرت شیخؒ نے عشاء کی نماز با جماعت ادا کی اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد ہوش میں آئے تو حاضرین سے پوچھا۔

''کیا میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟''

''سیّدی! آپ نماز با جماعت ادا کر چکے ہیں۔'' خدام نے دست بستہ عرض کیا۔

''میں دوبارہ عشاء کی نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''اللہ ہی جانتا ہے کہ پھر کیا ہو؟'' یہ کہہ کر آپؒ نے دوبارہ نماز ادا کی اور پھر بے ہوش ہو گئے۔

اس بار بے ہوشی کا وقفہ زیادہ طویل تھا۔ دوسری مرتبہ ہوش آیا تو خدام سے پوچھا۔

''کیا میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟''

خدام نے عرض کیا۔ ''سیّدی! آپ دو بار نماز ادا کر چکے ہیں۔''

''میں ایک بار اور نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''اللہ ہی جانتا ہے کہ پھر کیا ہو۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے تیسری بار عشاء کی نماز ادا کی اور پھر سجدے کی حالت

میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

حضرت بابا فریدؒ نے نماز ہی سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور نماز ہی میں آپؒ کی سانسوں کا شمار ختم ہوا۔

سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ مقدس ہے کہ ''نماز مومن کی معراج ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ کو بھی یہ معراج حاصل ہوئی اور اس شان سے کہ آخری سجدہ ادا کرنے کے بعد آپؒ کی آنکھوں نے کوئی دوسرا منظر نہیں دیکھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے دریافت کیا گیا کہ وفات کے وقت حضرت بابا فریدؒ کی عمر مبارک کیا تھی؟

''پچانوے سال۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ فرمایا۔ ''انتقال کے وقت حضرت شیخؒ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے۔ ''یا حی یا قیوم۔''

حضرت بابا فریدؒ 666ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

❀ ..... ❀ ❀ ..... ❀

حضرت بابا فریدؒ کے تمام صاحب زادوں کا اس پر اتفاق تھا کہ آپؒ کو اجودھن کی فصیل کے باہر اس مقام پر سپرد خاک کیا جائے جہاں شہداء مدفون ہیں۔ اسی غرض سے آپؒ کے جنازے کو فصیل کے باہر لے جایا گیا۔ ابھی نماز جنازہ کا اہتمام کیا جا رہا تھا کہ عین موقع پر آپؒ کے محبوب ترین صاحب زادے حضرت شیخ نظام الدینؒ تشریف لے آئے۔ اس وقت وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے ملازم تھے اور پٹیالی میں مقیم تھے۔ شیخ زادہ نظام الدینؒ نے کچھ دن پہلے خواب میں دیکھا تھا کہ والد محترم اُنہیں یاد فرما رہے ہیں۔ آپؒ نے فوراً ہی سلطان سے رخصت کی اجازت لی اور اجودھن روانہ ہو گئے۔ شیخ زادہ نظام الدینؒ اسی رات اجودھن پہنچے جس رات حضرت بابا فریدؒ کا وصال ہوا تھا۔ آپؒ نے شہر میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر تمام دروازے بند ہو چکے تھے اس لئے مجبوراً پوری رات شہر کے باہر گزاری۔

وفات سے پہلے حضرت بابا فریدؒ بار بار فرماتے تھے۔ ''نظام الدین آ تو گیا ہے مگر کیا فائدہ کہ اب اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔''

پھر جب صبح ہوئی اور شیخ نظام الدینؒ شہر میں داخل ہونے کے لئے فصیل کے دروازے تک پہنچے تو سامنے سے حضرت بابا فریدؒ کا جنازہ آ رہا تھا۔

شیخ نظام الدینؒ نے بے مثال صبر وضبط کا مظاہرہ کیا مگر والد محترم کی محبتیں یاد کر کے آپؒ کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو گئیں۔ پھر بھائیوں سے پوچھا کہ حضرت شیخؒ کو کہاں آسودۂ خاک کرو گے؟

''فصیل کے باہر جہاں شہداء کی قبریں ہیں۔'' بھائیوں نے جواب دیا۔ ''یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت شیخؒ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔''

''اگر تم نے حضرت شیخؒ کو فصیل کے باہر دفن کیا تو کوئی بھی تم پر اعتبار نہیں کرے گا۔'' بھائیوں کی بات سن کر شیخ نظام الدینؒ نے کہا۔ ''جو عقیدت مند بھی حضرت شیخؒ کی زیارت کو آئے گا، وہ باہر ہی سے فاتحہ پڑھ کر چلا جائے گا۔''

الغرض شیخ نظام الدینؒ کے مشورے سے جنازہ فصیل کے اندر لایا گیا اور اس جگہ دفن کیا گیا جہاں آپؒ کا مزار مبارک موجود ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت شیخؒ سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو مسکینوں کا وہ حجرہ جو لکڑی اور گارے سے بنا ہوا تھا، اسے پختہ اینٹوں سے تعمیر کرا دوں۔

جواب میں حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''سات سال پہلے میں نے عہد کیا تھا کہ اینٹ پر اینٹ نہیں رکھوں گا۔''

الغرض جب حضرت شیخؒ کا انتقال ہوا تو اسی حجرے کو توڑ کر آپؒ کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔ آپؒ کا روضۂ مبارک اسی مقام پر ہے جہاں یہ حجرہ موجود تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخؒ کی لحد کے لئے کچی اینٹیں تک موجود نہیں تھیں۔ مجبوراً پیر و مرشد کے مکان سے چند کچی اینٹیں نکال کر لحد میں لگائی گئیں۔

یہ ہے اس مردِ فقیر کی آخری آرام گاہ جس کے سامنے بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔

❀ ..... ❀ ❀ ..... ❀

پہلی بیوی نجیب النساء سے حضرت بابا فریدؒ کی سات اولادیں تھیں۔ چھ بچے کم سنی میں انتقال کر گئے۔ صرف بی بی شرف النساء جوانی کی منزل تک پہنچیں۔ آپ مشہور بزرگ حضرت مخدوم علی صابر کلیریؒ کی شریکِ حیات تھیں۔

دوسری بیوی خاتون بیگم سے دس اولادیں ہوئیں۔ حضرت شیخ شہاب الدین گنج علمؒ آپؒ کے فرزند اکبر تھے...... حضرت شیخ نظام الدین شہیدؒ، حضرت بابا فریدؒ انہیں سب

سے زیادہ چاہتے تھے۔ شیخ نظام الدینؒ، سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں رنتھمبور کے مقام پر شہید ہوئے...... حضرت شیخ بدر الدین سلیمانؒ، بعض تذکرہ نویسوں کے خیال میں یہ حضرت بابا فریدؒ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے...... حضرت شیخ محمد یعقوبؒ، بعض روایتوں کے مطابق امروہہ جا کر مردانِ غیب میں شامل ہو گئے تھے...... حضرت بی بی فاطمہؒ، مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی اہلیہ تھیں جن کا مزار مبارک دہلی میں ہے...... حضرت بی بی شریفہؒ، جن کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا...... حضرت شیخ عبداللہ بیابانیؒ، جنہیں مفسدین کی ایک جماعت نے بچپن ہی میں شہید کر دیا تھا...... حضرت بی بی مستورہؒ، جن کا انتقال شادی کے بعد ہوا۔ ان کے شوہر کا نام شیخ عمر صوفیؒ تھا...... حضرت بی بی ہاجرہؒ اور حضرت بی بی زینبؒ، ان دونوں صاحبزادیوں کا انتقال شیر خوارگی کے زمانے میں ہوا۔

حضرت بابا فریدؒ کی نسبی اولادیں سترہ تھیں...... مگر روحانی فرزندوں کا کوئی شمار نہیں۔ عقیدت اور غلامی کا یہ سلسلہ حشر تک جاری رہے گا۔ فارسی زبان کا مشہور شعر ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(جس کا دل عشق میں زندہ ہو جاتا ہے اسے ہرگز موت نہیں آتی۔ زمانے کے اوراق پر ہمیشہ کے لئے ہمارا نام ثبت کر دیا گیا ہے)

حضرت بابا فریدؒ کی حیاتِ دوام کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ جب صاحبقران امیر تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو سب سے پہلے اس نے آپؒ کے مزار مبارک پر حاضری دی۔ فاتح ایشیاء امیر تیمور کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ "لرزندۂ جہاں" تھا اور بڑے بڑے سلاطین اس کے نام سے خوف زدہ رہتے تھے...... مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جب امیر تیمور، حضرت بابا فریدؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپؒ کے جلالِ روحانی کے اثر سے کانپ رہا تھا۔

پھر اسی فاتح ایشیاء کی نسل سے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر پیدا ہوا۔ ہر چند شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کو خدا بنانے کی کوشش کی تھی مگر مغل شہنشاہ زندگی بھر بزرگانِ دین کے حلقۂ اثر سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس نے کئی بار حضرت بابا فریدؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی اور اجودھن کا نام بدل کر پاک پتن رکھ دیا۔ آج یہ شہر اسی عقیدت کی یادگار ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ ولادت	....	636ھ
تاریخ وفات	....	725ھ
مزار مبارک	....	دہلی

خاندانی نام سیّد محمدؒ...... والد محترم سید احمد بخاریؒ...... مادر گرامی بی بی زلیخاؒ...... اپنے پیر و مرشد حضرت بابا فریدؒ کی طرح پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔ اپنے وقت کے فاضل ترین اساتذہ سے حدیث، فقہ، ہیئت، اصول، تفسیر اور علم ہندسہ کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے علم کی وسعت اور قوتِ استدلال کے سبب "محفل شکن" کہلائے...... اور نوجوانی ہی میں تمام علمائے ہند پر سبقت لے گئے۔ عوام میں آپؒ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ قیامت تک کے لئے محبوب الٰہیؒ قرار پائے۔ سلطان علاء الدین خلجی جیسا با جبروت حکمراں زندگی بھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زیارت کے لئے ترستا رہا مگر آپؒ نے اسے ملاقات کا شرف نہیں بخشا۔

سیّد عربؒ کا تعلق خاندانِ سادات سے تھا۔ آپؒ ایک طویل عرصے سے بخارا میں مقیم تھے۔ تجارت آپؒ کا پیشہ تھا اور اللہ نے آپؒ کی روزی میں بہت برکت دی تھی۔ مشہور مؤرخ خافی خان کی روایت کے مطابق حضرت سیّد عربؒ، حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خاندانِ چشتیہ کے یہ وہی مشہور بزرگ ہیں جو سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیر و مرشد تھے۔ اس طرح حضرت سیّد عربؒ اور حضرت خواجہ غریب نوازؒ میں رشتۂ سادات کے علاوہ رشتۂ روحانی بھی موجود تھا۔ حضرت سیّد عربؒ بہت دنوں سے ہندوستان جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے تاکہ اس ملک کے حالات کا جائزہ لے کر تجارتی روابط قائم کر سکیں۔

کچھ دن بعد حضرت سیّد عربؒ نے خواب میں دیکھا۔ کوئی شخص انہیں مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ''سیّد! تمہارا ارادہ نیک ہے، ہندوستان چلے جاؤ۔''

اب سیّد عربؒ کو یقین ہو گیا کہ عازمِ ہندوستان ہونے کا خیال بے سبب نہیں تھا۔ آپؒ نے زوجہ محترمہ سے اپنا خواب بیان کیا، وہ ایک وفا شعار خاتون تھیں۔ انہوں نے شوہر کے خواب کو حقیقت سمجھا اور رضامندی کا اظہار کر دیا۔

حضرت سیّد علی بخاریؒ، حضرت سیّد عربؒ کے حقیقی چچا زاد بھائی بھی تھے اور دونوں میں بہت گہری دوستی بھی تھی۔ جب سیّد عربؒ ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے تو سیّد علی بخاریؒ بھی ہمراہ تھے۔ کچھ دنوں تک یہ دونوں بزرگ اور دونوں بھائی لاہور میں مقیم رہے اور پھر ان دونوں سیّد خاندانوں نے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سیّد عربؒ کے دو صاحبزادے تھے۔ خواجہ عبداللہؒ اور خواجہ سیّد محمودؒ۔ ایک صاحبزادی بی بی زلیخاؒ تھیں جنہیں زہد و تقویٰ کے سبب اپنے زمانے کی رابعہ بصریؒ کہا جاتا تھا۔ سیّد عربؒ کے سیکڑوں خدمت گار تھے جو آپؒ کے پیسے سے تجارت کرتے تھے۔ سیّد عربؒ کا شمار امیر و کبیر لوگوں میں ہوتا تھا۔ جب بی بی زلیخاؒ جوان ہوئیں تو سیّد عربؒ نے اپنے چچا زاد بھائی اور دوست سیّد علی بخاریؒ سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے خاندانی رشتے زیادہ مضبوط ہو جائیں۔''

سیّد علی بخاریؒ، سیّد عربؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔ ''یہ رشتے روزِ اوّل کی طرح مضبوط ہیں اور بفضلِ خدا آئندہ بھی اسی طرح استوار رہیں گے۔''

''علی! تم جانتے ہو کہ میری بچی زلیخا سن بلوغت کو پہنچ چکی ہے اس لئے میں اس کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔'' سیّد عربؒ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''کوئی لڑکا آپ کی نظر میں ہے؟'' سیّد علیؒ نے پوچھا۔

''تمہارے بیٹے سیّد احمد سے بہتر لڑکا کون ہو سکتا ہے؟'' سیّد عربؒ نے دوست کے سامنے اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔

''نہیں شیخ! وہ آپ کے ہم پایہ نہیں ہے۔'' سیّد علیؒ نے کسی تکلّف کے بغیر کہا۔ ''میرے اور آپ کے معاشی حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ظلم ہے کہ ناز و نعم میں پرورش پانے والی لڑکی کو ایک ایسے شخص سے وابستہ کر دیا جائے جس کے ذرائع آمدنی بہت زیادہ محدود ہوں۔''

''علی! تم نہیں جانتے کہ کثرتِ مال کے باوجود میں نے اپنے بچوں کو فقر و قناعت کی تعلیم دی ہے۔'' سیّد عربؒ نے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس نوجوان کے ہاتھ میں دے رہا ہوں جو زہد و تقویٰ اور علم کی دولت سے مالا مال ہے۔''

آخر سیّد علیؒ اس نئے رشتے پر رضامند ہو گئے اور 615ھ میں سیّد احمد بخاریؒ اور بی بی زلیخاؒ کی شادی ہو گئی۔

بیٹی کی شادی کے ایک سال بعد 616ھ میں سیّد عربؒ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

سیّد احمد بخاریؒ، بی بی زلیخاؒ جیسی نیک سیرت خاتون سے وابستگی کے بعد بہت خوش تھے لیکن حالات کی تنگی کے باعث اکثر کہا کرتے تھے۔ ''میں تمہیں وہ آسائشیں نہیں دے سکتا جن کی تم بچپن سے عادی رہی ہو۔''

بی بی زلیخاؒ اپنے شریکِ زندگی کی تالیفِ قلب کے لئے عرض کرتیں۔ ''ایک مسلمان عورت کی آسائشوں کی معراج یہ ہے کہ اس کا شوہر اس سے راضی رہے۔''

''بی بی! میں دل و جان کے ساتھ تم سے راضی ہوں مگر یہ خلش مجھے ہمیشہ بے چین رکھتی ہے۔'' سیّد احمد بخاریؒ ایک حساس انسان تھے۔ اس لئے بی بی زلیخاؒ کی تکلیف کا خیال کر کے بے قرار ہو جاتے تھے۔ شادی سے پہلے یہ صورت تھی کہ بی بی زلیخاؒ کی خدمت کے لئے کئی نوکرانیاں مامور تھیں........ اور اب یہ حال تھا کہ انہیں اپنے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کاج کرنا پڑتا تھا۔

پھر کچھ دن بعد سلطان شمس الدین التمش کے حکم کے مطابق سیّد احمد بخاریؒ کو بدایوں کے عہدۂ قضا پر فائز کر دیا گیا۔ والئ ہندوستان نے سیّد احمد بخاریؒ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''مجھے دیر سے خبر ملی کہ بدایوں میں آپ جیسا صاحبِ کردار شخص موجود ہے۔ براہِ کرم

عہدۂ قضا قبول فرمایئے اور اسلامی سلطنت کے استحکام میں میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ انصاف کے تقاضوں کو پورا کریں گے اور اس مقدس عہدے کو امراء کی دراز دستیوں سے محفوظ رکھیں گے۔"

حضرت سیّد علی بخاریؒ نے سلطان شمس الدین التمش کا شکریہ ادا کیا اور اس دعا کے ساتھ کرسئ انصاف پر جلوہ افروز ہوئے۔

"اے قادر و عادل! اپنے اس کمزور بندے سیّد علی کو اتنی طاقت عطا کر کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔"

حضرت سیّد علی بخاریؒ نے کبھی کسی امیر و وزیر کی سفارش قبول نہیں کی اور آزادانہ فیصلے کئے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ برسرِ اقتدار طبقے کے کسی فرد کو ملزم کی حیثیت سے عدالت میں لایا جاتا مگر آپؒ اسے کسی قسم کی رعایت نہ دیتے۔ آپؒ کے اس طرزِ عمل کے خلاف دربارِ سلطانی میں شکایت کی گئی کہ سیّد احمد بخاریؒ امراء کا لحاظ نہیں رکھتے۔

والئ ہندوستان شکایت کرنے والوں کو سرِ دربار جھڑک دیتا۔ "سیّد احمد بخاریؒ حسن و خوبی اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ اگر مجھے یہ اطلاع دی جاتی کہ بدایوں کے قاضی امراء کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں تو میں ان کی گرفت کرتا۔ یہ تو ان کے منصف ہونے کی روشن دلیل ہے کہ وہ مقدمے کے دوران بیرونی اثرات کو قبول نہیں کرتے۔ آئندہ اس قسم کی شکایتیں کر کے میرا وقت برباد نہ کیا جائے۔"

حضرت سیّد احمد بخاریؒ کی زندگی پُرسکون تھی مگر پھر بھی ایک خلش انہیں مضطرب رکھتی تھی۔ شادی کو پندرہ سال ہو چکے تھے مگر سیّد احمد بخاریؒ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ بی بی زلیخاؒ بھی اکثر اُداس رہا کرتی تھیں۔ سیّد احمدؒ انہیں مختلف انداز میں تسلیاں دیتے۔ جواب میں بی بی زلیخاؒ فرماتیں۔

"میں اُداس ضرور ہوں مگر رحمتِ حق سے مایوس نہیں ہوں۔"

آپؒ اکثر رات کے سناٹے میں وہ دعا مانگا کرتے تھے جو حضرت زکریا علیہ السلام کا وِرد تھا۔ اللہ کے یہ محبوب پیغمبر اولاد کی تمنا کرتے کرتے بوڑھے ہو چکے تھے مگر آپؑ نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ روزانہ نصف شب کو خالقِ کائنات کے سامنے اپنا دامنِ مراد پھیلا دیتے تھے اور گریہ وزاری کے ساتھ عرض کرتے تھے۔

"اے میرے رب! مجھے تنہا نہ چھوڑ کہ تُو بہتر وارث دینے والا ہے۔" (ترجمہ)

پھر ایک دن جلیل القدر نبی حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے جو حضرت زکریا علیہ السلام کی مراد تھے۔

حضرت سیّد احمد بخاریؒ بھی رات کی تاریکیوں میں غم ناک آنکھوں کے ساتھ یہی دعا مانگا کرتے تھے۔

آخر دعائیں مقبول ہوئیں اور 636 ھ میں بی بی زلیخاؒ کے بطن سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جس کے چہرے کی روشنی سے گھر کے در و بام منور ہو گئے۔ بچے کا نام منور رکھا گیا۔ پھر اسی بچے نے "نظام الدین اولیاءؒ" کے نام سے شہرت پائی اور "محبوب الٰہی" کے لقب سے سارے عالم میں مشہور ہوئے۔

دوسرے سال بی بی زلیخاؒ کے بطن سے ایک صاحب زادی پیدا ہوئیں۔ ابھی سیّدوں کا یہ گھرانا خدائے بزرگ و برتر کی بخشی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اچانک سیّد احمد بخاریؒ بسترِ علالت پر دراز ہو گئے۔ قاضئ شہر ہونے کی وجہ سے بعض شاہی طبیبوں نے بھی آپؒ کا علاج کیا مگر بیماری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔

ساعتِ فراق قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی اور وہ مردِ خدا بہت جلد اس دنیا سے جانے والا تھا جس کے دم سے صرف بی بی زلیخاؒ ہی کے گھر میں نہیں بلکہ پورے بدایوں میں کردار و علم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اللہ کی وہ عام مخلوق بھی بے اماں ہو جانے والی تھی جس کے دلوں کو سیّد احمد بخاریؒ کا بڑا سہارا تھا۔ منصبِ قضا پر فائز ہونے کے دوران حضرت سیّد احمد بخاریؒ نے تمام اعلیٰ سفارشات اور آمرانہ دباؤ کو نظرانداز کرتے ہوئے ایسے فیصلے کئے تھے جن سے ظالم، ظالم قرار پایا تھا...... اور مظلوم، مظلوم ٹھہرا تھا۔ آج وہی منصف و عادل انسان دوسری دنیا کے سیر کی تیاریاں کر رہا تھا۔

پھر وقتِ معلوم آ پہنچا۔ سانسوں کا شمار ختم ہونے میں چند ساعتیں باقی تھیں۔ حضرت سیّد احمد بخاریؒ نے اپنی شریکِ حیات حضرت بی بی زلیخاؒ سے نحیف و نزار آواز میں کہا۔

"بی بی! سیّد محمد کو میرے قریب لاؤ۔"

زوجہ محترمہ نے شوہر کے حکم کی فوری تعمیل کی۔ سیّد محمد (نظام الدین اولیاءؒ) کو والد محترم کے رُوبرو لایا گیا۔ جیسے ہی حضرت سیّد احمد بخاریؒ کی بے قرار نظریں اپنے معصوم فرزند کے چہرے پر پڑیں۔ آپؒ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر رب ذوالجلال کے حضور عرض کرنے لگے۔

"اے میرے اللہ! تیری قدرتِ کاملہ کو کسی ظاہری سبب کی حاجت نہیں۔ تیری ذات پاک تو وہ ہے کہ جس نے اسباب و وسائل کے بغیر یہ عظیم الشان کائنات تخلیق کر دی۔ تیری صفت خلاقی کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے کہ تُو نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ

کے پیدا کیا پھر جب منکرین ابنِ مریمؑ کی پیدائش کے بارے میں گمراہ ہو کر جھگڑنے لگے تو تُو نے اپنے کلامِ مقدس کے ذریعے ان سے سوال کیا۔

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! یہ لوگ عیسیٰؑ کا باپ نہ ہونے کی وجہ سے شبے میں مبتلا ہوئے۔ ان سے کہو کہ آدم علیہ السلام کی تو نہ ماں تھیں اور نہ باپ۔ پھر بھی ہم انہیں عدم سے وجود میں لے آئے۔ ہمارے لئے زمین و آسمان کو مٹا دینا یا برقرار رکھنا ذرا بھی مشکل نہیں۔"

"اے میرے رب! میں تجھ سے تیری اسی قدرت اور کرم کا سوال کرتا ہوں۔ تُو نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی یتیم پیدا کیا تھا اور پھر اسی بے سہارا بچے کو سارے عالموں کے لئے رحمت بنا دیا۔ میں بھی آج رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واسطے سے تیرے سامنے اپنا دستِ طلب دراز کرتا ہوں۔ مجھے ناکام و نامراد واپس نہ کر کہ تیرے سوا میری کوئی پناہ گاہ نہیں۔ میرا کوئی دستگیر اور کوئی مشکل کشا نہیں، میں تیرے ہی حکم سے تیری بارگاہِ عزت و جلال میں حاضر ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے سایۂ رحمت میں چھپا لے...... اور میری زوجہ اور میرے بچے سیّد محمد کو بے یار و مددگار نہ چھوڑ۔ انہیں زمانے کے حادثات سے محفوظ رکھ اور ہدایت دینے کے بعد ان کے دلوں میں ٹیڑھ نہ ڈال۔ یہ جب تک زندہ رہیں انہیں دینِ حنیف پر قائم رکھ اور جب یہ دنیا سے رخصت ہوں تو ان کی زبانوں پر تیری وحدانیت اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا ذکر جاری ہو۔ ان کی کوششوں کو کامیابی سے ہم کنار کر اور ان کی گواہیوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما کہ تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں۔"

اس دعا کے بعد حضرت سیّد احمد بخاریؒ نے اہلیہ محترمہ سے فرمایا۔ "سیّد محمد کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ وقتِ رخصت آ پہنچا۔ ہر شے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والی ہے۔ مجھے بھی میرے رب کے حضور لے جایا جا رہا ہے۔"

شوہر کا حکم سنتے ہی حضرت بی بی زلیخاؒ، سیّد محمد کو دوسرے کمرے میں لے گئیں......
اور پھر جیسے ہی واپس آئیں تو سیّد احمد بخاریؒ کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری تھا جو ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے رسول ہیں۔"

اپنے عقیدے پر آخری گواہی دینے کے بعد حضرت سیّد احمد بخاریؒ نے زوجہ محترمہ کی طرف دیکھا اور نہایت شکستہ لہجے میں کہا۔ "الوداع میری امین و پاک باز ہم سفر......

الفراق! میرے معصوم فرزند سیّد محمد!"

پھر وہ جب چراغ بجھ گیا جو بخارا میں روشن ہوا تھا اور جس کی آخری لو تھرتھرانے سے پہلے خاکِ بدایوں ہمیشہ کے لئے ضیاء بار ہو گئی۔

❀ ...... ۞ ۞ ...... ❀

بدایوں میں ایک بہت بڑا تالاب "ساگر تال" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت سیّد احمد بخاریؒ کو اسی تالاب کے کنارے سپردِ خاک کیا گیا۔ وصال کے بعد ایک زمانے تک آپؒ کی قبر مبارک کا نشان تو ملتا تھا مگر ایک مردِ خدا کی آخری آرام گاہ دیگر عمارتوں کے مقابلے میں نمایاں نہیں تھی۔

پھر کئی صدیاں گزر جانے کے بعد روہیل کھنڈ کے حکمراں حافظ رحمت خان روہیلہ ایصالِ ثواب کے لئے حضرت سیّد احمد بخاریؒ کی قبر مبارک پر حاضر ہوئے۔ پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے حافظ رحمت خان روہیلہ نے چار دیواری بھی بنوائی اور گنبد بھی تعمیر کرایا۔ اس کے ساتھ ہی مزار سے ملحقہ ایک مسجد کی بنیاد ڈالی اور اسے بھی تکمیل تک پہنچایا۔

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مادرِ گرامی حضرت بی بی زلیخاؒ ایک امیر و کبیر بزرگ حضرت خواجہ عربؒ کی صاحب زادی تھیں لیکن آپؒ نے اپنے والد کی دولت کے ذخائر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ انتہا یہ ہے کہ بیوگی کا لباس پہننے کے بعد اس دروازے کی جانب نگاہ نہ کی جہاں آپؒ کا پورا بچپن اور جوانی کے ابتدائی چند سال گزرنے لگے۔ حضرت سیّد احمد بخاریؒ کے انتقال کے بعد حضرت بی بی زلیخاؒ کے بھائیوں نے اپنی بہن کی مالی استعانت کرنی چاہی مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی والدہ ایک غیور خاتون تھیں۔ آپؒ نے بھائیوں کے اس محبت آمیز سلوک کا شکریہ ادا کیا اور محنت و مزدوری کر کے اپنی زندگی کے جاںگداز لمحات گزارنے لگیں۔

اس وقت حضرت بی بی زلیخاؒ کے گھر میں کھانے والے چار افراد تھے۔ ایک خود آپؒ کی ذات، دوسرے حضرت نظام الدین اولیاءؒ، تیرے محبوب الٰہیؒ کی چھوٹی بہن اور چوتھے گھر کی ایک ملازمہ۔ ان سب کی کفالت کی ذمہ داریاں تنہا حضرت بی بی زلیخاؒ پر آ پڑی تھیں۔ آپؒ دن رات سوت کاتتیں اور پھر اسے ملازمہ کے ہاتھ بازار میں فروخت کرا دیتیں۔ اس طرح جو کچھ رقم حاصل ہوتی، اس سے گزر اوقات کرتیں۔ یہ آمدنی اتنی قلیل ہوتی کہ معمولی غذا کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ شدید محنت کے باوجود ہفتے میں ایک فاقہ ضرور ہو جاتا۔ جس روز فاقہ ہوتا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ

مادر گرامی سے کھانا مانگتے تو حضرت بی بی زلیخاؒ بڑے خوشگوار انداز میں فرماتیں۔

''بابا نظام! آج ہم سب اللہ کے مہمان ہیں۔''

حضرت بی بی زلیخاؒ کا بیان ہے کہ میں جس روز سیّد محمد سے یہ کہتی کہ آج ہم لوگ اللہ کے مہمان ہیں تو وہ بہت خوش ہوتے۔ سارا دن فاقے کی حالت میں گزر جاتا مگر وہ ایک بار بھی کھانے میں کوئی چیز طلب نہ کرتے اور اس طرح مطمئن رہتے کہ اللہ کی مہمانی کا ذکر سن کر انہیں دنیا کی ہر نعمت میسر آ گئی ہو۔

پھر جب دوسرے دن کھانے کا انتظام ہو جاتا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی محترم ماں کے حضور عرض کرتے۔ ''مادرِ گرامی! اب ہم کس روز اللہ کے مہمان بنیں گے؟''

والدہ محترمہ جواب دیتیں۔ ''بابا نظام! یہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر شے اس کی دست نگر ہے۔ وہ جب بھی چاہے گا، تمہیں اپنا مہمان بنا لے گا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ مادر گرامی کی زبان سے یہ وضاحت سن کر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو جاتے اور پھر نہایت سرشاری کے عالم میں یہ دعا مانگتے۔

''اے اللہ! تُو اپنے بندوں کو روزانہ اپنا مہمان بنا۔''

اللہ کی مہمانی کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس روز فاقہ کشی کی حالت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پانچ سال کی عمر میں یہ دعا، یہ خواہش اور یہ آرزو؟ اہلِ دنیا کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی....... مگر وہ جنہیں اس کائنات کا حقیقی شعور بخشا گیا اور جن کے دل و دماغ کو کشادہ کر دیا گیا وہ اس راز سے باخبر ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا تھا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ انتہائی کم سنی کے عالم میں اللہ کا مہمان بننے کی آرزو کیوں کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک مقام پر کہا ہے۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت آپ کر لیتی ہے لالے کی حنا بندی
وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اسی ذاتِ پاک نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بھی پانچ سال کی عمر میں یہ ذوق بخشا تھا کہ آپؒ اللہ کا مہمان بننے کی آرزو کرتے تھے۔

حضرت نظام الدنی اولیاءؒ کی تعلیم کا سلسلہ والد محترم کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا

لیکن اس وقت تک آپؒ کسی مکتب میں داخل نہیں کئے گئے تھے۔ پھر جب حضرت سیّد احمد بخاریؒ دنیا سے رخصت ہو گئے تو والدہ محترمہ نے کچھ دنوں تک خود ہی اپنے فرزند کی تربیت کی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ بہت کم سن تھے۔ الغرض چھ یا سات سال کی عمر میں حضرت بی بی زلیخاؒ نے سیّد محمدؒ کو مولانا شادی مقریؒ کے مکتب میں داخل کرا دیا۔

مولانا شادی مقریؒ بدایوں کے رہنے والے ایک صاحب کرامت بزرگ تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے استاد گرامی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''مولانا شادی مقریؒ کی ایک کرامت یہ تھی کہ اگر کوئی شخص ان سے قرآن شریف کی ایک سورۃ بھی بڑھ لیتا تو اس کی برکت سے اسے پورا قرآن کریم حفظ ہو جاتا۔ میں نے بھی مولانا شادی مقریؒ سے ایک پارہ پڑھا تھا، پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا ذہن روشن ہو گیا ہے، جو آیت بھی تلاوت کرتا وہ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی۔ یہاں تک کہ استاد محترم کے فیض روحانی سے کسی خاص اہتمام کے بغیر مجھے پورا قرآن پاک حفظ ہو گیا۔''

ایک اندازہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دس سال کی عمر میں اللہ کی آخری مقدس کتاب کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد آپؒ نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، مگر کسی استاد کی رہنمائی کے بغیر علم کے اسرار و رموز تک رسائی ممکن نہیں تھی، اس لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مولانا علاء الدین اصولیؒ کی شاگردی اختیار کی۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی عمر مبارک گیارہ بارہ سال تھی۔

مولانا اصولیؒ نے ابتداء میں کچھ مذہبی کتابیں پڑھائیں، پھر اپنے شاگرد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اسلامی فقہ کی اہم ترین کتاب ''قدوری'' کی تعلیم دینا شروع کی۔ ''قدوری'' امام احمد بن محمدؒ کی تصنیف ہے۔ امام احمد، بغداد کے ایک محلے ''قدور'' کے رہنے والے تھے۔ اس لئے امام قدوریؒ کے نام سے شہرت دوام حاصل کی۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود ''فقۂ حنفی'' پر اس قدر جامع تصنیف ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی، اس کی عظمت و انفرادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

جب امام قدوریؒ کی یہ کتاب قریب الختم تھی تو ایک دن مولانا علاء الدین اصولیؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے فرمایا۔ ''سیّد! اب تم ایک منقبت اور ایک بڑی کتاب ختم کر رہے ہو۔ اس لئے تمہیں لازم ہے کہ اپنے سر پر دانش مندی کی دستار بندھواؤ۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے استادگرامی کی بات سنی اور خاموش ہو گئے۔ مگر جیسے ہی آپؒ مکتب سے گھر پہنچے تو شدید اضطرابی کیفیت میں والدہ محترمہ سے عرض کرنے لگے۔ ''استادِ گرامی چاہتے ہیں کہ میں قدوری (کتاب فقہ) ختم کرنے سے پہلے اپنے سر پر دستار باندھوں۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اضطراب کی وجہ آپؒ کے معاشی حالات تھے۔ دستار بندی کا واضح مفہوم تھا کہ اس تقریب میں بدایوں کے ممتاز علماء کی خاطر مدارات کا اہتمام کیا جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ یہی سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ جس گھر میں دو وقت کی روٹی بمشکل میسر آتی ہو، وہاں مہمانوں کی تواضع کس طرح کی جا سکتی ہے؟

حضرت بی بی زلیخاؒ اپنے فرزند کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوئیں اور نہایت سرشاری کے عالم میں فرمانے لگیں۔ ''بابا نظام! تم اس سلسلے میں ذرا بھی فکر مند نہ ہو، تمہارے استاد کی یہ خواہش جلد پوری ہو جائے گی۔''

اس کے بعد حضرت بی بی زلیخاؒ نے دن رات سوت کاتنا شروع کر دیا اور اسے ملازمہ کے ذریعے بازار میں فروخت کراتی رہیں۔ پھر آپؒ نے اسی سوت سے کپڑا بُنا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لئے دستار تیار کی۔ ظاہر پرستوں کی جماعت شاید اس دستار کی قیمت کا اندازہ نہ کر سکے، مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ وہ معمولی سوتی کپڑے کی دستار بہت قیمتی تھی۔ اس دستار کی تیاری میں اس مہربان ماں کے شب و روز کا خون شامل تھا جس نے اپنے امیر و کبیر باپ کی دولت کو اس وقت بھی قبول نہیں کیا تھا جب اس نے بیوگی کی قبا پہنی تھی۔ پھر یہ حلال روزی، پرہیزگار ہاتھوں کی مزدوری، غرض ان ہی تمام چیزوں نے مل کر اس سوتی کپڑے کی دستار کو تاجِ شاہی سے بھی زیادہ گراں قدر بنا دیا تھا۔

پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زندگی کا وہ یادگار دن بھی آیا جب آپؒ نے فقہ حنفی کی اس عظیم کتاب کو ختم کر لیا۔ اس کے بعد حضرت بی بی زلیخاؒ نے کھانا تیار کرایا اور بدایوں کے جلیل القدر علماء کو دعوت دی۔

جب بدایوں کے تمام علماء جمع ہو چکے تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت خواجہ علیؒ کے ہمراہ مجلس میں داخل ہوئے۔ حضرت بی بی زلیخاؒ کی طرف سے پہلے مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت بی بی زلیخاؒ نے سوت کات کر جو رقم جمع کی تھی، وہ کم تھی اور مہمان نوازی کے اخراجات زیادہ تھے۔ حضرت نظام الدین

اولیاءؒ نے یہ رقم اپنے استادگرامی مولانا علاء الدین اصولیؒ کے سامنے رکھ دی اور اپنی عاجزی کا اظہار کیا۔

''یہ چند سکے بھی ہزار دشواریوں کے بعد جمع ہوئے ہیں۔''

''تم کیوں پریشان ہوتے ہو سیّد محمد؟'' مولانا علاء الدین اصولیؒ نے اپنے شاگردِ خاص کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔ اور جتنی رقم حضرت بی بی زلیخاؒ نے جمع کی تھی، اپنے پاس سے اتنی ہی رقم اس میں ملا دی۔

کھانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے والدہ محترمہ کی تیار کی ہوئی دستار مولانا علاء الدین اصولیؒ کے سامنے رکھ دی۔ مولانا اصولیؒ نے دستار کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں رکھا اور دوسرا حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سر پر۔ پھر حضرت خواجہ علیؒ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

''اجازت ہے؟''

''آپ سیّد محمد کے استاد ہیں۔'' حضرت خواجہ علیؒ نے فرمایا۔ ''آپ کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔''

''مگر میں آپ کی اجازت کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔'' مولانا علاء الدین اصولیؒ نے فرمایا۔

''تو پھر بسم اللہ کیجئے۔'' حضرت خواجہ علیؒ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ''اللہ برکت دے گا۔''

حضرت خواجہ علیؒ کے ارشادِ گرامی کے بعد مولانا علاء الدین اصولیؒ نے اپنے شاگرد کے سر پر دستارِ فضیلت باندھنی شروع کر دی۔ حاضرین نے اس مجلس روحانی میں بڑا جانفزا منظر دیکھا۔ زمانۂ حال کا عالم مستقبل کے عالم کو اپنے علم کی امانت منتقل کر رہا تھا۔

دستار بندی کے بعد مولانا علاء الدین اصولیؒ نے حضرت خواجہ علیؒ سے دعا کی درخواست کی۔

حضرت خواجہ علیؒ نے ایک نظر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف دیکھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''اے خدائے بحر و بر! جس طرح تُو نے مجھ گم راہ کو صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی توفیق بخشی، اسی طرح اس بچے پر بھی اپنے رحم و کرم کی بارش فرما۔ میں تو بت پرستوں کی اولاد تھا اور قزاقی میرا پیشہ تھا...... لیکن سیّد محمد (نظام الدین اولیاءؒ) تو تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل پاک کا نمائندہ ہے۔ پرہیزگاروں کی اولاد ہے۔ اس کی خاندانی

عظمت کو برقرار رکھ اور سیّد زادے کو علمائے دین میں شامل فرمالے اور اپنی قدرتِ بے پناہ کے صدقے میں اسے جرأت وصداقت کے اعلیٰ درجے پر پہنچادے۔"

حضرت خواجہ علیؒ کے لہجے میں اس قدر گداز تھا کہ اہلِ مجلس بے اختیار ہوکر رونے لگے۔ مولانا علاء الدین اصولیؒ کی آنکھیں بھی نم ناک ہوگئیں۔ خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی آبدیدہ نظر آرہے تھے۔

پھر جب حضرت خواجہ علیؒ کی دعاؤں کا سلسلہ ختم ہوا اور دستار بندی کی رسم ادا ہو چکی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی نشست سے اُٹھے۔ سب سے پہلے آپؒ نے حضرت خواجہ علیؒ کی دست بوسی کی کہ اس وقت بدایوں میں وہی ولایت کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔

حضرت خواجہ علیؒ کی دست بوسی کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے استادِ گرامی کی طرف بڑھے اور مولانا علاء الدین اصولیؒ کی دست بوسی سے شرف یاب ہوئے۔ مولانا اصولیؒ نے بھی اپنے محبوب ترین شاگرد کو اس طرح دعائیں دیں کہ شدتِ جذبات سے اہلِ مجلس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر عام رسم دعا ادا کی گئی اور اس طرح تمام علمائے بدایوں کی دعاؤں کے سائے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے علم کے نئے سفر کا آغاز ہوا۔

اسی تقریب میں مولانا علاء الدین اصولیؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اللہ نے چاہا تو اس بچے کا سر کسی انسان کے آگے خم نہیں ہوگا۔"

مولانا علاء الدین اصولیؒ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک دن مولاناؒ بدایوں کی گلیوں میں پھر رہے تھے۔ اس وقت آپؒ کا لڑکپن تھا۔ اچانک حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی نظر ان پر پڑی۔ حضرت شیخؒ نے انہیں مخاطب کرکے فرمایا۔

"لڑکے! ادھر آؤ۔"

مولانا علاء الدین اصولیؒ آگے بڑھے اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے سامنے ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

"یہ تم نے کیا لباس پہن رکھا ہے؟" حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

مولانا علاء الدین اصولیؒ نے اپنے کپڑوں پر نظر کی اور شرمندہ نظر آنے لگے۔ "میں ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں۔ اس لئے اچھا لباس نہیں پہن سکتا۔"

"میں تمہاری غربت اور افلاس کی بات نہیں کررہا ہوں۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "تمہارے جسم پر یہ لباس مناسب نظر

نہیں آتا۔"

مولانا علاء الدین اصولیؒ نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ "پھر کیا کروں؟"

"آؤ! میں تمہیں نیا لباس پہناتا ہوں۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنا پیرہن مبارک اُتارا اور مولانا علاء الدین اصولیؒ کو پہنادیا۔

"یہ تو بہت بڑا ہے۔" مولانا علاء الدین اصولیؒ اس وقت لڑکے تھے۔ اس لئے حضرت شیخؒ کی قبا آپؒ کے جسم پر موزوں نظر نہیں آتی تھی۔

"اسے پہنا کرو لڑکے! اللہ تم پر اپنا فضل فرمائے گا۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نصیحت کی۔

مولانا علاء الدین اصولیؒ اکثر قبائے شیخ کو زیبِ تن فرماتے تھے۔ محلے کے بچے مذاق اُڑایا کرتے تھے کہ یہ لباس کس سے مانگ کر لایا ہے۔ مولانا اصولیؒ اپنے ساتھیوں کی طنز آمیز گفتگو سنتے مگر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے پیرہن مبارک کو اپنے جسم سے علیحدہ نہ کرتے۔ اس زمانے کے بزرگانِ دین کا قول ہے کہ مولانا علاء الدین اصولیؒ میں جو استقامت و کرامت نظر آتی تھی وہ سب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے لباس کی برکت تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ بدایوں کے تمام بڑے بزرگوں سے اکتسابِ علم کر چکے تو مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ دہلی روانہ ہو گئے۔ یہ 641ھ کا زمانہ تھا۔ بعض مؤرخین کی تحقیق کے مطابق 651ھ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دہلی کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس سفر میں چار افراد شامل تھے۔ حضرت بی بی زلیخاؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، آپؒ کی چھوٹی ہمشیرہ اور ایک عزیز بزرگ مولانا عوض۔

سیّد امیر خوردؒ نے اپنی تصنیف "سیّد الاولیاء" میں سفرِ دہلی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب تک یہ مختصر سا قافلہ شہری حدود سے گزرتا رہا، مولانا عوض پُرسکون رہے...... مگر جیسے ہی تاریک اور گھنے جنگل کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا عوض پریشان نظر آنے لگے۔ اس جنگل میں درندوں کے ساتھ چوروں اور قزاقوں کا بھی مسکن تھا جو موقع ملتے ہی مسافروں کو لُوٹ لیا کرتے تھے۔ مولانا نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح دن کے اُجالے میں جنگل کا سفر ختم ہوجائے مگر دو خواتین کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔ مجبوراً اس قافلے کو رات کے وقت تاریک جنگل میں قیام کرنا پڑا۔ تاریکی اور سناٹے کے سبب اگر کوئی پتا بھی کھڑکتا تو مولانا عوض کو کسی رہزن کی آمد کا گمان ہوتا اور بے اختیار پکار اُٹھتے۔

''اے پیر! تشریف لائیے.......اے پیر! تشریف لائیے۔''

اسی طرح جب کسی شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی تو مولانا عوض نے وہی الفاظ دہرا دیئے۔''اے پیر! تشریف لائیے۔''

الغرض رات بھر جنگل میں مولانا عوض کی آواز گونجتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ سورج طلوع ہوتے ہی یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مولانا عوض سے دریافت کیا۔

''محترم! یہ کون پیر ہیں جنہیں آپ رات بھر پکارتے رہے ہیں؟''

مولانا عوض نے جواباً کہا۔''میں شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کو پکارتا تھا۔ اللہ نے ان کے صدقے میں ہمارا یہ مشکل ترین سفر آسان کر دیا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ جیسے ہی مولانا عوض نے حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کا ذکر کیا، میرے دل پر ایک خاص اثر ہوا حالانکہ اس سے پہلے میں جانتا بھی نہیں تھا کہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کون بزرگ ہیں؟

دہلی پہنچ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ کے ساتھ ایک سرائے میں قیام کیا۔ یہ سرائے دہلی کے ایک بازار میں بنائی گئی تھی اور ''سرائے نمک'' کے نام سے مشہور تھی۔ سیّد امیر خوردؒ کی روایت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مادر گرامی اور ہمشیرہ کو اسی سرائے میں ٹھہرایا اور خود سرائے کے سامنے ایک کمان ساز کے مکان میں ٹھہرے۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کا مکان بھی اسی محلے میں تھا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی عمر مبارک سولہ سال تھی۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی تشریف لائے تو اس وقت یہ شہر اہلِ کمال کا مرکز تھا۔ جس طرح دیگر علوم وفنون کے ماہرین یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح ممتاز علمائے دین نے بھی اپنے قیام سے دہلی کو شرف بخشا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کچھ دنوں تک مختلف علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے لیکن کسی مجلس میں آپؒ کو ایسی کشش محسوس نہیں ہوئی کہ اس جگہ سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ پھر ایک دن آپؒ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کی بارگاہِ علم میں حاضر ہوئے۔ اس مجلس کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ در و دیوار تک سے ہیبت و جلال کی بارش ہوتی تھی کہ ہر آنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا تھا۔ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ سے تعارف کے بغیر ہی لوگ سمجھ لیتے تھے کہ یہ کسی مردِ قلندر کی مجلس ہے،

جس نے صرف اپنے اللہ کی مرضی کے لئے علم حاصل کیا ہے اور اللہ کی رضا کی خاطر ہی اس دولتِ لازوال کو اس کے بندوں میں تقسیم کر رہا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے پہلے دن ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ پوری دہلی میں تنہا ایسے عالم ہیں جن کی تعلیم و تربیت سے انسانی دل و دماغ روشن ہو سکتے ہیں۔ آخر درس شروع ہوا۔ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کی پُر جلال آواز گونجی اور تمام اہلِ مجلس کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ شدید حیرت کے عالم میں مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کا رُخِ تابناک دیکھنے لگے۔ آپؒ نے اپنی زندگی میں پہلی بار علم کے سمندر کو موجزن دیکھا تھا۔ درس کے دوران حضرت نظام الدین اولیاءؒ بار بار ایک ہی بات سوچتے رہے کہ آپؒ کا یہ سفر رائیگاں نہیں گیا اور شوقِ طلب نے آپؒ کو صحیح مقام تک پہنچا دیا ہے۔

پھر جب درس ختم ہوا تو مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے پچھلی صفوں کی طرف دیکھا۔ وہاں آپؒ کا ایک شاگرد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ حضرت مولانا نے اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔ شاگرد فوراً کھڑا ہو گیا مگر بارِ ندامت سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے بھری مجلس میں اپنے اس شاگرد سے دریافت کیا۔

''کل تم کہاں تھے کیا تمہیں حصولِ علم سے بھی زیادہ کوئی ضروری کام تھا؟'' مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کے لہجے سے انتہائی ناخوشگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

شاگرد کے پاس مولاناؒ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بدستور خاموش کھڑا رہا۔

آخر مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے نہایت شگفتہ لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔''میرے بچے! مجھے اتنا بتا دو کہ میں نے تمہارا کیا قصور کیا تھا جو تم میرے درس میں نہیں آئے؟ خدا کے لئے میری غلطی کی نشاندہی کرو تاکہ آئندہ بھی میں اسی غلطی کو دہراؤں اور تم اسی طرح درس میں شامل نہ ہو سکو۔ یہاں تک کہ میں مسلسل غلطیاں کرتا رہوں اور پھر تم مستقل طور پر میرے درس میں آنا چھوڑ دو۔''

مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کی اس گفتگو سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ نادرِ روزگار عالم انسانی ہجوم سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے اور صرف ان ہی لوگوں کو اپنا علم منتقل کرنا چاہتا ہے جو حقیقتاً اپنے سینوں میں علم کی طلب نہیں، بھڑکتی ہوئی آگ رکھتے ہیں۔

پھر جب تمام طالب علم درس ختم ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو

مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے ایک ایسے نوجوان کو دیکھا جو دست بستہ، سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مولاناؒ کو حیرت ہوئی۔ آج سے پہلے آپؒ نے اس نوجوان کو اپنی مجلس میں شریک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

''میرے قریب آؤ!'' بالآخر مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو مخاطب کیا۔

جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ قریب پہنچے تو مولانا نے آپؒ سے سوال کیا۔ ''تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اپنا مختصر تعارف پیش کیا۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟'' مولانا نے دوسرا سوال کیا۔

''علم کی طلب مجھے بدایوں سے دہلی لائی تھی۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لہجے میں شوق کے ساتھ روح کا وہ سوز بھی شامل تھا جو قدرت کی طرف سے کسی انسان کو بخشا جاتا ہے۔ ''دہلی پہنچ کر مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ اس شہر میں علم کا سمندر بھی موجود ہے۔''

مولانا شمس الدین خوارزمیؒ بہت غور سے نوجوان کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ عالم جو بڑے بڑے اہلِ کمال کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اسے سولہ سال کے ایک طالب علم نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ''تم جسے علم کا سمندر کہہ رہے ہو، وہ کون ہے؟'' مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے دریافت کیا۔

''وہ سمندر آپ ہیں۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لہجے سے انتہائی عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''تم سمندر اور دریا میں تمیز کر سکتے ہو؟'' مولانا شمس الدینؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل ہے جس کی بنیاد پر تم مجھے علم کا سمندر کہہ رہے ہو؟''

''نہیں! میں کوئی دلیل نہیں رکھتا۔'' مولاناؒ کے اس سوال پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنی عاجزی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ ''میں اپنے محسوسات کو لفظوں کی زبان نہیں دے سکتا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا جواب سن کر مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر بدایوں سے آنے والے نوجوان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''حصولِ علم سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ تم دیکھ رہے ہو کہ ہزاروں انسان علم حاصل کر

رہے ہیں۔ اپنے کاندھوں پر کتابیں لادنے والوں کا ایک ہجوم ہے۔ آخر تم اس ہجوم میں کیوں شامل ہونا چاہتے ہو؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پاس بظاہر اس سوال کا کوئی ایسا جواب نہیں تھا جو مولانا شمس الدین خوارزمیؒ جیسے عالم و فاضل انسان کو مطمئن کر دیتا مگر پھر بھی آپؒ نے لب کشائی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ''بس میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے جسم پر بھی کتابیں لاد دیں۔ یہ بوجھ جہالت اور بے علمی کے بوجھ سے تو کہیں بہتر ہوگا۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بصد احترام عرض کیا۔ ''میں زندگی بھر، کم سے کم اس تصور سے تو سرشار رہوں گا کہ میرے جسم پر یہ بوجھ حضرت مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے لادا ہے اور مولانا شمس الدین، آخر شمس الدین ہیں۔''

بدایوں کے ایک سولہ سالہ نوجوان نے مولانا شمس الدین خوارزمیؒ جیسے امام وقت کو اس قدر متاثر کیا کہ آپؒ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اگر کچھ کہا بھی تو بس یہ کہا۔ ''بابا جاؤ! تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح آتے رہنا۔ میں تمہارے جسم پر بھی کتابیں بار کرتا رہوں گا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ آپؒ بے تابانہ اپنی نشست سے اُٹھے اور مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کی دست بوسی کا اعزاز حاصل کیا اور اُلٹے قدموں واپس چلے گئے۔

دوسرے دن جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ، مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کی بارگاہِ علم میں حاضر ہوئے تو استادِ گرامی نے ایک خاص انداز سے آپؒ کی جانب دیکھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے چند لمحوں میں اس نگاہ کا مفہوم سمجھ لیا۔ یہ وہی نگاہ تھی جو دلوں کے رشتے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے دل ہی دل میں اپنے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ آپ سے راضی ہو گئے تھے۔

اگر کسی دن شدید بیماری کے سبب حضرت نظام الدین اولیاءؒ شریکِ درس نہ ہوتے تو دوسرے روز آپؒ کو دیکھتے ہی مولانا شمس الدین خوارزمیؒ بلند آواز میں فرماتے۔

''سیّد! تم تو غیر حاضر ہو کر مجھے آزار نہ پہنچایا کرو۔''

مولانا شمس الدینؒ کے اس جملے نے تمام حاضرینِ مجلس اور شاگردوں کی کثیر جماعت پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ مستقبل میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہی مولانا خوارزمیؒ کے علم کی امانت کا بارِ گراں اُٹھائیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ چند روز بعد ہی مولاناؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنے مخصوص حجرے میں طلب کر کے فرمایا۔

''سیّد! آئندہ سے تم شاگردوں کی عام قطار میں نہیں بیٹھو گے۔ تمہارے لئے میں

نے اپنا یہ حجرہ وقف کر دیا ہے۔"

مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کا یہ حجرہ کسی شہنشاہ کے دربار سے بھی زیادہ محترم تھا۔ آپؒ بڑے سے بڑے امیر کو بھی اس حجرے میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ مولاناؒ کے اس حجرے میں صرف دو شاگردوں حضرت قطب الدین فاقلہؒ اور حضرت برہان الدین عبدالباقیؒ کو علم سیکھنے کا شرف حاصل تھا۔ تیسرے حضرت نظام الدین اولیاءؒ تھے جن کے لئے استادِ گرامی کی نظرِ کرم مخصوص تھی۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنے برابر بٹھاتے۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ مولانا اپنی مسند خاص پر شاگرد کو بیٹھنے کا حکم دیتے۔

اس موقع پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کرتے۔ "یہ مقامِ ادب ہے۔ میں ہرگز اس جگہ نہیں بیٹھوں گا۔"

"سیّد! یہ میرا حکم ہے۔" مولانا شمس الدین خوارزمیؒ فرماتے۔ "اور استاد کا حکم ہی سب کچھ ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ مجبور ہو کر مسند استاد پر بیٹھ جاتے مگر اس دوران آپؒ شدید اضطراب میں مبتلا رہتے۔

مولانا شمس الدین خوارزمیؒ ایک عالم باعمل تھے۔ مولانا کے علم اور کردار کی اثر انگیزی کا یہ حال تھا کہ عام انسانوں سے لے کر فرمانروائے وقت تک، سب کے سب آپؒ کے حلقۂ اثر میں شامل تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دستِ قدرت نے اہلِ شہر کو زنجیر پہنا کر مولانا کے آستانۂ عالیہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن جیسا باجبروت شہنشاہ بھی مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کے نیاز مندوں میں شامل تھا۔ اس نے آپؒ کو "شمس الملک" کا خطاب دیا تھا۔ اگرچہ مولانا شمس الدینؒ کے لئے یہ خطاب باعثِ افتخار نہیں تھا لیکن غیاث الدین بلبن کی بے پناہ عقیدت کے سبب آپؒ نے یہ خطاب اور ایک اہم سرکاری عہدہ قبول کر لیا تھا۔

عام اندازہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مولانا شمس الدین خوارزمیؒ سے کم و بیش دو سال تک مختلف علوم حاصل کئے۔ اس دوران آپؒ نے عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی اور شعر و ادب کے رموز و نکات بھی آپؒ پر منکشف ہو گئے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے "مقاماتِ حریری" کے چالیس مقالے حفظ کئے۔ یہ عربی زبان کی ایک بے مثال اور مشکل ترین کتاب ہے۔ "مقاماتِ حریری" کی عبارت اس قدر مسجع اور مقفّٰی ہے کہ غیر عرب کے لئے اس کا پڑھنا ہی ایک

کارِ دشوار ہے مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اللہ نے وہ ذہن بیدار عطا کیا تھا کہ مختصر وقت میں سینکڑوں صفحات یاد کر لئے پھر جب آپؒ کسی مجلس میں "مقاماتِ حریری" کا کوئی حوالہ پیش کرتے تو سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے آپؒ کی زبان مبارک سے ایک دریا جاری ہے۔ واضح رہے کہ دوسرے طالب علم اس کتاب کے حوالے سے صرف مشکل الفاظ یاد کرتے تھے مگر یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بلند ہمتی تھی کہ آپؒ نے ایک منفرد کارنامہ انجام دیا۔

پھر اٹھارہ سال کی عمر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو کسی بحث یا مناظرے میں شکست دے۔ نتیجتاً آپؒ جس محفل میں جاتے، حاضرین بے ساختہ پکار اُٹھتے۔

"مولانا نظام "بحاث شکن" آ گئے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو "محفل شکن" بھی کہا جاتا تھا۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دوسرے استاد مولانا کمال الدین زاہدؒ تھے جن سے آپؒ نے علم حدیث حاصل کیا۔ مولانا کمال الدینؒ کا وصف امتیازی یہ تھا کہ آپؒ دنیوی علم کے ساتھ مذہبی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے....... لیکن جس چیز نے آپؒ کو زیادہ محترم بنایا وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عشق تھا۔ اسی عشق کے زیر اثر مولانا کمال الدین زاہدؒ نے علم حدیث حاصل کیا اور دنیا سے بے نیاز ہو گئے۔

اگرچہ مولانا کمال الدینؒ ایک گوشہ نشیں بزرگ تھے لیکن آپؒ کے کردار اور علم کی خوشبو دربارِ شاہی تک پہنچ گئی۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے آپؒ کے زہد و تقویٰ کے بارے میں سنا اور ملاقات کا شوق ظاہر کرتے ہوئے ایک خط تحریر کیا۔

"اگر آپ کسی دن دربارِ شاہی کو رونق بخشیں تو میں اسے اپنی سعادت سمجھوں گا۔"

دوسرے دن مولانا کمال الدین زاہدؒ دربارِ سلطانی میں اس طرح تشریف لائے جیسے وہ کسی فرمانروا کا محل نہیں، کوئی عام گزرگاہ ہو۔ مولانا کے چہرے پر بے زاری کے آثار صاف نمایاں تھے مگر آپؒ نے سلطان کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔ غیاث الدین بلبن ایک علم دوست حکمران تھا۔ مولانا کمال الدین زاہدؒ بھی اس کی اسی خوبی کے باعث ادب و احترام سے پیش آئے اور مناسب الفاظ میں سلطان کی مزاج پُرسی کی۔

غیاث الدین بلبن، مولانا کے اندازِ گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ اُس نے اس مردِ پرہیزگار کے بارے میں جیسا سنا تھا، ویسا ہی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ کچھ دیر تک

فرمانروائے ہند، مولانا سے رسمی بات چیت کرتا رہا۔ پھر اس نے نیاز مندانہ لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ہماری امامت قبول فرمالیں۔''

''اس سے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟'' مولانا کمال الدین زاہدؒ نے والیٔ ہندوستان سے پوچھا۔

''آپ جیسے متقی انسان کی امامت کے طفیل ہماری نمازیں بھی قبول ہو جائیں گی۔'' سلطان غیاث الدین بلبن نے کہا۔

''سلطان! آپ کے حُسنِ نظر نے اس فقیر کے دامن کو نہ جانے کن کن نعمتوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ حالانکہ یہ فقیر اپنی حالت کو خود ہی بہتر جانتا ہے۔'' مولانا کمال الدین زاہدؒ نے فرمایا۔ ''غور سے دیکھئے، یہاں کچھ نہیں ہے۔ دامن بھی خالی ہے اور ہاتھ بھی خالی ہیں۔ جو انسان اتنا تنگ دست ہو، وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے؟'' مولانا کمال الدین زاہدؒ نے اس طرح اپنی ذات کی نفی کر دی تھی، کہ حاضرین دربار حیران رہ گئے۔

''آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔'' سلطان غیاث الدین بلبن نے دوبارہ درخواست کی۔

''ہرگز نہیں۔'' مولانا کمال الدین زاہدؒ نے فرمایا۔ ''لے دے کر میرے پاس ایک نماز ہی تو رہ گئی ہے۔ سلطان چاہتے ہیں کہ وہ بھی مجھ سے چھین لی جائے۔ آخر فرمانروائے ہند کے پاس کسی شے کی کمی ہے؟ میں اپنے امیر مملکت سے کوئی طلب نہیں رکھتا۔ سوائے اس کے کہ میری نماز میرے پاس رہنے دی جائے۔''

یہ کہہ کر مولانا کمال الدین زاہدؒ تشریف لے گئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن اور حاضرین دربار حیرت وسکوت کے عالم میں انہیں واپس جاتے دیکھتے رہے۔

یہی وہ مردِ جلیل ہیں جن سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے علم حدیث حاصل کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ دو سال تک مولانا کمال الدین زاہدؒ کی بارگاہِ علم میں حاضر ہوتے رہے۔

اس دوران حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے ساتھیوں سے فرمایا کرتے تھے۔ ''میں زیادہ دنوں تک تمہارے درمیان نہیں رہوں گا۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو مولانا محفل شکن؟'' ساتھی سوال کرتے۔

''میں تو تمہاری مجلسوں میں ایک مہمان کی حیثیت رکھتا ہوں۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے۔ ''مہمان کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔''

''ہمارے درمیان سے اُٹھ کر کہاں جاؤ گے؟'' ساتھی اُداس لہجے میں پوچھتے۔

''یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ کہاں جاؤں گا۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے۔

''کیا علم کی دنیا سے اُکتا گئے ہو مولانا بحاث شکن؟'' دوست پوچھتے۔ ''کیا دہلی سے اس لئے چلے جاؤ گے کہ اب یہاں تم سے بحث کرنے والا کوئی نہیں؟''

''علم تو مقصودِ حیات ہے مگر پھر بھی مجھے ایک تشنگی محسوس ہوتی ہے۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے۔ مگر خود آپؒ بھی اس بے چینی کی وجہ جاننے سے قاصر تھے۔

کیسی پیاس تھی اور کیسی طلب؟ حضرت نظام الدین ایک عجیب ذہنی کشمکش کا شکار تھے۔

اکثر تنہائی میں حضرت بابا فریدؒ کو یاد کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس مرد بزرگ کو آنکھ سے نہیں دیکھا تھا لیکن دل پر شیخؒ کی یادیں نقش تھیں۔ اس سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

''اس وقت میری عمر بارہ سال تھی اور میں حضرت مولانا علاء الدین اصولیؒ سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ایک دن ایک شخص ابوبکر قوال، استادِ گرامی کے مکتب میں حاضر ہوا اور مولاناؒ سے عرض کرنے لگا۔

''حضرت! پچھلے دنوں ملتان جانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی بہت شہرت سنی تھی۔ شوقِ دید ان کی خانقاہ تک لے گیا۔ بڑی شان والے بزرگ ہیں۔ شیخؒ کے فیضِ روحانی کا یہ اثر ہے کہ ان کی کنیزیں بھی چکی پیستے وقت ذکرِ الٰہی کرتی رہتی ہیں۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ ابوبکر قوال نے نہایت پُرجوش لہجے میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے اوصاف بیان کئے تھے مگر میرے دل پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ پھر ابوبکر قوال اپنے سفرِ اجودھن کا حال سنانے لگا۔

''کچھ دنوں ملتان میں قیام کرنے کے بعد اجودھن پہنچا اور حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ کی ریاضت کا یہ اثر ہے کہ اجودھن کے در و دیوار تک سے نور برستا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے حضرت بابا فریدؒ کی روحانیت نے پورے ہندوستان کو مسخر کر لیا ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں۔ ''حضرت بابا فریدؒ کا ذکر سنتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میری پوری شخصیت حضرت شیخؒ کے زیر اثر ہے اور کسی نادیدہ طاقت نے

میرے دل و دماغ کو بھی تسخیر کرلیا ہے۔"

اس دن کے بعد سے قیامِ دہلی تک، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بابا فریدؒ کو مسلسل یاد کیا کرتے تھے۔ اس تاثر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی کے جس محلے میں آپؒ کا قیام تھا، وہیں حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ بھی رہا کرتے تھے۔ یہ بزرگ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے مرید اور چھوٹے بھائی تھے۔ حضرت بابا فریدؒ کے فیضِ روحانی نے شیخ نجیب الدینؒ کو حقیقتاً "متوکل" بنا دیا تھا۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن شیخ نجیب الدین متوکلؒ درس میں پہنچے تو استاد نے پوچھا۔

"نجیب الدین متوکل تم ہو؟"

شیخؒ نے جواب دیا۔ "میں تو نجیب الدین متاکل (کھانے والا) ہوں۔ متوکل ہونا کس کے اختیار میں ہے؟"

استاد نے دوسرا سوال کیا۔ "تم شیخ الاسلام فرید الدینؒ کے چھوٹے بھائی ہو؟"

شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے عرض کیا۔ "میں شیخ کا برادرِ صوری ہوں۔ برادرِ معنوی اللہ جانے کون ہوگا؟"

حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ خاندانی اعتبار سے آپؒ حضرت بابا فریدؒ کے بھائی تھے مگر کردار و علم کے لحاظ سے آپؒ ان کے بھائی کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ یہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کا انکسار تھا۔ ورنہ آپؒ خود بھی بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ چار سال تک آپؒ کے پڑوس میں مقیم رہے۔ اس دوران اکثر ملاقاتیں ہوتیں اور ہر ملاقات میں حضرت بابا فریدؒ کا ذکر ضرور ہوتا۔ نتیجتاً حضرت نظام الدین اولیاءؒ غیر محسوس طور پر حضرت بابا فریدؒ کے زیرِ اثر آتے چلے گئے۔

پھر اسی دوران حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ ایک جانگداز واقعہ پیش آیا جس نے آپؒ کی زندگی کا رُخ یکسر بدل دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا معمول تھا کہ نیا چاند دیکھ کر خاص طور پر والدہ محترمہ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں حضرت بی بی زلیخاؒ بیمار تھیں مگر ظاہری حالت ایسی نہیں تھی کہ دیکھنے والا ان کے سفرِ آخرت کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ آخر چاند نظر آیا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی والدہ ماجدہ کے دیدارِ باسعادت کے لئے حاضر ہوئے۔ مادرِ گرامی نے دعائیں دیں پھر کچھ دیر خاموش رہ کر فرمانے لگیں۔

"سیّد محمد! آئندہ ماہ رویتِ ہلال کے موقع پر کس کی قدم بوسی کرو گے؟"

بڑا عجیب سوال تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سمجھ گئے کہ وقتِ رخصت قریب آ پہنچا ہے۔ آپؒ مادرِ گرامی کی جدائی کے تصور سے لرز اُٹھے اور زار و قطار رونے لگے۔

"مخدومہ! آپ مجھ غریب کو کس کے سپرد کر رہی ہیں؟"

حضرت بی بی زلیخاؒ نے فرمایا۔ "کل تمہیں اس کا جواب دوں گی۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دل میں کہا کہ "مخدومہ! آج اور اسی وقت کیوں نہیں؟ مجھ پر یہ رات بھاری گزرے گی۔" آپؒ براہِ راست والدہ محترمہ سے سوال کر سکتے تھے مگر یہ بات خلافِ ادب تھی اس لئے آپؒ خاموش رہے۔

کچھ دیر بعد حضرت بی بی زلیخاؒ نے فرمایا۔ "سیّد محمد! آج رات تم شیخ نجیب الدین کے یہاں رہو۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر چلے گئے مگر ذہن پر ایک ہی اذیت ناک خیال مسلط تھا کہ آج رات کچھ ہونے والا ہے۔

حضرت نجیب الدین متوکلؒ کے یہاں پہنچے تو شیخؒ نے حسبِ روایت والہانہ استقبال کیا۔ روزانہ ہی رات گئے تک کوئی نہ کوئی علمی بحث ہوتی تھی مگر آج خلافِ توقع حضرت نظام الدین اولیاءؒ خاموش تھے۔

حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے بہت غور سے آپؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ "مولانا نظام الدین! آج تم خاموش بھی ہو اور اُداس بھی۔ خیریت تو ہے؟"

"شیخ! آج کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ آپؒ اس اذیت ناک خیال سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہے تھے۔

پھر عشاء کی نماز کا وقت آیا۔ دونوں نے نماز ادا کی۔ عام طور پر عشاء کی نماز کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے گھر تشریف لے جاتے تھے......... مگر آج خلافِ معمول بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے پوچھا۔ "آج تم گھر نہیں جاؤ گے؟"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی طرف دیکھا۔

"خدانخواستہ تم مجھ پر بار نہیں ہو۔" حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے فرمایا۔ "آج کئی باتیں خلافِ معمول نظر آئی ہیں۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"والدہ محترمہ کا حکم ہے کہ میں آج کی رات آپ کے مکان پر بسر کروں۔"

''بسر و چشم۔'' حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''میرا گھر، تمہارا ہی گھر ہے۔''

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ آج کسی بات میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ اس لئے حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے آپؒ کے لئے بستر کا انتظام کیا اور خود سونے چلے گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کس طرح محوِ خواب ہوتے؟ مستقل ایک کانٹا سا کھٹک رہا تھا۔ اس کی خلش آپؒ کو کیسے سونے دیتی؟ نتیجتاً رات بھر جاگ کر دعائیں کرتے رہے۔

''اے اللہ! میرے اس سرمائے کو بچا لے۔ اگر یہ لٹ گیا تو تیرا بندہ نظام الدین بہت غریب ہو جائے گا۔''

ابھی صبح صادق کے آثار نمایاں نہیں ہوتے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ شدید بے قراری کے عالم میں اُٹھے، دروازہ کھولا تو خادمہ سامنے کھڑی تھی۔ آپؒ نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے؟''

''بی بی آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔'' خادمہ نے عرض کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اضطراب کا یہ حال تھا کہ بھاگتے ہوئے گھر پہنچے۔ والدہ محترمہ کو بخیر و عافیت پا کر سکون کا سانس لیا۔ پھر سلام عرض کر کے بستر کے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔

''میرے پاس بیٹھو سیّد محمد!'' حضرت بی بی زلیخاؒ نے فرزند کو حکم دیا۔ آپؒ کی آواز سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ مگر ایسی نقاہت نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر مریض کی موت کا گمان ہو سکے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ حضرت بی بی زلیخاؒ کے پائنتی بیٹھے اور دونوں ہاتھ والدہ ماجدہ کے قدموں میں رکھ دیئے۔

''سیّد محمد! کل تم نے مجھ سے کوئی سوال کیا تھا؟'' حضرت بی بی زلیخاؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''خادم نے عرض کیا تھا کہ اس غریب کو کس کے حوالے کر رہی ہیں؟'' شدتِ جذبات سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

''آج میں تمہارے سوال کا جواب دیتی ہوں۔'' حضرت بی بی زلیخاؒ نے کہا اور چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئیں۔ پھر فرمایا۔

''سیّد محمد! تمہارا دایاں ہاتھ کون سا ہے؟''

اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بی بی زلیخاؒ کی بینائی دُھندلی ہو چلی تھی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنا دایاں ہاتھ والدہ محترمہ کی طرف بڑھایا۔ حضرت بی بی زلیخاؒ نے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔

''اے اللہ! میں سیّد محمد کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ تیری ہی ذات پرستش کے لائق ہے اور تُو ہی اپنے بندوں کا کفیل ہے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہاتھ پر حضرت بی بی زلیخاؒ کے ہاتھ کی گرفت کمزور ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ماں کا ہاتھ بیٹے کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے گھبرا کر دیکھا۔ حضرت بی بیؒ کلمۂ شہادت کا وِرد کر رہی تھیں۔ آپؒ نے تین مرتبہ اپنے اللہ کی وحدانیت اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر گواہی دی اور اس طرح دنیا سے رخصت ہو گئیں جیسے بادِ نسیم کا کوئی جھونکا کسی چمن زار سے گزر گیا ہو۔

ایک ولی صفت اور شفیق ماں کی موت کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا کہ گردشِ وقت اس کی یادوں کو دُھندلا کر دیتی۔ آپؒ کے مرید خاص حضرت امیر حسن سنجریؒ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تالیف ''فوائد الفوائد'' میں تحریر کرتے ہیں کہ جب بھی والدہ محترمہ کا ذکر آتا تو پیر و مرشد کی حالت غیر ہو جاتی۔ اس قدر گریہ طاری ہوتا کہ آپؒ کے لئے بات کرنا بھی دُشوار ہو جاتا۔ قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی یہ جاننے سے قاصر رہتے کہ حضرت شیخ کیا فرما رہے ہیں؟ اس بات پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہمیشہ یہ شعر پڑھتے اور زار و قطار روتے۔

افسوس دلم کہ ہی تدبیر نہ کرد
شب ہائے وصال را زنجیر نہ کرد

(میرے دل افسوس کہ تُو نے کوئی تدبیر نہیں کی۔ وصال کی راتیں گزر گئیں اور تُو نے انہیں زنجیر نہیں پہنائی)

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ پہلے ہی ایک نامعلوم اضطراب میں مبتلا تھے۔ والدہ محترمہ کے وصال کے بعد یہ اضطراب ''وحشت'' میں تبدیل ہو گیا۔ دوست اور ساتھی تسلیاں دیتے مگر آپؒ کی اُداسی میں کوئی کمی نہ ہوتی۔ زیادہ تر وقت حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی صحبت میں گزرتا۔ بار بار فرماتے۔

''شیخ! میں نہیں جانتا کہ کیا ہونے والا ہے؟''

حضرت نجیب الدین متوکلؒ فرماتے۔ ''سیّد! جو کچھ ہوگا، بہتر ہوگا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مالی حالت بہت شکستہ تھی۔ ایک دن حضرت نجیب الدین متوکلؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔

''شیخ! میرے لئے دعا فرمادیں کہ میں کسی شہر کا قاضی بن جاؤں۔''

''سیّد! قاضی بن کر بھی تمہیں سکونِ قلب حاصل نہیں ہوگا۔'' حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے فرمایا۔ ''قاضئ شہر کی بجائے کچھ اور بن جاؤ۔''

''کیا بن جاؤں؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔

''جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔'' حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے فرمایا۔

''آپ کی آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے پُر شوق لہجے میں عرض کیا۔

''یہی کہ منصبِ قضا تمہارے لائق نہیں ہے۔'' حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے فرمایا۔ ''عنقریب اللہ تم پر یہ ظاہر کردے گا کہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اضطراب میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر ایک دن آپؒ جامع مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ پیش امام نے یہ آیت تلاوت کی۔

''کیا اہل ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے جھک جائیں۔''

یہ آیت مقدسہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی حالت غیر ہوگئی اور نماز ہی میں آپؒ پر گریہ طاری ہوگیا۔ نماز ختم ہوئی تو آپؒ مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر دیر تک سوچتے رہے۔

پھر دل سے آواز آئی۔

''نظام الدین! یہ ہدایت غیبی ہے۔ تجھے سکون اللہ کے ذکر ہی سے ملے گا۔ کتابوں کے انبار میں تیری نجات نہیں ہے۔''

یہ خیال آتے ہی آپؒ حضرت نجیب الدین متوکلؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ ''شیخ! میں اجودھن جا رہا ہوں۔ آپ کی آنکھیں یہی دیکھ رہی تھیں؟''

حضرت نجیب الدین متوکلؒ مسکرائے۔ ''سیّد! اب تمہیں سکونِ قلب حاصل ہو جائے گا۔ جب تم حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو تو اس خادم کا بھی سلام عرض کرنا۔''

''شیخ! میرے حق میں دعا کیجئے گا کہ میری حاضری قبول ہو جائے۔'' حضرت

نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔

حضرت نجیب الدین متوکلؒ نے دعا فرمائی اور ایک بیس سالہ نوجوان جو دہلی میں ''محفل شکن'' کے نام سے مشہور تھا، اجودھن روانہ ہوگیا۔

❀ ..... ❀ ❀ ..... ❀

جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی سے روانہ ہوئے تو آپؒ کے پاس ایک مصلّے اور پانی کے ایک برتن کے سوا کوئی زادِ راہ نہیں تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ دُشوار اور طویل سفر آپؒ نے کس طرح طے کیا؟

حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس مجلسِ عرفانی کا رنگ دیکھ کر آپؒ کی زبان گنگ ہوگئی اور جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آپؒ اہلِ علم کی کیسی کیسی محفلوں میں شریک ہوئے تھے مگر ایک درویش کی خانقاہ کا انداز ہی جداگانہ تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دیکھتے ہی حضرت بابا فریدؒ نے یہ شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دل ہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

(تیرے فراق کی آگ نے دلوں کو کباب کر ڈالا اور تیرے شوق کے سیلاب نے جانوں کو برباد کر دیا)

حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سوچا تھا کہ اپنے شوقِ دیدار کو مختلف زاویوں سے بیان کروں گا مگر جب حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا تو آپؒ سب کچھ بھول گئے۔

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب رُوئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

حضرت بابا فریدؒ کے روبرو دہلی کے ''محفل شکن'' کا بھی یہی حال تھا۔ بڑے بڑے علماء کو اپنے زورِ بیان اور دلائل سے عاجز کر دینے والا آج خود اظہارِ شوق کے لئے ترس رہا تھا۔ ساری منطق دھری رہ گئی تھی اور تمام لغت الفاظ سے خالی نظر آ رہی تھی۔ بس اتنا ہی عرض کر سکے۔

''مخدوم! مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔''

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے فرمایا۔ ''ہر نئے آنے والے پر دہشت طاری ہو جاتی ہے مولانا نظام الدین! تمہارا شوق اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ تم بیان کرتے ہو۔''

حضرت شیخؒ نے شوقِ جاں سوز کی تائید کی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سر عقیدت خم کر دیا۔ "مخدوم! میرے لئے بس یہی ارشادِ گرامی کافی ہے۔"

عقیدت و نیاز مندی کا یہ انداز دیکھ کر حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "میری خواہش تھی کہ یہ نعمت سجادہ اور ولایت ہند کسی اور کو دوں کہ ہاتف غیبی نے آواز دی۔ ابھی ٹھہر جاؤ! نظام الدین بدایونی آ رہا ہے۔"

حضرت شیخؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر گریہ طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک پیر و مرشد کے سامنے سر جھکائے روتے رہے۔ "سیّدی! میں کس لائق ہوں؟"

۞ ...... ۞ ۞ ...... ۞

حضرت بابا فریدؒ کے تمام مرید جماعت خانے کے فرش پر سوتے تھے مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لئے چارپائی کا انتظام کیا گیا۔ پھر جب رات آئی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح زمین پر لیٹ گئے۔ عشاء کے بعد خانقاہ کا ایک خادم ادھر آیا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اس حال میں دیکھا تو کہنے لگا۔

"نظام الدین! تم چارپائی پر کیوں نہیں لیٹتے؟"

"یہاں کیسے کیسے حافظ قرآن اور بزرگ زمین پر سو رہے ہیں۔ مجھے اس خیال سے ہی شرم آتی ہے کہ میں ان محترم ہستیوں کی موجودگی میں چارپائی پر آرام کروں۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

خادم واپس چلا گیا اور سارا واقعہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے گوش گزار کر دیا جو حضرت بابا فریدؒ کے خلیفہ بھی تھے اور داماد بھی۔

خادم کی بات سن کر مولانا بدر الدین اسحاقؒ جماعت خانے میں تشریف لائے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے کہا۔

"تم یہاں اپنی منطق پیش کرنے آئے ہو یا ہدایت پانے؟" مولاناؒ کے لہجے سے کسی قدر تلخی جھلک رہی تھی۔ "تم اپنی من مانی کرو گے یا حکم شیخ پر عمل پیرا ہو گے؟"

"مرشد کا فرمان ہی اب میری زندگی ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاء نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کیا۔

"تو پھر اُٹھو اور حضرت شیخؒ کے حکم کے مطابق چارپائی پر آرام کرو۔" مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے فرمایا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ پلنگ پر دراز ہو گئے۔ اگرچہ آپؒ کے دل میں اب بھی

وہی جذبات موجزن تھے کہ میں برگزیدہ ہستیوں کی موجودگی میں آرام دہ بستر پر کس طرح لیٹ سکتا ہوں لیکن حکم شیخ نے آپؒ کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رات بھر اس ذہنی کشمکش نے سونے نہیں دیا۔ پھر فجر کی اذان ہوئی تو آپؒ پر یہ راز فاش ہوا کہ طریقت میں حکم شیخ ہی سب کچھ ہے۔ یہاں عقل اور منطق کا گزر نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔

۞ ...... ۞ ۞ ...... ۞

حضرت بابا فریدؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔

"شیخ کا حکم ہو تو اپنی تعلیم جاری رکھوں یا پھر اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟"

حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "میں کسی کو تعلیم چھوڑ دینے کے لئے نہیں کہتا۔ وہ بھی جاری رکھو اور یہ بھی کرتے رہو۔ پھر دیکھو کہ دونوں میں سے کون سی چیز غالب آتی ہے؟ درویش کو اتنا علم ضرور ہونا چاہئے کہ وہ شریعت سے باخبر رہے ورنہ اس کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔"

پیر و مرشد کی یہ عنایت خاص تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بہ نفس نفیس کچھ چیزیں پڑھایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف "عوارف المعارف" کا درس شروع کیا اور اس کے چھ باب پڑھائے۔ "ابوشکور سالمی" بھی اوّل سے آخر تک پڑھائی۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چھ پارے مکمل تجوید کے ساتھ پڑھائے۔

زمانے گزر جانے کے بعد بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس درس کی لذت کو یاد کر کے فرماتے تھے۔

"عوارف المعارف" کے درس میں جو حقائق اور نکات حضرت شیخؒ کی زبان مبارک سے سنے، اب وہ کبھی سننے میں نہیں آئیں گے۔ پیر و مرشد کے بیان کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب تقریر فرماتے تھے تو یہ آرزو ہوتی کہ کاش اسی حالت میں موت آ جائے۔"

حضرت بابا فریدؒ کے پاس "عوارف المعارف" کا جو نسخہ تھا اس میں کچھ سقم بھی تھا اور اس کا خط بھی باریک تھا۔ ایک دن پیر و مرشد درس دے رہے تھے کہ اچانک کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں کتابت میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ حضرت بابا فریدؒ نے تامل فرمایا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی سادگی اور نوعمری کے سبب خاموش نہ رہ سکے، بے اختیار آپؒ کی زبان سے نکل گیا۔

''میں نے شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے پاس ایک اور نسخہ دیکھا تھا، جو صحیح تھا۔''

حضرت بابا فریدؒ نے جواباً فرمایا۔ ''کیا فقیر میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ غلط نسخے کی تصحیح کر سکے؟''

پیر و مرشد کی بات سن کر حاضرین درس پر گہرا سکوت چھا گیا۔

حضرت بابا فریدؒ نے دوبارہ فرمایا۔ ''کیا فقیر میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ غلط نسخے کی تصحیح کر سکے؟''

پیر و مرشد نے یہی جملہ اپنی زبان مبارک سے تین بار ادا کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہیں آیا مگر جب بار بار حضرت شیخؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تو میرے دوسرے ساتھی مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

''مولانا نظام الدین! پیر و مرشد کا اشارہ تمہاری طرف ہے۔''

یہ سنتے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی حالت غیر ہو گئی۔ بے اختیار اپنی نشست سے اُٹھے، سر برہنہ کیا اور حضرت شیخؒ کے سامنے خم ہو گئے۔

''معاذ اللہ! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ پیر و مرشد کے ہاتھ پکڑ کر رو رہے تھے۔ ''سیدی! میں تو حضرت کی ذاتِ گرامی پر اعتراض کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ بہت دیر تک گریہ وزاری کرتے رہے مگر حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک پر عکسِ ملال نمایاں رہا۔ یہاں تک کہ آپؒ درس گاہ سے اُٹھ کر اپنے حجرۂ خاص میں تشریف لے گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے ہم سبق ساتھیوں کی طرف دیکھا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''اب میں کیا کروں؟ مرشد خفا ہو گئے۔ دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔''

تمام ساتھی خاموش رہے۔ کسی میں اظہار رائے کی جرأت نہیں تھی۔ کوئی کیسے مداخلت کرتا؟ اسے بھی راندۂ درگاہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے حجرے میں چلے آئے مگر ایک لمحے کے لئے بھی قرار حاصل نہیں تھا۔ ساری رات جاگتے اور روتے گزار دی۔

دوسرے دن درس میں حاضر ہوئے مگر حضرت بابا فریدؒ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بیتابانہ اپنی نشست سے اُٹھے اور پیر و مرشد کے سامنے رو رو کر عرض کرنے لگے۔

''واللہ! اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ زبان کی لغزش تھی، دل اور دماغ کی نہیں۔''

حضرت بابا فریدؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپؒ کے چہرۂ مبارک پر عکسِ ملال اب بھی نمایاں تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اُٹھے اور اُلٹے قدموں چلتے ہوئے درس گاہ سے نکل کر جنگل کی طرف چلے گئے۔ دیوانہ وار روتے تھے اور بار بار اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے تھے۔

''نظام الدین! اس دنیا میں تجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا؟''

یہ اضطراب حد سے بڑھا تو ایک کنوئیں کے قریب پہنچے اور چاہا کہ اپنے آپ کو پانی میں غرق کر کے اس جان لیوا کرب سے نجات حاصل کر لیں۔ پھر خیال آیا کہ خودکشی حرام ہے........اور اگر خودکشی جائز بھی ہوتی تو جرم اپنی جگہ پھر بھی برقرار رہتا، اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ اگر تو کنوئیں میں ڈوب گیا تو کتنے افسانے بنیں گے۔ پتہ نہیں اس جرم میں کتنے بے گناہ لوگوں سے باز پُرس کی جائے۔

الغرض حضرت نظام الدین اولیاءؒ عجیب دور وحشت سے گزر رہے تھے۔ کئی دن تک کھانا نہیں کھایا۔ آخر حضرت بابا فریدؒ کے ایک صاحب زادے حضرت شیخ شہاب الدینؒ، آپؒ کو تلاش کرتے ہوئے جنگل پہنچے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شکستہ حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگے۔

''مولانا! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کوئی جواب نہ دے سکے۔ بس آنکھیں اشک برساتی رہیں۔ گویا آنسو ہی آپؒ کے غم کے ترجمان تھے۔

حضرت شیخ شہاب الدینؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں گہری دوستی تھی۔ پیر و مرشد کی ناراضگی کے خوف سے دوسرے مرید تو پُرسشِ حال نہ کر سکے مگر حضرت شیخ شہاب الدینؒ اپنے ساتھ کھانا لے کر گئے تھے۔

''مولانا! کب تک فاقے کرو گے؟''

''اب کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''میری خاطر چند لقمے ہی کھا لو۔'' حضرت شیخ شہاب الدینؒ نے کہا۔ ''میں بابا جان سے عرض کروں گا۔''

یہ نوید سنتے ہی ایسا لگا جیسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی

ہو۔

پھر ایک دن تنہائی میں شیخ زادہ شہاب الدینؒ نے حضرت بابا فرید سے عرض کیا۔

"مخدومی! مولانا نظام الدین کا بہت برا حال ہے۔ اب آپ انہیں معاف فرما دیجئے۔ ورنہ آپ کے قدموں سے یہ دُوری اُنہیں ہلاک کر ڈالے گی۔"

"شہاب الدین! میں بھی اس کی جدائی میں مضطرب ہوں۔" حضرت بابا فریدؒ کے لہجے سے اُداسی کا رنگ نمایاں تھا۔ "لوگ اسے معتوب نہ سمجھیں۔ وہ میرا محبوب ہے مگر عشق میں ایک ایسا مقام بھی آ جاتا ہے کہ جس سے گزرے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہوتی۔"

"پھر مولانا نظام کے لئے کیا حکم ہے؟" شیخ شہاب الدینؒ نے عرض کیا۔

"اسے میرا سلام پہنچاؤ اور کہو کہ درس گاہ اس کی منتظر ہے۔" حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

جب حضرت شیخ شہاب الدینؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو یہ مژدہ سنایا تو آپؒ شدت جذبات میں رونے لگے۔

"اب کیوں روتے ہو مولانا؟" شیخ زادہ شہاب الدین نے پوچھا۔

"اس بدبختی کے احساس نے رُلایا تھا، اب خوش بختی پر آنسو بہاتا ہوں۔" بہت دیر تک حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر وارفتگی کا عالم طاری رہا۔

پھر خانقاہ میں حاضر ہوئے اور حضرت شیخؒ کے سامنے اتنا روئے کہ حاضرین مجلس کی آنکھیں بھی نم آلود ہو گئیں۔

"اگر بابِ کرم وا نہ ہوتا تو یہ سوالی کہاں جاتا؟" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ہچکیوں کے درمیان عرض کیا۔

"ہم نے تمہیں دہلی سے اس لئے تو نہیں بلایا تھا کہ کہیں اور چلے جانے دیتے۔" حضرت بابا فریدؒ کا دستِ مہربان سایہ فگن تھا اور زبان مبارک سے محبت کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔

"ایک بار آ گئے تو بس آ گئے۔ اب جہاں بھی رہو گے، ہمارے ہی رہو گے۔"

پھر جب آتش فراق بجھ گئی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ، پیر و مرشد کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے۔

"مولانا نظام! میں نے یہ سب کچھ تمہاری تکمیل کے لئے کیا۔" حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مرید باصفا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "شکر ہے اس مالک حقیقی کا جس نے

اپنے بندے کی دستگیری کی اور اس وادیٔ خانہ زار میں مسافرِ عشق کو ثابت قدم رکھا۔" اس کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنے پیرہن خاص سے سرفراز فرمایا۔

دراصل یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آزمائش تھی ان کی محبت اور ظرف کو دیکھنا بھی تھا اور دوسروں کو دکھانا بھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایک عالم و فاضل شخص تھے اور پوری دہلی میں "محفل شکن" کے نام سے مشہور تھے۔ نوعمری کے باوجود علمائے وقت آپؒ کا احترام کرتے تھے۔ ایک ذرا سی بات پر پیر و مرشد کا ناراض ہو جانا اور حاضرین مجلس کے سامنے برہمی کا اظہار کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی عقیدت سطحی ہوتی تو عرض کر سکتے تھے کہ صرف اس اطلاع پر کہ شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے پاس بہتر نسخہ موجود ہے، اس قدر غیض و غضب کیوں؟ ظاہر کی نگاہ میں یہ کوئی گستاخی نہیں تھی مگر عشق کی نظر میں یہ جرم عظیم تھا کہ حضورِ شیخ لب کشائی کیوں کی؟ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا عشق سچا تھا اس لئے غلطی کے احساس نے آپؒ کو کئی دن تک رُلایا۔ پیر و مرشد کی ناراضگی کو دین و دنیا کی بربادی سمجھا۔ احساس کی یہ گہرائی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عشق کی صداقت پر گواہی دیتی ہے۔ امتحان یہ تھا کہ دہلی کا "محفل شکن" انا پرست ہے یا نیاز مند۔ اگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ انا پرست ہوتے تو پیر و مرشد کے انداز تغافل سے دل برداشتہ ہو کر دہلی واپس جا چکے ہوتے...... مگر چونکہ نیاز مند تھے، اس لئے دامن پھیلائے مرشد کے در پر پڑے رہے۔ اور پھر یہی کاسہ لیسی آپؒ کے کام آ گئی۔ پہلے پیر و مرشد کے محبوب ہوئے اور بعد میں "محبوب الٰہی" بن گئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اسی زمانے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک فاضل دوست کسی کام سے اجودھن آئے۔ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو خبر ہوئی تو آپؒ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ وہ دوست اپنے کسی شناسا کے مکان پر ٹھہرے تھے اور یہ مکان اجودھن کے بازار میں واقع تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر دوست کو شدید تکلیف پہنچی۔

"مولانا نظام الدین! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟" دوست نے انتہائی افسردہ لہجے میں کہا۔

"اللہ اپنے بندے کو جس حال میں بھی رکھے، مقامِ شکر ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "تم کیسے ہو؟ اہلِ خانہ عافیت سے ہیں؟" اس کے بعد

دہلی کے دوسرے دوستوں کی خیریت پوچھتے رہے۔

دوست نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُداس نظروں سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ظاہری حالت کو دیکھتا رہا۔ ''مولانا نظام! تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں اور تم دہلی کی علمی مجلسوں میں مناظرے کیا کرتے تھے؟''

''ہاں! یاد ہے۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''پھر تم نے یہ کیسی زندگی اختیار کی ہے؟'' دوست نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم دہلی میں قیام کرتے اور درس و تدریس میں مشغول ہوتے تو مجتہد زمانہ کہلاتے اور بڑی شان و شوکت سے زندگی گزارتے۔''

''تمہارا حُسنِ ظن اپنی جگہ مگر میں اس طرزِ زندگی سے راضی ہو چکا ہوں۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا اور دوست سے گزرے زمانے کی باتیں کرنے لگے۔

پھر جب خانقاہ میں واپس پہنچے تو پیر و مرشد نے طلب کر کے فرمایا۔

''مولانا نظام! اگر کسی دوست سے تمہاری ملاقات ہو اور وہ تم سے کہے کہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے......اور درس و تدریس کا وہ سلسلہ کیوں چھوڑ دیا جو فارغ البالی اور خوش حالی کا ذریعہ بنتا......اور تم یہ کیسی زندگی بسر کر رہے ہو؟''

پیر و مرشد کے ارشادات سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ حیرت زدہ رہ گئے۔ حضرت بابا فریدؒ نے دوست سے ملاقات کا حال اس طرح بیان کر دیا جیسے آپؒ بہ نفسِ نفیس وہاں موجود تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حیران پا کر پیر و مرشد نے فرمایا۔ ''مولانا! تم اپنے اس دوست کے سوالوں کا کیا جواب دو گے؟''

''جو پیر و مرشد کا حکم ہو۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔

''اگر کبھی کوئی دوست یہ سوال کرے تو اس کے سامنے یہ شعر پڑھ دینا۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

''تُو میرا ہم سفر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنا راستہ پکڑ۔ تجھے تیری خوش بختی مبارک ہو اور مجھے میری شکستہ حالی۔''

اس کے بعد حضرت شیخؒ نے حکم دیا کہ مختلف اقسام کے کھانے ایک خوان میں سجاؤ اور پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر دوست کے پاس لے جاؤ۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایسا ہی کیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دہلی کا محفل شکن، بوسیدہ لباس میں، سر پر خوان رکھے ہوئے اجودھن کے بازار سے گزر رہا

تھا۔ لوگ تماشائی تھے مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس اعزاز پر نازاں تھے۔ جیسے سر پر خوان نہیں، تاجِ شاہی رکھا ہو۔

دوست نے یہ منظر دیکھا تو روتا ہوا دوڑا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سر سے خوان اُتارا۔ ''مولانا! تم نے کیا، کیا؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''تمہارے شیخ بڑے زبردست ہیں کہ انہوں نے تمہیں چند دنوں میں نفس کشی کے اس مقام پر پہنچا دیا۔'' دوست نے بے اختیار کہا۔ ''واللہ! تمہارے شیخ عارف ہیں۔ مجھے بھی ان کے پاس لے چلو۔''

کھانے کے بعد دوست نے اپنے ملازم سے کہا۔ ''یہ خوان اُٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے انکار کر دیا۔ ''جس طرح میں اس خوان کو اپنے سر پر رکھ کر لایا تھا، اسی طرح واپس لے جاؤں گا۔''

پھر وہ فاضل دوست جسے اپنے علم پر بڑا ناز تھا، حضرت بابا فریدؒ کے خدمت گاروں میں شامل ہو گیا۔

ساڑھے سات ماہ کے قیام کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ پیر و مرشد کی اجازت سے دوبارہ دہلی تشریف لائے۔ اجودھن سے رخصت ہوتے وقت حضرت بابا فریدؒ نے محبوب الٰہیؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''جس طرح بھی ممکن ہو، اپنے دشمنوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا اور جس کسی سے قرض لو، اس کی ادائیگی سے غافل نہ ہونا۔ حق تعالیٰ تم پر منزل آسان فرمائے۔''

(واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا لقب محبوب الٰہی ہے)

غرض پیر و مرشد کی دعاؤں کے سائے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک گھنا اور تاریک جنگل پڑتا تھا۔ اتفاق سے اس روز بارش بھی ہو گئی تھی جس نے فضا کو مزید تاریک اور پُر ہول بنا دیا تھا۔ اچانک پانچ چھ قزاق بے نیام تلواریں لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف بڑھے۔ اس وقت آپؒ بارش سے بچنے کے لئے ایک تناور درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ قزاقوں کو دیکھ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دل میں سوچا۔

''میں ایک غریب مسافر ہوں۔ میرے پاس مال و متاع نام کی کوئی شے نہیں۔ اگر کچھ ہے تو بس پیر و مرشد کا یہ عطیہ۔'' اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بابا

فریدؒ کا عطا کردہ پیرہن زیب تن کئے ہوئے تھے اور کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ ''اگر ان قزاقوں نے پیر و مرشد کی یہ نشانیاں مجھ سے چھین لیں تو میں ہرگز کسی آبادی میں نہیں جاؤں گا اور زندگی بھر کسی کو منہ نہیں دکھاؤں گا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے اور قزاق تیزی سے آپؒ کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ پھر وہ قزاق چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ان کے سامنے تھے۔ آپؒ کو یقین ہو چلا تھا کہ قزاقوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے....... مگر اچانک قزاقوں نے اپنا رُخ بدلا اور تیزی سے بھاگتے ہوئے تاریک جنگل کے کسی گوشے میں گم ہو گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ ''یہ پیرو مرشد کے بخشے ہوئے پیرہن اور کمبل کی برکت تھی کہ یا تو وہ قزاق اندھے ہو گئے تھے یا پھر میں انہیں نظر نہیں آیا۔''

دہلی پہنچ کر حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پیر و مرشد کی بے پناہ نوازشات کا ذکر کیا۔

حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ یہ تمام ماجرا سن کر بہت خوش ہوئے اور بے اختیار فرمایا۔ ''نظام الدین محمد! تم خوش نصیب ہو کہ بہت جلد آسودۂ منزل ہو گئے۔ ورنہ اس راستے میں تو عمریں تمام ہو جاتی ہیں اور منزل کا دُھندلا سا نشان تک نظر نہیں آتا۔''

دہلی پہنچتے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پیر و مرشد کی نصیحتیں یاد آئیں۔ آپؒ دوسرے ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے اپنے ایک دوست کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہ وہی دوست تھا جس سے کچھ عرصے قبل حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک کتاب پڑھنے کے لئے مستعار لی تھی۔ جیسے ہی اس دوست سے ملاقات ہوئی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''اے مخدوم! تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے تم سے ایک کتاب عاریتاً لی تھی۔ اتفاق سے وہ کتاب گم ہو گئی اور میں اس دوران حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے اجودھن چلا گیا۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو مولانا نظام الدین؟'' دوست نے پوچھا۔

''وہ کتاب دوبارہ تو مل نہیں سکتی۔ اور میری مالی حیثیت بھی اس قابل نہیں کہ میں دوسری کتاب خرید کر تمہیں دے سکوں۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''میرے ذہن و دل پر ایک بوجھ سا ہے اور اس بارِ گراں کو اُتارنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میں

اس کتاب کو دوبارہ صفحات پر منتقل کر دوں۔ بس ذرا مجھے کچھ کاغذات میسر آ جائیں۔ مجھے چند دنوں کی مہلت اور دے دو۔''

دوست نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بات بہت غور سے سنی۔ کچھ دیر تک وہ گہرے سکوت کے عالم میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے چہرۂ مبارک کو دیکھتا رہا پھر نہایت پُرسوز لہجے میں کہنے لگا۔ ''نظام الدین! تم جس جگہ سے آئے ہو، وہاں کی یہی برکت ہے کہ انسان کو اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور دل سے دنیا کی محبت رخصت ہو جاتی ہے۔ اب تم اس کتاب کو بھول جاؤ۔ وہ ایک دوست کی طرف سے دوسرے دوست کے لئے تحفہ تھا۔''

اس واقعے سے دو تاریخی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی غربت کے سبب چند کاغذات بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے غیر معمولی حافظے کے سہارے پوری کتاب دوبارہ تحریر کر سکتے تھے۔

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ایک اور شخص یاد آیا جس کی کچھ رقم آپؒ پر قرض تھی۔ وہ شخص کپڑے کا ایک تاجر تھا جس سے حضرت محبوب الٰہیؒ نے کچھ کپڑا خریدا تھا۔ اس سلسلے میں اس دکاندار کے بیس جیتل (سکّے) آپؒ پر قرض تھے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

''جب میں اجودھن سے دہلی روانہ ہوا تھا تو پیر و مرشد نے مجھے دس جیتل عنایت کئے تھے۔ میں نے دکاندار سے ملاقات کی اور تمام حالات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اے عزیز! میں نے ایک بار تم سے جو کپڑا خریدا تھا، اس کے بیس جیتل مجھ پر واجب الادا ہیں۔ فی الوقت میں مکمل ادائیگی نہیں کر سکتا۔ بس یہی دس جیتل میرا کل سرمایہ ہیں۔ تم انہیں رکھ لو۔ باقی رقم انشاء اللہ جلد از جلد ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

کپڑے کا تاجر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس طرزِ عمل سے بہت خوش ہوا اور پُرجوش لہجے میں کہنے لگا۔

''سیّد! تم جس دربار سے آ رہے ہو، اس کی یہی شان ہے اور جن بزرگ نے تمہیں بیعت کی سعادت بخشی ہے، ان کی صحبت کا یہی اثر ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے باقی رقم معاف کر دی۔

❀ ...... ✿ ✿ ...... ❀

اجودھن سے واپس آ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دہلی کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ کچھ دنوں کے بعد امیر خسروؒ کے نانا راوت عرض کا مکان خالی ہوا۔ حضرت محبوب

الٰہیؒ اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکان اپنی ظاہری ساخت کے اعتبار سے ایک شاندار حویلی نظر آتا تھا۔ اس کی تین منزلیں تھیں۔ پہلی منزل میں سیّد محمد کرمانیؒ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ سیّد محمدؒ، حضرت بابا فریدؒ کی شہرت سن کر اجودھن حاضر ہوئے تھے اور پھر حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی تشریف لائے تو سیّد محمد کرمانیؒ بھی اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ اس تاریخی شہر میں چلے آئے۔ راوت عرض کے مکان کی دوسری منزل میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ قیام فرما تھے۔ تیسری منزل میں مرید اور دوسرے عقیدت مند رہتے تھے اور اسی جگہ کھانا وغیرہ پکتا تھا۔

کچھ دن بعد راوت عرض کے بیٹے (حضرت امیر خسروؒ کے ماموں) اپنی جاگیروں سے واپس آ گئے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا۔

"مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "مناسب جگہ ملتے ہی ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"تم بہانہ سازی کر رہے ہو۔" راوت عرض کے بیٹے حضرت نظام الدینؒ اولیاءؒ کے مقام سے ناواقف تھے، اس لئے گستاخانہ طرزِ عمل کے مرتکب ہوئے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بار بار اپنی معذوری ظاہر کی مگر وہ دنیا دار لوگ تھے، ایک درویش کی مجبوری کو نہ سمجھ سکے۔ یہاں تک کہ راوت عرض کے بیٹوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور حکومت کے کارندے اس طرح سر پر آ کر کھڑے ہو گئے جیسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ مکان پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتے ہوں۔ (معاذ اللہ)

حضرت محبوب الٰہیؒ نے حکومت کے کارندوں سے بھی مہلت طلب کی مگر آپؒ کی بات کسی نے نہیں سنی۔ آخر حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس مکان سے باہر نکل آئے۔

کتابوں کے سوا گھر میں کوئی دوسرا سامان نہیں تھا۔ سیّد محمد کرمانیؒ اور دوسرے عقیدت مندوں نے کتابیں اپنے سروں پر اُٹھائیں اور ان خانہ بدوشوں کی طرح چل دیئے جن کا بظاہر کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ درویشوں کا یہ قافلہ بے گھری کے عالم میں کہاں جاتا؟ کچھ دیر تک یہ مردانِ خدا حیرت و پریشانی کی کیفیت میں کھڑے رہے۔ پھر اللہ کے بھروسے پر ایک طرف چل دیئے۔ کچھ فاصلے پر سراج بقال کا مکان تھا اور اس کے سامنے ایک مسجد تھی جسے چھپر والی مسجد کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ چلتے چلتے حضرت محبوب الٰہیؒ کی نظر اس مسجد پر پڑی۔ آپؒ نے مریدوں اور عقیدت مندوں کو رک جانے

کا اشارہ کیا۔

"یہ اللہ کا گھر ہے۔ اس پر تو کوئی انسان اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرے گا۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "کتابیں یہاں رکھ دو۔"

الغرض دہلی کے "محفل شکن" کی کتابیں چھپر والی مسجد میں رکھ دی گئیں......اور محفل شکن نے وہ رات مسجد میں گزاری۔

سیّد محمد کرمانیؒ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مسجد کی سیڑھیوں پر پڑے رہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جانے کے بعد محلے کے کچھ بزرگوں نے راوت عرض کے بیٹوں سے کہا۔ "آپ کو ان درویشوں کے ساتھ یہ جارحانہ سلوک روا نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ بڑی برکت تھی ان لوگوں کے دم سے۔ پورے علاقے میں ایک عجیب سی روشنی کا احساس ہوتا تھا۔"

راوت عرض کے بیٹے دولت و اقتدار کے نشے سے سرشار تھے۔ متکبرانہ انداز میں کہنے لگے۔

"ہم خوب جانتے ہیں ان درویشوں کو۔ دنیا کمانے کا ایک یہ بھی انداز ہے۔"

پھر اسی رات مکان میں آگ لگ گئی اور اس شاندار عمارت کی تینوں منزلیں زمین بوس ہو گئیں۔ آگ بجھانے کی بہت کوشش کی گئی مگر آگ نہیں بجھی......اور سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اہل محلہ حیران تھے کہ اس پختہ عمارت میں آگ کیسے لگی؟ اگر گھاس پھونس کی جھونپڑی ہوتی تو خیال گزر سکتا تھا کہ کوئی چنگاری پڑوس سے اُڑ کر آئی ہو گی اور اس نے سب کچھ پھونک دیا ہو گا......مگر وہ تو پتھروں سے بنی ہوئی ایک مضبوط ترین عمارت تھی۔ پھر اس میں آگ کس نے لگائی؟ راوت عرض کے بیٹے دم بخود کھڑے رہے اور ان کی سماعتوں میں پڑوسیوں کے الفاظ گونجتے رہے۔

"بڑی برکت تھی ان لوگوں کے دم سے۔" وہ کیا گئے کہ ان کے ساتھ رحمت چلی گئی اور زحمت باقی رہ گئی۔

یہ اسی کرامت کا عکس تھا جو تقریباً ستر سال پہلے اجمیر کے ایک میدان میں ظاہر ہوئی تھی۔ راجپوت حکمراں پرتھوی راج چوہان کے کارندوں نے بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے اسی انداز میں کہا تھا۔

"یہ راجہ کے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے، اسے خالی کر دو۔"

جواب میں حضرت سلطان الہندؒ نے فرمایا تھا۔ "ہم تو اُٹھے جاتے ہیں مگر ہمارے بعد جو بھی یہاں بیٹھے گا، وہ دوبارہ نہیں اُٹھے گا۔"

پھر جب پرتھوی چوہان کے سینکڑوں اونٹ اس میدان میں بیٹھے تو زمین نے انہیں پکڑ لیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بھی اسی جابرانہ انداز میں گھر سے بے دخل کیا گیا تھا۔ بے شک! محبوب الٰہیؒ نے راوت عرض کے بیٹوں کو بد دعا نہیں دی تھی مگر آپؒ کی دل آزاری تو ہوئی تھی........ اور یہی خلش برق بلا بن کر ٹوٹی۔ آپؒ اُٹھے تو اس جگہ سے برکت بھی رخصت ہوگئی اور راوت عرض کا مکان راکھ کا ایک ڈھیر بن کر رہ گیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ بدسلوکی کا یہ واقعہ سلطان ناصر الدین محمود کے دورِ حکومت میں پیش آیا۔

سلطان ناصر الدین محمود ایک درویش حکمراں تھا اور قرآن کریم کی کتابت کر کے اپنی روزی حاصل کرتا تھا۔ فرمانروائے ہند، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پیر و مرشد حضرت بابا فریدؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ ایک بار حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا مگر وزیر سلطنت غیاث الدین بلبن نے راستے کی دشواریوں کا ذکر کر کے اسے سفر سے باز رکھا اور خود ایک لشکر کثیر لے کر اجودھن حاضر ہوا۔ اگر سلطان ناصر الدین محمود یا غیاث الدین بلبن کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت بابا فریدؒ کے چہیتے مرید کے ساتھ راوت عرض کے بیٹوں نے یہ سلوک کیا ہے تو انہیں حکومت ہند کی طرف سے سخت سرزنش کی جاتی اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے بہترین رہائش گاہ کا انتظام کر دیا جاتا۔ مگر اللہ کو یہ منظور نہیں تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کسی شہنشاہ یا وزیر کے احسان مند ہوتے۔ وہ جس شہنشاہ معرفت کے دربار سے فقر و قناعت کا تاج پہن کر دہلی تشریف لائے تھے اس کا تقاضا یہی تھا کہ صاحبان وسائل و اسباب سے بے نیاز ہو کر ہر حال میں اپنے خالق کا شکر ادا کریں۔

سعد کاغذی، حضرت شیخ صدر الدینؒ کے مریدوں میں سے تھا۔ دوسرے روز اسے اس واقعے کا پتہ چلا تو گریہ و زاری کرتا ہوا حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''شیخ! میرے ہوتے ہوئے آپ اس طرح بے آرامی کی زندگی بسر کریں۔''

''اب میں کسی بندۂ خدا کو زحمت دینا نہیں چاہتا۔'' حضرت محبوب الٰہیؒ نے در پردہ راوت عرض کے بیٹوں کے سلوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ابھی تو میں اپنے اللہ کے گھر مہمان ہوں۔ اگر اس کے بندوں کو میرا یہ اندازِ قیام بھی پسند نہیں آیا تو میں صحرا کی جانب نکل جاؤں گا۔''

سعد کاغذی بہت دیر تک خوشامد کرتا رہا۔ آخر اس کی خوشنودی کے لئے حضرت محبوب الٰہیؒ چھپر والی مسجد سے سعد کاغذی کے مکان میں منتقل ہو گئے اور سیّد محمود کرمانیؒ کے اہلِ خانہ کے لئے کسی دوسری جگہ کا انتظام کر دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایک ماہ تک یہاں مقیم رہے۔ پھر جب دوسری جگہ تشریف لے جانے لگے تو سعد کاغذی نے دست بستہ عرض کیا۔

''شیخ! یہ کس غلطی کی سزا ہے، غلام کو خدمت سے محروم کیا جا رہا ہے؟''

''سعد! تُو نے میزبانی کا حق ادا کر دیا مگر میں اپنے دل کا کیا کروں؟ کسی جگہ ٹھہرنے ہی نہیں دیتا۔'' حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''جہاں جا رہا ہوں، وہاں بھی چند دنوں سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا۔''

اس کے بعد آپؒ ''رکاب دار کی سرائے'' کے ایک گھر میں تشریف لے گئے۔ یہ سرائے پُل قیصر کے قریب واقع تھی۔ سیّد محمد کرمانیؒ بھی اپنے خاندان والوں کے ساتھ اسی سرائے کے ایک حجرے میں مقیم ہوئے

اس سرائے میں بھی آپؒ کا قیام بہت مختصر رہا۔ یہاں سے اُٹھ کر آپؒ شادی گلابی کے گھر میں تشریف لے گئے۔

کچھ دن بعد شمس الدین ''شراب دار'' کے عزیز و اقرباء آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے بے حد اصرار پر آپؒ شمس الدین ''شراب دار'' کے گھر تشریف لے گئے۔ (شراب دار ایک عہدہ تھا جس کے سپرد بادشاہ کو پانی پلانے کا کام تھا) حضرت محبوب الٰہیؒ اس مکان میں کئی سال تک مقیم رہے۔ اجودھن سے آنے والے عقیدت مند اسی مکان میں آپؒ سے ملاقات کرتے تھے۔

غربت و افلاس کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی وقت روٹی میسر نہ آتی۔ اس سلسلے میں خود حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں۔

''سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں اشیائے ضرورت کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ دو جیتل (سکے) میں ایک من خربوزے ملتے تھے مگر پوری فصل گزر گئی اور میں خربوزہ چکھ بھی نہیں سکا یہی حال آٹے کا تھا لیکن میں ایک روٹی خریدنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا۔''

اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ شہر پناہ کے اس برج میں مقیم تھے جو ''مندرہ'' دروازے کے قریب ہے۔ یہاں آپؒ ذکرِ الٰہی بھی کرتے تھے اور طلباء کو

تعلیم بھی دیتے تھے۔ حسب روایت کئی روز گزر گئے اور آپؒ کے کھانے کے لئے کوئی چیز میسر نہیں آئی۔ پھر بھی استقامت کا وہی عالم تھا۔ پوری توجہ اور خوش دلی کے ساتھ طالب علموں کو درس دیتے۔ اتفاق سے ایک شاگرد جو اپنے استاد کے شب و روز پر گہری نظر رکھتا تھا، یہ راز جان گیا کہ حضرت شیخؒ نے کئی دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ طالب علم خود بھی بہت غریب تھا۔ اس لئے خود تو استاد کے کھانے کا انتظام نہیں کر سکا لیکن پڑوسیوں کے پاس جا کر کہنے لگا۔

''تمہارے دسترخوان پر تو انواع و اقسام کے کھانے جمع ہیں۔ مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پڑوس میں کسی عظیم ہستی نے کئی دن سے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا ہے؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہ پڑوسی کپڑا بُننے کا کام کرتے تھے۔ شاگرد کی زبانی حضرت شیخؒ کا حال سن کر بہت افسردہ ہوئے۔ پھر ان لوگوں نے کئی قسم کے کھانے پکائے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؒ نے اسے غیبی انتظام سمجھ کر کھانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ پھر جب کھانا لانے والوں میں سے ایک شخص آپؒ کے ہاتھ دُھلا رہا تھا تو اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''اللہ بھلا کرے اس طالب علم کا جس نے ہمیں خبر کر دی۔''

یہ سنتے ہی حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لئے اور اس شخص سے فرمایا۔

''کیا خبر دی تھی اس طالب علم نے؟''

''یہی کہ آپ کئی دن کے فاقے سے ہیں۔'' ہاتھ دُھلانے والے نے سادگی سے کہا۔

''مجھے معاف رکھو۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''غلط کہا اس طالب علم نے۔ میں ہرگز فاقے سے نہیں ہوں۔'' شدید بھوک کے عالم میں بھی آپؒ کی غیرت اس احسان کو برداشت نہیں کر سکی۔

کھانا لانے والے بہت دیر تک خوشامد کرتے رہے مگر آپؒ نے ان کی ضیافت قبول نہیں کی۔ بڑی شان بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔

''میری فاقہ کشی کا معاملہ اللہ کے سوا کسی غیر پر کیوں کھلے؟ اگر رازق عالم خود تمہارے دلوں میں یہ بال ڈالتا تو میں تمہاری میزبانی قبول کر لیتا۔ اللہ مجھے اس وقت سے محفوظ رکھے جو دوسرے میری بھوک کا حال جان لیں۔ اور پھر لانے والے اس طرح میرے سامنے کھانا لائیں کہ فلاں شخص نے انہیں میری فاقہ کشی کی خبر کر دی تھی۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ شہر کی پُر شور فضا سے ہمیشہ بیزار رہتے تھے۔ آپؒ سکون اور یکسوئی کے طالب تھے اور یہ دونوں چیزیں شہری علاقے میں ناپید تھیں۔ اپنی اسی کیفیت کے بارے میں حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں۔

''شروع ہی سے میرا دل اس شہر میں نہیں لگتا تھا۔ میں ایک روز قتلغ خان کے حوض پر تھا اور قرآن مجید حفظ کر رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک درویش پر پڑی جو یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔ میں ان درویش کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ پھر جب وہ ذکر سے فارغ ہو گئے تو میں نے ان سے عرض کیا۔

''کیا آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟''

''ہاں!'' ان درویش نے کہا۔

''کیا آپ اپنی مرضی سے اس شہر میں رہتے ہیں؟'' میں نے دوبارہ عرض کیا۔

''یہ بات نہیں ہے۔'' درویش نے جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ کمال دروازے کے باہر جہاں چبوترے پر شہیدوں کی چار دیواری بنی ہوئی ہے، وہاں ایک درویش بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اپنے ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو اس شہر سے چلے جاؤ۔''

میں نے اسی وقت مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا........ مگر آج پچیس سال ہو گئے ہیں کہ جب بھی اس شہر سے جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آ جاتی ہے۔''

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ ان درویش کی بات سن کر میں نے یہ شہر چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کبھی سوچتا کہ فلاں مقام پر چلا جاؤں۔ کبھی خیال آتا کہ ''پٹیالی'' کا رُخ کروں کہ وہاں ایک ترک رہتا تھا۔ (پٹیالی ضلع ایٹہ کا ایک قصبہ ہے جہاں حضرت امیر خسروؒ پیدا ہوئے تھے اور یہیں آپؒ کی ننھیال تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا) کبھی دل کہتا کہ ''بسالہ'' چلا جاؤں، وہ ایک پاک صاف جگہ ہے۔ آخر میں ''بسالہ'' چلا گیا۔ وہاں تین روز رہا مگر کوئی مکان نہیں ملا۔ مجبوراً واپس چلا آیا۔ پھر بھی ترکِ سکونت کا خیال ہر وقت لگا رہتا تھا۔

غرض اسی کشمکش میں ایک دن ''حوض رانی'' کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک باغ میں جسے ''باغِ حیرت'' کہتے ہیں، پروردگارِ عالم سے دعا کی۔

''اے اللہ! تو اپنے بندے کے اضطراب سے خوب واقف ہے۔ میں اس شہر سے

چلا جانا چاہتا ہوں۔ تُو میری رہنمائی کر۔"

جیسے ہی میری دعا ختم ہوئی، ایک صدائے غیبی سنائی دی۔ "غیاث پور"

اس سے پہلے میں نے غیاث پور نہیں دیکھا تھا کہ یہ مقام کس جگہ آباد ہے۔ پھر مجھے اپنے ایک نیشا پوری دوست کا خیال آیا جو دربارِ سلطانی میں نقیب تھا۔ میں اس دوست کے گھر پہنچا تو اہلِ خانہ نے بتایا کہ وہ غیاث پور گیا ہوا ہے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہی وہ غیاث پور ہے جس کی طرف غیب سے اشارہ کیا گیا ہے۔ الغرض میں وہاں پہنچا تو وہ ایک ویران علاقہ تھا۔ دُور دُور انسانی آبادی نہیں تھی۔ سنسان فضا دیکھ کر مجھے سکونِ قلب حاصل ہوا کہ یہاں اطمینان سے رہ سکوں گا۔

ابھی غیاث پور میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ یہاں بھی دنیا کے ہنگامے برپا ہونے لگے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے انتقال کے بعد جب اس کا بیٹا معز الدین کیقباد ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو اس علاقے کا نقشہ ہی بدل گیا۔ کیقباد نے "کیلوکھڑی" میں اپنی تفریح گاہ اور محل تعمیر کیا تو یہاں بھی امرائے سلطنت، خدمت گاروں اور سپاہیوں کا اژدھام ہو گیا۔ مخلوقِ خدا کی کثرت دیکھ کر میں نے سوچا کہ اب یہ جگہ بھی میرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اتفاق سے انہی دنوں دہلی کے ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا۔ یہ بزرگ میرے استاد بھی رہ چکے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ جب استاد کی فاتحہ میں جاؤں گا تو پھر کسی اور طرف کا ارادہ کروں گا۔ اسی روز عصر کی نماز کے وقت ایک دُبلا پتلا نوجوان مسجد میں داخل ہوا۔ اس کی جسامت کمزور تھی مگر نقش و نگار اس قدر دلکش تھے کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ اللہ جانے وہ مردانِ غیب میں سے تھا یا کون تھا۔ نوجوان نے دوسرے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کی اور پھر مجھے مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔

"جس روز اللہ نے تجھے چاند بنایا تھا، اسی روز سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ساری دنیا کی اُنگلیاں تیری طرف اُٹھیں گی۔" (ترجمہ)

اس کے بعد اس نوجوان نے کہا۔

"پہلے تو آدمی کو مشہور نہیں ہونا چاہیے اور جب کوئی شخص مشہور ہو جائے تو اُسے ایسا بننا چاہیے کہ کل روزِ قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یہ تو کوئی حوصلے کی بات نہیں کہ انسان مخلوقِ خدا سے بھاگ کر کسی غار یا ویرانے میں گوشہ نشیں ہو جائے۔ حوصلہ تو اسے کہتے ہیں کہ مخلوقِ خدا کے درمیان رہ کر یادِ خدا میں مشغول ہو جائے۔"

جب وہ نوجوان اپنی بات مکمل کر چکا تو میں نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھا۔ بظاہر وہ بھوکا نظر آتا تھا مگر اس نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ پھر جب میں نے دل میں یہ نیت کی کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا تو اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور چلا گیا۔"

❁ ❁ ❁ ❁

غیاث پور کے قیام میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ دنیاوی مصائب حضرت محبوب الٰہیؒ کا مقدر نہیں تھے۔ آسائشیں تو آپؒ کے دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں مگر خود آپؒ ہی انہیں منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہم تاریخ کی روشنی میں یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایک بار رسماً بھی سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں تشریف لے جاتے اور صرف تعارف کے طور پر ہی فرما دیتے کہ میں حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا مرید ہوں تو فرمانروائے ہند آپؒ پر اپنی نوازشات کی بارش کر دیتا۔ مگر آپؒ بلبن کے دربار میں کس طرح حاضری دیتے کہ بلبن تو خود اقتدار کی بھیک مانگنے کے لئے اجودھن حاضر ہوا تھا۔ اگرچہ ابھی تک حضرت محبوب الٰہیؒ کی روحانی عظمتوں کا مکمل اظہار نہیں ہوا تھا مگر حضرت بابا فریدؒ سے نسبت کے سبب آپؒ خود بھی شہنشاہ تھے۔ پھر ایک شہنشاہ کسی بادشاہ سے کیا طلب کرتا۔ جو بچپن سے "اللہ کا مہمان" رہا ہو، وہ کسی انسان کی میزبانی کس طرح قبول کرتا؟ صبر و رضا کی منزل کا مسافر تھا۔ حرص و طمع کو اپنے دل میں جگہ دیتا تو جل کر خاک ہو جاتا۔

❁ ❁ ❁ ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار میں بدایوں سے دہلی آ رہا تھا۔ راستے میں مجھے ایک شخص ملا۔ وہ سیاہ گدڑی پہنے ہوئے تھا اور ایک میلی سی پگڑی اس کے سر پر بندھی ہوئی تھی۔ اپنے ظاہری حلیے سے وہ کوئی مست معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بڑے والہانہ انداز میں بغل گیر ہو گیا۔ کچھ دیر تک میرے سینے سے سینہ ملائے کھڑا رہا۔ پھر الگ ہوا اور میرے دل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"یہاں سے بوئے مسلمانی آتی ہے۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا مگر میں اس کی حیثیت کو نہ پہچان سکا۔

دوسری بار میں نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ جماعت خانہ میں "کندوری" کا کھانا تیار تھا اور دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ (کندوری اس کھانے کو کہتے ہیں جس پر حضرت فاطمہ

رضی اللہ عنہا کی فاتحہ ہوتی ہے) اچانک وہی شخص جو مجھے بدایوں میں ملا تھا، جماعت خانے میں داخل ہوا اور سلام کر کے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد میں نے اسے تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ حاضرین سے پوچھا کہ اس درویش نے کچھ کھایا بھی یا نہیں؟ وہاں موجود لوگوں نے بتایا کہ جب کھانا شروع ہوا تھا تو اس درویش نے چار روٹیاں اور کچھ شوربہ ایک لکڑی کے پیالے میں ڈالا اور خانقاہ کے سامنے والے ٹیلے پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ پھر کسی طرف چلا گیا۔ اس وقت تنگی کے سبب ہم پر تیسرا فاقہ تھا۔ پھر کہیں جا کر اس فاتحہ کا اہتمام ہوا تھا۔

تیسری بار وہ شخص مولانا عمرؒ کو راستے میں ملا۔ ''کیلوکھڑی'' سے کچھ عقیدت مند غیاث پور آ رہے تھے اور ان میں مولانا عمرؒ بھی شامل تھے۔ اچانک وہ شخص کسی طرف سے نمودار ہوا اور مولانا عمرؒ سے پوچھنے لگا۔

''تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''شیخ نظام الدین سے ملاقات کے لئے جا رہے ہیں۔'' مولانا عمرؒ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اس مسکین کے پاس کیا رکھا ہے؟'' اس شخص نے کہا اور اپنے پیرہن کی جیب سے بارہ جیتل نکالے۔ ''یہ میری طرف سے نظام الدین کو دے دینا۔'' اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

اس کے بعد سے خانقاہ میں فتوحات (نذرات) آنا شروع ہو گئیں۔ اس دن مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ وہ مردانِ غیب میں سے تھا مگر اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔

اہلِ نظر ان تمام واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کس غربت میں اپنی زندگی بسر کی تھی اور راہِ سلوک میں کس طرح ثابت قدم رہے تھے۔ جو دنیا دار لوگ ظاہری کرامت کو ولایت کی نشانی سمجھتے ہیں، انہیں حضرت محبوب الٰہیؒ کی حیاتِ مبارک کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ آپؒ کی پوری زندگی ایک کرامتِ مسلسل تھی۔

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

غذا کی کمیابی کے ساتھ جسمانی زیبائش کا بھی عجیب حال تھا۔ سیّد محمد کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے، جب حضرت محبوب الٰہیؒ کے پاس کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا تھا۔ کثرتِ استعمال سے وہ بوسیدہ بھی ہو گیا تھا اور میلا بھی۔ لباس پر میل کچیل جم جانے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ صابن خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ سیّد محمد کرمانیؒ کی اہلیہ بی بی رانی نے یہ حال دیکھا تو عرض کیا۔

''برادر عزیز! تمہارے کپڑے پھٹ بھی گئے ہیں اور میلے بھی ہو گئے ہیں۔ اگر تم کچھ دیر کے لئے اپنا یہ لباس مجھے دے دو تو میں اسے دھو کر صاف بھی کر دوں اور اس میں پیوند بھی لگا دوں۔'' واضح رہے کہ بی بی رانی عمر میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بڑی تھیں۔

''بی بی! مجھے فرصت نہیں مل رہی ہے۔ ایک آدھ روز میں یہ کام بھی ہو جائے گا۔ تم فکر مند نہ ہو۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت لطیف انداز میں معذرت کی۔

بی بی رانی نے آپؒ کا یہ عذر قبول نہیں کیا اور اپنی چادر پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

''بھائی! اسے باندھ لو۔ میں اتنی دیر میں تمہارے کپڑے دھو دوں گی۔''

بی بی رانی بھی حضرت بابا فریدؒ کی مرید تھیں اس لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ ان کی اس خواہش پر مجبور ہو گئے۔ آپؒ نے چادر باندھی اور ایک کتاب لے کر مطالعے میں مشغول ہو گئے۔ پھر جب کپڑے دُھل کر خشک ہو گئے تو بی بی رانی نے اپنے شوہر سیّد محمد کرمانیؒ کی چھوٹی پگڑی دھوئی اور اسے کاٹ کر حضرت محبوب الٰہیؒ کے کُرتے میں جو گریبان کے پاس پھٹ گیا تھا، پیوند لگائے۔ پھر وہ کپڑے بڑے ادب سے آپؒ کی خدمت میں پیش کئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت معذرت اور شکریے کے ساتھ وہ کپڑے پہنے۔ سیّد محمد کرمانیؒ کہتے ہیں۔

''بظاہر یہ معمولی سی بات تھی مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس واقعے کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اکثر اس واقعے کا ذکر فرماتے۔ یہاں تک کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا۔ مجھ پر بھی مہربان رہے اور میری اولاد پر بھی۔ میں نے اور میرے خاندان نے جو کچھ برکتیں اور نعمتیں حاصل کیں وہ سب محبوب الٰہیؒ کی دعاؤں کا صدقہ تھیں۔''

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ دوسری بار پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؒ کو سلسلۂ چشتیہ کی خلافت سے سرفراز کیا گیا۔

خلافت نامہ عطا کرنے کے بعد، خانقاہ میں موجود تمام درویشوں کے سامنے حضرت بابا فریدؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔

''ہم نے خلافت کے ساتھ نظام الدین محمدؒ کو ہندوستان کی ولایت بھی دی۔''

حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ، حضرت بابا فریدؒ کے محبوب ترین خلیفہ تھے مگر ہندوستان کی ولایت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مقدر ٹھہری۔

جیسے ہی حضرت بابا فریدؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، محبوب الٰہیؒ نے پیر و مرشد کی دست بوسی کی۔ پھر اس طرح کھڑے رہے کہ آپؒ کا سرِ نیاز حضرت شیخؒ کی بارگاہِ جلال میں جھکا ہوا تھا۔

''مولانا نظام الدین! سر اٹھاؤ۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل کی تو ایک اور نعمت عظیم آپؒ کی منتظر تھی۔ حضرت بابا فریدؒ کبھی کبھی ایک خاص دستار باندھتے تھے اور یہ دستار وہ تھی جو آپؒ کے پیر و مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آپؒ کو عطا کی تھی۔ بعض روایات کے مطابق یہ دستار حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اپنے شیخ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عطا ہوئی تھی۔ اس طرح دستار کو پیرانِ چشت کے تبرکات میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے حکم شیخ پر سر اُٹھایا تو حضرت بابا فریدؒ اس دستار کو کھول رہے تھے۔ پھر اہلِ دل کے لئے وہ منظر بڑا عجیب تھا، جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عطا........ حضرت قطبؒ کی بخشش........ اور حضرت بابا فریدؒ کی عنایت، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سر کی زینت بن گئی۔ حضرت بابا فریدؒ نے خود اپنے دستِ مبارک سے وہ دستارِ ولایت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سر پر آراستہ کی۔

اس کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے اپنا عصا حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو مرحمت کیا اور پھر فرمایا۔

''نظام الدین محمد! دو رکعت نماز ادا کرو۔''

محبوب الٰہیؒ فوراً حکم شیخ پر عمل پیرا ہوئے۔ پھر جب آپؒ نماز ادا کر چکے تو حضرت بابا فریدؒ نے ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''فرزند! میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

پھر حضرت بابا فریدؒ نے تمام درویشوں کے سامنے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لئے خصوصی دعا فرمائی۔

''اے اللہ! نظام الدین محمد تجھ سے جو کچھ مانگے اسے عطا فرما دے کہ تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں۔''

پھر جب حضرت محبوب الٰہیؒ اجودھن سے رخصت ہونے لگے تو حضرت بابا فریدؒ نے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''نظام الدین محمد! اپنا یہ خلافت نامہ ہانسی میں مولانا جمال الدین کو اور دہلی میں قاضی منتجب الدین کو دکھا دینا۔''

قاضی منتجب الدینؒ، حضرت بابا فریدؒ کے عظیم المرتبت خلیفہ تھے۔ اس وقت قاضی صاحب، پیر و مرشد کے حکم سے دہلی میں مقیم تھے اور بندگانِ خدا میں علم ظاہری و باطنی کی دولت تقسیم کر رہے تھے۔

مولانا جمال الدین سے مراد حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ ہیں۔ آپؒ کا سلسلۂ نسب امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ سے ملتا ہے۔ حضرت شیخ جمالؒ سے حضرت بابا فریدؒ اس قدر محبت کرتے تھے کہ ان جذبات کو الفاظ میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شیخ جمالؒ کی خاطر حضرت بابا فریدؒ نے بارہ سال تک ہانسی میں قیام کیا تھا۔ اپنے محبوب مرید کے بارے میں آپؒ فرمایا کرتے تھے۔

''جمال، جمال ماست۔'' (جمال، ہمارا جمال ہے)

حضرت بابا فریدؒ جب اپنے کسی مرید کو خلافت نامہ عطا کرتے تو اس شخص کو تاکید فرما دیتے کہ ہانسی جا کر شیخ جمال الدینؒ سے مہر لگوا لینا۔ اگر حضرت شیخ جمال ہانسویؒ خلافت نامے پر مہر لگا دیتے تو وہ مستند سمجھا جاتا........ اور اگر شیخ جمالؒ مہر نہ لگاتے تو حضرت بابا فریدؒ بھی اس خلافت نامے کو قبول نہ فرماتے اور صاف صاف کہہ دیتے۔

''جمال کے چاک کئے ہوئے کو ہم سی نہیں سکتے۔''

حضرت بابا فریدؒ کے یہ الفاظ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جب حضرت شیخ جمالؒ نے آپؒ کے ایک مرید کا خلافت نامہ اس کی بے ادبی اور غرور کے سبب چاک کر دیا تھا اور پھر اس شخص نے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر شیخ جمالؒ کی شکایت کی تھی۔ جواباً حضرت بابا فریدؒ نے تمام اہلِ مجلس کے سامنے فرمایا تھا۔

''جسے ہمارا جمال چاک کر دے، ہم اسے نہیں سی سکتے۔''

الغرض دولتِ عظیم سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت نظام الدینؒ، پیر و مرشد کی دعاؤں کے سائے میں اجودھن سے دہلی رخصت ہوئے۔ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا انتقال 659ھ میں ہوا۔ اس تاریخی پس منظر کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 657ھ یا 658ھ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو خلافت عطا ہوئی۔ بعض روایتوں میں خلافت نامہ تحریر کئے جانے کی تاریخ 669ھ درج ہے۔ اس وقت تو خود حضرت بابا فریدؒ بھی وصال فرما چکے تھے۔ آپؒ 664ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں بہت سے تاریخی اختلافات موجود ہیں مگر ہم نے ان ہی تاریخوں پر انحصار کیا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی سے روانہ ہو کر اجودھن تشریف لائے اور حضرت

جمال الدین ہانسویؒ کو اپنا خلافت نامہ دکھایا۔ شیخ جمالؒ بہت خوش ہوئے اور نہایت والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

(تمام جہانوں کے مالک کے لئے ہزار شکر ہے کہ گوہر اس شخص کے حوالے کر دیا گیا جو گوہر شناس ہے)

ہانسی میں چند روزہ قیام کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے بھر آپؒ کو ایک ہی خیال پریشان کرتا رہا کہ حضرت شیخؒ نے خلافت عطا کرتے وقت قاضی منتجب الدینؒ کے ساتھ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کا نام کیوں نہیں لیا؟ حالانکہ وہ آپؒ کے چھوٹے بھائی بھی تھے اور خلیفہ بھی۔ اس مسئلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔ عقلی طور پر اس واقعہ کی ایک ہی توجیہہ سمجھ میں آئی تھی کہ شاید پیر و مرشد حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ سے ناراض ہیں........ اور یہ خیال حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے نہایت تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی دعاؤں اور صحبتوں کے طفیل ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت بابا فریدؒ کا آستانۂ عالیہ میسر آیا تھا۔

غرض اسی ذہنی کشمکش میں سفر تمام ہوا اور ایک جانگداز خبر آپؒ کی منتظر تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اجودھن اور ہانسی کے درمیان میں تھے کہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ایک طویل رفاقت تھی جو ختم ہو گئی، ایک رشتۂ خاص تھا جو ٹوٹ گیا........ ایک شہرِ علم تھا جو اُجڑ گیا........ اور ایک درس گاہِ محبت تھی جو خالی ہو گئی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایصالِ ثواب کے لئے حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی قبر پر حاضر ہوئے۔ پھر اہلِ خانہ سے تعزیت کی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو یاد کر کے اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے اور پھر نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے۔

”اس شہر میں وہی اپنے محسن بھی تھے اور دوست بھی........ وہی غمگسار بھی تھے اور رہنما بھی........ علم و آگہی کا ایک روشن پیکر تھا جو موت کے گرد و غبار میں گم ہو گیا۔ زہد و تقویٰ کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا جو دستِ قضا نے ہم سے چھین لیا۔ اللہ، حضرت شیخؒ کی قبر کو نور سے بھر دے کہ وہ ہم دھوپ میں جلنے والوں کے لئے محبت کا ایک مضبوط سائبان تھے۔“

پھر جب رنج و الم کی شدت کچھ کم ہوئی تو حضرت محبوب الٰہیؒ کی سمجھ میں یہ راز آیا کہ حضرت بابا فریدؒ نے آپؒ کو خلافت نامہ عطا کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں فرمایا تھا کہ ”اسے نجیب الدین متوکلؒ کو بھی دکھا لینا۔“ یہ حضرت بابا فریدؒ کے نورِ باطن کی عجیب مثال تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

روز و شب کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر ایک ویران علاقے ”غیاث پور“ میں اپنے مالک کی رضا تلاش کرتے رہے۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے ساتھیوں کے افلاس کا وہ زمانہ تھا کہ تین تین دن روٹی کا ایک لقمہ بھی میسر نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی غیب سے کچھ حاصل ہو جاتا تو آپؒ پہلے اپنے خدمت گاروں کو کھلاتے۔ خدام عرض کرتے کہ پیر و مرشد بھوکے ہیں تو ہم کس طرح اس غذا کو اپنے حلق سے اُتار سکتے ہیں........ مگر آپؒ کمال صبر کے ساتھ اس مشکل وقت کو گزار دیتے اور خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلاتے۔ کبھی آپؒ فرماتے کہ یہ میرا حکم ہے اور خدمت گار مجبوراً کھانا کھانے لگتے۔ کبھی آپؒ فرماتے کہ میں بھی تمہارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟ ایک بار تو ایسا ہوا کہ آپؒ نے روٹی کا پہلا نوالہ توڑا اور اسے شوربے میں ڈبونے کے لئے دستِ مبارک بڑھایا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آخری وقت تک آپؒ کا ہاتھ سالن کے پیالے میں رہا مگر آپؒ نے غذا کا لقمہ نہیں کھایا۔ یہاں تک کہ تمام درویش کھانے سے فارغ ہو گئے۔ پھر آپؒ نے وہ لقمہ کھایا اور دسترخوان سے اُٹھ گئے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

سلطان غیاث الدین بلبن، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے استادِ گرامی مولانا کمال الدین زاہدؒ کا بہت معتقد تھا مگر حیرت کی بات ہے کہ اپنے طویل دورِ اقتدار میں وہ ایک بار بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ دارالحکومت سے دُور غیاث پور جیسے ویران علاقے میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ غیاث الدین بلبن علم دوست ضرور تھا مگر اس کے دماغ میں بوئے سلطانی موجود تھی۔ وہ ایسے اہلِ علم کو نوازتا تھا جو اس کے دربار میں حاضری دیا کرتے تھے اور اس کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے۔ سلطان کو درویشوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایسے درویش تھے جو قصرِ سلطانی کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ پھر دونوں میں کس طرح قربت کے رشتے قائم ہوتے؟

آخر سلطان غیاث الدین بلبن شدید محرومی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کا لائق ترین بیٹا سلطان محمد مغلوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ بغرا خان عیش و عشرت میں مبتلا تھا۔ مجبوراً بلبن نے خان شہید کے بیٹے کیخسرو کے نام وصیت کی۔ ملک فخر الدین کوتوال بلبن کا ایک طاقت ور امیر تھا۔ شہزادہ خان شہید اپنی زندگی میں ملک فخر الدین کوتوال کو ناپسند کرتا تھا۔ نتیجتاً اس نے خان شہید کی روح سے انتقام لینے کے لئے اس کے بیٹے کی بجائے بغرا خان کے لڑکے معز الدین کیقباد کو ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ اگرچہ بلبن نے کیقباد کو نامور اساتذہ سے تعلیم دلائی تھی اور خود بھی اسے عیش و عشرت کی فضاؤں سے دور رکھتا تھا....... مگر اٹھارہ سال کی عمر میں تاجِ سلطانی سر پر رکھتے ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ پھر معز الدین کیقباد، گناہوں کی پستی میں ایسا گرا کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ کون سی رنگینی تھی جو معز الدین کیقباد نے مہنگے داموں نہیں خریدی...... اور وہ کون سی بدمستی تھی جو اس کے حلقۂ اختیار میں نہیں تھی۔ ساغر و صراحی، رقصِ بُتاں، شوخئ دلبراں، ساز و آواز، خود فراموشی و بے خبری۔ بس یہی وہ سامانِ کیف و نشاط تھا جس کے سہارے معز الدین کیقباد کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ آخر اکیس سال کی عمر میں وہ فالج کا شکار ہو کر بسترِ علالت پر دراز ہو گیا۔

معز الدین کیقباد نے ایک ویران علاقے کیلوکھڑی کو آباد کیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے قیام فرمایا تھا۔ بعد میں آپؒ سلطان شمس الدین التمش کی درخواست پر ''مہرولی'' تشریف لے آئے تھے۔ کیقباد نے کیلوکھڑی میں شاہی قلعے کی بنیاد رکھی، ایک دلکش جامع مسجد تعمیر کرائی اور سرکاری دفاتر دہلی سے یہاں منتقل کرا دیئے۔ نتیجتاً یہ سنسان جگہ اُمراء اور سرکاری ملازموں کی پُرہجوم بستی میں تبدیل ہو گئی۔

کیلوکھڑی سے دو تین میل کے فاصلے پر ''غیاث پور'' ہے جہاں حضرت نظام الدین اولیاءؒ ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا، جب سرکاری کارندوں کا ہجوم دیکھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ کسی اور جگہ تشریف لے جانا چاہتے تھے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ''کیلوکھڑی'' میں جشنِ کیف و نشاط جاری تھا....... اور بمشکل دو تین میل کے فاصلے پر ''غیاث پور'' میں درویشوں کی ایک جماعت فاقہ کشی کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ جہالت پر دنیاوی نعمتوں اور آسائشوں کی بارش ہو رہی تھی اور اہلِ علم کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یہ درویشوں کی کم نصیبی نہیں، خود معز الدین کیقباد کی بدبختی تھی کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی آپؒ کی دعاؤں سے محروم رہا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کو تو اپنی بے سروسامانی کا خیال تک نہ آتا کہ آپؒ اس مردِ جلیل کے تربیت یافتہ تھے جس نے قرض لئے ہوئے نمک کا سالن کھانے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''نظام الدین محمد! درویش کو بھوک کی شدت سے مر جانا قبول ہے مگر قرض کی ذلت گوارہ نہیں۔''

حضرت بابا فریدؒ کی اسی تعلیم اور فیض صحبت نے محبوب الٰہیؒ کو صبر و تحمل کی آگ میں اس قدر جلایا تھا کہ آپؒ نوعمری ہی میں اکسیر بن گئے تھے....... مگر ساتھی درویشوں کی تکلیف ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی۔

اسی زمانے میں حضرت برہان الدین غریبؒ اور حضرت شیخ کمال الدین یعقوبؒ جیسے عظیم بزرگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زیرِ نگرانی معرفت کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ جب مسلسل کئی دن تک فاقے ہونے لگتے تو محبوب الٰہیؒ اپنے مریدانِ خاص سے مخاطب ہو کر فرماتے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم لوگ میری خاطر یہ مصائب برداشت کر رہے ہو اور اس ویرانے میں پڑے ہو جہاں زندگی کی کوئی آسائش تو کجا، ایک وقت کی سوکھی روٹی بھی میسر نہیں۔ تمہیں خبر ہونی چاہئے کہ اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے۔ میں رزقِ حرام کی بات نہیں کرتا۔ اللہ کی آباد کی ہوئی بستیوں میں حلال کی روزی بھی بکثرت موجود ہے۔ تم لوگ شریعت کے دائرے میں رہ کر بھی دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ ناہموار زمین پر سوتے سوتے یقیناً تمہارے جسم دُکھنے لگے ہوں گے۔ میں تمہیں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنی پشت کے لئے نرم بستر تلاش کر لو کہ یہ سب کچھ جائز ہے۔ میری طرف نہ دیکھو کہ مجھے تو ویرانے میں پڑے رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے.... اور میں تمہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہوں کہ اپنے شکم کو فاقہ کشی کی آگ سے بچا لو کہ اللہ نے تمہارے لئے بے شمار چیزیں حلال کی ہیں۔ میرے بھوکا رہنے پر نہ جاؤ کہ میرا بچپن اسی بے سروسامانی میں گزرا ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں اور رضا و رغبت سے بات کہہ رہا ہوں کہ میری خاطر اتنے آزار نہ اُٹھاؤ۔ مجھے تمہاری بھوک اور ناآسودہ زندگی کا خیال بہت پریشان کرتا ہے۔ میں تمہارے ظاہری سکون کے لئے اللہ سے شب و روز دعا کرتا ہوں مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔''

حضرت برہان الدین غریبؒ اور مولانا کمال الدین یعقوبؒ اپنی زندگی سنوارنے

کے لئے تمام تکلیفیں برداشت کر رہے تھے۔ مگر یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اپنی ذات کو مریدوں کے آزار کا سبب قرار دیا۔

پیر و مرشد کی یہ باتیں سن کر حضرت برہان الدین غریبؒ اور مولانا کمال الدین یعقوبؒ بے قرار ہو گئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے گریہ وزاری کرنے لگے۔

"شیخ! ہم تو اس در پر آپڑے ہیں۔ اب اور کہاں جائیں گے؟ آپ کی محبتوں کے سوا ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں۔ خدمتِ شیخ میں گزرنے والا فاقہ کشی کا ایک دن، ہمارے لئے زندگی بھر کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔ اگر ہمیں حکومت ہند بھی دے دی جائے تو ہم اس کے بدلے میں آپ کی قربت کے ایک لمحے کو بھی فروخت نہیں کریں گے۔ ہمیں یہ شرف کافی ہے کہ ہمارے پاؤں میں شیخ کی زنجیر غلامی پڑی ہے۔ آزاد کر دیئے تو اپنی ہوس کے غلام ہو جائیں گے اور یہ غلامی ہمیں منظور نہیں۔"

حضرت برہان الدین غریبؒ اور شیخ کمال الدین یعقوبؒ کی یہ التجائیں اس قدر رقت آمیز ہوتیں کہ حضرت محبوب الٰہیؒ خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور پھر اپنے دونوں مریدوں کی تالیفِ قلب کے لئے فرماتے۔

"اللہ کی رحمت ہمیشہ تمہارے سروں پر سایہ فگن رہے۔ اگر تم نے اللہ کی رضا کے لئے اپنے جسم کو بھوک کی آگ میں جلا ڈالا اور شعلۂ عشق کی تپش سے نفس کو خاکستر بنا دیا تو پھر تم پر آتشِ دوزخ حرام ہو جائے گی۔ اس کائنات میں ایفائے عہد ہی سب کچھ ہے۔ جو لوگ اپنا عہد توڑ دیتے ہیں، انہیں دنیا تو شاید حاصل ہو جائے مگر آخرت میں ان کے لئے شدید عذاب ہے۔ نا قابل بیان ذلت و رسوائی ہے اور بدترین محرومی و ناکامی ہے۔"

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

معز الدین کیقباد بسترِ مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور دوسری طرف سلطان غیاث الدین بلبن کا ایک ترک سردار جلال الدین خلجی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک دن خلجی نے ترک سپاہیوں کے ذریعے معز الدین کیقباد کا فسانۂ حیات انجام تک پہنچا دیا۔ جو محافظ تھے، وہی قاتل بن گئے۔ ترک سپاہیوں نے معز الدین کیقباد کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور اس کے مُردہ جسم کو ریشمی بستر میں لپیٹ کر دریائے جمنا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔

سلطان معز الدین کیقباد کے قتل کے بعد جلال الدین خلجی نے اس کے چھ سالہ بیٹے کیمرث کو شمس الدین کا لقب دے کر ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ اگرچہ سلطنت کی پوری باگ ڈور جلال الدین خلجی کے ہاتھوں میں تھی لیکن پھر بھی وہ دنیا کو دکھانے کے

لئے سلطان بلبن کے خاندان کی وفاداریوں کا دم بھرتا تھا۔ پھر ایک دن یہ مصلحت بھی ختم ہو گئی۔ جلال الدین خلجی نے کیقباد کے چھ سالہ بچے کو قتل کرا کے اپنی مطلق العنان حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ سلطان جلال الدین خلجی پر اپنے دو آقازادوں کا قتل ثابت ہے مگر پھر بھی مؤرخین اسے ایک نیک سیرت فرمانروا قرار دیتے ہیں۔ یہ کیسا عجیب مذاق ہے۔

جلال الدین خلجی سلاطین ہند میں پہلا حکمران تھا جس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے نیاز حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن سلطان جلال الدین خلجی کے چند باہوش مصاحبوں نے اپنے فرمانروا سے کہا۔

"آپ دیگر اہلِ فن اور علماء پر اپنے الطاف و کرم کی بارش کرتے رہتے ہیں مگر پھر بھی کچھ مستحق لوگ آپ کی نظرِ التفات سے محروم ہیں؟"

"آخر وہ کون لوگ ہیں؟" سلطان جلال الدین خلجی نے تعجب سے پوچھا۔

"شیخ نظام الدین اور ان کے کچھ ساتھی غیاث پور میں نہایت غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

مصاحبین نے عرض کیا۔ "اگر آپ ان درویشوں کی کفالت کریں تو یہ بات حکومتِ ہند کے لئے انتہائی سعادت کا باعث ہو گی۔ شیخ نظام الدین ایک باکمال بزرگ ہیں۔"

سلطان جلال الدین خلجی خود بھی علم دوست حکمران تھا۔ اس لئے وہ اپنے مصاحبین خاص کے مشورے پر فوراً عمل پیرا ہوا۔ کاتب سلطانی نے فرمانروائے ہند کے حکم کے مطابق مندرجہ ذیل عبارت تحریر کی۔

"اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے لئے اور آپ کے ساتھی درویشوں کے لئے کچھ گاؤں (جاگیر) وقف کر دوں۔"

سلطان جلال الدین کے مکتوب کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بغور پڑھا۔ شاہی قاصد کا خیال تھا کہ غیاث پور کے ایک گوشے میں فاقہ کشی کی زندگی گزارنے والا یہ درویش عطیۂ سلطانی کو فوراً قبول کر لے گا۔ مگر شاہی قاصد اس وقت حیران رہ گیا، جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے مکتوبِ سلطانی واپس کرتے ہوئے فرمایا۔

"سلطان کو اس فقیر کی جانب سے سلام پیش کرنا اور کہہ دینا کہ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ میرے لئے یہی پُرسش کافی ہے کہ ایک حکمراں کو ان لوگوں کا خیال تو آیا جو دربارِ سلطانی سے بہت دور، ایک گوشے میں اپنی زیست بسر کر رہے ہیں۔"

شاہی قاصد کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں پہلی بار کسی ضرورت مند

شخص کی بے نیازی کا یہ انداز دیکھا تھا۔

یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی تواضع تھی کہ آپؒ نے سلطان جلال الدین خلجی کے محبت نامے کا جواب دعاؤں سے دیا اور یہ آپؒ کی غیرت تھی کہ ایسی بڑی جاگیر کو ادائے بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔

پھر جب سلطان کا قاصد واپس جانے لگا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ تو میرا فیصلہ تھا کہ میں شاہی عطیات کو پسند نہیں کرتا مگر ممکن ہے کہ میرے دیگر ساتھی ضرورت مند ہوں۔ تمہارے سلطان نے اپنے مکتوب میں ایک میرا ہی نہیں، دوسرے درویشوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس لئے مجھے لازم ہے کہ میں ان کی رائے بھی معلوم کرلوں۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان جلال الدین خلجی کا وہ خط اپنے مریدوں اور دوسرے خدمت گاروں کے پاس بھیج دیا۔

''سیر الاولیاء'' میں سیّد امیر خوردؒ کی روایت ہے کہ جب دوسرے مریدوں اور خدمت گاروں نے سلطان جلال الدین خلجی کا خط دیکھا تو وہ لوگ جو بھوک کے عذاب سے گزر رہے تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔

''شیخ! اگر یہ جاگیر مل جائے تو ہمارے دن پھر جائیں۔ آپ کے صبر و استقامت کا یہ عالم ہے کہ پانی تک نہیں پیتے مگر ہم لوگ اتنی قوتِ برداشت کہاں سے لائیں؟ ہماری حالت بہت شکستہ ہے۔ فاقے کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔ خدا کے لئے اس عطیۂ سلطانی کو قبول فرما لیجئے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے خدمت گاروں کی اس درخواست کو سنا جو بہت عاجزانہ تھی۔ آپؒ کہہ سکتے تھے کہ جو لوگ سلوک کے راستے میں سختیاں برداشت نہیں کر سکتے وہ خانقاہ سے چلے جائیں...... مگر آپؒ نے رسمِ دلداری ادا فرمائی اور ان لوگوں کے جواب سے خفا نہیں ہوئے جو کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

پھر آپؒ نے اپنے پیر بھائی سیّد محمد کرمانیؒ اور چند دوسرے لوگوں کو طلب کر کے فرمایا۔ ''اس ملک کا حکمراں درویشوں کے لئے ایک جاگیر وقف کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

سیّد محمد کرمانی اور دوسرے دوستوں نے عرض کیا۔ ''مولانا نظام الدین! ہم تمہارے یہاں وقتاً فوقتاً کھا لیتے ہیں۔ اگر یہ جاگیر مقرر ہو گئی تو پھر ہم تمہارے گھر کا پانی بھی نہیں پئیں گے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ دوستوں کے جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔

''میں دوسروں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میرا مقصود صرف تمہاری صحبت ہے۔ میں تمہارے جواب سے مطمئن ہوں۔ الحمدللہ! تم دین کے کاموں میں میری مدد کرتے ہو۔ دوستوں کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔''

اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مریدانِ خاص حضرت برہان الدین غریبؒ اور حضرت شیخ کمال الدین یعقوبؒ کو طلب کر کے سلطان جلال الدین خلجی کا خط ان کے سامنے رکھ دیا۔

دونوں مریدوں نے مکتوبِ سلطانی پڑھا اور بصد احترام عرض کیا۔ ''شیخ عالی مقام نے کیا پسند کیا؟''

''کوئی طلب نہیں!'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''تو پھر یہ خادم بھی اپنے سینے میں کسی جاگیر کی طلب نہیں رکھتے۔'' حضرت برہان الدین غریبؒ اور حضرت شیخ کمال الدین یعقوبؒ نے بیک زبان عرض کیا۔ ''ہمیں تو صرف اپنے شاہ کی غلامی منظور ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مریدانِ خاص کا جواب سن کر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''اللہ تمہیں اس حُسنِ نیت کا صلہ دے اور خارزارِ حیات میں مزید استقامت بخشے۔''

اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے شاہی قاصد کو طلب کیا اور خط واپس کرتے ہوئے فرمایا۔

''میں نے اپنے ایک ایک ساتھی سے پوچھا مگر کسی کو بھی اس جاگیر کی حاجت نہیں۔ مجھے اپنے غمگساروں سے یہی اُمید تھی۔ اب تم سلطان سے کہہ دینا کہ غیاث پور میں رہنے والوں کو ان کا اللہ کافی ہے۔''

شاہی قاصد ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ان خدمت گاروں کو جو فاقہ کشی سے تنگ آکر جاگیر سلطانی قبول کرنے کے خواہاں تھے، طلب کر کے فرمایا۔ ''تم لوگ صبر کرو۔ عنقریب تمہارے لئے رزقِ کثیر کے دروازے کھلنے والے ہیں۔''

سلطان جلال الدین خلجی نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا حرفِ انکار سنا اور حکومت کے ہنگاموں میں گم ہو گیا۔ دراصل سلطان کی پیشکش میں خلوص نہیں تھا۔ اگر اس کے دل میں درویشوں کے لئے تڑپ ہوتی تو وہ بار بار درخواست کرتا...... بلکہ جاگیر کے کاغذات

لے کر خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مگر وہ تو عنایت شاہی کا ایک انداز تھا، ایک رسمی کارروائی تھی۔ پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسا مردِ قلندر اسے کیسے قبول کرتا؟ آپؒ تو خود رسم شکن تھے۔ پھر زمانے کی یہ حقیر رسمیں آپؒ کی بارگاہِ جلال میں کیسے داخل ہو سکتی تھیں۔

جب بھی کوئی امیر شرفِ باریابی چاہتا تو حضرت محبوب الٰہیؒ ناگوار لہجے میں فرماتے۔
''ان امراء کو کیا ہو گیا ہے؟ درویش کا وقت برباد کرنے کے لئے یہاں کیوں آنا چاہتے ہیں؟''

سلطان جلال الدین خلجی کا عطیہ شکریے کے ساتھ لوٹا دیا گیا تھا۔ اور اب پھر غیاث پور کے درویش کی خانقاہ میں چار وقت کا فاقہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ممنوعہ ایام کے علاوہ ہمیشہ روزے سے رہا کرتے تھے۔ اگر غذا میسر آ جاتی تو جو کی ایک روٹی سے افطار فرماتے...... اور دوسری روٹی سے سحری کا اہتمام کرتے۔ کل دو روٹیاں آپؒ کی خوراک تھی۔ اکثر روایتوں میں درج ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے برسوں نمک کے پانی سے جو کی روٹی استعمال کی۔ یعنی لذتِ کام و دہن سے آپؒ اتنے ہی دور تھے جتنی یہ زمین، آسمان ہے۔

غیاث پور میں ایک بوڑھی عورت بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ہمسایہ تھی اور آپؒ سے بے حد عقیدت رکھتی تھی۔ اس بوڑھی عورت کا یہ کام تھا کہ صبح سے شام تک رسّی بنتی اور پھر دوسرے دن قریب کی آبادی میں جا کر اس رسّی کو فروخت کر دیتی۔ پھر چار پیسے جو حاصل ہوتے ان سے جو کا آٹا اور تھوڑی سی ترکاری خرید لاتی۔ اس کے بعد چند روٹیاں پکا کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں پیش کر دیتی۔ پہلی بار جب ان ضعیف خاتون نے اس طرح عقیدت کا مظاہرہ کیا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے یہ کہہ کر وہ روٹیاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

''اس غذا سے تو خود تمہارا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔ پھر ہم لوگ تمہارے ناتواں کاندھوں پر اپنے رزق کا بوجھ کیوں ڈالیں؟ ہم اللہ کے لئے عبادت کر رہے ہیں تو پھر اللہ ہی ہمارا رازق ہے اور دوسری ضروریات کا کفیل بھی۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کا جواب سن کر بوڑھی عورت گریہ و زاری کرنے لگی۔ ''مجھے اپنی خدمت سے محروم نہ فرمائیے۔ میرے نامۂ اعمال میں اس کے سوا کچھ نہیں۔''

ضعیف خاتون کے لہجے میں اس قدر خلوص اور گداز تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ انکار نہ کر سکے اور جو کی پکی ہوئی روٹیاں قبول فرما لیں۔

اب یہ اتفاق تھا یا قدرت کی مصلحت کہ وہ خاتون کئی دن سے رسّیاں تیار کر رہی تھیں مگر کوئی خریدار نہیں ملتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اور دوسرے درویشوں کی طرح وہ خاتون خود بھی چار دن سے بھوکی تھیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی تکلیف کو بھول گئی تھیں اور ہمہ وقت اس فکر میں غرق رہتی تھیں کہ رزاقِ دو عالم کسی طرح چند روٹیوں کا انتظام کر دے اور یہ مردانِ خدا ان روٹیوں سے روزہ کشائی کر لیں۔

بالآخر پانچویں دن کسی شخص نے ان خاتون سے ایک رسّی خرید لی۔ خاتون بہت خوش تھیں کہ آج فاقہ کشی کا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ رسّی فروخت کرنے کے بعد جو رقم حاصل ہوئی وہ محض اتنی تھی کہ اس سے ایک سیر جو کا آٹا خریدا جا سکتا تھا۔ خاتون نے یہی کیا اور جب عصر کا وقت آیا تو انہوں نے وہی سیر بھر آٹا حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر مولانا کمال الدین یعقوبؒ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ نذرِ خلوص ہے۔ اسے قبول کر لو اور آٹے کو دیگ میں ڈال کر پکنے کے لئے رکھ دو۔''

حضرت شیخ کمال الدین یعقوبؒ نے پیر و مرشد کے حکم پر عمل کرتے ہوئے جو کے آٹے کو دیگ میں ڈال دیا اور پھر زیادہ مقدار میں پانی بھر دیا۔ اس کے بعد آگ دہکا دی گئی۔ ایسا کرنے سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا مقصد یہ تھا کہ اگر آٹے کے علاوہ غیب سے کچھ اور حاصل ہو تو اسے بھی دیگ میں ڈال کر پکا لیا جائے۔ اس طرح غذا کی مقدار بڑھ جاتی۔ ورنہ اگر روٹیاں پکائی جاتیں تو ایک دو نوالوں سے زیادہ خوراک کسی درویش کے حصے میں نہ آتی۔

آگ کے شعلے بھڑکتے رہے اور پانی اُبلتا رہا۔ اسی اثناء میں ایک گدڑی پوش فقیر کہیں سے گھومتا ہوا آیا اور نعرہ زنی کرنے لگا۔
''اگر کسی کے پاس کچھ ہے تو وہ اسے فقیر کے سامنے پیش کرے۔ آج فقیر بہت بھوکا ہے۔ جلدی کرو اور اس کی بھوک مٹا دو۔''

درویش نعرہ زنی کرتا ہوا کمال الدین یعقوبؒ کے پاس آیا۔ مولانا اس دیگ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ نزدیک آ کر درویش نے پھر صدا لگائی۔
''اگر کچھ ہے تو کھانے کو دے۔ دیگ کو بند کیوں کر رکھا ہے؟ اس کا منہ کھول دے۔''
حضرت مولانا کمال الدین یعقوبؒ نے غور سے اس گدڑی پوش کی طرف دیکھا۔ درویش کا لباس دریدہ بھی تھا اور میلا بھی۔ اس کی داڑھی بے ترتیب تھی اور بال پریشان

تھے۔ وہ اپنی ظاہری حالت سے کوئی مجذوب معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کمال الدین یعقوبؒ جس منزل کے مسافر تھے، وہ یکسر ہوش کی منزل تھی۔ وہاں کسی انتشار اور جذب و مستی کو دخل نہیں تھا۔ مولانا نے گدڑی پوش کو ایک نظر دیکھا اور اُٹھ کر حضرت نظام الدینؒ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اس وقت کچھ پڑھ رہے تھے۔ مولانا کمال الدین یعقوبؒ کو اپنے سامنے دست بستہ کھڑے دیکھ کر آپؒ نے ان سے آنے کا سبب دریافت کیا۔

''ایک مرد درویش بہت بھوکا ہے۔'' مولانا کمال الدین یعقوبؒ نے عرض کیا۔ ''اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھائے پیئے بغیر نہیں جائے گا۔''

''مولانا! آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایک عارفانہ تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''اس میں تو اس درویش کا بھی حصہ شامل ہے۔ ہم تو محض منتظم ہیں۔ مخلوقِ خدا کو کھلانے ہی کے لئے بیٹھے ہیں۔ ان درویش سے بھی کہہ دو کہ ابھی کھانا پک رہا ہے۔ جیسے ہی تیار ہوگا، سب سے پہلے ان ہی کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔''

پیر و مرشد کا حکم سن کر مولانا کمال الدین یعقوبؒ واپس تشریف لے گئے اور اجنبی درویش کے سامنے حضرت محبوب الٰہیؒ کے الفاظ دہرا دیئے۔

گدڑی پوش فقیر بھوک سے بہت بے قرار تھا۔ شدید حالت اضطراب میں کہنے لگا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ اپنے شیخ سے کہہ کہ کھانا جس حالت میں موجود ہے، بھیج دیں۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ خود ہی مجھے کھانا کھلائیں۔''

یہ کہہ کر وہ گدڑی پوش فقیر وہاں سے ہٹا اور کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا۔

مولانا کمال الدین کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں اس گدڑی پوش فقیر کو دیکھتے رہے، پھر جھجکتے ہوئے دوبارہ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درویش کی خواہش من و عن بیان کر دی۔

وہ لمحات بڑے عجیب تھے، جب مولانا کمال الدین یعقوبؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ حضرت شیخؒ نہایت جذب و شوق کے عالم میں فرما رہے تھے۔

''میزبان کے لئے مہمان کی تواضع فرض ہے۔۔۔۔۔۔۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر فرض یہ ہے کہ مہمان جس طرح بھی خوش ہو، اسے خوش کیا جائے۔''

یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہیؒ اس جگہ تشریف لے گئے جہاں وہ گدڑی پوش کھانے کے

انتظار میں بیٹھا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور سامنے ہی وہ دیگ پک رہی تھی جس میں سیر بھر جو کے آٹے کے سوا کوئی دوسری جنسِ خوردنی شامل نہیں تھی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دیکھ کر وہ درویش کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔ ''شیخ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ آج بہت بھوک لگی ہے۔ اس لئے تمہارے دروازے پر چلے آئے۔ اب تم اپنے ہاتھ سے اس فقیر کو کچھ کھلاؤ۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے دیگ کے قریب جا کر دیکھا۔ پانی اس طرح اُبل رہا تھا کہ اگر اس کا ایک قطرہ بھی انسانی جسم پر گر جاتا تو کھال جھلس کر رہ جاتی۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ ''آپ نے مجھ فقیر کو میزبانی کی سعادت بخشی مگر کھانا ابھی گرم ہے۔ تھوڑا سا انتظار کر لیں۔''

''شیخ! اب انتظار نہیں۔'' درویش بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ''تم اس آگ کی بات کر رہے ہو، میرے شکم میں جو آگ لگی ہے، وہ اس سے بھی فزوں تر ہے۔ بس تم دیگ اٹھا کر میرے سامنے لاؤ۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے پھر کچھ نہیں فرمایا۔ آستینیں چڑھائیں اور ایک موٹے کپڑے سے دیگ کے دونوں کنارے پکڑ لئے۔ پیر و مرشد کے اس عمل کو دیکھ کر مولانا کمال الدین یعقوبؒ آگے بڑھے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا۔

''میزبان کو مہمان کی مرضی کا لحاظ رکھنا چاہئے اور ہمارا مہمان یہی چاہتا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کی تواضع کروں۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ دیگ اُٹھا کر اس درویش کے پاس لے گئے۔ مولانا کمال الدین یعقوبؒ کو گدڑی پوش کی یہ ادا سخت ناگوار گزری تھی کہ اس نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی اور اس طرح بیٹھا رہا جیسے خانقاہ کے لوگ اس کے خدمت گار ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مولانا یعقوبؒ نے یہ بھی محسوس کیا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی پیشانیٔ مبارک پر ناگواری کی شکن تک نہیں تھی بلکہ آپؒ دیگ اُٹھاتے وقت بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔

جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ دیگ لے کر اُس درویش کے قریب پہنچے تو وہ بھوک کی شدت سے اس قدر مضطرب ہوا کہ اُس نے اُبلتے ہوئے پانی میں بے جھجک اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اُسے منع کرتے ہی رہ گئے۔۔۔۔۔۔۔ مگر درویش بار بار دیگ میں ہاتھ ڈالتا اور پھر جو کے رقیق آٹے کو منہ میں رکھ لیتا۔ گدڑی پوش نے یہ عمل تین بار دہرایا۔ پھر اس نے دیگ کو اُٹھا کر زمین پر مار دیا۔ وہ دیگ دراصل مٹی کا ایک بڑا مٹکا تھا

جو زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نہایت صبر و سکون سے درویش کی اس اضطراری حرکت کو دیکھتے رہے مگر مولانا کمال الدین یعقوبؒ خاموش نہ رہ سکے۔

''مہمان! تم نے یہ کیا، کیا؟'' مولانا کے لہجے سے تلخی کا رنگ نمایاں تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اس پانی جیسی غذا سے کچھ اور بندگانِ خدا بھی روزہ کشائی کرتے۔ افسوس! تم نے دوسروں کی بھوک کو نظر انداز کر دیا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ درویشانِ خدا مست کتنے دن کے فاقے سے ہیں۔''

''میں اللہ کے حکم سے یہ بات جانتا تھا مگر کیا کرتا کہ میرے لئے اللہ کا یہی حکم تھا۔'' درویش بڑی بے نیازی کے عالم میں بول رہا تھا۔ ''مجھ سے یہی کہا گیا تھا کہ میں اس دیگ کو توڑ دوں۔'' یہ کہہ کر گدڑی پوش حضرت محبوب الٰہیؒ کے قریب آیا اور نہایت محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''شیخ نظام الدین! تمہیں بابا فرید گنج شکرؒ نے نعمت باطنی بخشی اور میں نے تمہاری فاقہ کشی کی دیگ کو توڑ دیا۔ اب تم سلطانِ ظاہری بھی ہو اور سلطانِ باطنی بھی۔'' یہ کہہ کر وہ درویش تیز قدموں سے چل گیا اور تھوڑی دُور جا کر غائب ہو گیا۔

مولانا کمال الدین یعقوبؒ حیرت سے اپنے پیر و مرشد کی طرف دیکھنے لگے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مرید کی حیرت دُور کرنے کے لئے فرمایا۔ ''مولانا! اللہ کی قدرت بھی لامحدود ہے اور اس کا کرم بھی۔ انسان عاجز ہے کہ وہ توفیقِ الٰہی کے بغیر کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ ہم نہیں جانتے کہ کس بھیس میں کون ہے؟ آؤ! اپنے اللہ کا ذکر کریں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔''

اس گدڑی پوش درویش نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ''سلطانِ ظاہری و باطنی'' کہہ کر پکارا تھا۔ اس لئے آپؒ کا ایک لقب ''سلطان المشائخ'' بھی ہے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اس اجنبی درویش کے جانے کے بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر تسخیرِ ظاہری کے دروازے کھل گئے۔ لوگ قطار در قطار چلے آتے تھے۔ آنے والوں میں امراء، وزراء اور صاحب حیثیت افراد شامل تھے۔ مفلس و تنگ دست لوگوں کے علاوہ جو شخص بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوتا، کچھ نہ کچھ نذر کے لئے ضرور لاتا اور درخواست گزار ہوتا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اسے قبول فرما لیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ اگر آنے والا متکبر سرمایہ دار ہوتا تو یہ

درویش خدا مست اسے ناکام و نامراد لوٹا دیتا...... ورنہ عام طور پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نذریں قبول فرما لیتے تھے۔ مگر اس طرح کہ ساری چیزیں اسی وقت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ تسخیر ظاہری کے دروازے کھل جانے کے بعد بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کا وہی حال تھا۔ ایامِ ممنوعہ کو چھوڑ کر آپؒ تمام سال روزہ رکھتے۔ سحری میں جو کی ایک ٹکیہ استعمال فرماتے اور جب افطار کا وقت آتا تو جو کی دوسری روٹی آپؒ کی غذا ہوتی۔ خانقاہ میں رہنے والے خدمت گار شکم سیر ہو کر کھاتے اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ، سلطان علاء الدین خلجی کے اقتدار میں آنے سے پہلے ہی دہلی اور اس کے گرد و نواح میں بہت زیادہ مشہور ہو چکے تھے۔ آپؒ کی خانقاہ میں ہر محرم کی پانچویں تاریخ سے لے کر دسویں تک حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے عرس مبارک کی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ عرس میں شرکت کرنے کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے زائرین آتے تھے۔ اس طرح طویل و عریض ملک کا شاید ہی ایسا کوئی خطہ ہو، جہاں کے لوگ حضرت محبوب الٰہیؒ کے حلقۂ عقیدت میں شامل نہ ہوں۔

اس زمانے میں سلطان علاء الدین خلجی کا ایک امیر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قیمتی نذر پیش کی۔ خلجی امیر کا خیال تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کسی پس و پیش کے بغیر اس کی نذر قبول فرما لیں گے۔ شاید اس خیال کی وجہ یہ ہو کہ خلجی امیر گوشہ نشین درویشوں کو ضرورت مند سمجھتا تھا۔

''تمہاری اس محبت کا شکریہ کہ تم نے درویشوں کا اس قدر خیال رکھا۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''مگر اس فقیر کو اتنی بڑی رقم کی حاجت نہیں ہے۔''

خلجی امیر کا چہرہ اُتر گیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے طرزِ عمل نے ایک سرمایہ دار کے ان خیالات کی نفی کر دی تھی کہ درویش ضرورت مند ہوتے ہیں اور ہر خاص و عام کی پیش کردہ نذریں قبول کر لیتے ہیں۔

''یہ رقم ضرورت مندوں تک پہنچا دو کہ وہ مجھ سے زیادہ تمہاری امداد کے مستحق ہیں۔'' خلجی امیر کو خاموش پا کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

ایک سرمایہ دار کا قصر پندار آن کی آن میں منہدم ہو گیا۔ خلجی امیر نے درویش کا یہ اندازِ بے نیازی نہیں دیکھا تھا۔ دل پر چوٹ لگی تھی کہ گڑگڑانے لگا۔ ''شیخ! مجھے اس طرح تو ناکام و نامراد واپس نہ لوٹائیں۔''

"بھائی! اپنا راستہ لو۔ کیوں ایک درویش کا وقت برباد کرتے ہو؟" حضرت محبوب الٰہیؒ نے بیزاری کے ساتھ فرمایا۔ "مجھے اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں۔"

دراصل وہ خلجی امیر اپنی دولت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور درویشوں کو ایک بڑی رقم دے کر اپنی انا کی تسکین چاہتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ پر کشف کے ذریعے خلجی امیر کی نیت ظاہر ہو چکی تھی۔ اس لئے آپؒ اُس کی نذر قبول کرنے سے گریز فرما رہے تھے۔

"شیخ! کچھ تو کرم فرمائیے!" خلجی امیر نے دوبارہ درخواست کی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خادم خاص خواجہ اقبالؒ کو طلب کیا اور پھر تھیلی میں سے ایک سکہ نکال کر فرمایا۔ "اسے کسی ضرورت مند کو دے دو۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس عمل سے خلجی امیر کے چہرے پر اطمینان کا رنگ اُبھر آیا۔

"اب جاؤ!" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خلجی امیر کو مطمئن انداز میں بیٹھا دیکھ کر فرمایا۔

"میں نے اپنی مرضی کے خلاف تمہاری خواہش کی تکمیل کر دی۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "اب کہاں تک کسی کی دلجوئی کروں؟ باقی رقم تم رکھ لو، یہ تمہارے کام آئے گی۔"

خلجی امیر کی شخصیت پر چڑھا ہوا ملمع اُتر گیا اور اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "مجھے اس رقم کی حاجت نہیں کہ میرے پاس بہت دولت ہے۔"

سرمائے کے نشے میں مبتلا ایک مقتدر انسان کی بات سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے چند لمحوں کے لئے سکوت فرمایا۔ پھر آپؒ کے چہرۂ مبارک پر رنگِ جلال اُبھر آیا۔

"بے شک! تم ایک دولت مند شخص ہو مگر اللہ نے اس درویش کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کیا ہے۔" اس کے بعد آپؒ نے خلجی امیر کو حکم دیا کہ اپنے بائیں طرف دیکھے۔

امیر نے جیسے ہی اپنے بائیں جانب نگاہ کی، اس کی زبان گنگ ہو گئی اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اشرفیوں کا ایک دریا جاری تھا جسے خلجی امیر شدید حیرت و استعجاب کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اتنا کچھ دیکھ کر وہ امیر شرمندہ ہو گیا۔

"میں نے سونے اور چاندی کے چند سکوں پر بڑا غرور کیا اور اللہ کے درویش بندوں کو مفلس و نادار سمجھا۔ شیخ! مجھے معاف فرما دیں۔" خلجی امیر کے لہجے سے انتہائی عاجزی جھلک رہی تھی۔

"تیری نذر میں خلوص اور نیت کی صفائی شامل نہیں تھی۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "تُو درویشوں کی مفلسی کا تماشا دیکھنے آیا تھا۔ مگر یاد رکھ کہ اللہ اپنے سوختہ

جانوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ بہرحال میں نے تجھے معاف کیا۔"

پھر جب وہ خلجی امیر نقرئی سکوں کی تھیلی اُٹھا کر انتہائی شکستگی کے عالم میں واپس جانے لگا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا۔

"تُو نے خانقاہ کے اندر جو کچھ دیکھا ہے، کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

اس واقعے کے بعد وہ امیر جب بھی سلطان علاء الدین خلجی کی خدمت میں حاضر ہوتا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ذکر ضرور کرتا۔ "وہ بڑی شان والے ہیں۔ ان کی روحانی عظمتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔"

والئ ہندوستان بڑے ذوق و شوق سے ایک درویش گوشہ نشیں کا ذکر سنتا اور پھر اس امیر سے پوچھتا۔ "آخر تُو نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ میں ایسی کون سی بات دیکھی ہے جو تُو ان کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکتا۔"

"سلطان ذی وقار! میں کیا عرض کروں کہ میں نے شیخ کی ذاتِ عالی صفات میں کیا کیا دیکھا ہے؟" خلجی امیر کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ سلطان علاء الدین سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے ایک درویش بے سر و ساماں کے قدموں میں دولت کا دریا بہتے دیکھا ہے........ مگر جیسے ہی وہ اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کرتا، اس پر نامعلوم سا خوف طاری ہو جاتا........ اور پھر جب وہ اپنے ارادے سے باز رہتا تو اس کی حالت معمول پر آجاتی۔

سلطان علاء الدین خلجی نے اس امیر سے کئی بار پوچھا مگر وہ ہر مرتبہ بس اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ "شیخ میں اتنی خوبیاں ہیں کہ وہ الفاظ کے حصار میں نہیں آسکتیں۔"

غائبانہ طور پر والئ ہندوستان بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ عقیدت کی طرف بڑھنے لگا۔

حضرت امیر خسروؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انتہائی چہیتے اور محبوب مرید تھے۔ حضرت امیر خسروؒ کو سلطان غیاث الدین بلبن کے آخری زمانے میں عروج حاصل ہوا۔ بلبن کا سب سے بڑا بیٹا شہزادہ خان شہید حضرت امیر خسروؒ سے بہت محبت کرتا تھا۔ خود حضرت امیر خسروؒ بھی شہزادہ خان شہید سے بہت زیادہ قربت رکھتے تھے۔ پھر جب شہزادہ سلطان محمد ملتان میں مغلوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا تو حضرت امیر خسروؒ گرفتار کر لئے گئے اور پھر آپؒ کو روسی ترکستان لے جایا گیا۔ کئی سال بعد قید سے رہا ہوئے اور شہزادہ خان شہید کا ایسا اثر انگیز مرثیہ لکھا جسے سن کر غیاث الدین بلبن زار و قطار روتا تھا۔ بلبن خاندان کی تباہی کے بعد سلطان جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں حضرت امیر

خسروؒ کو "امیر" کا منصب حاصل ہوا، آپؒ کو خلعتِ امارت سے نوازا گیا اور بارہ سو تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ جلال الدین کے قتل کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے بھی حضرت امیر خسروؒ کا عہدہ و منصب بحال رکھا۔ پھر سلطان سے اس قدر قربت بڑھی کہ آپؒ "مصاحبین خاص" کے حلقے میں شمار ہو گئے۔

پھر جب بھی فرصت کے لمحات میسر آئے اور سلطان، حضرت امیر خسروؒ کو خلوت میں طلب کرتا تو آپؒ علاء الدین خلجی کے سامنے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روحانیت اور زہد و تقویٰ کا ذکر چھیڑ دیتے۔ خلجی امیر پہلے ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کی شان میں قصیدے سن چکا تھا۔ جب خسروؒ بھی انتہائی والہانہ انداز میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ذکر کرتے تو سلطان علاء الدین خلجی جیسا خود پرست حکمراں اس درویش کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا جو غیاث پور کے ایک گوشے میں بیٹھ کر لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا تھا۔

"خسرو! ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ذکر کے علاوہ تمہیں دنیا میں کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔"

"سلطان معظم! میرے شیخ ایسے ہی ہیں۔" حضرت محبوب الٰہیؒ کا نام لیتے ہی حضرت امیر خسروؒ کے چہرۂ مبارک پر عقیدت و محبت کا سمندر موجزن نظر آنے لگتا تھا۔

"خسرو! تم اپنے پیر و مرشد سے کتنی محبت کرتے ہو؟" ایک بار سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے درباری شاعر سے پوچھا۔

"سلطان ذی حشم! غریب خسرو کے پاس اپنے شیخ کی محبت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔" حضرت امیر خسروؒ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ فرمایا۔

"پھر بھی؟" علاء الدین خلجی حضرت امیر خسروؒ کی انتہائی عقیدت دیکھنا چاہتا تھا۔

"سلطان ذی وقار! اس غلام کے پاس ایک جانِ بے قرار کے سوا کچھ نہیں۔" حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا۔ "اگر پیر و مرشد حکم دیں تو نذرانۂ جاں قدموں میں رکھ کر عرض کروں کہ سیّدی یہ حقیر تحفہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

حضرت امیر خسروؒ کا جوشِ عقیدت دیکھ کر سلطان علاء الدین خلجی حیران رہ گیا...... اور پھر نادیدہ طور پر والئ ہندوستان بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی کا اسیر ہوتا چلا گیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک دن سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ کو خلوتِ شاہی میں طلب

کرتے ہوئے کہا۔

"خسرو! میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے لئے گراں قدر تحائف بھیجوں۔ میرے چاروں طرف سیم و زر کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اگر اس میں سے کچھ دولت کسی درویش کے کام نہیں آئی تو پھر وسائل کا یہ ذخیرہ بے کار ہے۔"

اگرچہ علاء الدین خلجی نے یہ بات خلوصِ دل سے کہی تھی لیکن حضرت امیر خسروؒ خاموش رہے۔

"خسرو! تم مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے پیر و مرشد کی خدمت میں کیا نذر بھیجوں؟" سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے درباری شاعر اور مصاحبِ خاص کو خاموش پا کر دوبارہ پوچھا۔

حضرت امیر خسروؒ نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور خاموش رہے۔

سلطان علاء الدین خلجی حیرت زدہ ہو کر اپنے درباری شاعر کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا کوئی خاص بات ہے جو تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو؟" سلطان نے حضرت امیر خسروؒ کے سکوت کا سبب دریافت کرنا چاہا۔

اس بار امیر خسروؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور آپؒ نے والئ ہندوستان کو حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔

"میرے شیخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے غیاث پور سے کیلوکھڑی تشریف لے جاتے ہیں۔ شدید گرمی کے موسم میں یہ طویل فاصلہ انسانی جسم کو بہت گراں گزرتا ہے۔ ایک دن پیر و مرشد کے دل میں خیال آیا کہ اگر میرے پاس کوئی گھوڑا ہوتا تو یہ ایک کوس سے زیادہ کا فاصلہ سواری پر طے کر لیتا اور گرم ہواؤں کے تکلیف دہ جھونکوں سے کسی حد تک محفوظ رہتا۔ حضرت شیخ نور الدین یار پرانؒ جو ایک ممتاز صوفی ہیں، ان کے کسی خادم کے پاس ایک گھوڑی تھی۔ جس روز حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دل میں یہ خیال آیا تھا، اسی روز حضرت شیخ نور الدینؒ کے خادم نے خواب میں اپنے پیر و مرشد کو دیکھا۔ شیخ نور الدین یار پرانؒ اپنے خادم سے فرما رہے تھے۔

تیرے پاس جو گھوڑی ہے اسے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں بلا تاخیر پیش کر دے کہ وہ نماز جمعہ کے لئے پیدل چل کر سخت تکلیف اُٹھاتے ہیں۔"

صبح خادم کی آنکھ کھلی تو اس نے حکمِ شیخ پر عمل کرنے کا ارادہ کیا مگر کسی کام کی وجہ سے اپنے ارادے کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا اور شام ہوتے ہوتے اس کے ذہن سے وہ خواب بھی محو ہو گیا۔ پھر جیسے ہی وہ دوسری رات سویا، اس نے وہی خواب دیکھا۔ اب کی بار

حضرت شیخ نورالدین یار پراںؒ کسی قدر ناراضگی سے فرما رہے تھے۔

”حکم کی تعمیل میں دیر کیوں ہوگئی؟ تجھے معلوم ہے کہ تیری غفلت کی وجہ سے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے؟“

خادم بے چین ہو کر اُٹھا۔ پھر جیسے ہی صبح ہوئی، اس نے نمازِ فجر ادا کی اور گھوڑی لے کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خادم سے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ جواب میں خادم نے اپنا خواب سنا کر گھوڑی کو نذر کے طور پر پیش کرنا چاہا۔

خادم کی وضاحت کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ”تم اپنے شیخ کے حکم سے یہ ہدیہ میرے پاس لائے ہو........ مگر میں اسے اس وقت تک قبول نہیں کروں گا جب تک میرے شیخ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ مجھے حکم نہیں دیں گے۔“

حضرت نورالدین ملک یار پراںؒ کا خادم مایوس ہو کر چلا گیا۔ پھر تیسری شب اس نے خواب میں اپنے شیخ کو دیکھا حضرت نورالدینؒ فرما رہے تھے۔

”حضرت بابا فریدؒ نے شیخ نظام الدین کو حکم دے دیا۔ تُو کسی پس و پیش کے بغیر نذر پیش کر دے وہ قبول کر لیں گے۔“

پھر جب علی الصباح حضرت نورالدین ملک یار پراںؒ کا خادم گھوڑی لے کر حضرت محبوب الٰہیؒ کے پاس پہنچا تو آپؒ نے اس کی نذر قبول فرمالی۔ یہ کہہ کر حضرت امیر خسروؒ خاموش ہو گئے۔

سلطان علاء الدین خلجی ایک ذہین حکمراں تھا۔ اس نے حضرت امیر خسروؒ کی اس علامتی گفتگو کا مفہوم سمجھ لیا اور وہ اس راز تک پہنچ گیا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس کی نذر قبول نہیں فرمائیں گے۔ والئ ہندوستان نے حضرت امیر خسروؒ کے اس اشارے کو اقتدار کی انا اور شاہانہ ضد کا مسئلہ نہیں بنایا اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

پھر ایک دن سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ سے مشورہ کئے بغیر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ایک قیمتی نذر بھیجی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ اکبر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات ”خیر المجالس“ میں ایک مقام پر تحریر ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے حاجب (دربانِ خاص) کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پچاس ہزار دینار بطور نذر بھیجے تھے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے دولت کے اس انبار کو قبول نہیں فرمایا تھا اور اس عجیب انداز سے انکار کیا تھا کہ اہلِ مجلس حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک دن مولانا حسام الدین نصرت خانیؒ اور مولانا شرف الدین کاشانیؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے تمام اہلِ مجلس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

”اگر کوئی شخص دن کو روزہ رکھے اور رات کو عبادت کرے تو یہ کام بہت سہل ہے کہ یہ کام تو بیوہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں........ لیکن وہ شغل کچھ اور ہے کہ جس کے ذریعے مردانِ طلب گار، خداوند ذوالجلال کا قرب حاصل کرتے ہیں۔“

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ ارشادِ گرامی سن کر اہلِ مجلس بے قرار و مضطرب ہو گئے کہ کب آپؒ اس نکتے کی تشریح کریں اور کب اہلِ طلب کو قرار آئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے راہِ سلوک کے مسافروں کی بے قراری کا اندازہ کر لیا اور فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے وقت معرفت کے اس راز کو ظاہر کیا جائے گا۔

قافلۂ روز و شب اپنی منزل کی جانب مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ پھر تقریباً چھ ماہ بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنا عہد یاد آ گیا۔ آپؒ اس نکتے کی وضاحت کرنے ہی والے تھے کہ محمد کاتب جو سلطان علاء الدین خلجی کا مقرب تھا، مجلس میں داخل ہوا اور دست بستہ بیٹھ گیا۔ محمد کاتب کو دنیوی عزت و وقار کے علاوہ یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا۔

”محمد! تم کہاں تھے؟“

علاء الدین خلجی کے مقرب نے اپنے پیر و مرشد کے حضور رسمِ احترام ادا کی اور پھر سرِ عقیدت خم کرتے ہوئے عرض کرنے لگا۔

”سیّدی! میں والئ ہندوستان کے دربار میں تھا، آج سلطان نے پچاس ہزار دینار آپؒ کی نذر کئے ہیں۔“

اپنے مرید محمد کاتب کی بات سنتے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مولانا حسام الدین نصرت خانیؒ، مولانا شرف الدین کاشانیؒ اور دیگر حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

”بادشاہ کا انعام بہتر ہے یا اس وعدے کا وفا کرنا جو کچھ دن پہلے تم لوگوں سے کیا گیا تھا۔“

تمام عقیدت مندوں اور خدمت گاروں کے سر جھک گئے اور سب نے بیک زبان

عرض کیا۔ "ایفائے عہد زیادہ بہتر ہے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ارادت مندوں کا جواب سنا اور اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "ایفائے عہد آٹھ بہشتوں سے بہتر ہے۔ اس کے سامنے پچاس ہزار دینار کی حیثیت ہی کیا ہے؟"

یہی وہ نکتہ تھا جس کی وضاحت حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے چھ ماہ بعد ایسے موقع پر فرمائی جب سلطان علاء الدین خلجی آپؒ کے مبارک قدموں میں دولت کے انبار لگا دینا چاہتا تھا۔ دراصل ایفائے عہد ہی سب کچھ ہے........ اور اپنے عہد کا پاس رکھنا مردانِ جانباز کا کام ہے........ اور مردانِ جانباز ہی حق تعالیٰ کی بارگاہِ جلال میں قربت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی ایک بڑی کرامت ہے کہ آپؒ نے معرفت کے ایک اہم راز کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب آپؒ ایک بڑی آزمائش سے گزرنے والے تھے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کا محبوب بندہ وہ ہے جو گناہ پر قدرت رکھتا ہو مگر جب ایسا لمحہ آئے تو وہ بے اختیار کہے کہ "میں اپنے اللہ سے ڈرتا ہوں۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ بھی عطیۂ سلطانی قبول کرنے پر اختیار رکھتے تھے مگر آپؒ نے تائیدِ غیبی کے سہارے انسانی نفس کی سب سے بڑی کمزوری پر قابو پایا اور اس شے کو ٹھکرا دیا جس کی طلب میں بے شمار لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ "مال و دولت اور اولاد انسان کے لئے سب سے بڑا فتنہ ہے۔" جو اس فتنے سے بچ کر سلامت روی کے ساتھ گزر گیا، اسی کو خداوند ذوالجلال کی قربت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی ایک مجلس میں اسی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

دوسرے دن محمد کاتب نے سلطان علاء الدین خلجی کو یہ واقعہ سنایا تو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ بہت دل شکستہ نظر آنے لگا۔ والئ ہندوستان کی مایوسی اور آزردگی دیکھ کر محمد کاتب نے کہا۔ "سلطان ذی حشم! افسردہ خاطر نہ ہوں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایک مردِ آزاد ہیں۔ انہیں کسی عہدہ و منصب یا ذخیرۂ سیم و زر سے متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ بس اپنے جذبۂ عقیدت کو زندہ رکھئے کہ شاید کسی روز سلامِ شوق قبول ہو جائے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس طرزِ انکار سے ایک مطلق العنان شہنشاہ کے قصرِ پندار میں زلزلہ سا آ گیا تھا مگر سلطان علاء الدین خلجی نے ایک مردِ پاکباز کی طرف سے اپنے دل کو غبار آلود نہیں ہونے دیا۔ پھر وہ کسی دوسرے موقع کا انتظار کرنے لگا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ آپؒ "گناہ اور توبہ" کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"پرہیزگار اور گناہوں سے توبہ کرنے والا، دونوں برابر ہیں۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس ارشادِ گرامی پر اہل مجلس کو حیرت ہوئی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس حدیث مقدسہ کے مطابق دونوں برابر ہیں۔"

"گناہوں سے توبہ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔" (حدیث شریف)

مزید ارشاد فرمایا کہ جس نے گناہ کیا اور گناہ سے لذت حاصل کی تو پھر تائب ہونے کی صورت میں جب وہ نیک عمل کرے گا تو عبادت سے بھی اسے ذوق حاصل ہوگا۔ ممکن ہے کہ عبادت سے حاصل ہونے والی راحت کا ایک ذرّہ گناہوں کے کھلیانوں کو جلا کر راکھ کر ڈالے۔

اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ اللہ والوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ پوشیدہ رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے کمالات کو ظاہر فرما دیا ہے۔

حضرت خواجہ ابوالحسن نوریؒ پابندی کے ساتھ یہ دعا کیا کرتے تھے۔ "یاالٰہی! تُو اپنے شہروں میں مجھے اپنے بندوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھ۔"

ہاتفِ غیبی نے انہیں آواز دی۔ "اے ابوالحسن! حق کو کوئی شے نہیں چھپا سکتی اور حق کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔"

پھر اس سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ناگور کے علاقے میں رہنے والے ایک بزرگ خواجہ حمید الدین سوالیؒ کا واقعہ سنایا۔ خواجہ سوالیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت خواجہ حمید الدین سوالیؒ سے ایک مجلس میں پوچھا گیا۔

"یہ کیا راز ہے کہ بعض مشائخ دنیا سے گزر جانے کے بعد اس طرح بے نشان ہو جاتے ہیں کہ کوئی شخص ان کا نام تک نہیں لیتا........ اور بعض بزرگ ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی زندگی میں گمنام رہتے ہیں........ مگر انتقال کے بعد ان کی کرامات کا شور سارے عالم میں سنائی دیتا ہے۔"

حضرت خواجہ حمید الدین سوالیؒ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنی زندگی میں شہرت کا خواہاں رہتا ہے مرنے کے بعد اس کی یہی خواہش گمنامی کا سبب بن جاتی ہے اور جن لوگوں نے

زندگی میں اپنے حال کو چھپانے کی کوشش کی ہے، مرنے کے بعد اللہ نے انہیں شہرتِ دوام بخشی ہے۔"

پھر اسی نمائشِ ذات کے حوالے سے حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ واقعہ بیان فرمایا۔

"ایک عقیدت مند نے حضرت سیّدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ مبارک کے دروازے پر ایک شخص کو پڑے ہوئے دیکھا جس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ عقیدت مند خدمت شیخؒ میں حاضر ہوا تو اس نے حضرت غوث اعظمؒ کو اس شخص کا حال سنایا اور اس کے لئے دعا کی درخواست کی۔

جواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "اس بے ادب کے سلسلے میں خاموش رہو۔"

عقیدت مند نے دست بستہ عرض کیا۔ "سیدی! اس شخص سے کیا بے ادبی سرزد ہوئی ہے؟"

حضرت سیّدنا غوث اعظمؒ نے فرمایا۔

"یہ شخص جو خانقاہ کے دروازے پر اس شکستہ حالت میں پڑا ہے، چالیس ابدالوں میں سے ایک ابدال ہے۔ کل یہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ ہوا میں اُڑتا ہوا ادھر سے گزرا۔ جب یہ تینوں خانقاہ کے قریب پہنچے تو ایک ابدال نے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دائیں جانب کا رخ کیا۔ پھر اسی طرح دوسرا ابدال بھی بائیں طرف چلا گیا...... مگر اس بے ادب نے خانقاہ کے اوپر سے گزر جانا چاہا۔ پھر جیسے ہی یہ گستاخ خانقاہ کے مقابل آیا، زمین پر گر پڑا اور اپنے ہاتھ پاؤں کھو بیٹھا۔"

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا آستانہ عالیہ پر جمع رہتے تھے۔ بے شمار بھوکے حضرت محبوب الٰہیؒ کے لنگر سے کھانا کھاتے اور لاتعداد ضرورت مند اس طرح فیض یاب ہوتے کہ پھر ان کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ جسے بھی دنیا کے رنج و الم ستاتے، وہ حضرت نظام الدینؒ کی خانقاہ کا رُخ کرتا، کوئی اس پریشان حال شخص سے پوچھتا کہ کہاں جارہا ہے تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا۔

"شہنشاہ کے دربار میں جارہا ہوں، اپنے دُکھ بیان کرنے کے لئے۔"

سننے والا اس سے دوسرا سوال کرتا۔ "اے شخص! تُو سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں جارہا ہے؟"

کہنے والا کہتا۔ "میں کسی سلطان علاء الدین خلجی کو نہیں جانتا۔ میرے شہنشاہ تو حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ ہیں۔ ان ہی کے در پر جارہا ہوں۔"

یہ آوازیں اتنی شدت اور کثرت سے سنائی دے رہی تھیں کہ عوامی حلقوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ہندوستان کا "بے تاج بادشاہ" کہہ کر پکارا جانے لگا تھا پھر ان صداؤں کی گونج اتنی بڑھی کہ خود علاء الدین خلجی کی سماعت بھی اس شور سے محفوظ نہ رہ سکی۔ فرمانروائے ہند اس بات سے بہت خوش تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی عوام و خواص کی نگاہوں کا مرکز ہے...... مگر بدکردار خوشامدی وزیروں اور بے ضمیر مصاحبوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس شہرت کو غلط رنگ دے کر پیش کیا۔

کہنے والوں نے سلطان علاء الدین خلجی سے سرگوشیوں میں کہا۔ "حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بھی وہی انداز ہیں جو کبھی مولہؒ کے تھے۔ آج جس طرح حضرت محبوب الٰہیؒ کے در سے ہزاروں افراد فیض یاب ہوتے ہیں اسی طرح کبھی سیدی مولہؒ بھی دہلی کے لوگوں پر انصاف و کرم کی بارش کرتے تھے۔"

یہ ایک اشارہ تھا کہ کہیں نظام الدین اولیاءؒ کی بڑھتی ہوئی محبوبیت، حکومتِ وقت کے لئے کوئی سنگین مسئلہ نہ بن جائے۔

بعض حاسدین جو اپنی فطرتِ بد کے تقاضوں سے مجبور تھے، واضح الفاظ میں سلطان کو تنبیہہ کرنے لگے۔

"عوام کے ساتھ آپ کے بہت سے درباری بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ اثر میں داخل ہو چکے ہیں۔ لوگوں کے دل و دماغ پر حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ گرفت کہیں کسی سیاسی انقلاب کا پیش خیمہ نہ ہو۔"

کچھ ضمیر فروش اور دریدہ دہن افراد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے عقیدت مندوں کا لشکر جمع کر رہے ہیں۔ اور یہی لشکر ایک دن سلطان کے اقتدار کے خلاف بغاوت کرے گا اور پھر ہندوستان کا تاج ایک گوشہ نشین درویش کے سر کی زینت بن جائے گا۔

چاپلوسوں اور خوشامدیوں کی اس حاشیہ برداری نے کچھ دیر کے لئے سلطان علاء الدین خلجی کے ذہن کو منتشر کر دیا اور وہ پریشان سا نظر آنے لگا۔ سیاہ کردار رکھنے والے مصاحبوں نے کچھ اس تسلسل کے ساتھ والئ ہندوستان کے کان بھرے تھے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف سے اس کے دل و دماغ پر شکوک و شبہات کا غبار چھانے لگا۔ سیّدی مولہؒ کے حوالے نے اُسے سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا...... اور

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی خود بھی اپنے حقیقی چچا جلال الدین خلجی کو قتل کر کے منصبِ اقتدار تک پہنچا تھا اس لئے وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محبوبیت سے خوف زدہ ہو گیا پھر بھی اس نے ضبط و ہوش کا دامن نہیں چھوڑا۔

سلطان کئی دن تک تنہائی میں اس صورتِ حال کے متعلق سوچتا رہا۔ بار بار اس کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھرتا تھا کہ آخر ایسی کون سی تدبیر اختیار کی جائے جس سے پتہ چل سکے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سیاسی اقتدار کی خواہش رکھتے ہیں یا وہ اس قسم کے جذبات سے بالکل بے نیاز ہیں؟

انجام کار سلطان علاء الدین خلجی کئی دن کی کشمکش کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے بڑی ذہانت سے ایک مسودہ مرتب کرایا جس کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

"سلطان المشائخ ساری دنیا کے مخدوم ہیں۔ ہندوستان کے لوگ دینی اور دنیوی مُعاملات میں آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کی حکومت مجھے بخشی ہے اور رعایا کی ذمہ داریاں میرے سپرد کی ہیں۔ اس لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں تمام امور میں آپ سے مشورہ کروں۔ براہِ کرم مجھے تحریر فرما دیجئے کہ کس کام میں میری اور سلطنت کی بہتری ہے اور میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی جا سکے۔"

جب یہ تحریر مکمل ہو گئی تو سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے محبوب ترین بیٹے خضر خان کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری عرضداشت ہے۔ اسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پہنچاؤ اور شیخؒ سے درخواست کرو کہ وہ اس کا جواب لکھنے کی زحمت فرمائیں۔"

خضر خان، سلطانی مسودہ لے کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوا۔ ولی عہد سلطنت، شاہی دستاویز کے مندرجات سے بے خبر تھا۔ اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتے ہی نہایت عقیدت کے ساتھ رسمِ احترام ادا کی اور شیخؒ کے حضور میں سلطان کا مکتوب پیش کر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے چند لمحوں کے لئے سلطان علاء الدین خلجی کے بھیجے ہوئے سربمہر لفافے کو دیکھا اور حاضرین مجلس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آپ حضرات فاتحہ پڑھیں۔"

اس کے بعد آپؒ نے ولی عہد سلطنت خضر خان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"ہم درویش ہیں اور درویشوں کو شہنشاہی کے کاموں سے کیا غرض؟ میں ایک درویش کی حیثیت سے تمہارے شہر میں رہتا ہوں اور برسوں سے میری یہی روش ہے کہ اہلِ اسلام کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ جب تک زندہ ہوں، اپنے عمل کو جاری رکھوں گا۔ پھر بھی اگر بادشاہ کو میرے قیام پر اعتراض ہے تو پھر میں اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ کیونکہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔"

یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے سلطان علاء الدین خلجی کا خط اس کے سب سے بڑے بیٹے خضر خان کو واپس کر دیا۔

جب خضر خان نے اپنے باپ کے سامنے اس واقعے کی ساری تفصیلات بیان کیں تو والیٔ ہندوستان نے خضر خان سے پوچھا۔

"کیا شیخ نے میرے عریضے کو کھول کر نہیں دیکھا؟"

ولی عہد سلطنت نے نفی میں جواب دیا۔

"واللہ! اس خط کے مندرجات وہی تھے جن کے جوابات شیخؒ نے دیئے۔" علاء الدین خلجی حیرت زدہ بھی تھا اور پُر جوش بھی۔ "اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کچھ باتیں میرے دل میں تھیں مگر وہ بھی شیخؒ پر روشن ہو گئیں۔"

پھر فرمانروائے ہند نے اپنے ان مصاحبوں کو مخاطب کر کے فرمایا جو علاء الدین خلجی کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف اُکسا رہے تھے۔ "میں جانتا تھا کہ یہ تمام باتیں تہمت طرازی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ مجھے خبر تھی کہ میری سلطنت کے کچھ بدنہاد لوگ شیخ نظام الدین پر جھوٹے الزامات تراش رہے ہیں۔ وہ واقعی مردِ قلندر ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک بڑے گناہ سے بچا لیا۔ دشمن تو یہی چاہتے تھے کہ میں اللہ کے برگزیدہ بندے سے اُلجھ جاؤں۔ پھر یہی تصادم میرے لئے اور اس ملک کے لئے تباہی کا سبب بن جائے۔"

یہ سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ کے بدخواہوں کے چہرے اُتر گئے۔

اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی جناب میں ایک معذرت نامہ ارسال کیا۔

"میں حضرت شیخؒ کا دل سے معتقد ہوں۔ میں نے جرأتِ بے جا کی ہے، مجھے معاف کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اجازت دی جائے کہ میں خود حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کر سکوں۔"

سلطان علاء الدین خلجی کی اس درخواست کے جواب میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے لئے غائبانہ دعا کرتا ہوں۔"

اور یاد رکھو کہ غائبانہ دعا میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔"

فرمانروائے ہند نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا جواب سنا تو بہت زیادہ اُداس ہو گیا۔ اس کی شاہانہ زندگی میں حضرت محبوب الٰہیؒ پہلے بزرگ تھے جو نہ اس کی نذر قبول فرماتے تھے اور نہ اسے اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت دیتے تھے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

اس واقعے کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے ایک مصاحب خاص قرا بیگ کو اس خدمت پر متعین کر دیا کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر محفل سماع میں شرکت کرے اور جن اشعار پر حضرت محبوب الٰہیؒ کو وجد آئے، ان اشعار کو تحریر کر کے، سلطان کی خدمت میں پیش کرے۔ قرا بیگ ایک ترکی النسل سردار تھا جو اپنے علم و کردار کے سبب ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ بھی قرا بیگ سے خوش تھے اس لئے آپؒ نے اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا تھا۔

ایک دن قرا بیگ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محفلِ سماع میں حاضر ہوا۔ سب سے پہلے حضرت امیر خسروؒ نے ایک عارفانہ غزل پڑھی۔ اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کے خادم خواجہ مبشرؒ نے حکیم سنائی کے اشعار پڑھے جنہیں سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ قرا بیگ نے فوراً ان اشعار کو قلم بند کر لیا پھر دوسرے روز صبح، قرا بیگ نے وہ کاغذ سلطان علاء الدین خلجی کے سامنے پیش کر دیا۔ ان اشعار کو دیکھتے ہی سلطان کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ بار بار ان اشعار کو پڑھتا اور اُنہیں آنکھوں سے لگاتا۔ قرا بیگ بہت دیر تک اپنے فرمانروا کا یہ عمل دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے حضورِ شاہ کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔

سلطان علاء الدین خلجی نے بڑے والہانہ انداز میں اپنے مصاحب خاص سے کہا۔
"اس وقت تمہیں اجازت ہے کہ جو چاہو کہو اور جو چاہو طلب کرو۔"

قرا بیگ نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ "سلطانِ معظم! مجھے سخت تعجب ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے اس قدر عقیدت رکھتے ہوئے بھی آپ کبھی ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے؟"

سلطان علاء الدین خلجی نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کیا۔ "ہم دنیا دار بادشاہ ہیں اور سر سے پاؤں تک گناہوں میں آلودہ ہیں۔ یہی آلودگی ہمیں شیخؒ کی بارگاہ میں جانے سے روکتی ہے کہ ہم کس طرح اس پاک ہستی کے رُوبرو حاضر ہوں۔ مگر تم خضر خان اور شادی خان کو لے جا کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں میں ڈال دو۔"

تمام معتبر روایتوں سے ثابت ہے کہ سلطان کے دونوں بیٹے خضر خان اور شادی خان، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے مگر چونکہ دولت و اقتدار کے ماحول میں پرورش پا کر جوان ہوئے تھے اس لئے ان پر درویشی کا رنگ نہ چڑھ سکا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید ہونے کے باوجود دونوں شہزادے عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے رہے۔

یہاں بعض کم نظر حضرات اعتراض کر سکتے ہیں کہ عیش پرست شہزادوں کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنا مرید کیوں کیا؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ مرشد ان ہی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ تمام لوگ رہنمائی حاصل کر کے نجات پا جائیں۔ تاریخِ انسانی ایسی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ رہنما کے موجود ہوتے ہوئے بہت سے مسافر کارواں سے الگ ہو کر راستے کے گرد و غبار میں گم ہو جاتے ہیں۔ شہزادہ خضر خان اور شادی خان کی بھی یہ حالت تھی۔ مطلق العنان شہنشاہ کے بیٹے ہونے کے سبب دونوں شہزادے درویشی کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ ویسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ خضر خان اور شادی خان تاج و تخت چھوڑ کر خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ جائیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ دونوں شہزادے لہو و لعب کی زندگی سے تائب ہو جائیں اور پھر جب وہ علاء الدین خلجی کے بعد منصبِ سلطانی تک پہنچیں تو ہندوستانی عوام کو نیک سیرت حکمراں میسر آ جائیں۔ معرکۂ حیات میں یہ ایک مرد درویش کی ذاتی کوشش تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ خضر خان اور شادی خان نے شروع میں تو محتاط زندگی بسر کی مگر جب حصولِ اقتدار کی کشمکش کا آغاز ہوا تو دونوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ پیر و مرشد سے کیا ہوا عہد بھول گئے اور پھر دونوں لرزہ خیز انجام کو پہنچے۔

خیر! وہ تو شہزادے تھے، گناہوں کی فضا کے پروردہ۔ اگر ہم تاریخِ تصوف کا سرسری مطالعہ کریں تو ایسے مشائخ کی طویل فہرست نظر آئے گی جنہوں نے مرشد کے بخشے ہوئے خرقۂ خلافت کو دنیا کے بازار میں نیلام کیا اور ہمیشہ کے لئے رسوائی کی علامت بن کر رہ گئے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام جیسے برگزیدہ رسول کا بیٹا منکرین کی صفوں میں شامل ہو سکتا ہے....... اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی مشرکین کی شریک کار بن سکتی ہے تو پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مریدوں خضر خان اور شادی خان کے انجام پر ہمیں حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔

اس بحث سے قطع نظر دونوں شہزادے حضرت محبوب الٰہیؒ کا بے حد احترام کرتے

تھے۔ خصوصاً خضر خان تو پیر و مرشد کو اپنے باپ سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ یہ خضر خان کی بے پناہ محبت ہی تھی کہ جس سے مجبور ہو کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے خانقاہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ آج جس عمارت کے صحن میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا مزار مبارک ہے اسے خضر خان ہی نے بصد ذوق و شوق تعمیر کرایا تھا۔

✿ ...... ✿ ✿ ...... ✿

خضر خان اور شادی خان کے مرید ہو جانے کے بعد سلطان کے خواب کی تعبیر برآمد ہونے کا امکان نظر آنے لگا تھا...... مگر یہ خواب اس وقت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے سخت الفاظ میں ملاقات سے انکار کر دیا۔

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو مسلسل کئی خطوط لکھے جن میں حاضری کے لئے انتہائی عاجزانہ درخواست کی گئی تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے کچھ دنوں تک سکوت اختیار کیا اور جب سلطان کی التجائیں حد سے بڑھ گئیں تو آپؒ نے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

''سلطان! اس فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر فرمانروائے ہند ایک دروازے سے داخل ہو گا تو یہ فقیر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے گا۔''

کچھ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس جواب کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے بعض مصاحبین سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تھا کہ آخر وہ کس طرح حضرت محبوب الٰہی کے نیاز حاصل کر سکتا ہے۔ سلطان کے اس سوال کے جواب میں مصاحبین نے والیٔ ہند کو بتایا تھا کہ حضرت امیر خسروؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہیتے مرید ہیں۔ اگر وہ کسی موقع پر حضرت محبوب الٰہیؒ سے عرض کریں تو اس ملاقات کا انتظام ہو سکتا ہے۔ علاء الدین خلجی کے کردار میں بعض خامیاں نمایاں سہی مگر بزرگانِ دین سے اس کی عقیدت ایک مثالی درجہ رکھتی تھی۔

آخر اسی عقیدت نے سلطان علاء الدین کو مجبور کیا کہ وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید خاص حضرت امیر خسروؒ سے رابطہ قائم کرے۔ پھر ایک دن ایسا ہی ہوا۔ علاء الدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ سے کہا۔

''خسرو! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ شیخ نظام الدینؒ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ تم شیخؒ کے بہت قریب ہو۔ اس لئے میری سفارش کر دو۔ میں صرف ایک بار حضرت کی دست بوسی سے سرفراز ہونا چاہتا ہوں۔''

یہ مقام فکر ہے کہ جس کی بارگاہِ اقتدار میں بڑے سے بڑا امیر بھی سفارش کرتے

ہوئے گھبراتا تھا، آج وہ خود اپنے ایک ملازم کی سفارش کا محتاج تھا۔ اس واقعے سے اگر ایک طرف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا جبروتِ روحانی ظاہر ہوتا ہے تو دوسری طرف علاء الدین کی نیازمندی بھی جھلکتی ہے۔

امیر خسروؒ بہت دیر تک خاموش رہے مگر جب سلطان نے کئی بار اصرار کیا تو کہنے لگے۔ ''میں سلطان سے وعدہ نہیں کرتا مگر حضورِ شیخ عرضِ حال ضرور کروں گا۔ شاید آپ کی دلی مراد بر آئے۔''

پھر جب ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کسی بات پر مسکرا رہے تھے تو حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاء الدین کی عرضداشت پیش کر دی۔ ''سیّدی! سلطان حاضری کے لئے بہت بے قرار ہے۔ اسے بس ایک بار شرفِ باریابی بخش دیجئے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ بہت دیر تک حضرت امیر خسروؒ کی اس درخواست پر غور کرتے رہے۔ پھر نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''ترک! تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہیں کتنا عزیز رکھتا ہوں مگر شاہوں سے ملاقات کرنا میرا مزاج نہیں۔ آئندہ تم اس سلسلے میں محتاط رہنا اور کسی فرمانروا کی سفارش نہ کرنا کہ ان لوگوں کا راستہ الگ ہے اور میرا مسلک جدا۔ اگر میں ایک بار سلطان کو یہاں آنے کی اجازت دے دوں تو پھر درویشوں کی خانقاہوں میں شہنشاہوں کی آمد ایک رسم بن جائے گی اور میں اس رسم کو زندہ کرنا نہیں چاہتا۔ کچھ سلطان کی عقیدت اور کچھ تمہاری محبت، ان دونوں چیزوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں علاء الدین کے لئے دعا کرتا رہوں، سلطان سے کہہ دو کہ اس کی ذمہ داریاں مجھ سے زیادہ ہیں۔ وہ بندگانِ خدا کے حقوق کی حفاظت کرے اور اپنی رعایا کے سروں پر سکون و عافیت کا سائبان قائم رکھے۔ معاملاتِ دنیا میں پورے پورے انصاف سے کام لے اور جہاں تک میری دعاؤں کا تعلق ہے تو جب تک سلطان ان کا طلب گار رہے گا، یہ دعائیں ان کے حق میں جاری رہیں گی۔'' یہ آخری موقع تھا جس میں واضح ہو گیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور سلطان علاء الدین خلجی کے درمیان بالمشافہ گفتگو یا ملاقات کا کوئی امکان موجود نہیں۔

اس واقعے کے بعد علاء الدین بہت مایوس ہوا۔ سلطان کے مصاحبین خاص کا خیال تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس انکار کے بعد والیٔ ہندوستان اپنے ارادے سے باز آ جائے گا...... مگر کسے معلوم تھا کہ علاء الدین، غیاث پور سے درویش کی خانقاہ میں حاضر ہونے کے لئے کچھ اور ہی منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس منصوبے کی تفصیلات یہ ہیں کہ ایک دن فرمانروائے ہند نے حضرت امیر خسروؒ کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

"خسرو! میں حضرت شیخ سے التجا کرتے کرتے تھک گیا۔ اب ملاقات کا یہی ایک طریقہ باقی رہ گیا ہے کہ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اجازت کے بغیر خانقاہ میں حاضر ہو جاؤں اور اپنے شوقِ بے پناہ کی تکمیل کرلوں۔"

حضرت امیر خسروؒ نے جواباً فرمایا۔ "میں سلطانِ معظم کے اضطراب کو سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی آدابِ خانقاہی سے بھی واقف ہوں۔ دربارِ شاہی کے قوانین کچھ اور ہیں...... مجلس صوفیاء کے اصول کچھ اور......... میری گزارش ہے کہ آپؒ حضرت شیخؒ کی مرضی کے خلاف خانقاہ میں تشریف نہ لے جائیں۔"

حضرت امیر خسروؒ نے بہت احتیاط سے سلطان علاء الدین کو روکنے کی کوشش کی مگر والئ ہندوستان نے حضرت امیر خسروؒ کی گفتگو کو ایک درباری شاعر کا جذباتی تجزیہ سمجھا۔ نتیجتاً علاء الدین خلجی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کل کسی وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ضرور حاضری دے گا۔

یہ حضرت امیر خسروؒ کے لئے ایک بڑا لمحہ فکریہ تھا۔ اگر آپ سلطان علاء الدین کو حضرت محبوب الٰہیؒ کی اجازت کے بغیر خانقاہ میں جانے دیتے تو ناراضئ شیخ کا اندیشہ تھا۔ اور اگر سلطان کے ارادوں سے پیر و مرشد کو قبل از وقت خبردار کر دیتے تو پھر شاہی عتاب نازل ہونے کا خطرہ تھا۔ حضرت امیر خسروؒ دن بھر ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔ پھر جب دربارِ شاہی برخواست ہوا تو حضرت امیر خسروؒ پیر و مرشد کی جناب میں حاضر ہوئے۔ اس دوران آپؒ ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت امیر خسروؒ کو افسردہ دیکھا تو بے قرار ہو گئے۔

"ترک! ایسی کون سی ذہنی خلش ہے جس نے تمہارے چہرے کا رنگ بدل دیا ہے؟"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے چہیتے مرید کی دلداری کرتے ہوئے فرمایا۔

جواب میں حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاء الدین کے حوالے سے پیش آنے والا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمانروائے ہندوستان کی ضد کا احوال سن کر امیر خسروؒ سے دریافت کیا۔ "تم اس بات کو مجھ سے پوشیدہ بھی رکھ سکتے تھے۔ پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا خسرو؟"

امیر خسروؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے سر جھکا دیا۔ "سیّدی! یہ غلام، کوئی بات آپ سے کس طرح پوشیدہ رکھ سکتا ہے؟ میں کسی کی خوشی کو آپ کی ناخوشی پر ترجیح نہیں دے سکتا چاہے وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے امیر خسروؒ کے اس جواب پر اظہارِ مسرت فرمایا اور اسی وقت اپنے پیر و مرشد حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دینے کے لئے اجودھن (پاک پتن) روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن جب علاء الدین کو معلوم ہوا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ اسی رات دہلی سے اجودھن تشریف لے گئے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر سلطان نے حضرت امیر خسروؒ کو تنہائی میں طلب کر کے اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "خسرو! میں نہیں جانتا کہ حضرت شیخؒ کو میرے اس منصوبے کی خبر کس طرح ہو گئی۔"

حضرت امیر خسروؒ غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مصلحت کے طور پر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے کشف کی قوت سے سلطان کے ارادے کو جان لیا اور پھر اس ملاقات سے بچنے کے لئے اجودھن تشریف لے گئے...... مگر یہ عقیدت کا امتحان بھی تھا اور راہِ سلوک کا تقاضا بھی کہ حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاء الدین کے رُوبرو واضح الفاظ میں فرمایا۔

"میں نے پیر و مرشد کو آپ کے ارادے سے باخبر کر دیا تھا۔"

سلطان علاء الدین چند لمحوں کے لئے دم بخود رہ گیا۔ پھر اس کی یہ حیرت غیظ و غضب میں تبدیل ہو گئی۔ "خسرو! تمہیں خبر ہے کہ تم نے مجھے کس قدر آزار پہنچایا ہے۔ میں صرف تمہاری وجہ سے حضرت شیخ کے دیدار کے شرف سے محروم ہو گیا۔"

سلطان علاء الدین کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد اسے تبدیل نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح اگر وہ ایک بار کسی سے ناراض ہو جاتا تھا تو پھر کسی بھی حال میں اس کے دل کی کدورت ختم نہیں ہوتی تھی۔ حضرت امیر خسروؒ بھی فرمانروائے ہند کی اس مزاجی کیفیت سے پوری طرح واقف تھے لیکن جب حضرت محبوب الٰہیؒ کی نسبت سے سلطان نے گفتگو کی تو آپؒ نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرمایا۔

"سلطان ذی حشم! میں آپ کی برہمی سے بے خبر نہیں تھا۔"

"اور خسروؒ! تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہماری برہمی کا ردِ عمل بہت شدید ہوتا ہے۔"

سلطان علاء الدین نے اسی ناراضگی کے عالم میں کہا۔

"اس سے زیادہ ردِ عمل کیا ہو گا کہ سلطان مجھے اس خدمت سے سبک دوش کر دیں گے۔" حضرت امیر خسروؒ نے ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر فرمایا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے حوالۂ زنداں کر دیا جائے۔"

"ان سزاؤں کے علاوہ اور بھی سزائیں ہیں۔" سلطان علاء الدین نے حضرت امیر خسروؒ کی وضاحت کے جواب میں کہا۔

"موت کی سزا سے زیادہ اذیت ناک سزا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔" حضرت امیر خسروؒ نے احترام شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے نزدیک بادشاہ یا سربراہِ حکومت کی ناراضگی کا انتہائی نتیجہ یہ ہے کہ میں قتل کر دیا جاؤں اور زندگی سے محروم ہو جاؤں مگر پیر و مرشد کی ناراضگی سے آخرت خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ میں یہ تو برداشت کر سکتا ہوں کہ فرمانروائے ہند مجھ سے ناراض ہو جائیں اور اپنی اس خفگی کا تاثر قائم کرنے کے لئے اپنے اس خادم کو تہہ تیغ کرا دیں...... مگر مجھے پیر و مرشد کے چہرۂ مبارک پر ہلکا سا عکسِ ملال بھی گوارہ نہیں کہ ان کی ناخوشی میری آخرت کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ بس یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے مجھے افشائے راز کی ترغیب دی۔ دراصل میں جان کے مقابلے میں اپنی آخرت بچانا چاہتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری آخرت سلامت رہی۔ جان باقی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اپنی نافرمانی کے جرم میں میری جان لے سکتے ہیں۔"

بیشتر مؤرخین کی روایت کے مطابق سلطان علاء الدین خلجی ایک ذہین حکمراں تھا۔ اسے امیر خسروؒ کا جواب بہت پسند آیا اور کچھ دیر کے لئے اس کے دل میں پیدا ہو جانے والا غبار صاف ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جسے مؤرخین نے اس کی ذہانت سے تعبیر کیا ہے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ حضرت امیر خسروؒ کے جواب پر سلطان کا خاموش رہنا درپردہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جلالِ روحانی کے زیر اثر تھا۔ یہ سریع الغضب حکمراں اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات سننا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے حضرت امیر خسروؒ کی یہ بے باکی صرف اس لئے برداشت کی کہ وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے جلالِ روحانی سے ڈرتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس واقعے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور سلطان علاء الدین خلجی کے درمیان ملاقات کے تمام امکانات ختم ہو گئے...... مگر یہ بات بھی طے ہو گئی کہ سلطان کو حضرت محبوب الٰہیؒ کی دعاؤں کا سائبان حاصل ہے۔

❁ .... ❁ ❁ .... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلسِ درس روشن تھی۔ ایک عقیدت مند اپنے غلام کے ساتھ حاضر ہوا۔ اس غلام کا نام ملیح تھا۔ عقیدت مند نے شکرانے کے طور پر حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے اپنے غلام کو آزاد کر دیا۔ آزاد ہوتے ہی غلام اپنی جگہ سے بے اختیار اُٹھا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگا۔

"دنیا کی غلامی سے آزاد ہو کر خوش ہوں مگر اب ایک اور غلامی کی تمنا ہے۔"

"یہاں آقائیت اور غلامی کا نہیں، صرف محبت کا رشتہ ہے۔" یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے غلام ملیح کو بیعت کے شرف سے سرفراز کیا۔

پھر حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اس راستے میں نہ کوئی آقا ہے، نہ کوئی غلام۔ یہ محبت کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں جو بھی نیک نیتی کے ساتھ داخل ہوا، اس کا کام بن گیا اور وہ کامیاب ٹھہرا۔"

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"غزنی میں ایک بزرگ تھے۔ زیرک نامی ان کا ایک غلام تھا جو صاحب صلاحیت تھا۔ جب ان بزرگ کے انتقال کا وقت آیا تو تمام مرید جمع ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

"آپ کے بعد سجادہ نشینی کا اعزاز کسے حاصل ہو گا؟"

بزرگ نے اپنے غلام کی طرف دیکھا۔ "میرے بعد زیرک میرا خلیفہ ہو گا۔"

ان بزرگ کے چار لڑکے تھے جو فطرتاً نہایت چالاک بھی تھے اور صاحبِ اختیار بھی۔

غلام زیرک نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے عرض کیا۔

"خواجہ! ارشادِ گرامی سر آنکھوں پر مگر آپ کے صاحبزادے مجھے سجادے (خلافت) پر بیٹھنے نہیں دیں گے اور ہر لحہ مجھ سے دشمنی کا اظہار کریں گے۔ میں بہت کمزور انسان ہوں اس لئے پیر و مرشد مجھے معاف فرمائیں۔"

زیرک کو پس و پیش میں مبتلا دیکھ کر بزرگ نے فرمایا۔ "تجھے اس سلسلے میں ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر میرے بیٹے تجھ سے تکرار و فساد کریں گے تو میں ان کے شر کو دفع کر دوں گا۔"

الغرض جب بزرگ کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق زیرک کو سجادے پر بٹھا دیا گیا۔ خلافت کا اعلان ہوتے ہی چاروں لڑکوں نے زیرک کے خلاف دشمنی کا آغاز کر دیا۔ بھری خانقاہ میں سینکڑوں مریدوں کے سامنے زیرک کی تحقیر کرنے لگے۔

"یہ بے ہنر شخص والد محترم کا خلیفہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ تو ہمارا غلام ہے اور ایک غلام کی کیا مجال کہ وہ سجادے پر بیٹھ کر اس اعلیٰ منصب کی تذلیل کرے۔"

زیرک کچھ دنوں تک تو شیخ زادوں کا تحقیر آمیز سلوک برداشت کرتا رہا مگر جب اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تو پیر و مرشد کے مزار پر حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

"خواجہ! آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر میرے لڑکے تجھ سے مزاحمت کریں گے تو میں ان کے شر کو دفع کر دوں گا۔ اب اپنا وعدہ وفا کیجئے کہ وہ لوگ میری زندگی کے در پے

ہیں۔" یہ التجا کر کے زیرک خانقاہ میں واپس آ گیا۔

ابھی اس بات کو چند روز بھی نہ گزرے ہوں گے کہ غزنی کے نواحی علاقے پر کفار کے ایک لشکر نے چڑھائی کر دی۔ شہر کو دشمنوں سے بچانے کے لئے گرد و نواح کے لوگ اسلامی لشکر میں شامل ہونے لگے۔ ان بزرگ کے چاروں لڑکوں نے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور کفار سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس طرح کسی مزاحمت کے بغیر شیخؒ کا مقامِ خلافت زیرک۔ کے لئے خالی ہو گیا۔ یہ بزرگ کا فیضِ روحانی تھا کہ بیٹوں کو شہادت نصیب ہوئی اور غلام سجادگی۔"

❁ ❁ ❁

سلطان علاء الدین کی عقیدت اور حاسدین کی مخالفت سے بے نیاز، حضرت نظام الدین اولیاءؒ مخلوقِ خدا کی اصلاح میں مشغول تھے۔ ایک روز آپؒ کی خانقاہ میں سینکڑوں طالبانِ حقیقت جمع تھے۔ کسی درویش نے عرض کیا۔ "شیخ! ترکِ دنیا کیا ہے؟"

جواب میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "میرے ایک دوست خواجہ محمود ہیں۔ وہ ایک دن راستے میں جا رہے تھے کہ انہوں نے ایک درویش کو دیکھا جو اپنے فقر کے باعث فاقہ کشی میں مبتلا تھا۔ اکثر اوقات بھوکا رہنے کے باعث اس کا پیٹ کمر سے جا لگا تھا۔ خواجہ محمود نے درویش کی یہ حالت دیکھ کر اسے ایک دانگ (تانبے کا سکہ) دینا چاہا۔

درویش نے خواجہ محمود سے کہا۔ "آج میں نے کٹھل (ایک جنگلی پھل) جی بھر کے کھایا ہے اور روزی کی طرف سے آج کے لئے استغنیٰ حاصل کر لیا ہے اس لئے اے خواجہ! مجھے اس سکے کی حاجت نہیں۔ کسی ضرورت مند کو دے دو۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "یہ ہے صبر اور یہ ہے قناعت........ اور اسی صبر و قناعت کو ترکِ دنیا کہتے ہیں۔"

پھر حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرینِ مجلس کو ایک اور واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔

"ایک بزرگ شیخ علیؒ تھے۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں دونوں پاؤں پھیلائے خرقے کی بخیہ گری کر رہے تھے۔ اسی حالت میں خلیفہ کا حاجب داخل ہوا اور شیخ علیؒ سے کہنے لگا۔ "خلیفہ آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔"

شیخ علیؒ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح اپنے پاؤں پھیلائے خرقہ سیتے رہے۔ حاجب نے کئی بار خلیفہ کی آمد کی اطلاع دی مگر شیخ علیؒ نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ خلیفہ گھر میں داخل ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ شیخ علیؒ نے خلیفہ کے سلام کا جواب دیا اور حاکم وقت کو سوالیہ نظروں سے

دیکھنے لگے۔

حاجب نے کئی بار کہا کہ شیخ! آپ خلیفہ کے احترام میں اپنے پاؤں سمیٹ لیں........ مگر شیخ علیؒ نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے آپؒ نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

خلیفہ نے کئی مسائل دریافت کئے۔ شیخ علیؒ نے پوری تفصیل اور خوش دلی کے ساتھ جوابات دیئے مگر اپنے بیٹھنے کا زاویہ تبدیل نہیں کیا۔ پھر جب خلیفہ واپس جانے لگا تو شیخ علیؒ نے ایک ہاتھ سے خلیفہ کا ہاتھ اور دوسرے ہاتھ سے حاجب کا ہاتھ پکڑا اور کھڑے ہو گئے۔ پھر نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

"جو شخص اپنے دونوں ہاتھ سکیڑ لیتا ہے، اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے دونوں پاؤں پھیلا دے۔"

شیخ علیؒ کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ انہیں خلیفہ وقت سے کوئی طمع نہیں تھا۔ اس کے لئے احتراماً کھڑے نہیں ہوئے۔ جب کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے دستِ طلب دراز کرتا ہے تو وہ اپنے پاؤں سمیٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

شیخ علیؒ کا واقعہ سنانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "اس کو ترکِ دنیا کہتے ہیں۔"

پھر اسی مجلس میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے مشہور بزرگ حضرت اجل شیرازیؒ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"ایک شخص حضرت خواجہ شیرازیؒ کا مرید ہوا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ پیر و مرشد اسے کسی وظیفے کی تلقین فرماتے ہیں؟ کچھ دیر تک مجلس پر سکوت طاری رہا پھر حضرت خواجہ اجل شیرازیؒ نے اپنے نئے مرید کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"جس چیز کو تم اپنے لئے روا نہ رکھو، اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔"

مرید، پیر و مرشد کی ہدایات سن کر وہ چلا گیا۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد واپس آیا اور حضرت شیخؒ سے عرض کرنے لگا۔

"میں جس روز سے آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوا ہوں، اسی روز سے منتظر ہوں کہ پیر و مرشد نماز، روزہ اور دیگر وظائف کے لئے مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟"

اپنے مرید کی بات سن کر حضرت خواجہ اجل شیرازیؒ نے فرمایا۔ "میں نے تمہیں پہلے دن یہ سبق دیا تھا کہ جو چیز ذاتی طور پر تمہیں پسند نہ ہو اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔ مگر تم نے میری وہ بات یاد نہیں رکھی۔ جب کسی شخص کو پہلا سبق یاد نہ ہو تو پھر اسے دوسرا سبق کس طرح دیا جا سکتا ہے؟"

اس کے بعد حضرت خواجہ اجل شیرازیؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''ایک بزرگ اکثر کہا کرتے تھے کہ نماز، روزہ اور وظائف، دیگ کی ضروریات ہیں لیکن اصل چیز گوشت ہے۔ جب گوشت ہی نہ ہوگا تو مصالحے کیا کام آئیں گے؟''

حاضرین میں سے کسی شخص نے اس نکتے کی وضاحت چاہی تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ گوشت ''ترکِ دنیا'' ہے اور نماز، روزہ اور وظائف مصالحہ جات ہیں۔ اس لئے مردِ مومن کو لازم ہے کہ پہلے ترکِ دنیا کرے اور کسی چیز سے تعلق نہ رکھے۔ پھر نماز پڑھے، روزہ رکھے اور دوسرے وظائف میں مشغول ہو تو کوئی خطرہ نہیں...... مگر اس حالت میں کہ دل دنیا کی محبت سے لبریز ہو تو عبادت اور وظائف سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت خواجہ اجل شیرازیؒ کے حوالے سے یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا۔ ''اگر گھی، لونگ، لہسن اور پیاز وغیرہ دیگ میں ڈالیں اور بگھاریں، پھر پانی ڈال کر شوربہ کریں تو وہ جھوٹا شوربہ کہلائے گا۔ اصل شوربہ وہی ہے جس کا تعلق گوشت سے ہو۔ خواہ مصالحوں کا استعمال ہو یا نہ ہو۔''

مجلس کے اختتام پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''ترکِ دنیا کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انسان ننگا ہو کر، لنگوٹ باندھ کر ایک جگہ بیٹھ رہے...... بلکہ ترکِ دنیا یہ ہے کہ لباس پہنے، کھانا کھائے اور جو فتوحات حاصل ہوں انہیں بندگانِ خدا میں تقسیم کرتا رہے، جمع نہ کرے اور اپنی طبیعت کو کسی شے کی جانب مائل نہ ہونے دے۔''

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا حلقۂ درس روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپؒ کی مجلس میں دس دس ہزار آدمی جمع ہونے لگے۔ اس موقع پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ 700 ھ میں لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ پھر کسی برقی آلے کی مدد کے بغیر اتنے بڑے انسانی ہجوم کو مخاطب کرنا کس طرح ممکن تھا؟ عام مشاہدہ یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی بلند آواز مقرر ہو، اس کی آواز کا حلقۂ اثر دو چار سو آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر یہ دس ہزار انسان حضرت محبوب الٰہیؒ کی تقریر سے کس طرح فیض یاب ہوتے تھے؟ اس سلسلے میں دنیا دار اور مادہ پرست لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے درس سے حاضرین کی ایک محدود تعداد مستفیض ہوتی تھی۔ باقی لوگ محض اپنی عقیدت سے مجبور ہو کر بیٹھے رہتے تھے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک لفظ بھی ان کی سماعتوں تک نہیں پہنچتا تھا۔ جو لوگ صرف ظاہری اسباب اور وسائل پر یقین رکھتے ہیں، انہیں یہ عقلی توجیہہ مطمئن کر سکتی ہے...... مگر اہلِ نظر حضرات اسے تسلیم نہیں

کرتے۔ ان کا عقیدہ ہے اور سو فیصد درست ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تقریر سے مجلس میں حاضر ہونے والا ایک ایک شخص استفادہ کرتا تھا۔ آپؒ کی آواز مبارک نزدیک و دُور یکساں سنائی دیتی تھی...... اور یہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی کرامت ہے۔ ٹھٹھہ میں شاہ جہاں کے دور کی ایک ایسی مسجد آج بھی موجود ہے جس میں ہزاروں افراد نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب خطیب کوئی تقریر کرتا یا جمعہ کا خطبہ پڑھتا تو آخری صف میں بیٹھنے والے نمازیوں کو بھی اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ ماہرینِ تعمیرات کی نظر میں یہ انجینئرنگ کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ مسجد کی محراب اور دیواریں اس زاویے سے بنائی گئی ہیں کہ انسانی آواز در و بام سے ٹکرا کر اس طرح گونجتی ہے کہ مسجد کے آخری حصے میں بیٹھنے والا شخص بھی اس آواز کو پوری صحت اور صفائی کے ساتھ سن لیتا ہے۔ اسی طرح دس ہزار آدمیوں تک اپنی آواز کو پہنچانا حضرت محبوب الٰہیؒ کا کمالِ روحانی تھا...... جو سلسلۂ چشتیہ کے حوالے سے ہندوستان میں معرفت کے عظیم ترین انجینئر تھے۔

حاضرین مجلس کو جاڑوں کے موسم میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی لیکن گرمی کا زمانہ شائقین درس پر بہت گراں گزرتا تھا۔ خانقاہ کے سائبان میں اتنے لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا درس جاری تھا کہ لوگ آ آ کر جلتی دھوپ میں بیٹھنے لگے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ منظر دیکھا تو اپنا درس روک دیا اور حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

''لوگو! ذرا قریب قریب بیٹھو۔''

دراصل ہوتا یہ تھا کہ اگلی صف کے حاضرین پاسِ ادب کی وجہ سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ایک مخصوص فاصلے پر بیٹھتے تھے۔ نتیجتاً خاصی جگہ خالی رہ جاتی تھی۔ اسی طرح باقی صفوں کے لوگ بھی کھل کھل کر بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک تو سائبان مختصر اور دوسرے لوگوں کا ہجوم۔ یہاں تک کہ آخر میں آنے والوں کو تپتی دھوپ میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسی تکلیف دہ صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ حکم دیا تھا کہ لوگ مل کر بیٹھا کریں۔

پھر جب بھی اس قسم کی صورتِ حال پیش آتی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ با آواز بلند فرماتے۔ ''لوگو! ذرا پاس پاس ہو جاؤ تا کہ دوسرے لوگ بھی سائے میں بیٹھ جائیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ دھوپ میں بیٹھتے تو وہ ہیں، مگر جلتا میں ہوں۔''

یہی ہے حقیقی صوفیت...... اور یہی ہے منصب درویشی کہ زخم کسی اور کے جسم پر آئے مگر اس کی خلش درویش کو اپنے دل پر محسوس ہو۔ جو لوگ درویشوں کو سہل پسند اور گوشہ

نشین کہہ کر صوفیوں کا مذاق اُڑاتے ہیں انہیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قولِ مبارک پر غور کرنا چاہئے کہ راہِ سلوک کی یہ منزل آسان ہے یا دُشوار؟........ دُھوپ میں بیٹھے کوئی اور لیکن جلے کوئی اور۔ یہ انسانی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ ہے۔ آج جن مہذب قوموں یا افراد کو خدمتِ خلق کا دعویٰ ہے وہ صرف ایک بار بھی اس کیفیت کا عملی ثبوت نہیں دے سکتے......... مگر حضرت محبوب الٰہیؒ وہ مردِ درویش ہیں جو 95 سال تک سائے میں بیٹھ کر بھی دُھوپ میں جلے ہیں۔ یہاں ایک درویش کا کسی دوسرے درویش سے موازنہ منظور نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ تصوف کی طویل ترین تاریخ میں چند بزرگ ہی ایسے گزرے ہیں کہ جو اپنے دلوں میں مذہب اسلام اور مخلوقِ خدا کا اس قدر درد رکھتے تھے۔ ایک حضرت غوث اعظم سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور دوسرے حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

''دُھوپ میں بیٹھتے تو وہ ہیں مگر جلتا میں ہوں۔''

یہی ایک مختصر فقرہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے کردار کی بلندی اور روحانی عظمت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اگر لوگوں کے ذہن کشادہ اور دل روشن ہوں۔

علاء الدین خلجی کے حوالے سے ہمارے قارئین کے ذہنوں میں ایک سوال اُبھر سکتا ہے کہ جلال الدین خلجی کی طرح وہ بھی ایک محسن کش حکمراں تھا۔ پھر وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ دُعا میں کس طرح شامل ہو گیا تھا؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کے جواب میں کئی توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بدکردار انسان ہوتے ہوئے بھی سلطان علاء الدین بزرگانِ دین سے بے حد عقیدت رکھتا تھا اور خاص طور پر حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذات تک تو اس کی عقیدت غلامی کا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ اس لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سلطان کو دل سے ناپسند کرتے ہوئے بھی یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ محبت ایک گناہ گار کی ہو یا کسی پارسا کی، محبت بہرحال محبت ہے اور وہ اپنے اندر ایک خاص تائید رکھتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ تو وہ مردِ بزرگ تھے جو اپنے دشمنوں کو بھی دعائیں دیا کرتے تھے۔ پھر آپؒ ایک محبت کرنے والے کو کس طرح فراموش کر سکتے تھے؟

حضرت محبوب الٰہیؒ اور سلطان علاء الدین کے تعلق کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جائے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس وقت دعا کی جب اسلامی لشکر خطرات میں گھر جاتا تھا۔ اس طرح اہلِ نظر سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی دعاؤں کا مرکز سلطان کی ذات نہیں تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مخالفین بھی کسی

معتبر تاریخی روایت سے یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمانروائے ہند کی بلند اقبالی کے لئے دستِ دعا بلند کیا ہو۔ اس کے علاوہ تاریخ کے اوراق میں یہ تلخ ترین حقیقت بھی محفوظ ہے کہ سلطان علاء الدین نے اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے یہ درخواست نہیں کی کہ وہ اس کی ہدایت و رہنمائی کے لئے دعا فرمائیں۔ سلطان خوش قسمت ہوتے ہوئے بھی ایک بدنصیب انسان تھا۔ چشمۂ آبِ حیات کے قریب رہتے ہوئے بھی وہ آخری سانس تک پیاسا رہا اور اسی تشنگی کے عالم میں مر گیا۔ سلطان شمس الدین التمش حضرت قطبؒ کی خدمت میں رہ کر خود بھی ولی بن گیا...... مگر علاء الدین کی تقدیر میں یہ سعادت نہیں تھی۔ اس نے جب بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے اپنا دامنِ مراد پھیلایا تو اس کے ہونٹوں پر ایک ہی التجا ہوتی تھی کہ لشکرِ اسلام غالب رہے۔ سلطان کی یہ درخواست بظاہر اپنے عروج و اقتدار کے تحفظ کے لئے ہوتی تھی مگر درپردہ اس التجا میں مسلمانانِ ہند کا اجتماعی مفاد پوشیدہ ہوتا تھا۔ الغرض ان تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، علاء الدین کی سربلندی کے لئے نہیں بلکہ ملّتِ اسلامیہ کی سرخروئی کے لئے دعائیں فرماتے تھے۔

یہاں ہمارے قارئین کو ایک اور اہم نکتہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ سلطان علاء الدین کی زندگی کے بعض پہلو بہت تاریک تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ تو ایک مردِ کامل تھے۔ سلطان کی اس بے راہ روی کو کوئی عام صاحبِ کردار آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور علاء الدین کے درمیان جس قدر بھی رسم و راہ تھی، اس کا بنیادی سبب حضرت امیر خسروؒ تھے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہِ جلال میں حضرت امیر خسروؒ کو کیا مقام حاصل تھا، اس کا اندازہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اقوالِ مبارکہ سے ہوتا ہے۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے۔

''اگر قیامت میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ نظام الدین! تُو دنیا سے کیا لے کر آیا ہے، تو میں عرض کروں گا کہ ترک کے سینے کا سوز لایا ہوں۔'' حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت امیر خسروؒ کو کبھی ترک اور کبھی ترک زادہ کہہ کر پکارتے تھے۔

معتبر روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کبھی کبھی ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے۔ ''اے اللہ! اس ترک کے سوزِ دروں کے طفیل مجھے بخش دے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا معمول تھا کہ جب رات کے وقت اپنے حجرے میں تشریف لے جاتے تو پھر کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی........ لیکن حضرت امیر خسروؒ

کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ امیر جس وقت چاہتے، بلا تکلف اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ یہ ایک منفرد اعزاز تھا جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مریدوں میں امیر خسروؒ کے سوا کسی کو حاصل نہیں تھا۔

ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں یہ شعر برسرِ مجلس پڑھا اور اپنی بزرگانہ محبت کا اظہار اس طرح فرمایا۔

گر برائے ترک ترکم آرہ بر تارک نہند
ترک تارک گیرم و ہرگز نہ گیرم ترک ترک

(اگر میری پیشانی پر آرہ رکھ دیا جائے اور کہا جائے کہ اپنے ترک (خسرو) کو چھوڑ دو تو میں اپنی پیشانی کو چھوڑ دوں گا مگر اپنے ترک کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ بے پناہ شفقت بے سبب نہیں تھی۔ خود امیر خسروؒ بھی اپنے پیر و مرشد سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ راہِ سلوک میں اس محبت کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ امیر خسروؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ کے حجرۂ مبارک میں حاضر ہوتے، دست بستہ خاموش بیٹھے رہتے اور جب پیر و مرشد کا حکم ہوتا تو دیگر شعراء کا عارفانہ کلام سناتے یا حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حسب ارشاد اپنی کوئی غزل نظر کرتے۔ پھر جب پیر و مرشد فرماتے تو حضرت امیر خسروؒ اپنے گھر چلے جاتے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ باتیں کرتے کرتے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آنکھ لگ جاتی تو امیر خسروؒ اپنے پیر و مرشد کے پیروں پر سر رکھے رکھے سو جاتے۔ ایک بار کئی ماہ تک حضرت امیر خسروؒ کو اذنِ باریابی نہیں ملا۔ پھر جب اس سعادت سے سرفراز ہوئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے خسروؒ کو حجرۂ مبارک میں طلب فرمایا تو آپؒ شدید جذبات میں رونے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس گریہ و زاری کا سبب پوچھا تو امیر خسروؒ نے بڑی وارفتگی کے عالم میں عرض کیا۔

نخفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شب ہا
کہ دیدہ برکف پایت نہد بخواب شود

(غریب خسرو، اس حسرت میں کئی راتوں سے جاگ رہا ہے کہ حضور کے تلوؤں پر اپنی آنکھیں رکھ کر سوئے)

اس محبت و عقیدت کی زندہ مثال وہ مشہور تاریخی واقعہ ہے جو سلطان علاء الدین کے دورِ حکومت میں پیش آیا۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ دہلی سے دور رہنے والے ایک

مفلس شخص نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی غریب نوازی اور لطف و عنایات کے بارے میں بے شمار واقعات سنے تھے۔ کہنے والے کہا کرتے تھے کہ بظاہر تاجِ شاہی، سلطان علاء الدین کے سر پر سایہ فگن ہے مگر حقیقت میں ہندوستان کے بادشاہ تو صرف حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں۔ ان کے آستانے پر حاضر ہونے والا کوئی بھی ضرورت مند خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ اس مفلس و نادار شخص نے جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی کرم نوازیوں کے قصے سنے تو وہ بے چارہ کئی دن کا پیدل سفر طے کر کے دہلی پہنچا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدوں کو حدیث پاک کا درس دے رہے تھے۔ آپؒ نے ایک بدحال شخص کو خانقاہ کے دروازے پر حیران و پریشان کھڑا دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے اندر آکر بیٹھ جانے کے لئے کہا۔

پھر جب حدیث پاک کا درس ختم ہو گیا اور حاضرینِ مجلس اپنے گھروں کو چلے گئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس مفلوک الحال شخص کو اپنے قریب بلایا اور نہایت شفقت آمیز لہجے میں آمد کا سبب دریافت کرنے لگے۔

"میں نے اپنی زندگی بہت بدحالی میں بسر کی ہے لیکن آج تک کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ شاید میں آخری سانس تک بھی اپنا دامن نہ پھیلاتا مگر میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت نے مجھے آپ کے آستانۂ عالیہ تک آنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔" وہ مفلس و نادار شخص اب بھی اپنے دل کی بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ شرم دامن گیر تھی، اس لئے اس کی گفتگو کا انداز بہت پیچیدہ تھا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے بعض خدام کی طرف دیکھا جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ خدام اُٹھ کر چلے گئے۔ اب وہاں آپؒ کے اور اس ضرورت مند شخص کے سوا کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا۔ "برادرِ من! تمہیں جو کچھ کہنا ہے بلا تکلف کہہ ڈالو۔ اب یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔ میں تو خود تمہارا عزیز ہوں۔ مجھے اپنا سمجھ کر وہ بات کہہ دو جو تمہاری زبان تک آتے آتے اچانک رُک جاتی ہے۔"

پُرسشِ حال کے اس انداز پر وہ شخص زار و قطار رونے لگا۔ "شیخ! میں ایک سیّد زادہ ہوں۔ ساری عمر محنت مزدوری میں گزری مگر اب تین بیٹیاں جوان ہو چکی ہیں۔ کوئی اہلِ غیرت نہیں آتا کہ میری خاندانی شرافت کو معیار بنا کر مجھ سے رشتہ جوڑے۔ سب لوگ قیمتی جہیز طلب کرتے ہیں اور پُرتکلف دعوتوں کا اہتمام چاہتے ہیں۔ میں کیا کروں کہ مجھے تو دو وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اتفاق سے میرے ایک رفیق نے

مجھے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ ہندوستان کے بے تاج بادشاہ ہیں اور آپ کے دروازے سے کوئی ضرورت مند نامراد واپس نہیں جاتا۔ یہی سوچ کر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"میرے بھائی! تمہیں یہ کسی نے غلط بتایا کہ میں ہند کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ درویشی میں تو تاج کا تصور ہی حرام ہے اور شہنشاہ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ میں تو اس کی عظیم الشان سلطنت میں رہنے والا ایک ادنیٰ انسان ہوں جسے اس نے اپنی رحمتِ لازوال کے سائبان میں چھپا رکھا ہے۔ نہ میں یہاں کچھ لے کر آیا تھا اور نہ اپنے ساتھ کچھ لے کر جاؤں گا۔ جو کچھ ہے، سب اسی کا ہے اور وہ اپنے لامحدود خزانوں میں سے جس بندے کو جتنا چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔" یہ کہہ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خادم خاص خواجہ اقبالؒ کو طلب فرمایا اور پھر سرگوشی کے انداز میں فرمایا۔ "اقبال! تمہارے پاس جو کچھ زرِ نقد ہے، وہ لے آؤ۔"

خانقاہ میں آنے والے تمام تحائف اور نذرات خواجہ اقبالؒ کی تحویل میں رہتے تھے۔ اسی رقم سے لنگر خانے کے اخراجات پورے ہوتے تھے اور حاجت مندوں کی خالی جھولیاں بھری جاتی تھیں۔ خواجہ اقبالؒ پیر و مرشد کا حکم سن کر واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو بہت اُداس تھے۔ خواجہ اقبالؒ نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا کہ آج اتفاق سے ایک تنکہ (سکہ) بھی موجود نہیں ہے۔ جس قدر بھی رقم تھی، اس سے مطبخ کا سامان خرید لیا گیا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خواجہ اقبالؒ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "اب جو بھی نذر یا تحفہ آئے اسے میرے پاس لے آؤ۔"

پھر جب خواجہ اقبالؒ واپس چلے گئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مہمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "تم پریشان نہ ہو۔ اللہ کارسازِ اعلیٰ ہے اور وہی دست گیر و مشکل کشا ہے۔ مجھے اس کی ذات پاک پر یقین کامل ہے کہ وہ عنقریب تمہاری حاجت روائی کرے گا۔ انشاء اللہ! تمہاری بچیوں کی شادی حسب منشاء ہو جائے گی۔ آج خانقاہ میں جس قدر تحائف یا نذریں آئیں گی، ان سب پر تمہارا حق ہوگا۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس فرمان کے بعد اجنبی مہمان مسرور و مطمئن ہو گیا اور بڑے والہانہ انداز میں کہنے لگا۔ "شیخ! دونوں جہاں میں آپ کا مرتبہ بلند ہو۔ میں نے جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مہمان کی زبان سے اپنی تعریف سنی تو گفتگو کا موضوع

بدل دیا کہ دہلی کا کوئی امیر نذر بھیجے تو آپؒ اس مجبور باپ کی حاجت روائی کر سکیں۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جائے کہ اس دن ایک شخص بھی کوئی تحفہ یا نذر لے کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہوا۔ یہ بڑی تعجب خیز بات تھی۔ جب سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر فتوحات کا دروازہ کھلا تھا، اس روز سے لے کر آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ خانقاہ میں ہزاروں کی رقم نہ آئی ہو۔ آخر جب رات ہو گئی اور حضرت محبوب الٰہیؒ عشاء کی نماز سے فارغ ہو گئے تو آپؒ نے اجنبی مہمان سے معذرت خواہانہ لہجے میں فرمایا۔

"سیّد! میں بہت شرمندہ ہوں کہ تمہارا نہایت قیمتی وقت حالت انتظار میں گزر گیا۔ پھر بھی انسان کو صبر کرنا چاہئے کہ صبر ہی سلامتی کا راستہ ہے اور صبر ہی انسان کی نجات ہے۔ تم کل بھی اس فقیر کے مہمان رہو گے۔ دیکھیں! کل پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟"

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خواجہ اقبالؒ کو حکم دیا کہ مہمان کے لئے بطور خاص شب بسری کا اہتمام کیا جائے۔

دوسرے دن وہی ضرورت مند انسان صبح سے شام تک حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر رہا مگر اتفاق سے اس روز بھی کوئی عقیدت مند نذر لے کر نہیں آیا۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی جسے خانقاہ میں رہنے والے ہر شخص نے پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ حسب معمول عشاء کی نماز کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مہمان سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔ "میرے بھائی! آج کا دن بھی یوں ہی گزر گیا...... مگر تم آزردہ خاطر نہ ہو۔ ایک دن اور انتظار کر لو۔ انشاء اللہ! کل کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا ہو جائے گی۔"

مہمان ادب و احترام کے سبب خاموشی سے اُٹھ گیا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندرونی کرب میں مبتلا ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ ہر طرح اس کی پذیرائی کر رہے تھے۔ خانقاہ میں قیام کرنے والا ہر شخص سنگی فرش پر سوتا تھا مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مہمان کے لئے پلنگ اور نرم بستر کا انتظام کیا تھا تاکہ ایک عالی نسب سیّد کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رہ جائے...... مگر وہ شخص اس ظاہری تواضع سے مطمئن نہیں تھا۔ ایک کثیر رقم اس کی ضرورت تھی اور رقم کے حصول کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر جب وہ سیّد زادہ اپنے بستر پر دراز ہوا تو اس کی نظروں کے سامنے تین جوان بیٹیوں کے چہرے اُبھر آئے۔ سیّد کے دل میں درد کی ایک تیز لہر اُٹھی...... اور پھر یہ لہر اس کے پورے وجود پر مسلط ہو گئی۔

تیسرے دن سیّد زادے نے فجر کی نماز حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ ادا کی۔

پھر آنے والے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا گیا مگر ان میں کوئی ایک شخص بھی نذر یا ہدیہ لے کر نہیں آیا تھا۔ سیّد زادے کی مایوسی بڑھنے لگی۔ آنکھوں میں کئی بار عکسِ شکایت اُبھرا مگر احترامِ شیخ کے پیشِ نظر ہونٹوں کو جنبش نہ ہو سکی۔ دن آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ خانقاہ میں حاضری دینے والے عقیدت مندوں کی تعداد بلامبالغہ ہزاروں تک پہنچ گئی مگر اسے اتفاق ہی کہا جائے گا کہ نذر یا تحفے کے نام پر مسلسل تین روز سے ایک درہم یا دینار یا تنکہ، حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا۔ یہ صورتِ حال سیّد زادے کے لئے بہت فکر انگیز تھی اور خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی افسردہ نظر آرہے تھے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔

پھر مغرب کی نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے سیّد زادے کو اپنے حجرۂ مبارک میں طلب کیا۔ اجنبی مہمان کا خیال تھا کہ شاید دہلی کا کوئی امیر قیمتی نذر لے کر آیا ہوگا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ وہی نذر اُسے تنہائی میں پیش کرنا چاہتے ہوں گے۔ ان ہی خوش کن تصورات میں گھرا وہ شخص حضرت محبوب الٰہیؒ کی خلوت میں حاضر ہوا اور دست بستہ بیٹھ گیا۔

"معزز و محترم مہمان! تمہیں اس فقیر کے گھر آئے ہوئے تین دن گزر گئے۔ اب تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ درویش جس کے بارے میں بے تاج بادشاہ جیسے کئی خطابات شہرت پا گئے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں تو وہی ہوں جو نظر آتا ہوں مگر لوگ اپنی عقیدت کی آنکھ سے مجھ میں نہ جانے کیا کیا صفات دیکھ لیتے ہیں۔ میں تمہاری ضروریات کی نزاکت اور شدت سے بھی واقف ہوں مگر کیا کروں کہ آج میرے ہاتھوں میں اتنی فراخی نہیں ہے کہ تمہیں پورے سکون و اطمینان کے ساتھ تمہارے گھر کی جانب روانہ کر سکوں۔"

سیّد زادہ بھی بڑے لوگوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اہلِ علم کی صحبتیں اٹھائی تھیں، آدابِ مجلس سے آشنا تھا، اس لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی گفتگو سن کر مضطرب ہوگیا۔ "شیخ! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ یہ تو میری گردشِ وقت ہے جس نے آپ جیسے مردِ سخی کے ہاتھ کو مجھ پر تنگ کر دیا ہے۔"

"سیّد! اس فقیر کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور اللہ بہترین کارساز ہے۔ انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ کب بابِ رحمت کھلے گا اور کب انسان اس کے الطاف و کرم کی بارش میں نہا جائے گا۔"

سیّد زادہ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس تو نہیں تھا مگر اپنی شدید ترین

ضرورتوں کے پیشِ نظر فوری طور پر رحمتوں کا نزول چاہتا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بھی کچھ دیر کے لئے سکوت کیا، پھر سیّد زادے کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"درویش کے پاس اپنے مہمان کو نذر کرنے کے لئے جوتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے نعلین کی طرف اشارہ کیا جو ظاہری طور پر زیادہ شکستہ تو نہیں تھے مگر قیمتاً ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

سیّد زادہ چند لمحوں کے لئے دم بخود رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بے تاج بادشاہ کے در سے پرانے جوتوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

اجنبی مہمان کو حیران و پریشان دیکھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "میزبان پر لازم ہے کہ وہ مہمان کی خدمت میں اپنا بہترین اثاثہ اور سب سے زیادہ قیمتی تحفہ پیش کرے۔ میرے ذاتی مال و متاع میں یہ جوتے ہی سب سے زیادہ قیمتی ہیں۔ لباس اس قابل نہیں کہ وہ تمہاری نذر کیا جا سکے، بس یہی نعلین ہیں کہ ان کے بغیر بھی درویش کا کاروبارِ حیات جاری رہے گا۔"

سیّد زادہ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جوتوں کو اپنے رومال میں لپیٹ لیا۔ اس کے بعد اجازت طلب کی اور انتہائی بے دلی کے عالم میں خانقاہ سے نکل کر اپنے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

سیّد زادہ راستہ چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر اہلِ خانہ اس سے پوچھیں گے کہ تُو دہلی سے کیا لایا تو وہ صاف صاف کہہ دے گا کہ ہند کے بے تاج بادشاہ نے یہ پرانے جوتے اسے تحفے میں دیئے ہیں اور یہی جوتے بیٹیوں کی شادی کے معاملات میں اس کی کفالت کریں گے۔

اس شخص کی فکر کا انداز استہزائیہ تھا۔ سیّد زادے نے یہ سوچ کر جوتے قبول نہیں کئے تھے کہ چمڑے کے ان دو ٹکڑوں سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدموں کی خوشبو آتی ہے۔ اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتا تو اتنی بے دلی کے ساتھ خانقاہ سے نہ اُٹھتا...... اور اسی بے دلی نے اس شخص کو عدمِ آگہی کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ آگہی تو اس وقت پیدا ہوتی جب وہ دینے والے کی ذات سے مکمل طور پر متعارف ہوتا۔ تعارف ہی نہیں تھا تو کیسے پہچانتا کہ دینے والا کون ہے اور اس نے کیا دیا ہے؟ غرض اسی کشمکش میں سیّد زادہ اپنا سفر طے کرتا رہا۔ وہ دن بھر پیدل چلتا اور رات کو کسی سرائے میں قیام کر لیتا۔ ناکامی و نامرادی کا سفر تھا اس لئے ہر قدم پر شدید گرانی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے بارہا سوچا کہ اگر معلوم

ہوتا تو وہ کبھی دہلی کا رُخ نہ کرتا۔ سیّد زادہ ایک عجیب سے احساسِ ندامت و کرب میں مبتلا تھا کہ وقت بھی برباد ہوا اور راستے کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ یہی سوچتے سوچتے اس رات بھی وہ کسی سرائے کے ایک گوشے میں سو گیا۔

جب سیّد زادہ اپنا سوال لے کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانہ سخاوت و کرم پر حاضر ہوا تھا، اس وقت حضرت امیر خسروؒ سلطان علاء الدین خلجی کے ہمراہ دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ بعض مؤرخین کی روایت ہے کہ بنگال کے سفر میں حضرت امیر خسروؒ سلطان کے ہمراہ تھے۔ روایات میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کسی جنگی مہم کے موقع پر سلطان علاء الدین کے ساتھ تھے۔ اس جنگ میں علاء الدین نے شاندار فتح حاصل کی تھی اور اسی فتح سے متاثر ہو کر حضرت امیر خسروؒ نے علاء الدین کی شان میں ایک پُر جوش قصیدہ کہا تھا جس کے جواب میں سلطان نے پانچ لاکھ نقرئی سکّے بطور انعام دیئے تھے۔ یہ بڑا عجیب اتفاق تھا کہ وہ ضرورت مند شخص حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہ سے ناکام ہو کر اپنے گھر واپس جا رہا تھا اور حضرت امیر خسروؒ گھوڑوں پر لدی ہوئی ایک کثیر رقم لے کر دہلی کی طرف آ رہے تھے۔

معتبر تاریخ نویسوں کی روایت ہے کہ رات کے وقت جب حضرت امیر خسروؒ شاہی لشکر کے ساتھ سرائے کے قریب سے گزرے تو آپؒ نے اچانک دوسرے لوگوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا۔

"بوئے شیخ می آید......... بوئے شیخ می آید۔" (مجھے اپنے شیخ کی خوشبو آ رہی ہے)

حضرت امیر خسروؒ بار بار اسی ایک جملے کو دہرا رہے تھے اور پریشان ہو کر اپنے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔

حضرت امیر خسروؒ کی یہ کیفیت دیکھ کر بڑے فوجی افسر اپنے گھوڑوں سے اُتر گئے اور عرض کرنے لگے۔ "امیر! آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟"

"میں اس مقام پر اپنے پیر و مرشد کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔" حضرت امیر خسروؒ کے لہجے میں شدید اضطراب پنہاں تھا۔

"حضرت محبوب الٰہیؒ تو غیاث پور میں قیام فرما ہیں اور غیاث پور یہاں سے بہت زیادہ فاصلے پر ہے۔" شاہی سپہ سالار نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ ابھی غیاث پور بہت دور ہے مگر میں اس خوشبو کو کیسے نظر انداز کروں جس نے میرے مشامِ جاں کو معطر کر دیا ہے۔ یہ تمام فضا میرے شیخ کی خوشبو سے لبریز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پیر و مرشد یہیں کہیں جلوہ افروز ہیں یا پھر اس

مقام سے گزر رہے ہیں۔" حضرت امیر خسروؒ کی وارفتگی بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ محبوب مرید اور دوسرے فوجی افسر خوشبو کے تعاقب میں آگے بڑھے اور پھر ایک سرائے تک پہنچ گئے...... یہاں خوشبو کا احساس تیز تر ہو گیا تھا۔ رات زیادہ گزر جانے کے سبب سرائے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ مالک کو طلب کر کے سرائے کا دروازہ کھلوایا گیا۔ خوشبو کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ حضرت امیر خسروؒ بے قرار ہو کر سرائے کے ایک گوشے کی طرف بڑھے۔ یہاں ایک مسافر سویا ہوا تھا اور وہ خوشبو اسی کے قریب سے آ رہی تھی۔ حضرت امیر خسروؒ نے اس خوابیدہ مسافر کو اُٹھایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا ناگواری کے عالم میں اُٹھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا۔

"میں صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس سے بوئے شیخ کیوں آ رہی ہے؟"

"بوئے شیخ اور میرے پاس سے؟" وہ شخص حیران و پریشان تھا۔ "نہ میں آپ سے واقف ہوں اور نہ بوئے شیخ کا مطلب سمجھتا ہوں۔"

حضرت امیر خسروؒ نے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا مرید ہوں اور اسی ذاتِ گرامی کے جسم کی خوشبو تیرے پاس سے آ رہی ہے۔"

"ہاں، میں شیخ نظام الدینؒ سے مل کر آ رہا ہوں۔" اب وہ شخص کسی قدر صورتِ حال کو سمجھ گیا تھا۔

"کیسے ہیں میرے شیخ؟" حضرت امیر خسروؒ وارفتہ سے ہو گئے۔

"تمہارے شیخ تو اچھے ہیں مگر انہوں نے میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" مسافر کا لہجہ طنز آمیز تھا۔ "ان کی سخاوت کے بہت سے قصے سنے تھے مگر جب میں نے اپنی بیٹیوں کی شادی کے لئے دستِ طلب دراز کیا تو تمہارے شیخ نے اپنے پرانے جوتے میرے حوالے کر دیئے اور کہہ دیا کہ یہی جوتے تمہاری ضرورتوں کی کفالت کریں گے۔"

"کہاں ہیں میرے مرشد کے نعلین مبارک؟" حضرت امیر خسروؒ بے قرار ہو گئے۔

"میرے پاس موجود ہیں۔" مسافر نے ایک طرف اشارہ کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جوتے ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے اس کے قریب ہی رکھے تھے۔

"اے شخص! کیا تُو ان جوتوں کو فروخت کرے گا؟" حضرت امیر خسروؒ کے چہرے پر عجیب سی روشنی تھی، جیسے وہ دنیا کی سب سے قیمتی شے خرید رہے ہوں۔

"ایک وہ مذاق اور ایک یہ مذاق ہے۔ امیر! تمہیں میری حالت پر رحم نہیں آتا؟" سیّد زادہ بے زار نظر آ رہا تھا۔

"نہ وہ مذاق تھا اور نہ یہ مذاق ہے۔" اچانک امیر خسروؒ کے لہجے میں جلالِ روحانی

جھلک رہا تھا۔ ''تُو نے میرے شیخ کو پہچانا نہیں۔''

سیّد زادہ سنبھل چکا تھا، پھر بھی اُس نے ازراہِ تمسخر کہا۔ ''امیر! تم ان جوتوں کی کیا قیمت دو گے؟''

''اس وقت میرے پاس پانچ لاکھ نقرئی سکے ہیں۔'' حضرت امیر خسروؒ نے انتہائی عاجزی کے ساتھ فرمایا۔

سیّد زادے کو سکتہ سا ہو گیا۔

''اگر یہ رقم ناکافی ہے تو میرے ساتھ دہلی واپس چلو۔'' حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا۔ ''میں اتنی ہی رقم کا اور انتظام کر دوں گا۔''

سیّد زادہ بدحواس ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس نے جوتے اُٹھا کر امیر خسروؒ کے حوالے کر دیئے اور التجا کرنے لگا۔

''میرے لئے تو ایک ہزار سکے بھی کافی ہیں۔ خدا کے لئے اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔''

حضرت امیر خسروؒ، سیّد زادے کو اپنے ہمراہ لے کر سرائے سے باہر آئے اور اس جگہ پہنچے جہاں نقرئی سکوں سے لدے ہوئے گھوڑے کھڑے تھے۔ ''صرف ایک ہزار نہیں، یہ تمام سکے اب تمہاری ملکیت ہیں۔'' حضرت امیر خسروؒ نے گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

سیّد زادے پر ایک بار پھر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اسے اپنی بصارت و سماعت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ پھر جب کچھ دیر بعد وہ شخص ورطۂ حیرت سے باہر نکلا تو حضرت امیر خسروؒ سے کہنے لگا۔ ''مگر میں یہ مال و متاع لے کر اپنے گھر تک کس طرح جاؤں گا؟''

''یہی گھوڑے اس بوجھ کو اُٹھائیں گے۔'' حضرت امیر خسروؒ نے جواباً فرمایا۔

''گھوڑے تو اپنا کام کریں گے مگر میں اپنے شہر کے لوگوں کو کیا جواب دوں گا؟'' مسافر یکایک بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ ''کون مجھ غریب کی باتوں پر یقین کرے گا کہ یہ ساری دولت میری ملکیت ہے۔ گھر سے نکلا تھا تو سارے شناسا میرے افلاس سے واقف تھے۔ اب واپس جاؤں گا تو انہیں کس طرح مطمئن کروں گا کہ ایک رات میں سب کچھ بدل گیا۔ کوئی شخص بھی میرے دلائل کو تسلیم نہیں کرے گا۔ سب ہی مجھے قزاقی یا رہزنی کا الزام دیں گے۔''

''پھر تم کس طرح اطمینان حاصل کر سکتے ہو؟'' حضرت امیر خسروؒ نے پوچھا۔

''آپ مجھے ایک دستاویز لکھ کر دے دیں کہ میں آج سے اس تمام دولت کا مالک

ہوں۔'' مسافر نے تجویز پیش کی۔

حضرت امیر خسروؒ نے کسی تاخیر کے بغیر ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھ دی:

''میں امیر خسرو، سلطان علاء الدین خلجی کے دیئے ہوئے انعام کی رقم شخص مذکورہ کو بطور نذر پیش کر رہا ہوں۔''

کاغذ پر تحریر شدہ الفاظ نے سیّد زادے کو مطمئن کر دیا۔ پھر اس نے حضرت امیر خسروؒ سے آخری التجا کی کہ لشکر کے چند سپاہیوں کی نگرانی میں یہ گھوڑے اس کے گھر تک پہنچا دیئے جائیں۔ کیونکہ راستے میں لٹ جانے کا خطرہ درپیش ہے۔

حضرت امیر خسروؒ نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مسافر کو بحفاظت اس کی منزل تک پہنچا دیں اور خود بہت تیز رفتاری کے ساتھ اس طرح دہلی کی طرف بڑھے کہ آپؒ کی دستار میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جوتے لپٹے ہوئے تھے۔

پھر جب امیر خسروؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوئے تو اہل مجلس نے دیکھا کہ آپؒ کے دونوں ہاتھ اس طرح بلند ہیں جیسے کوئی مزدور اپنے سر پر بارِ گراں اُٹھائے ہوئے آ رہا ہو۔ بزمِ عرفاں پر سناٹا طاری تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہر خادم اور عقیدت مند حیران تھا کہ آج خسرو کو کیا ہو گیا ہے؟ اپنے اپنے ذہن کی رسائی کے مطابق تمام اہل مجلس اس مریدِ جاں سوختہ کی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''خسرو! کامیابی کا یہ سفر مبارک ہو مگر تم اپنے شیخ کے لئے کیا تحفہ لائے ہو؟''

حضرت امیر خسروؒ گھٹنوں کے بل جھک گئے اور اپنی دستار میں لپٹے ہوئے مرشد کے نعلین مبارک فرش پر رکھ دیئے۔ ''شیخ کے حضور میں شیخ ہی کی نشانی لایا ہوں۔ دنیا کی کوئی اور شے اس قابل ہی نہیں تھی۔'' یہ کہہ کر امیر خسروؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدموں سے لپٹ گئے۔

''کتنے میں خریدی؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تبسم دل نواز کے ساتھ دریافت فرمایا۔

''پانچ لاکھ نقرئی سکوں میں۔'' حضرت امیر خسروؒ شدتِ جذبات میں رونے لگے۔

''خسرو! بسیار ارزاں خریدی۔'' (بہت سستے داموں خریدی)

''سیّدی! یہ غلام اور کیا کرتا؟ اُس شخص نے اسی پر قناعت کی ورنہ اگر وہ ان جوتوں کے بدلے میں مجھ سے میرا تمام مال و متاع بھی طلب کرتا تو خسرو اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا۔''

"خسرو! اگر ایسا کرتے تب بھی یہ سودا بہت سستا ہوتا۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔

"بے شک سیّدی!" حضرت امیر خسروؒ زار و قطار روتے جا رہے تھے اور عرض کر رہے تھے۔ "سیّدی! یہ غلام کس قابل تھا؟ بس آقا کی نگاہِ کرم تھی جو اپنے ایک حقیر نام لیوا کو سربلند کر گئی۔"

یہ تھا حضرت امیر خسروؒ کے جذبۂ عقیدت کا ایک ہلکا سا عکس...... اور امیر خسروؒ کی اسی عقیدت کے سبب حضرت نظام الدین اولیاءؒ، سلطان علاء الدین کی درخواست سن لیا کرتے تھے۔ اگر درمیان میں حضرت امیر خسروؒ کا واسطہ نہ ہوتا تو حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے اسی مشہور قول پر عمل کرتے: آپؒ نے سلطان علاء الدین کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔

"اس فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر تُو ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے سے نکل جاؤں گا...... اور اگر زیادہ تنگ کرے گا تو میں تیرا ملک ہی چھوڑ دوں گا کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

پھر 6 شوال 716ھ کی ایک سیاہ رات میں سلطان علاء الدین خلجی کی زندگی کا چراغ بجھ گیا۔ نمک حرام ملک کافور جسے سلطان علاء الدین نے محبوبیت کے درجے تک پہنچایا تھا اور جس کے عشق میں سلطان نے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر لی تھی، اسی ہندوزادے نے اپنے آقائے نعمت کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ علاء الدین کی موت کے بعد تاریخ ہند نے ایک اور خوف ناک کروٹ لی۔ حصولِ اقتدار کے لئے بڑے شرم ناک کھیل کھیلے گئے، بڑا خون بہایا گیا اور بڑی رُسوائیاں ہوئیں۔ ملک کافور نے سلطان علاء الدین کے دونوں بیٹوں خضر خان اور شادی خان کو اندھا کر کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ سلطان کے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو جس کی عمر چھ سال تھی، اسے تختِ شاہی پر بٹھا دیا گیا اور خود ملک کافور نائب سلطنت بن بیٹھا۔ اب وہ ہندوزادہ جس نے اپنے مکروہ چہرے پر اسلام کی نقاب چڑھا رکھی تھی، علاء الدین کے چوتھے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کے تعاقب میں تھا تاکہ اسے قتل کر دے اور پھر ہندوستان کا مطلق العنان فرمانروا بن جائے۔

پھر وقت نے ایک اور عجیب کروٹ لی۔

مبارک شاہ کے بدترین دشمن ملک کافور کو اسی کے آدمیوں نے ہلاک کر دیا اور تاجِ شاہی اس شخص کے سر پر جگمگانے لگا جو بظاہر اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور جس کی

ذاتی حیثیت ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے ایک حقیر تنکے سے زیادہ نہیں تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

راج کمار مہندر ہردیو کسی ہندو حکمراں کے خاندان سے تھا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس کا نام "احمد ایاز" رکھ دیا تھا۔ یہی مہندر ہردیو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کو روزانہ قلم بند کرتا تھا۔ پھر یہی روزنامچہ "مہندر ہردیو کی ڈائری" کے نام سے مشہور ہوا۔ راج کمار نے اپنے اسی روزنامچے میں قطب الدین شاہ مبارک کے متعلق ایک عجیب واقعہ تحریر کیا ہے جسے پڑھ کر ایک طرف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شانِ بے نیازی کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف فرمانروائے ہند کی خباثتِ نفسی اور ناشکرگزاری کا۔

راج کمار مہندر ہردیو لکھتا ہے کہ مبارک شاہ کو میرے پیر و مرشد سے پرانی دشمنی تھی کیونکہ اس کے دونوں بھائی خضر خان اور شادی خان حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید تھے۔ وہ ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتا تھا کہ کہیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ اُس کے درباری امیروں اور فوج کے سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ نہ کر دیں۔ اس لئے مبارک شاہ نے اپنے ایک قاصد کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حکم دیا۔

"شیخ نظام الدینؒ! میں چاہتا ہوں کہ تم کسی تاخیر کے بغیر دہلی چھوڑ کر کہیں دُور چلے جاؤ۔ اس شہر میں تمہارا قیام میری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے سلطان کے قاصد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں اور اس فقیر کو اپنے مالک کی رضا حاصل کرنے کے سوا کسی دوسری شے کی طلب نہیں۔"

مبارک شاہ پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جواب کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ فرمانروائے ہند کے دل و دماغ کی کدورت بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سرِ دربار حضرت محبوب الٰہیؒ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔

پھر ایک دن قطب مبارک شاہ اچانک بیمار ہو گیا۔ بدکرداری کے سبب اسے ایسی کئی بیماریاں لاحق ہو گئی تھیں جنہیں وہ طبیبوں کے سامنے ظاہر کرتے ہوئے بھی شرماتا تھا۔ ان ہی خفیہ بیماریوں کے سبب والئ ہندوستان کا پیشاب بند ہو گیا۔ مجبوراً مبارک شاہ نے طبیبانِ خاص کو اپنی خلوت میں طلب کیا...... مگر وہ ماہر طبیب بھی اپنے آقا کو اس تکلیف سے نجات نہ دلا سکے۔ مختصر کہ اسی حالت میں تین دن گزر گئے۔ مبارک شاہ تکلیف کی

شدت سے اس قدر چیختا تھا کہ ''قصرِ ہزار ستون'' کے در و دیوار تک گونجنے لگتے تھے۔

آخر شاہی طبیبوں نے مبارک شاہ کی ماں بی بی مالک سے صاف صاف کہہ دیا کہ سلطان کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ اگر ایک دو دن میں یہ تکلیف رفع نہ ہوئی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

بی بی مالک نے فوری طور پر شیخ نجم الدینؒ سے رجوع کیا اور دعاؤں کی طلب گار ہوئی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ شیخ نجم الدینؒ کی دعاؤں سے مبارک شاہ کو اقتدار حاصل ہوا تھا اس لئے بی بی مالک پُریقین تھی کہ اس مشکل وقت میں بھی شیخ نجم الدینؒ کی روحانی امداد مبارک شاہ کے کام آئے گی...... مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شیخ نجم الدینؒ کی دُعائیں بھی بے اثر ثابت ہوئیں۔

بیٹے کی بیماری نے بی بی مالک کی نیندیں اُڑا دی تھیں اسی دوران ایک شاہی خدمت گار نے اپنی جان کی امان مانگتے ہوئے عرض کیا۔ ''سلطانِ معظم، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ بیماری اسی بے ادبی کا نتیجہ نہ ہو۔''

بی بی مالک ایک خدا ترس عورت تھی۔ خدمت گار کی زبان سے یہ انکشاف سنتے ہی وہ قطب الدین مبارک شاہ کے پاس پہنچی اور بیٹے سے کہنے لگی۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیخ نظام الدینؒ کے ساتھ تیرا رویہ گستاخانہ ہے اور اسی وجہ سے تجھے اس موذی مرض نے آگھیرا ہے۔ اگر تُو اپنی سلامتی چاہتا ہے تو ان سے معافی مانگ لے اور اپنی صحت کے لئے دعا کی درخواست کر!''

اگرچہ قطب الدین مبارک شاہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن اس عالم میں بھی اس کا دل حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں ان فقیروں کو نہیں مانتا۔ یہ سب کے سب دنیا دار اور دکاندار لوگ ہیں۔ میری بیماری کا تعلق شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی بد دعا سے نہیں ہے۔''

بی بی مالک نے مبارک شاہ کو بہت سمجھایا مگر بدبختی نے اس کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ آخر ایک غمزدہ ماں بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر خود ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوئی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ملکۂ ہند کی آمد کو بڑی حیرت سے دیکھا مگر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا۔

''میرا بیٹا ایک نہایت تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہے۔ آپ اس کی صحت کے لئے دُعا فرمائیں۔'' بی بی مالک نے رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ خاموش رہے۔

''سلطان ایک نادان بچہ ہے اور آپ ایک سن رسیدہ بزرگ ہیں۔'' ملکۂ ہند نے دوبارہ عرض کیا۔ ''مبارک شاہ کی شوخیوں کا خیال نہ کیجئے اور اسے معاف فرما دیجئے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس بار بھی سکوت اختیار کیا۔ پھر جب بی بی مالک بہت زیادہ بے قرار نظر آنے لگی تو آپؒ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

''میں اُس وقت تک اس کی خطا معاف نہیں کروں گا، جب تک وہ چیز ختم نہ ہو جائے جس کے باعث اس سے بار بار خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔''

''میں شیخ کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھی۔'' ملکۂ ہند نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔

''آخر وہ کون سی چیز ہے جس کا آپ خاتمہ چاہتے ہیں؟''

''خاتون! آپ کے بیٹے کو اس بات کا خطرہ ہے کہ میں اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرا دوں گا۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ اقتدار ہی تو ہے جو اسے مجھ سے بدگمان رکھتا ہے اور وہ بار بار گناہِ عظیم کا مرتکب ہوتا ہے۔ لہٰذا سلطان کو چاہئے کہ وہ اپنی بادشاہت میرے حوالے کر دے۔ پھر اس کے سارے خوف اور اندیشے ختم ہو جائیں گے اور وہ آئندہ اس گناہ سے محفوظ رہے گا۔''

ملکۂ ہند بصد حسرت و یاس واپس چلی گئی اور اس نے تمام صورتِ حال بیٹے کے سامنے بیان کر دی۔ قطب الدین مبارک شاہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ ماں کی بات سنتے ہی رونے لگا۔ ''آپ کو کیا معلوم کہ میں کس اذیت میں مبتلا ہوں؟ آپ شیخ نظام الدینؒ کے پاس دوبارہ جائیں اور ان سے کہیں کہ میں نے اپنی بادشاہت انہیں دی۔ بس وہ میری صحت کے لئے دعا کر دیں۔'' پہلی بار وہ مغرور حکمراں ایک درویش کے سامنے خم ہوا تھا۔

بی بی مالک دوبارہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کی درخواست پیش کی۔

جواب میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''میں ان زبانی باتوں کو نہیں مانتا۔ قطب الدین مبارک شاہ سے کہو کہ وہ حکومت سے دستبردار ہونے کی دستاویز لکھے، اس پر اپنی مہر لگائے اور تمام امیروں اور وزیروں کی تصدیق کرائے۔ پھر وہ دستاویز میرے پاس بھیجے۔ اس کے بعد میں تمہارے بیٹے کے حق میں دعا کروں گا۔''

بی بی مالک ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ارشادِ گرامی سن کر عرض کیا۔ ''حضور تو تارک الدنیا ہیں۔ پھر حضور کو بادشاہت کی کیا ضرورت ہے؟''

ملکۂ ہند کی بات سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''میں دنیا کا تارک (چھوڑنے

والا) بھی ہوں اور جو لوگ اس دنیا کا غلط استعمال کرتے ہیں، ان سے ان کی غلطیوں کو ترک کرانے والا بھی ہوں۔ جب تک میری یہ شرط پوری نہیں ہوگی، میں اس وقت تک مبارک شاہ کے حق میں ہرگز دعا نہیں کروں گا۔"

بی بی مالک ایک بار پھر قطب الدین مبارک شاہ کے پاس پہنچی اور اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شرط بیان کر دی۔ کئی دن سے پیشاب بند ہونے کے سبب سلطان اس وقت جان کنی کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ جیسے ہی اس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی شرط سنی، چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"سب امیروں اور وزیروں کو جمع کر لو۔ شیخ نظام الدینؒ جو کچھ چاہتے ہیں اُنہیں دے دو مگر مجھے مرنے سے بچا لو۔ موت میرے سرہانے کھڑی ہے۔ بس وہ مجھ پر قابو پایا ہی چاہتی ہے۔"

مبارک شاہ کی فریاد و فغاں سن کر بی بی مالک نے اسی وقت سلطنت ہند کے تمام بڑے منصب داروں کو اسی کمرے میں طلب کر لیا جہاں اس کا بیٹا بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ فوری طور پر ایک دستاویز تیار کی گئی جس کی عبارت حسب ذیل تھی:

"میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ بن علاء الدین خلجی مرحوم بہ رضا و رغبت اپنے تمام تر اختیارات شیخ نظام الدینؒ کو تفویض کرتا ہوں۔ آج سے شیخ نظام الدین بدایونیؒ ہی اس ملک کے حکمراں ہیں اور ان ہی کا حکم نافذ العمل ہے۔"

اس عبارت کے نیچے سلطان قطب الدین شاہ کی مہر ثبت کی گئی۔ بعد میں تمام امرائے سلطنت نے دستخط کئے۔ پھر بی بی مالک انتقالِ اقتدار کی دستاویز لے کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کچھ دیر تک اس دستاویز کو ملاحظہ فرماتے رہے۔ پھر آپؒ نے وہ کاغذ کا ٹکڑا بی بی مالک کو واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ "مبارک شاہ سے کہو کہ وہ اس دستاویز پر پیشاب کر دے۔ اس کی تمام تکلیف رفع ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔"

ملکۂ ہندوستان خوشی خوشی بیٹے کے پاس پہنچی اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد گرامی اس کے گوش گزار کر دیا۔ مبارک شاہ کسی ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ اور پھر وہ تکلیف چند لمحوں میں دور ہو گئی جس نے فرمانروائے ہند کو تین چار دن تک ناقابل بیان اذیت میں مبتلا رکھا تھا۔

مبارک شاہ کے صحت یاب ہوتے ہی بی بی مالک نے انتہائی وارفتگی کے عالم میں کہا۔

"بیٹے! تُو نے دیکھا کہ شیخ نظام الدینؒ کیسے عظیم الشان بزرگ ہیں اور تُو نے اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ اقتدار کی طرف سے کیسے بے پرواہ ہیں؟ اب تجھ پہ لازم ہے کہ تُو ان کی خدمت میں حاضر ہو، اپنے گناہوں سے توبہ کر اور شیخ کی خدمت میں صحت کا شکرانہ پیش کر۔"

بی بی مالک کی باتیں سن کر مبارک شاہ بہت زور سے ہنسا۔ اس کے قہقہوں میں ریاکاری کا رنگ شامل تھا۔ "مادر گرامی! آپ شہنشاہوں کی حکمت عملی کو نہیں سمجھ سکتیں۔"

بی بی مالک نے بڑی حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا اور نہایت افسردہ لہجے میں کہا۔

"مبارک شاہ! شیخ نظام الدینؒ نے تیری تحریر کردہ دستاویز تجھے واپس کر دی اور اقتدار پرستوں کو یہ راز سمجھا دیا کہ جس حکومت پر انسان اس قدر نازاں رہتا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ شیخ کی کرم نوازی کے صلے میں تُو احسان فراموشی کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے؟"

قطب الدین مبارک شاہ ایک بار پھر تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔

"مادر گرامی! جس شخص نے مجھ سے یہ فرمان لکھوایا تھا، آپ اسے نہیں جانتیں۔ وہ شخص پکا دکاندار ہے۔"

"اگر شیخ نظام الدینؒ دکاندار ہوتے تو انتقالِ اقتدار کی دستاویز ہرگز تجھے واپس نہ کرتے۔" بی بی مالک نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پھر اور کیا کرتا؟" مبارک شاہ خلجی نہایت گستاخانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ "اس نے مجھ سے چال چلی اور میں نے اس سے چال چلی۔ پھر میری چال کامیاب رہی کہ میں شہنشاہ ہوں اور اس سے زیادہ ذہین ہوں۔ میں نے جو دستاویز لکھی تھی، بظاہر وہ مکمل تھی مگر اس کے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ مجبوراً اس نے مجھے واپس کر دی۔"

"مجھے تجھ سے یہ اُمید نہیں تھی مبارک شاہ!" بی بی مالک نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ کھلی احسان فراموشی ہے۔"

"کیسی احسان فراموشی؟" سلطان قطب الدین خلجی بھڑک اُٹھا۔

"تُو شیخ نظام الدینؒ کی دعا سے صحت یاب ہوا ہے۔ اس لئے تجھ پر فرض ہے کہ تُو شیخ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر ان کا شکریہ ادا کر۔" بی بی مالک نے ایک بار پھر اپنے بے ہودہ اور سرکش بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ان دکانداروں کی دعا اور بددعا سے کچھ نہیں ہوتا۔" مبارک شاہ نے درویشوں کا

مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو دواؤں کی تاثیر ہے کہ میں نے اس تکلیف دہ مرض سے نجات حاصل کی۔''

بی بی مالک اپنے بیٹے کی اصلاح سے مایوس ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس نے اتمامِ حجت کے طور پر کہا۔

''میرے نادان بیٹے! بس تُو ہی تو خاندانِ خلجی کی ایک نشانی رہ گیا ہے۔ تُو نے تمام بھائیوں کو مار ڈالا۔ اب تُو اپنے حال پر رحم کر۔''

(واضح رہے کہ ملک کافور نے خضر خان اور شادی خان کو اندھا کرا کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ مگر جب مبارک شاہ خلجی برسرِ اقتدار آیا تو اس نے خضر خان، شادی خان اور اپنے سب سے چھوٹے بھائی شہاب الدین عمر کو قتل کرا دیا)

''اقتدار کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' مبارک شاہ نے انتہائی سفاکانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس نے ماں کی نصیحتوں کا ذرّہ برابر بھی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔

'ذرا یاد کر کہ تیرے باپ، شیخ نظام الدینؒ کے کیسے معتقد تھے؟'' بی بی مالک نے سلطان علاء الدین کی مثال پیش کی کہ شاید باپ کے حوالے سے یہ سرکش بیٹا راہِ راست پر آ جائے کہ اس دکاندار کو نہ پہچان سکے۔ مبارک شاہ کے دل و دماغ پر بے حسی اور بے خبری کی مہریں لگ چکی تھیں۔ اس لئے وہ جہل اور طاقت کے نشے میں مسلسل بہک رہا تھا۔

''ذرا اپنے درباریوں کی طرف دیکھ!'' بی بی مالک نے ایک اور دلیل کا سہارا لیا۔ ''تیرے اکثر امراء اور فوجی شیخ نظام الدینؒ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر تُو اسی طرح شیخ کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا تو یہ سب لوگ تیرے دشمن ہو جائیں گے۔''

بی بی مالک کی بات سن کر مبارک شاہ برہم ہو گیا اور اس نے انتہائی طیش کے عالم میں اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں کسی کی روحانی طاقت پر اعتبار نہیں کرتا۔ مجھے صرف اپنے بازوؤں کی طاقت پر یقین ہے۔''

بیٹے کا متکبرانہ انداز دیکھ کر بی بی مالک خوف زدہ ہو گئی۔ ''مت کر ایسی غرور کی باتیں۔''

''غرور تو شاہوں کی ادا ہے۔ سلطانوں کا شیوہ ہے۔'' مبارک شاہ کچھ اور غضب ناک ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی شمشیر بے نیام کی اور اسے لہرانے لگا۔ ''اگر دنیا میں مجھے کسی پر بھروسہ ہے تو اپنی اس تلوار پر۔ یہی تلوار میری ہمدم ہے اور یہی مددگار۔ میں نے اسی

تلوار سے اپنی حکومت کے راستے صاف کئے ہیں۔ بس ایک ہی کانٹا باقی رہ گیا ہے جسے میری تلوار بہت جلد صاف کر دے گی۔'' قطب الدین مبارک شاہ کا اشارہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف تھا۔

بی بی مالک نے بیٹے کی بہت منت وسماجت کی، اُسے اُس کے انجام سے ڈرایا مگر وہ بدکار حکمران کسی تاویل اور دلیل سے متاثر نہیں ہوا۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کی روایت ہے کہ مبارک شاہ خلجی بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہا کرتا تھا۔ ''جو شخص بھی شیخ نظام الدینؒ کا سر لائے گا، میں اسے ہزار اشرفیاں انعام میں دوں گا۔''

سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانِ مقدس ہے کہ جس نے اللہ کے دوست سے دشمنی کی، وہ اللہ کے ساتھ جنگ کے لئے تیار رہے۔

اللہ کے دوست کی دل آزاری ایک قیامت ہے...... اور قصر ''ہزار ستون'' پر یہ قیامت اس وقت نازل ہوئی، جب مبارک شاہ کے سپاہی حضرت محبوبِ الٰہیؒ کو فرمانروا کا یہ حکم سنا رہے تھے۔

''شیخ! کل چاند کی پہلی تاریخ ہے۔ اگر آپ وقتِ مقررہ پر سلام کے لئے دربار میں حاضر نہیں ہوئے تو ہم مجبور ہو جائیں گے اور آپ کو پابہ زنجیر کر کے سلطانِ معظم کے رُوبرو پیش کر دیا جائے گا۔''

ابھی سپاہیوں کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ''قصر ہزار ستون'' میں موت کا رقص شروع ہو گیا۔ خسرو خان کے آدمیوں نے قطب الدین مبارک شاہ کا سر کاٹ کر محل کے نیچے پھینک دیا تھا اور قصرِ سلطانی کے مکین بدحواسی کے عالم میں اس طرح بھاگ رہے تھے کہ جیسے ان کی مضبوط پناہ گاہیں شدید زلزلے کی لپیٹ میں ہوں۔

آخر قیامت کی وہ کالی رات ختم ہوئی اور روشن و تابناک سورج طلوع ہوا۔ دہلی کے عام باشندے اب بھی خوف سے سہمے ہوئے تھے مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خدمت گاروں کے چہروں پر خوشی کا رنگ نمایاں تھا۔ آپؒ نے اپنے عقیدت مندوں کی مسرت کا یہ عالم دیکھا تو بڑے پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

''ایک انسان کو دوسرے انسان کی موت پر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ وہ اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ موت ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ اگر آج وہ گیا ہے تو کل کسی دوسرے کی باری ہوگی۔ ہمیں اپنے اعمال پر نظر رکھنی چاہئے۔ اللہ ہم سب کا انجام بخیر کرے۔''

پھر حضرت محبوب الٰہیؒ مقررہ وقت پر اپنی والدہ محترمہ سیدہ زلیخاؒ کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے اور بہت دیر تک دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے دعا مانگتے رہے۔ خادم نے دیکھا کہ اس بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ فاتحہ خوانی کرتے وقت بہت روئے تھے۔ یہ خالقِ حقیقی کے حضور شکر گزاری کے آنسو تھے کہ خداوند ذوالجلال نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو قطب الدین مبارک شاہ جیسے ظالم ومفسد حکمراں کے فتنہ وشر سے محفوظ رکھا تھا۔ جس وقت حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی والدہ ماجدہ کے حق میں دعائے خیر کر رہے تھے، عین اسی وقت مبارک شاہ کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا۔ اور یہ چاند کی پہلی تاریخ تھی۔

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ قطب الدین مبارک شاہ 5 ربیع الاول 721ھ کو قتل ہوا۔ اگر یہ روایت درست ہے تو پھر واقعہ اس طرح پیش آیا ہوگا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ یکم ربیع الاول کو دربار میں تشریف نہیں لے گئے ہوں گے۔ نتیجتاً مبارک شاہ نے 4 ربیع الاول کی شام کو آپؒ کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا ہوگا۔ مگر جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے سپاہیوں سے یہ فرمایا کہ پہلے تم اپنے سلطان کی خبر لو تو حکومت کے کارندوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ اپنے کام کی تکمیل کے بغیر ہی واپس چلے آئے اور پھر ان کی آنکھوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پابہ زنجیر دیکھنے کی خواہش رکھنے والا خود ہی فرشتۂ اجل کے ہاتھوں اسیر ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ بہرحال واقعات کی ترتیب میں یہ فرق ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ چاند رات یا پہلی تاریخ کو صرف اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ آپؒ کے اس معمول کو بڑے سے بڑا جابر وقت بھی تبدیل نہ کر سکا۔ اسی استقامت کا نام ولایت ہے...... اور یہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے مردِ آزاد کے لئے قطب الدین مبارک شاہ کا سوا چار سالہ دورِ حکومت ایک نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ مریدوں اور خدمت گاروں کے دل اس خیال سے ہر وقت دھڑکتے ہی رہتے تھے کہ پتہ نہیں کب عتابِ شاہی نازل ہو اور کب ان کے پیر و مرشد کی ذات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے...... مگر خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سکون و اطمینان کا یہ عالم تھا کہ کسی سے ان سازشوں کا ذکر تک نہ کرتے۔ اگر کبھی کوئی مرید یا خادم عرض کرتا کہ فلاں شخص آپ کا بدخواہ ہے تو

بے اختیار فرماتے۔

"اگر کوئی شخص تیرے راستے میں کانٹا رکھے اور تُو بھی اس کے بدلے میں کانٹا بچھا دے تو پھر پوری دنیا کانٹوں سے بھر جائے گی۔ عام لوگوں کا تو یہ دستور ہے کہ وہ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں مگر درویشوں کا یہ طریقہ نہیں۔ یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہئے۔"

کبھی کوئی خدمت گار عرض کرتا کہ آج فلاں شخص نے آپ کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں تو مسکراتے ہوئے یہ شعر گنگنانے لگتے ؎

ہر وہ شخص جو مجھے رنج دیتا ہے، اسے بے شمار راحتیں میسر ہوں
ہر وہ شخص جو مجھے اپنا یار نہیں سمجھتا، اللہ اسے اپنا دوست رکھے
ہر وہ شخص جو میرے راستے میں دشمنی سے کانٹے بچھاتا ہے
اس کی عمر کے باغ میں کھلنے والا ہر پھول کانٹوں سے محفوظ رہے

(ترجمہ)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مشہور قول ہے۔ "برا کہنا برا ہے مگر برا چاہنا اس سے بھی برا ہے۔"

ایک موقع پر آپؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"انسان کے ساتھ دو چیزیں ہیں۔ ایک نفس، دوسرے قلب۔ جب کوئی نفس سے پیش آئے تو اس کے ساتھ قلب سے پیش آنا چاہئے...... یعنی نفس میں دشمنی غوغا (شور) اور فتنہ ہے...... اور قلب میں سکوت، رضا اور نرمی ہے۔ پس جب کوئی نفس (دشمنی) سے پیش آئے تو قلب (نرمی) سے پیش آنا چاہئے۔ اس طرح نفس مغلوب ہو جائے گا...... لیکن اگر کوئی نفس سے پیش آئے اور دوسرا بھی اس کا مقابلہ نفس سے کرے تو پھر دشمنی اور فتنے کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ان اقوالِ مبارکہ کی تشریح موجودہ دنیا کے حالات ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک اور موقع پر فرمایا۔

"اگر دو آدمیوں میں جھگڑا اور رنجش ہو تو طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنا دل صاف کر لے۔ جب ایک شخص اپنا باطن عداوت سے پاک کر لے گا تو دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔"

ایک مجلس میں آپؒ نے انسانی معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگوں کے آپس میں معاملے کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ ایک شخص سے

دوسرے کو نہ فائدہ پہنچے اور نہ نقصان۔ ایسا شخص جماد (پتھر وغیرہ) کا حکم رکھتا ہے۔ دوسری قسم اس سے بہتر ہے۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جن سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا۔ تیسری قسم جو پہلی دو قسموں سے بہتر ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے دوسروں کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر لوگ اسے نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ ان مضرتوں کا خیال نہیں کرتا بلکہ تحمل سے کام لیتا ہے اور تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے۔ یہ کام صدیقوں کا ہے۔"

چھجو نامی ایک شخص اندرپت کا رہنے والا تھا۔ اُس کی زبان درازی مشہور تھی اور وہ گالی کے بغیر کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ جب بھی چھجو کے سامنے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ذکر آتا، وہ برہم ہو جاتا اور آپؒ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگتا۔ لوگ اس سے پوچھتے کہ آخر تجھے حضرت محبوب الٰہیؒ سے کیا دشمنی ہے؟ چھجو سے کوئی جواب نہ بن پڑتا اور وہ کسی وجہ کے بغیر مزید بے ہودگی کا مظاہرہ کرنے لگتا۔

لوگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر چھجو کی بے ادبی کا ذکر کرتے تو آپؒ مسکراتے ہوئے فرماتے۔ "اللہ اُس کا بھلا کرے۔"

پھر وہ منزل بھی آ گئی کہ چھجو بدگوئی کے ساتھ بدخواہی بھی کرنے لگا۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو جسمانی طور پر نقصان بھی پہنچا دیتا۔ بعض عقیدت مندوں نے جوش جذبات میں عرض کیا۔

"اگر حضرت حکم دیں تو اُس ناہنجار کی زبان بند کر دی جائے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ "ہرگز نہیں! یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ تم درمیان میں بولنے والے کون ہو؟" پھر ان لوگوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "وہ تو اپنی جگہ بدزبان ہے مگر تم نے بھی اسے برے الفاظ سے یاد کیا۔ پھر تم میں اور اس میں کیا فرق ہوا؟"

پھر ایک دن کسی عقیدت مند نے برسرِ مجلس بڑے پُرجوش لہجے میں عرض کیا۔

"سیّدی! آج وہ غلاظتوں کا چشمہ بند ہو گیا۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے استفہامیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "تم کس کی بات کرتے ہو؟"

"چھجو مر گیا۔" عقیدت مند کے چہرے سے خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔

"کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں دفن ہے؟" حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا لہجہ اُداس تھا۔

عقیدت مند نے قبرستان کا پتہ بتایا تو حضرت محبوب الٰہیؒ چھجو کی قبر پر تشریف لے

گئے اور ان الفاظ میں اس کے لئے دُعائے خیر کی۔

"الٰہی! اگرچہ یہ شخص مجھے برا بھی کہتا تھا اور میرے لئے برا بھی چاہتا تھا لیکن میں نے اسے معاف کر دیا۔ تُو بھی اسے اپنے کرم سے معاف فرما دے۔ میرے معاملے میں اس کی گرفت نہ کرنا کہ تُو بڑی شان کا بخشنے والا ہے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

ایک بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں ایک اجنبی شخص داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ خدمت گاروں کو شک ہوا تو وہ اجنبی سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ نو وارد شخص خاموش کھڑا رہا۔ آخر تلاشی لی گئی تو اجنبی کی جیب سے ایک بڑا چاقو برآمد ہوا۔ خادم نے اسے پکڑ کر چاقو چھین لیا۔ پھر جب حضرت محبوب الٰہیؒ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپؒ نے خدمت گاروں کو سختی سے حکم دیا کہ اس شخص کو کسی قسم کی جسمانی اذیت نہ پہنچائی جائے۔

ظہر کی نماز کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اجنبی کو اپنے حجرۂ مبارک میں طلب کیا۔ کئی خدمت گار اسے مجرم قیدیوں کی طرح پکڑے ہوئے تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے کہ تُو کس ارادے سے یہاں آیا تھا اور تجھے کس نے بھیجا ہے؟

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "اس کے ہاتھ چھوڑ دو اور اس کے جرم کی پردہ پوشی کرو۔"

خدمت گار بہت مشتعل تھے مگر حکمِ شیخ سے مجبور تھے۔ اجنبی کے ہاتھ چھوڑ دیئے گئے۔

"بیٹھ جاؤ!" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اجنبی سے فرمایا۔ پھر جب وہ بیٹھ گیا تو آپؒ نے پوچھا۔ "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

اجنبی نے کانپتے ہوئے لہجے میں بتایا کہ وہ مقامی باشندہ نہیں ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ بس اتنا فرمایا۔ "عہد کرو کہ آج کے بعد کسی کو ایذا نہیں پہنچاؤ گے۔"

اجنبی نے روتے ہوئے عہد کیا کہ وہ بھٹک گیا تھا۔ آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خدمت گاروں سے فرمایا۔ "اسے سفر خرچ دے کر رخصت کر دو کہ اس نے بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔"

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے قتل کے بعد ہندوستان میں اسلامی اقتدار کو ایک اور آزمائش سے گزرنا پڑا۔ خسرو خان نے خفیہ طور پر بیس ہزار ہندو فوج میں بھرتی

کئے تھے۔ راتوں رات وہ تمام سپاہی دہلی پہنچ گئے اور انہوں نے قصرِ ہزار ستون کا محاصرہ کر لیا۔ دوسرے دن شدید خوف و ہراس کے عالم میں مبارک شاہ خلجی کی لاش دفن کر دی گئی۔ نہ رسم تعزیت ادا کی گئی، نہ قصرِ سلطانی میں سوگ کا اہتمام کیا گیا اور نہ سرکاری کارندوں کی نگرانی میں عوامی سطح پر فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ پورے دہلی میں عجیب ہیبت ناک سماں تھا۔

لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

مبارک شاہ خلجی کے دفن ہوتے ہی خسرو خان جو برسوں سے منافقت کی قبا پہنے ہوئے تھا، سرِ دربار نمودار ہوا۔ خاندانِ خلجی کے تمام وفادار اُمراء گرفتار کئے جا چکے تھے۔ خسرو خان نے دربار میں آتے ہی اعلان کیا۔

''میں دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ناصر اور مددگار ہوں۔ اس لئے آج سے میرا نام ناصر الدین محمد ہے۔ میں مذہب اسلام اور مملکت ہند کی خیرخواہی میں سلطان کا عہدہ و منصب قبول کرتا ہوں۔ آج سے جو میری اطاعت کرے گا، اس کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں........اور جو سرکشی اختیار کرے گا، اس کی جگہ قبرستان ہے جہاں بے شمار لوگ ہنگامۂ اقتدار سے بے خبر گہری نیند سو رہے ہیں۔''

اس اعلان کے ساتھ ہی خسرو خان نے اپنے رازدار ساتھیوں کو نئی ہندو فوج تیار کرنے کا حکم دے دیا۔

خسرو خان نے اقتدار سنبھالتے ہی سلطان علاء الدین اور مبارک شاہ کے تمام ہمدردوں کو قتل کرا دیا اور اپنے دونوں آقاؤں کی بیویوں کو گجرات کے ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔ اس بدنہاد انسان نے اپنے چھوٹے بھائی کو ''خان خاناں'' کا خطاب دیا اور علاء الدین کی بیٹی اسے انعام کے طور پر بخش دی۔ علاء الدین خلجی کا حقیقی بھانجا ملک مسرت جو ایک عرصے سے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا، خسرو خان نے اسے قتل کرا دیا اور اس طرح خاندانِ خلجی کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مرید مہندر ہردیو اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

''صبح ہوتے ہی ہندو فوج کی بھرتی کا حکم دے دیا گیا۔ مسجدیں جلا دی گئیں........ قرآن مجید پھاڑ ڈالے گئے........اور تمام امیروں پر پہرے بٹھا دیئے گئے..........اور جتنے بڑے عہدے تھے وہ سب ہندوؤں کو دے دیئے گئے۔''

مہندر ہردیو کی بات کی تصدیق تاریخ فرشتہ سے بھی ہوئی ہے۔ قاسم فرشتہ، خسرو خان

کے دورِ حکومت کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

''اس زمانے میں مسلمانوں کی بہت بری حالت تھی۔ غیر مسلموں کے حوصلے اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ وہ قرآن پاک سے وہی کام لیتے تھے جو (نعوذ باللہ) کسی موڑھے یا کرسی سے لیا جاتا ہے۔''

اس صورتِ حال نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بہت آزردہ کر دیا تھا۔ آپؒ اکثر اُداس رہا کرتے تھے۔ معتقدین اور خدمت گار ان لرزہ خیز واقعات کا ذکر کرتے تو حضرت محبوب الٰہیؒ آبدیدہ ہو جاتے اور نہایت رقت انگیز لہجے میں فرماتے۔

''لوگو! قدرت کی آتشِ قہر بھڑک رہی ہے۔ اسے توبہ و استغفار کے پانی سے ٹھنڈا کرو۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہماری بد اعمالیاں کسی اور بڑے عذاب کا سبب نہ بن جائیں۔ دین اسلام کی دیواریں ڈھانے کی کوششیں جاری ہیں اور اللہ کی آخری کتاب کو بے حرمت کیا جا رہا ہے۔ آؤ، ہم سب مل کر رب ذوالجلال کی پناہ ڈھونڈیں، اس سے عافیت طلب کریں کہ وہی اپنے دین کو سربلند کرنے والا ہے اور وہی اپنے نام لیواؤں کو اس مشکل گھڑی سے نجات دینے والا ہے۔''

***

خسرو خان کے برسرِ اقتدار آتے ہی مہندر ہردیو بہت زیادہ پریشان رہتا تھا۔ ایک دن وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔

''سیّدی! مبارک شاہ قتل ہو گیا مگر خطرہ نہیں ٹلا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے پوچھا۔ ''تم کس خطرے کی بات کر رہے ہو؟''

مہندر ہردیو نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ''شیخ! میں تو ہر وقت آپ ہی کی فکر میں مبتلا رہتا ہوں۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' حضرت محبوب الٰہیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''سیّدی! آپ خسرو خان کو نہیں جانتے؟'' مہندر ہردیو کے چہرے سے انتہائی خوف ظاہر ہو رہا تھا۔

''میں صرف اپنے اللہ کو جانتا ہوں۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔

مہندر ہردیو نیا نیا مسلمان ہوا تھا، اس لئے وہ درویشوں کے صبر و تحمل اور قناعت و توکل سے واقف نہیں تھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں عرض کرنے لگا۔

"میں خسرو خان کو خوب جانتا ہوں۔ وہ ظاہر میں مسلمان ہے مگر اندر سے کٹر ہندو۔ اس کا اسلام مصنوعی ہے۔ جب مبارک شاہ زندہ تھا تو خسرو خان مجھ سے کہا کرتا تھا کہ یہ مسلمان باہر سے اس ملک میں آئے ہیں اور انہوں نے ہم ہندوؤں کو غلام بنالیا ہے۔ میں ایک دن تجھے دکھاؤں گا کہ ان مسلمانوں کو کیسی عبرت ناک سزا دی جائے گی۔" میں نے اس بد بخت سے کہا کہ تُو اپنے مذموم ارادوں سے باز آ جا ورنہ تیری انتقامی روش پوری ہندو قوم کو مصیبت میں ڈال دے گی۔"

"پھر اُس نے کیا جواب دیا؟" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مہندر ہردیو سے پوچھا۔

"وہ ایک کینہ پرور ہندو ہے۔" مہندر ہردیو نے عرض کیا۔ "اس پر ذرا بھی میری باتوں کا اثر نہیں ہوا۔ خسرو خان اس وقت بھی مسلمانوں کی بیخ کنی کے منصوبے بناتا رہتا تھا، جب وہ مبارک شاہ کا غلام تھا۔ آج تو اس کے ہاتھوں میں مکمل اقتدار ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا کرے گا؟"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ، مہندر ہردیو کا اضطراب دیکھ کر مسکرائے۔ پھر نہایت شیریں لہجے میں فرمایا۔ "ہردیو! آخر تم بھی تو ہندو ہو۔ کیا تم علاء الدین خلجی کے خلاف نہیں تھے؟ کیا سلطان مرحوم نے تمہارے ملک (دیوگڑھ دکن) کو فتح نہیں کیا؟ کیا اس کے بیٹے مبارک شاہ نے تمہارے علاقے کو تاخت و تاراج نہیں کیا؟"

"سیّدی! یہ تو درست ہے۔" مہندر ہردیو نے عرض کیا۔ "میں کل تک ہندو تھا مگر اب تو حضور کا غلام ہوں اور میں نے سچے دل سے اسلام قبول کرلیا ہے۔"

"اگر تم سچے دل سے مسلمان ہوئے ہو تو پھر سارے معاملات کو اللہ پر چھوڑ دو۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مرید کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔

"خسرو خان ہندو حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔" مہندر ہردیو کے چہرے سے بدستور خوف و ہراس نمایاں تھا۔ "اور اُس نے اس کام کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ خسرو خان آپ کا بدترین دشمن ہے۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ جب تک یہ درویش دہلی میں موجود ہے، اس وقت تک ہندو حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ وہی بد بخت مبارک شاہ کو بھی ورغلایا کرتا تھا۔"

"یہ میرا اور خسرو خان کا معاملہ ہے۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مہندر ہردیو کی پریشان کن گفتگو سن کر نہایت مطمئن لہجے میں فرمایا۔ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کی حکومت ہوگی اور کون بے نشان ہو جائے گا۔"

مہندر ہردیو کے اس انکشاف نے ایک بار پھر تمام خدمت گاروں کو فکر و تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ پوری دلجمعی کے ساتھ رشد و ہدایت کے کام میں مشغول تھے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک روز حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلسِ درس آراستہ تھی۔ حاضرین میں سے کسی معتقد نے عرض کیا۔ "شیخ!" "آدابِ مجلس کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے جواباً فرمایا۔

"اہلِ علم کی مجلسوں میں شریک ہونے والوں پر لازم ہے کہ جہاں جگہ پائیں وہاں بیٹھ جائیں۔ اس انتظار میں نہ رہیں کہ کوئی عمدہ مقام میسر آئے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو بامراد رہیں گے۔"

اس کے بعد آپؒ نے واقعہ بیان فرمایا۔

"ایک روز رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپؐ کے گرد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حلقہ کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ اسی دوران تین افراد حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک شخص حلقے میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے حلقے میں ایک ہی جگہ خالی تھی۔ دوسرے شخص نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور حلقے کے باہر ہی بیٹھ گیا۔ تیسرا شخص رنجیدہ ہو کر واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ان تین افراد میں سے جس شخص نے حلقے میں جگہ پائی اور وہاں بیٹھ گیا، ہم نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ دوسرا شخص جو دیر سے آنے کے سبب شرمندہ ہوا اور دائرے کے باہر بیٹھا، ہمیں بھی اس سے شرم آئی اور ہم نے اسے بخش دیا......... مگر وہ تیسرا شخص جو غصے کی حالت میں واپس چلا گیا، ہماری رحمت نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہوئے۔

"مجلس میں حاضر ہونا اور بیٹھنا بھی ادب میں شامل ہے۔ آنے والے پر لازم ہے کہ جہاں خالی جگہ پائے وہیں بیٹھ جائے۔ اگر دائرے میں جگہ نہ ملے تو دائرے کے باہر بیٹھے........ اور اگر وہاں بھی جگہ نہ ملے تو کسی گوشے میں بیٹھ جائے۔"

پھر آپؒ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر فرمایا۔

"مجلس میں آکر اس وقت تک نہ اُٹھے جب تک مجلس برخاست نہ ہو جائے۔ اگر کسی

شدید ضرورت کے بغیر درمیان سے اُٹھ گیا تو ملعون ہوگا۔"

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک دن مجلس میں "پردہ پوشی" کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ کا ایک اسم پاک "ستار" ہے، عیبوں کا چھپانے والا۔ یہ اس کی صفت خاص ہے۔ اگر وہ اہلِ دنیا کی خلوتوں کے راز ظاہر کر دے تو بے شمار لوگ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ مگر یہ اُس کی شانِ کریمی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی خطاؤں اور گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے........ اور بندوں سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا عیب ظاہر نہ کریں۔"

یہ کہہ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایک صاحب کمال بزرگ تھے۔ نہایت متقی اور پرہیزگار، اپنی عبادت و ریاضت کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے والے۔ اسی وجہ سے عوام کی اکثریت حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کے عارفانہ مقام سے واقف نہیں تھی اور خود حضرت شیخؒ بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کے اور اللہ کے درمیان جو تعلق ہے وہ کسی اور پر ظاہر نہ ہو۔

حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ غزنی میں رہا کرتے تھے اور ترکاریوں کا سالن بیچا کرتے تھے۔ یہی آپؒ کا کاروبارِ حیات تھا اور اسی سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ ایک دن ایک شخص حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کے پاس کھوٹا سکہ لایا اور سالن طلب کرنے لگا۔ حضرت شیخؒ نے اس کے کھوٹے سکے کو ایک نظر دیکھا۔ خریدار کا خیال تھا کہ شیخؒ اس کے پیسے واپس کر دیں گے مگر آپؒ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور سالن دے دیا۔ دو چار دن بعد پھر وہی شخص چند کھوٹے سکے لے کر آیا اور اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر واپس چلا گیا۔ پھر یہ بات پورے شہر میں مشہور ہوگئی کہ حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کھرے اور کھوٹے میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزنی کے قرب و جوار کے لوگ بھی حضرت شیخؒ کے پاس کھوٹے سکے لانے لگے۔ یہاں تک کہ کھوٹے سکوں کا ڈھیر لگ گیا مگر حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے کبھی کسی شخص کو واپس نہیں کیا۔

پھر جب حضرت شیخؒ کا آخری وقت آیا تو آپؒ رو رو کر عرض کرنے لگے۔ "اے میرے معبود! اے میرے پیدا کرنے والے! تُو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیرے بندوں کے دیئے ہوئے کھوٹے سکے اس لئے قبول کر لئے کہ وہ میرے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ الٰہی! تُو بھی میری عبادتوں کو اپنے فضل سے قبول کر لے، چاہے وہ کھوٹی ہی

ہوں۔ انہیں میرے سامنے رد نہ کر اور مجھے شرمندگی سے بچا لے۔"

یہ واقعہ سن کر حاضرین مجلس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی اور بعض لوگوں کی آنکھیں شدتِ جذبات سے بھیگ گئیں۔

مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت عثمان خیر آبادیؒ کے کشف و کرامات کے بارے میں فرمایا۔

"اگرچہ حضرت شیخؒ زندگی بھر اپنے آپ کو چھپاتے رہے لیکن آخری وقت میں عجیب انداز سے آپؒ کی کرامت ظاہر ہوگئی تھی۔ ایک دن ایک درویش حضرت شیخ عثمانؒ کی دکان پر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک روٹی تھی۔ اسے دیکھتے ہی حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

"کیا چاہتے ہو بابا؟"

"میرے پاس خالی روٹی ہے۔ سالن چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے سالن دو گے؟" درویش نے سوالیوں کے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں؟ میرے پاس بہت سالن ہے۔" حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"مگر میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔" درویش نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"سالن مفت دو گے یا قرض؟"

"نہ مفت، نہ قرض۔" حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے فرمایا۔ "یہ میری طرف سے نذر ہے۔"

درویش نے بہت غور سے حضرت شیخؒ کی طرف دیکھا۔ "چلو نذر ہی سہی۔"

حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے دیگ میں کفگیر ڈالا اور سالن نکال کر درویش کی طرف بڑھایا۔

"میں اس کا کیا کروں؟ مجھے تو سالن چاہئے۔" درویش نے کہا۔

"یہ سالن ہی تو ہے۔" حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے فرمایا۔

"ذرا اپنے کفگیر کی طرف تو دیکھو، اس میں سالن کے بجائے پتھر بھرے ہوئے ہیں۔ میں ان پتھروں سے کیسے روٹی کھاؤں گا؟" درویش نے کہا۔

حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے کفگیر کی طرف دیکھا۔ اس میں آبدار موتی بھرے ہوئے تھے۔ حضرت شیخؒ کے چہرے پر ندامت کے آثار ظاہر ہوئے اور آپؒ نے فوراً ہی وہ موتی دیگ میں ڈال دیئے۔ پھر دوبارہ کفگیر کو بھرا اور درویش کے سامنے پیش کر دیا۔

"تم نے پھر مجھے پتھر دے دیئے۔" درویش نے کہا۔ "میں تم سے سالن مانگتا ہوں

اور تم مجھے پتھر دے دیتے ہو۔ دیگ سے کوئی سبزی نکالو تاکہ میں روٹی کھا سکوں۔"

حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے چونک کر کفگیر کی طرف دیکھا۔ اس بار کفگیر سونے کے چمکتے ہوئے سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کے چہرے پر شرمساری کے آثار اُبھر آئے۔ درویش سے معذرت کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

"معاف کرنا! تمہیں بہت زحمت ہوئی۔"

حضرت شیخؒ نے تیسری بار کفگیر دیگ میں ڈالا۔ اس مرتبہ ساگ نکلا۔ اور آج حضرت شیخؒ نے یہی سالن پکایا تھا۔

درویش نے ایک بار پھر حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کی طرف غور سے دیکھا اور سالن لے لیا۔ اس نے دکان کے سامنے کھڑے کھڑے روٹی کھائی اور حضرت شیخؒ سے پانی مانگا۔

جب حضرت عثمان خیر آبادیؒ مٹکے سے پانی نکالنے لگے تو درویش نے آپؒ کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم سے پانی مانگا ہے۔ کہیں پیالے میں ہیرے جواہرات نہ بھر دینا۔"

"نہیں! اب ایسا نہیں ہوگا۔" حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ نے معذرت خواہانہ لہجے میں فرمایا۔

پھر درویش نے پانی پیا اور حضرت شیخ عثمان آبادیؒ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہنے لگا۔ "اب تمہیں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہئے۔"

حضرت شیخؒ نے چونک کر درویش کی طرف دیکھا۔

"ہاں! اب تمہیں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ درویش تیز قدموں سے چلا گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی حضرت شیخ عثمان خیر آبادیؒ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت شیخؒ کے حالات سنانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اولیاء اللہ سے بعض راز اس وقت فاش ہو جاتے ہیں جب ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انبیائے پاک علیہم السلام ہر وقت ہوش میں رہتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جب اولیاء کسی راز کو فاش کر دیں تو پھر انہیں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہئے۔"

اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "کشف و کرامت مرد کے لئے حجاب راہ

ہے اور استقامت کار محبت ہے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

مہندر ہردیو بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ بھی دیوگڑھ (دکن) سے دہلی آ گئے تھے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آئے تھے۔ خانقاہ کے قریب ہی تینوں کو ایک مکان میں ٹھہرا دیا گیا تھا۔ خسرو خان کی وجہ سے مہندر ہردیو پر ہر وقت خوف کی حالت طاری رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ چین کی نیند سو بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دن وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک گدڑی پوش فقیر آیا اور سینکڑوں عقیدت مندوں کی موجودگی میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی شان میں نازیبا کلمات ادا کرنے لگا۔ حاضرین کے چہروں پر شدید ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ بہت سے خدمت گار جوشِ غضب میں کھڑے ہو گئے اور عرض کرنے لگے۔

"سیدی! ہمیں حکم دیجئے۔ ہم اس گستاخ کی زبان بند کئے دیتے ہیں۔"

"اسے بولنے دو۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خدام کے جذباتی مظاہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ "آخر اسے میری ذات سے کوئی تکلیف تو پہنچی ہوگی۔"

"ہم دن رات آپ کی خدمت میں موجود رہتے ہیں۔" ایک خدمت گار نے دست بستہ عرض کیا۔ "ہم نے آج تک اس گدڑی پوش کو خانقاہ میں آتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر آپ کی ذاتِ مبارک سے اسے کیا تکلیف پہنچ سکتی ہے؟"

"یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ تم لوگ درمیان سے ہٹ جاؤ۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لہجے سے ہلکی سی ناگواری جھلک رہی تھی۔

خدمت گار ادب سے سر جھکائے ہوئے بیٹھ گئے۔ مہندر ہردیو نے حیرت سے اپنے پیر و مرشد کی طرف دیکھا۔ جب اس نے خسرو خان کی شر انگیزیوں کا ذکر کیا تھا، اس وقت بھی حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہی فرمایا تھا۔ "یہ میرا اور خسرو خان کا معاملہ ہے۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟"

گدڑی پوش فقیر جو خدمت گاروں کی مداخلت کے باعث چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا تھا، ایک بار پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نہایت صبر و تحمل سے اس کی بے ہودگی کو برداشت کرتے رہے۔ پھر جب وہ برا بھلا کہتے کہتے تھک گیا تو آپؒ نے گدڑی پوش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے شخص! تجھے میری ذات سے کیا تکلیف پہنچی ہے؟"

"تم خود تو یہاں مجلس سجائے بیٹھے ہو اور میں در بدر مارا مارا پھر رہا ہوں۔" گدڑی پوش نے نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں خود نہیں بیٹھا ہوں، مجھے کسی نے بٹھایا ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے متبسم لہجے میں فرمایا۔

گدڑی پوش نے آپؒ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا اور اسی گستاخانہ انداز میں کہنے لگا۔

"ساری دنیا نذریں لے کر آ رہی ہے۔ خانقاہ میں سیم و زر کے انبار ہیں اور مجھے ایک روٹی تک میسر نہیں۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خادم خاص خواجہ اقبالؒ سے فرمایا۔ "ضرورت مند ہے اور اسے خواہشات کی آگ نے جلا ڈالا ہے۔ اگر تم سے ہو سکے تو اس آگ کو بجھا ڈالو۔"

حضرت خواجہ اقبالؒ اس گدڑی پوش کو لے کر جماعت خانے کی طرف چلے گئے اور حاجت روائی کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

پھر جب وہ گستاخ فقیر چلا گیا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "خوش گفتاروں کو تو سبھی اپنی مجلسوں میں جگہ دیتے ہیں اور سروں پر بٹھاتے ہیں۔ مگر یہ بدزبان لوگ کہاں جائیں؟ یہاں بہت سے ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو اپنے ساتھ نذریں لاتے ہیں اور قدموں پر سر رکھتے ہیں۔ پھر وہ لوگ کیوں نہ آئیں جو آتے ہی گالیاں دیں اور اس کے جواب میں کچھ تحائف لے کر جائیں۔"

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے ماضی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "ایک بار کئی گستاخ اور دریدہ دہن لوگ میرے پاس آئے اور ان کے پاس برے الفاظ کا جس قدر سرمایہ تھا، وہ سب کا سب انہوں نے میرے اوپر خرچ کر دیا۔ میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔ آخر ان کی زبانیں تھک گئیں اور وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔

"جب تک یہ دنیا قائم ہے، اس وقت تک ساری بھلائیاں ہمارے لئے اور تمام برائیاں تمہارے لئے۔"

اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے پیر و مرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ "ایک بار اسی قسم کے بے باک لوگ حضرت شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی عادت کے مطابق حضرت شیخؒ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "بت بنے بیٹھے ہو اور مخلوقِ خدا سے اپنی پرستش کراتے ہو۔"

حضرت بابا فریدؒ نے نہایت شیریں لہجے میں فرمایا۔ "میں خود نہیں بیٹھا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے بٹھایا ہے۔"

گستاخوں کی جماعت نے اسی دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں! تم خود بن کر بیٹھے ہو۔"

حضرت بابا فریدؒ نے جواباً فرمایا۔ "اگر تم مجھے بت سمجھتے ہو تو اس بت کو بھی اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔"

آخر وہ بے باک لوگ شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ "ایک بار ان گستاخ لوگوں کی ایک جماعت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حضرت شیخؒ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خدمت گاروں کو خاص ہدایت تھی کہ ایسے لوگوں پر خانقاہ کے دروازے بند رکھے جائیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح گستاخوں کا وہ گروہ خانقاہ کے اندر داخل ہو گیا اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے بحث کرنے لگا۔

"تمہیں یہاں کس نے بٹھایا ہے کہ تم خدا کے بندوں پر حکومت کرو اور مذہب کی آڑ لے کر عقیدت و ارادت کے بہانے انہیں اپنا غلام بناؤ۔"

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ پہلے ہی ان جیسے لوگوں کو ناپسند کرتے تھے۔ پھر جب گستاخوں کی جماعت نے دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا تو حضرت شیخؒ نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ "میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ کسی تاخیر کے بغیر میری خانقاہ سے نکل جاؤ۔"

حضرت شیخؒ کی بات سن کر وہ لوگ برا بھلا کہتے ہوئے خانقاہ سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ خانقاہ کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ حضرت شیخؒ کے حکم پر عمل کیا گیا تو بے ادب لوگوں کا وہ گروہ کچھ اور برہم ہو گیا۔ وہ بے ہودہ لوگ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا نام لے لے کر انتہائی فحش اور نازیبا کلمات ادا کرتے رہے۔ پھر جب چیختے چیختے ان گستاخوں کی آوازیں بیٹھ گئیں تو انہوں نے خانقاہ کے دروازے پر سنگ باری شروع کر دی۔ سارے خدمت گار حیران و پریشان تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کچھ دیر تک اپنی خانقاہ کے دروازے پر پتھروں کی یہ بارش برداشت کرتے رہے، پھر یکایک آپؒ کو جوش آ گیا اور اسی حالتِ جلال میں اپنے خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

""خانقاہ کا دروازہ کھول دو اور ان گستاخوں کو اندر بلا لو۔""

خدمت گاروں نے حکم شیخ پر عمل کرتے ہوئے خانقاہ کا دروازہ کھول دیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بے باکوں کا وہ گروہ قہقہے لگانے لگا۔ خانقاہ کا دروازہ کھلنے کو وہ کم نظر لوگ اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔

""تمہیں حضرت شیخ نے یاد فرمایا ہے۔"" ایک خدمت گار نے با آواز بلند کہا۔

""ہمیں معلوم تھا کہ تمہارا شیخ ہماری باتوں کی تاب نہ لا سکے گا۔"" ایک گستاخ نے چیخ کر کہا اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

پھر وہ بے ہودہ اور مغرور لوگ اس طرح حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں پہنچے کہ ان کے ماتھوں پر بل پڑے ہوئے تھے اور گردنیں کج تھیں۔ حضرت شیخؒ نے ان گستاخوں سے نظریں ملائے بغیر فرمایا۔

""اس وقت تم لوگوں نے مجھ سے کیا سوال کیا تھا؟""

""اگر تُو پہلے ہی ہماری بات سن لیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔"" ایک گستاخ نے نہایت رعونت کے ساتھ کہا۔ جیسے وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی بے کسی کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

""تم صرف اپنا سوال دہراؤ۔"" حضرت شیخؒ نے اس شخص کی بے ہودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

""ہم نے پوچھا تھا کہ تجھے یہاں کس نے بٹھایا ہے اور تُو کس کی اجازت سے ملتان کے سادہ لوح انسانوں پر حکومت کر رہا ہے؟"" دوسرے بے ادب نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بھی غرور و تکبر کی وہی آمیزش تھی۔

""تم لوگ میری طرف غور سے دیکھو!"" حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے سرکشوں کی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

وہ بے ادب لوگ استہزائیہ انداز میں حضرت شیخؒ کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک مردِ درویش سے نگاہوں کا ملنا غضب تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے جسموں میں ایک برقی رو دوڑ گئی ہو۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے انتہائی پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

""مجھے اس جگہ اپنے وقت کے ایک کامل نے بٹھایا ہے جن کا نام حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ ہے۔""

ابھی فضا میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ

سرکشوں کا وہ گروہ آپؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ پھر ان میں سے ہر شخص رو رو کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگنے لگا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ بزرگوں کے صبر و تحمل اور جلالِ روحانی کے واقعات بیان فرما رہے تھے اس لئے آج خانقاہ کے در و دیوار پر غیر معمولی سکوت طاری تھا اور سناٹے کی یہ کیفیت تھی کہ لوگوں کو ان کے سانسوں کی آوازیں تک سنائی دے رہی تھیں۔

پھر جب مجلسِ درس ختم ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تو مہندر ہردیو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کیا۔ ""اگر حضور اجازت دیں تو میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دیوگڑھ (دکن) چلا جاؤں؟""

""کیا تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟"" حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مرید سے دریافت کیا۔

""تکلیف تو کوئی نہیں۔"" مہندر ہردیو کچھ سہما سہما نظر آرہا تھا۔

""درویشوں کی بستی میں تکلیف تو ہوگی۔"" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ""یہاں وہ عیش و آرام کہاں جو تمہیں دیوگڑھ میں میسر تھے۔ تم وہاں صاحب جاگیر تھے اور یہاں فقیروں کی کوئی ملکیت نہیں۔""

""حضور! آپ کی وجہ سے یہاں ہر شخص مجھ سے محبت کرتا ہے۔ گھر کے لوگوں سے بھی زیادہ۔"" مہندر ہردیو رک رک کر بول رہا تھا۔

""پھر تم کیوں جانا چاہتے ہو؟"" حضرت محبوب الٰہیؒ نے پوچھا۔

""دراصل بات یہ ہے کہ میں ہر لمحہ خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔"" آخر مہندر ہردیو نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ""خسرو خان مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ میری جان بھی لے سکتا ہے۔""

اگرچہ نظام الدین اولیاءؒ نے بارہا اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مہندر ہردیو نیا نیا مسلمان ہوا تھا اس لئے وہ خسرو خان جیسے کینہ پرور انسان سے ہر وقت خوف زدہ رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دہلی کی سیاسی فضا بھی اتنی لرزہ خیز تھی کہ بہادر سے بہادر مسلمان بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔

""تم دہلی میں رہو یا دیوگڑھ میں۔ اللہ تمہیں ہر جگہ اپنی پناہ میں رکھے گا۔"" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ""تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔""

مہندر ہردیو اور اس کے ماں باپ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی دست بوسی کی اور پھر یہ

تینوں غریب الدیار انسان اپنے آبائی وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

اپنی واپسی کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے مہندر ہردیو لکھتا ہے:

"جب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا تو ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے خسرو خان کے آدمی ہمارا پیچھا کر رہے ہوں مگر یہ میرا وہم ثابت ہوا۔ کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں تھا۔ سلطان علاء الدین نے دہلی سے دیوا گڑھ تک کا راستہ بہت اچھا بنا دیا تھا۔ جگہ جگہ سرائے موجود ہیں اور راستے کے دونوں طرف ہرے بھرے درخت کھڑے ہیں۔ میں نے سفر کے دوران ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ دیوگڑھ سے دہلی کی طرف آنے والے مسافر بے شمار تھے۔ وہ سب کے سب ہندو تھے اور مجھ سے خسرو خان کی بادشاہت کا حال پوچھتے تھے۔ میں انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تو دہلی کے دیہات کا رہنے والا ایک معمولی انسان ہوں اور اپنے عزیزوں سے ملنے دیوگڑھ جا رہا ہوں۔ وہ لوگ میری بے خبری کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتے۔ "ہندو ہو کر تجھے پتہ نہیں کہ خسرو خان ہمارا بادشاہ ہے اور اس نے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت دوبارہ قائم کر دی ہے۔" وہ سب کے سب بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اس کے برعکس مجھے راستے میں مسلمان برائے نام ہی ملے۔ اگر اتفاق سے کوئی مسلمان نظر بھی آیا تو وہ خاموش اور بہت زیادہ فکرمند دکھائی دیتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنے لباس اور شکل وصورت سے ہندو معلوم ہوتا تھا اس لئے مسلمان مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ میں خسرو خان کا آدمی ہوں........ اور میں بھی یہ سوچ کر خوف زدہ رہتا تھا کہ کہیں وہ خسرو خان کے طرف دار نہ ہوں۔ غرض اسی اذیت ناک کشمکش اور خوف و ہراس کے عالم میں یہ طویل سفر تمام ہوا۔ پھر جب میں اپنے ملک میں داخل ہوا تو عجیب ویرانی کا منظر تھا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے آخری حملے نے دیوگڑھ کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ اپنے آبائی وطن کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دہلی کے انقلاب کی خبریں یہاں بھی پہنچ چکی ہیں۔ بعض مسلمان کہتے ہیں کہ خسرو خان مسلمان ہو گیا ہے اور اس کی حکومت بھی اسلامی حکومت ہے۔ اب میں کسے بتاتا کہ خسرو خان کون ہے اور وہ مذہب اسلام کے ساتھ کیسا بہیمانہ سلوک کر رہا ہے؟ بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ خسرو خان نے منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا ہے، اس لئے اس کی حکومت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گی۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے میرا جینا محال کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت اور ہر محفل میں مجھ سے دہلی کے متعلق

اتنے سوالات کرتے تھے کہ میں پریشان ہو جاتا تھا۔ مجھے جتنے ہندو بھی ملے ان میں سے ہر ایک کا اس بات پر یقین تھا کہ عام ہندوستان کے ہندو خسرو خان کی مدد کریں گے اور اس طرح اسے کوئی مسلمان شکست نہیں دے سکتا۔ میں کچھ دن تک اپنے ماں باپ کے ساتھ دیوگڑھ میں رہا۔ ہماری ساری جاگیر ضبط کر کے شاہی مقبوضات میں شامل کر لی گئی تھی۔ اس لئے وہاں جتنے دن بھی گزرے، رنج و پریشانی میں گزرے۔"

شاید حضرت نظام الدین اولیاءؒ اسی لئے چاہتے تھے کہ مہندر ہردیو دہلی میں رہے اور دیوگڑھ جا کر اپنی املاک کی تباہی کا تکلیف دہ منظر نہ دیکھ سکے مگر اس کے اعصاب پر خسرو خان کا خوف اس قدر مسلط تھا کہ وہ آبائی وطن جانے اور اپنے آشیانے کی راکھ دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

❁ ..... ✿ ✿ ..... ❁

مہندر ہردیو کے قبول اسلام کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے جس سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے روحانی تصرف کا اندازہ ہوتا ہے۔ مہندر ہردیو، دیوگڑھ (دکن) کے علاقے کا ایک بڑا جاگیردار تھا۔ آسودہ حال زندگی گزارنے کے باوجود اسے ایک عجیب سی خلش کا احساس ہوتا تھا۔ اپنے اسی اضطراب کے زمانے میں مہندر نے اپنے ہم مذہبوں کی زبانی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا نام مبارک سنا۔

"وہ اپنے وقت کے بڑے درویش ہیں اور ان کی دعاؤں سے بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔" حضرت محبوب الٰہیؒ کی بزرگی کے قصے دیوگڑھ کے گلی کوچوں میں عام تھے۔

مہندر ہردیو غیر محسوس طور پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی کا اسیر ہوتا چلا گیا۔ پھر شوقِ دید اس قدر بڑھا کہ وہ اپنی ماں سے اجازت لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔

"میں مذہباً ہندو ہوں اور حضور کی زیارت کے لئے دیوگڑھ سے آیا ہوں۔" مہندر ہردیو نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے جماعت خانے میں ٹھہرایا اور اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ہندو مہمان کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔ مہندر ہردیو کئی دن تک جماعت خانے میں مقیم رہا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خدمت گار اس کے آگے پیچھے رہتے تھے۔ درس شروع ہوتا تو وہ بھی حاضرین میں شامل ہو جاتا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی باتیں غور سے سنتا رہتا۔ اگرچہ دکن کا ہندو ہونے کی وجہ سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی گفتگو کا بیشتر حصہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن وہ خانقاہ کے ظاہری آداب کو دیکھ کر بہت متاثر تھا۔

پھر ایک دن حضرت امیر خسروؒ، پیر و مرشد کی اجازت سے مہندر دیو کو اپنے مکان پر لے گئے۔ باقی واقعات وہ اس طرح تحریر کرتا ہے:

''رات کو میں امیر خسروؒ کے مکان پر رہا تھا۔ زیادہ دیر تک جاگنے کے سبب میری آنکھ دیر سے کھلی۔ میں نے دیکھا کہ امیر خسروؒ گھر پر موجود نہیں ہیں۔ نوکروں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ امیر خسروؒ علی الصباح دربارِ سلطانی میں تشریف لے گئے ہیں۔ آج کوئی خاص جشن ہے۔ اس لئے امیر رات کو ذرا دیر سے واپس آئیں گے۔ اکیلے میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا اس لئے سوچا کہ اپنی قیام گاہ پر چلا جاؤں۔ امیر خسروؒ کے ملازموں نے میری خاطر مدارات کی۔ پھر میں جماعت خانے واپس جانے کے لئے گھر سے نکل پڑا۔ میرے راستے میں دہلی کا وہ بازار بھی آتا تھا جہاں بخارا، ترکستان اور ایران کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان دکانوں کو دیکھتا جاتا تھا جہاں ہر قسم کے کپڑے، پوستین، کمبل، قالین، کمانیں، ڈھالیں، تیر، تلواریں، نیزے اور خنجر موجود تھے۔ میں ایک دکان پر رک کر کچھ تلواریں اور خنجر دیکھنے لگا۔ یہ دکان کسی ترک کی تھی مگر وہاں سامان فروخت کرنے والا ایک ہندوستانی نوکر بھی تھا۔

میں نے ملازم سے قیمتیں بھی دریافت کیں اور ان چیزوں کے متعلق یہ بھی پوچھا کہ انہیں کن ملکوں میں تیار کیا گیا ہے؟ دکاندار بہت اخلاق سے پیش آیا اور میرے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

پھر اس نے میرے بارے میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟

میں نے اسے بتایا کہ میرا نام مہندر ہردیو ہے اور دیوگڑھ کا رہنے والا ہوں۔ امیر خسروؒ کے یہاں قیام ہے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں بھی جاتا رہا ہوں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ اور امیر خسروؒ کا نام سن کر وہ شخص اس طرح بھڑک اُٹھا کہ جیسے میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہو۔ ''وہ دونوں بے دین ہیں۔ اعلانیہ گانا سنتے ہیں۔ قوالوں کی محفلوں میں ناچتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی شریعت میں گانا اور باجا سننا قطعاً حرام ہے۔''

دکاندار کی باتیں سن کر مجھے سخت غصہ آیا۔ حالانکہ میں اس شہر میں اجنبی تھا مگر میں نے اسے غضب ناک لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اپنی زبان بند کرو۔ میں ان دونوں بزرگوں کے بارے میں ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔''

دکاندار نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ''تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ تمہارا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

''ہندو ہوتے ہوئے تمہیں ایک مسلمان فقیر سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟'' دکاندار کی حیرت برقرار تھی۔

میں نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔ ''میں دکن سے صرف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زیارت کے لئے دہلی آیا ہوں۔ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں اور ان کی مجلس کا رنگ دیکھا ہے۔''

دکاندار نے میری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

''تم امیر خسروؒ کے پیر کو نہیں جانتے۔ وہ سیدھے سادے لوگوں سے اپنے آپ کو سجدہ کراتے ہیں اور انہوں نے مکر و فریب کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔''

میں نے دکاندار کی باتوں کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کل رات امیر خسروؒ کے مکان پر رہا تھا۔ میں نے ان میں یا ان کے پیر میں کوئی بات مکر و فریب کی نہیں دیکھی۔''

دکاندار نے کہا۔ ''تم بھی بت پرست ہو اور تمہارا دوست امیر خسروؒ بھی بت پرست ہے.......اور ان کا پیر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے تم اس کے گرویدہ ہو گئے ہو۔''

دکاندار کی یہ تحقیر آمیز گفتگو سن کر میں اپنے غصے پر قابو نہ پا سکا۔ ''اب میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہے گا کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا؟ نہ یہاں ٹھہرتا اور نہ ایسی تکلیف دہ باتیں سننے کو ملتیں۔''

دکاندار ہنس کر کہنے لگا۔ ''میں صاف اور کھرا آدمی ہوں۔ تم مسافر اور اجنبی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان حکومت کے ذمی ہو۔ اس لئے میں نے تمہیں برائی سے بچانا ضروری سمجھا۔''

''ذمی کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

دکاندار نے جواب دیا۔ ''جس کی حفاظت مسلمان حکومت کے ذمے ہو، اسے اسلامی شریعت میں ذمی کہتے ہیں۔ میں بھی اسلامی حکومت کا ایک فرد ہوں اور تمام ہندوؤں کو ذمی سمجھتا ہوں، اس لئے تمہاری حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔''

''مجھے تمہارے اس خیال سے بہت خوشی ہوئی۔'' میں نے دکاندار کی بات سن کر کہا۔

''تم نے مجھے لفظ ذمی کا مفہوم سمجھایا۔ میں بھی شکر گزاری کے طور پر تمہیں ایک گناہ سے بچانا چاہتا ہوں جس میں تم نادانستہ طور پر مبتلا ہو گئے ہو۔''

میری بات سن کر دکاندار ہنسا اور پھر کہنے لگا۔ ''اچھا میں کل شام ضرور جاؤں گا۔''

''آج دن میں کیوں نہیں؟'' میں نے اصرار کیا۔

"دن میں مجھے فرصت نہیں ملتی۔" دکاندار نے جواب دیا۔ "چونکہ شام کو سارا بازار بند ہو جاتا ہے، اس لئے وہی مناسب وقت ہے۔"

دکاندار کا عذر سن کر میں نے زیادہ زور نہیں دیا۔ "ٹھیک ہے، کل تم حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"

"مگر میری ایک شرط ہے۔" دکاندار نے کہا۔ "اگر تم نے وہ شرط پوری نہیں کی تو میں خانقاہ کے دروازے سے لوٹ آؤں گا۔"

"تم حضرت شیخؒ کی زیارت کو جا رہے ہو یا کسی سوداگر کی طرح کاروباری شرطیں عائد کر رہے ہو؟" اچانک میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔" دکاندار نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تم وہاں پہنچ کر کسی سے میری باتوں کا ذکر نہ کر دو۔"

"اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا کہ میں اپنی زبان کھولوں یا خاموش رہوں۔" میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"دراصل میں تمہارے دوست امیر خسروؒ کے شیخ کی روحانی طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے دکاندار کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی استہزائیہ مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

"جاہل عقیدت مندوں میں نظام الدین اولیاؒ کے کشفِ باطن کے بے شمار افسانے مشہور ہیں۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ان کی روشن ضمیری کا بڑا چرچا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ شیخ کو میرے خیالات کی خبر ہوتی ہے یا نہیں؟'

"اگر تم یہ شرط عائد نہ کرتے، تب بھی تمہاری گستاخانہ گفتگو کا ذکر کسی سے نہیں کرتا...... مگر تم ایک بدگمان شخص ہو۔ اس لئے میں شام تک یہیں ٹھہرے جاتا ہوں۔" میں نے دکاندار سے کہا۔ "تم آج ہی حضرت شیخؒ کی خانقاہ میں چلو۔ میں شام تک تمہارا مہمان ہوں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" دکاندار نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"میں ایک لمحے کے لئے بھی تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہتا۔" میں نے اسے مزید اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"میں آج شام تمہارے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پاس چلوں گا اور مجلس میں ایسی جگہ بیٹھوں گا کہ شیخؒ کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے مگر تم مجھے دیکھتے رہو اور اس بات کا جائزہ لیتے رہو کہ کہیں میں کسی سے تمہارا ذکر تو نہیں کر رہا ہوں۔"

دکاندار پوری طرح مطمئن ہو گیا اور اس نے مجھے دوپہر کا کھانا کھلایا۔ اس دوران خریدار آتے جاتے رہے۔ پھر جب عصر کا وقت آیا تو اس نے دکان بند کی اور ہم دونوں حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے بھر وہ شخص مختلف انداز میں شیخؒ کی ذاتِ گرامی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔

جب ہم دونوں خانقاہ میں داخل ہوئے تو وہاں عام دنوں سے زیادہ ہجوم تھا۔ مجلس میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ مجبوراً میں سب سے پیچھے بیٹھ گیا...... مگر وہ دکاندار حاضرین کی صفوں کو چیرتا ہوا حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے قریب پہنچا اور نہایت بے ادبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپؒ کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے اس شخص کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اگر آدابِ مجلس کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اسے آگے جانے سے روک دیتا...... مگر وہ میری دسترس سے دور تھا، اس لئے کچھ نہ کر سکا اور اپنی جگہ بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر میں نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ ہر شخص کے چہرے سے شدید غصے کے آثار نمایاں تھے مگر کوئی شخص بھی حضرت شیخؒ کے احترام کے پیشِ نظر لب کشائی کی جرأت نہ کر سکا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بڑی محبت کے ساتھ دکاندار کو اپنے پاس بٹھایا اور مزاج پُرسی کی۔ "غالباً تم اسی شہر کے رہنے والے ہو۔"

"جی ہاں! میں دہلی کا قدیم باشندہ ہوں۔ میرے باپ دادا بھی یہیں رہتے تھے۔"

"تمہارا بہت شکریہ کہ تم اس فقیر کی مجلس میں آئے۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ نے دلنواز لہجے میں فرمایا۔

جب حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بات مکمل کی تو دکاندار نے مڑ کر میری طرف دیکھا...... مگر میں ایسے زاویے سے اتنی دور بیٹھا ہوا تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں اس کی ایک ایک حرکت کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوف کی کیفیت طاری تھی۔ دراصل حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ان ہی چیزوں کا ذکر چھیڑ دیا تھا، جنہیں بنیاد بنا کر وہ دکاندار شیخؒ کی شان میں گستاخیاں کرتا تھا۔

حضرت شیخؒ کی یہ باتیں سن کر دکاندار نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ پوری مجلس گونج گئی۔ پھر وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ہاتھ پکڑ کر ہچکیوں سے رونے لگا۔

"شیخ! مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بڑی گمراہی میں مبتلا تھا۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ انتہائی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

"اگر اللہ ہدایت نہ دے تو ہم سب گمراہ ہو جائیں۔"

پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے شیخ زادے خواجہ سیّد محمدؒ سے فرمایا جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

''انہیں اُٹھاؤ۔ انہیں پانی پلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور ان کے لئے حلوہ لاؤ۔''

حضرت شیخؒ کا حکم سن کر خواجہ محمدؒ اُٹھے اور جماعت خانے کی طرف چلے گئے۔

پھر آپؒ نے بلند آواز میں فرمایا ''آج ہمارا ہندو مہمان ہردیو کہاں ہے؟''

میں نے حضرت شیخؒ کی زبان مبارک سے اپنا نام سنا تو میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر میں اسی حالت میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

''حضور! آپ کا غلام یہاں حاضر ہے۔''

حضرت شیخؒ نے میری طرف دیکھا۔ اس وقت آپؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ نہایت پُرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔ ''ہردیو! ہم سب اللہ کے ذمی ہیں۔ کوئی انسان کسی انسان کا ذمی نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے سوا کسی کو کوئی قدرت حاصل نہیں۔ ہم سب بے اختیار ہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی ایسی حفاظت نہیں کر سکتا جیسی اللہ اپنے بندوں کی نگہبانی کرتا ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا اخلاقِ کریمانہ دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور حاضرینِ مجلس بھی رونے لگے۔ یہ سن کر دکاندار کی تو حالت ہی غیر ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر چیخ ماری اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اتنے میں خواجہ سیّد محمدؒ کچھ کھانا، حلوہ اور پانی لے کر آ گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے دستِ مبارک سے دکاندار کو ایک نوالہ کھلایا۔ حلق سے غذا اُترتے ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

''شیخ! بس یہ بہت ہے۔''

''نہیں! یہ سب کھاؤ۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''تم ہمارے مہمان ہو۔''

الغرض دکاندار نے حلوہ کھایا اور بہت عاجزی سے بولا۔ ''شیخ! جب آپ نے مجھ گناہ گار کو معاف کر دیا تو اتنا کرم اور فرما دیجئے۔''

''اب کیا چاہتے ہو؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دکاندار کو اٹھاتے ہوئے فرمایا۔

''مجھے اپنی غلامی کا شرف بخش دیجئے۔'' دکاندار گریہ وزاری کرنے لگا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خواجہ سیّد محمدؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ پیر و مرشد کا نواسا ہے اور میرا بیٹا ہے۔ تم اس سے بیعت کر لو۔'' پھر خواجہ سیّد محمدؒ کو مخاطب

کر کے فرمایا۔ ''محمدؒ! یہ تمہارے مہمان ہیں۔ آج رات انہیں اپنے گھر ٹھہراؤ۔'' اس کے بعد مجھے حکم دیا۔ ''ہردیو! آج تم بھی سیّد محمدؒ کے مہمان ہو گے۔''

ہم دونوں نے حکمِ شیخ کی تعمیل کی اور خواجہ سیّد محمدؒ کے مکان پر حاضر ہوئے۔

پھر وہ دکاندار حضرت خواجہ سیّد محمدؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔

اہلِ شہر نے اس انقلاب پر بڑی حیرت کا اظہار کیا، دکاندار کا ہزاروں گاہکوں سے سابقہ پڑتا تھا اور وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہر عقیدت مند سے یہی کہتا تھا۔ ''تم سب بت پرست ہو۔''

آج جب ان ہی لوگوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانۂ مبارک پر اس شخص کو عقیدت سے جھکے ہوئے دیکھا تو حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تُو بھی بت پرستوں میں شامل ہو گیا؟''

''بت پرستوں میں تو شامل نہیں ہوا مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا غلام ضرور بن گیا ہوں۔'' دکاندار کی ساری چرب زبانی ختم ہو گئی تھی اور اس کے لہجے سے اس قدر عاجزی کا اظہار ہونے لگا تھا جیسے وہ کوئی گداگر ہے۔

''آخر تُو نے شیخ کی غلامی کیوں اختیار کی؟'' لوگ اس سے سوال کرتے۔

''یہ مت پوچھو کہ میں نے حضرت شیخؒ کی ذات میں کیا دیکھا؟'' یہ کہہ کر دکاندار رونے لگا۔

جب تک میں دہلی میں رہا، وہ روزانہ میرا شکریہ ادا کرتا۔

''ہردیو! تمہارا دکن سے دہلی آنا میرے لئے بڑا مبارک ثابت ہوا۔ اللہ کے بڑے عجیب انتظامات ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ کس کو کس طرح ہدایت بخشے گا۔ نہ تم میری دکان پر آتے اور نہ میں حضرت شیخؒ کے دربار میں حاضر ہوتا۔ اللہ تمہیں دونوں جہان میں عزتیں بخشے۔''

❁ ..... ❁ ❁ ..... ❁

اس رات مہندر ہردیو، حضرت سیّد محمدؒ کا مہمان تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سیّد محمدؒ سے عرض کیا۔ ''آج میں نے اپنی آنکھوں سے بیک وقت حضرت شیخؒ کی کئی کرامات دیکھیں...... اور ان کرامات کا تعلق ہم دونوں کی ذات سے تھا۔'' مہندر ہردیو نے دکاندار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری درخواست ہے کہ آپ حضرت شیخؒ کی کوئی اور کرامت بیان فرمائیں۔''

حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''میں حضرت شیخؒ کی کس کس

کرامت کا ذکر کروں؟ آپ کی حیات مبارک کا ہر عمل اور روز و شب کا ہر لمحہ کرامت ہے۔" حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے اختصار سے کام لیا۔

مہندر ہردیو چونکہ غیر مسلم تھا، اس لئے آپؒ کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا اور مسلسل اصرار کرنے لگا۔

آخر حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس روز میں بھی حضرت شیخؒ کی مجلس میں حاضر تھا۔ سیّدی درس دے رہے تھے کہ اسی دوران ایک شخص داخل ہوا اور خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اگرچہ وہ آدابِ مجلس کا لحاظ رکھتے ہوئے خاموش بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرے سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ حضرت شیخؒ کا درس ختم ہوا اور وہ اپنی درخواست پیش کرے۔ آخر بہت دیر بعد درس ختم ہوا تو وہ شخص اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"شیخ! میرے حق میں دعا فرمایئے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"آخر تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے متبسم لہجے میں فرمایا۔ "کوئی طبیب مرض کے بارے میں جانے بغیر کس طرح دوا دے سکتا ہے؟"

"شیخ! آپ پر تو سب کچھ روشن ہے۔" وہ شخص اپنے ظاہری لباس اور گفتگو سے بہت شائستہ نظر آتا تھا۔

"یہ تمہاری خوش گمانی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "اللہ جب چاہتا ہے تو اپنے کسی بندے پر کوئی راز منکشف کر دیتا ہے ورنہ ہم سب بے خبر ہیں۔"

"میری جاگیر کی سند گم ہو گئی ہے۔" اس شخص نے عرض کیا۔

"دوسری سند بھی بن سکتی ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"میں نے سلطان کے اہلکاروں سے کہا تھا مگر وہ نئی سند دینے سے انکار کرتے ہیں۔" اس شخص نے عرض کیا۔ "آپ دعا فرمایئے کہ میری گم شدہ دستاویز مل جائے ورنہ کوئی بھی دشمن اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"اگر تم مجھے بہترین حلوہ کھلاؤ تو میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وہ شخص اسی وقت مجلس سے اُٹھا اور حلوائی کی دکان تلاش کرنے لگا۔ دکانیں تو بہت

تھیں مگر وہ لوگوں سے اس دکان کا پتہ پوچھنے لگا جہاں بہترین حلوہ تیار ہوتا تھا۔ آخر وہ ایک دکان پر پہنچا اور حلوہ طلب کیا۔

پھر جب وہ واپس آیا تو اہلِ مجلس نے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا اور دوسرے ہاتھ میں حلوہ۔ اس نے دونوں چیزیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے رکھ دیں۔

"یہ کیا ہے؟" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔

"یہی تو میری گم شدہ دستاویز ہے۔" اس شخص کے چہرے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ تمہیں کہاں ملی؟" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"جب دکاندار نے حلوہ ایک کاغذ میں رکھنا چاہا تو میری نظر اس کاغذ پر پڑی۔ وہ ردّی کاغذ نہیں بلکہ میری کھوئی ہوئی سند تھی۔ میں نے دکاندار سے کاغذ مانگ لیا.........
اور اس طرح میں حضرت کی دعاؤں کے طفیل اپنے مقصد کو پہنچا۔"

پورا واقعہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تبسم فرمایا۔ "پہلے میرے پیر و مرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کرو۔ پھر یہ حلوہ اپنے بچوں میں تقسیم کر دو۔"

حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ مخصوص کرامت صرف اس لئے بیان کی تھی کہ دکاندار اور جاگیردار کے واقعات میں ایک چیز مشترک تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے گستاخیاں کرنے والے دکاندار کو تواضع میں خود حلوہ پیش کیا تھا.........اور جاگیردار کو حکم دیا تھا کہ وہ حلوے پر حضرت بابا فریدؒ کی فاتحہ دلائے۔

✿ ...... ✿ ✿ ...... ✿

اُردو زبان کی ابتداء کے بارے میں کئی روایات مشہور ہیں لیکن مہندر ہردیو نے اپنے روزنامچے میں جس واقعے کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو کی بنیاد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حکم پر رکھی گئی۔ مہندر ہردیو لکھتا ہے کہ ایک رات حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنی مجلس خاص میں امیر خسروؒ، خواجہ حسن سنجریؒ، خواجہ سیّد محمدؒ، ان کے بھائی خواجہ سیّد موسیٰؒ اور اپنی بہن کے پوتے خواجہ سیّد رفیع الدین ہارونؒ، میرے ہم وطن سنبھل دیو، چیتل دیو، سیتل دیو اور مجھے طلب فرمایا۔ پھر جب ہم لوگ جمع ہو گئے تو ارشاد ہوا۔

"تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان استعمال کریں تا کہ تمام لوگوں کو آپس کی بات چیت اور لین دین

کے معاملات طے کرنے میں آسانی ہو۔" یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے کچھ دیر کے لئے سکوت اختیار کیا۔ پھر ایک خاص نظر التفات سے حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ سیّد محمدؒ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"میں تم سے یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔"

حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے بیک زبان عرض کیا۔ "ہم دونوں مخدوم کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔"

حضرت امیر خسروؒ نے مزید عرض کیا۔

"میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مختصر کتاب تحریر کر رہا ہوں جس کا نام "خالق باری" تجویز کیا ہے۔"

"اس کتاب کا کچھ حصہ سناؤ۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت امیر خسروؒ کو حکم دیا۔

حضرت امیر خسروؒ نے اپنی اس منفرد کتاب "خالق باری" کے کچھ اشعار پیر و مرشد کو سنائے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ان اشعار کو پسند کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "یہ بہت مفید چیز ہے۔ مگر ہندی زبان میں ایسے اشعار بھی لکھو جنہیں لوگ گایا کریں۔"

اس کے بعد حضرت شیخؒ نے دوسرے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آج کل ہماری فارسی اور خسروؒ کی ترکی زبان کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے الفاظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور محفلوں میں بھی ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے۔ اس لئے انہیں سمجھانا چاہئے کہ ان کا اور ان کی حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کے دلوں کی حالت کو سمجھ سکیں........ اور یہ جب ہی ہوگا کہ وہ ضد چھوڑ دیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہندی بول چال کو فروغ دیں۔"

مہندر ہردیو کے بیان کردہ اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہ صرف اُردو زبان کی بنیاد رکھی بلکہ اسلام کی تبلیغ کے لئے بھی ایک نیا اور مؤثر راستہ کھول دیا۔

❀ ..... ❀ ❀ ..... ❀

مہندر ہردیو مکمل طور پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی جاں نواز شخصیت کے زیر اثر آ چکا تھا۔ وہ بڑے بڑے سادھوؤں اور جوگیوں سے ملا تھا، اس نے اپنے ہم مذہبوں کی سخت

ترین ریاضتیں بھی دیکھی تھیں مگر اسے کسی رشی یا منی نے اس قدر متاثر نہیں کیا کہ وہ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو جاتا۔ اس کے برعکس مہندر ہردیو، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ایک نظر کی بھی تاب نہ لا سکا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد کی شان میں ایک منقبت تحریر کی تھی جس کی گونج آج بھی برصغیر پاک و ہند کے گلی کوچوں میں سنائی دیتی ہے۔

"چھاپ تلک سب چھین لی مو سے نیناں ملائے کے۔" (تیری ایک نظر کا یہ اثر ہے کہ تُو نے بت پرستی کے سارے نشانوں کو مٹا ڈالا)

حضرت امیر خسروؒ کا یہ مصرع مہندر ہردیو پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اس کی ذات میں بہت دنوں سے ایک خوف ناک جنگ جاری تھی۔ کعبے کا تصور مہندر کو اپنی طرف کھینچتا تھا مگر اس کے پیروں میں بت خانے کی زنجیریں پڑی تھیں۔ آخر حضرت محبوب الٰہیؒ کی نگاہِ کیمیا اثر رنگ لائی اور مہندر ہردیو نے اپنے عقیدے کی تمام بندشوں کو توڑ ڈالا۔ ایک دن حاضرینِ مجلس کے سامنے عرض کرنے لگا۔

"حضور! یہ تو فرمائیں کہ مسلمان کس طرح بنتا ہے؟"

"جب تُو اللہ کو ایک مان لے گا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کر لے گا تو مسلمان ہو جائے گا۔"

"اگر مسلمان ہونا اتنا ہی آسان ہے تو مجھے اسی وقت مسلمان کر لیجئے۔" مہندر ہردیو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کیا۔

"مسلمان کرنا اور ہے اور مسلمان ہونا اور ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایمان لانے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "مسلمان کرنے کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا جبر، دباؤ، لالچ یا ذاتی غرض بھی شامل ہے........ اور مسلمان ہونا ایک الگ بات ہے۔ اگر تُو اس بات کا یقین کر لے کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے رسول ہیں تو اس یقین کے ساتھ ہی تُو مسلمان ہو جائے گا۔"

مہندر ہردیو پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ارشادِ گرامی کی اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے رسول ہیں۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "بس، تُو مسلمان ہے۔"

مہندر ہردیو کے چہرے پر خوشی کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی جیسے اسے غیر معمولی دولت حاصل ہوگئی ہو۔ "جب میں مسلمان ہو چکا ہوں تو پھر مجھے بیعت بھی کر لیجئے۔"

ارشاد ہوا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ تُو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے اور تیرا نام تبدیل کیا جائے۔''

مہندر ہردیو، حضرت محبوب الٰہیؒ کے حکم پر عمل کرتا رہا مگر اس کے ساتھ ہی وہ حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ آخر کچھ دنوں بعد اس نے عرض کیا۔

''حضور! مجھے بیعت کا شرف بھی دیجئے۔ ورنہ یہ خلش مجھے ہمیشہ بے قرار رکھے گی۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مہندر ہردیو کی درخواست کو قبولیت کا اعزاز بخشا اور بیعت کے بعد اپنے دست مبارک سے کلاہ چہار ترکی اس کے سر پر رکھی۔

حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد مہندر ہردیو نے دیوگڑھ جانے کی اجازت مانگی۔ ''حضور! میں نے بہت دنوں سے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا ہے۔''

''تم اپنے وطن جا سکتے ہو۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مہندر ہردیو کو دکن جانے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر تمہارے ماں باپ اجازت دیں تو دوبارہ آ جانا..... اگر وہ تمہارے ساتھ دہلی آنا چاہیں تو تم انہیں بھی لا سکتے ہو۔''

❀ ...... ✿ ✿ ...... ❀

ابھی مہندر ہردیو اپنے وطن جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ وہ سازشوں کے طوفان میں گھر گیا اور اس کا سفینۂ حیات ڈگمگانے لگا۔ اس خوف ناک واقعے کے بارے میں خود مہندر ہردیو تحریر کرتا ہے۔

''میں دیوگڑھ روانہ ہونے والا تھا کہ حضرت خواجہ سیّد محمدؒ کا خادم ملیح میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''کوتوال علاء الملک کا ایک آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

علاء الملک حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مرید تھا۔

''علاء الملک کے آدمی کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟'' میں نے خواجہ سیّد محمدؒ کے خادم سے پوچھا۔

''میں کیا بتا سکتا ہوں؟'' ملیح نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر ملیح سے کہا کہ کوتوال صاحب کے آدمی کو اندر بلا لو۔

جب وہ شخص اندر آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی نامعلوم خطرہ بہت تیزی سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔

''میں کوتوال علاء الملک صاحب کا نائب ہوں۔'' اس شخص کی آواز میں گرج تھی اور لہجہ تند و تیز تھا جیسے وہ اپنے کسی دشمن سے مخاطب ہو۔

میں نے علاء الملک کے نائب کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ مسلح تھا۔ اس کی لمبی داڑھی تھی اور چہرے سے خونخواری برس رہی تھی۔

''آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں پوچھا اور میں ایسا کرنے کے لئے مجبور تھا۔

اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی مجرم کی تلاشی لے رہا ہو۔ ''تم سے جو سوال کیا جائے، اس کا صحیح جواب دینا۔'' وہ گرجا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔'' میں نے بھی ہمت سے کام لیا۔

''کیا تمہارا ہی نام ہردیو ہے؟'' وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔

جب اس نے میرا نام لیا تو میں سمجھ گیا کہ یقیناً کوئی ناگوار واقعہ پیش آنے والا ہے۔ تاہم میں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میرا ہی نام ہردیو ہے۔''

''تم دیوگڑھ کے رہنے والے ہو؟'' علاء الملک کے نائب نے دوسرا سوال کیا۔

وہ میرے بارے میں پوری معلومات رکھتا تھا، اس لئے کچھ چھپانا فضول تھا۔ میں نے صاف صاف کہا۔

''ہاں! میرا وطن دیوگڑھ ہے۔''

''کیا تم کچھ دن پہلے اجمیر، ہانسی، ملتان اور بدایوں گئے تھے؟'' کوتوال علاء الملک کے نائب نے تیسرا سوال کیا۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی جاسوس ہے اور میرے ایک ایک لمحے کی نگرانی کرتا ہے۔

''میں حال ہی میں ان تاریخی مقامات کی سیاحت کر کے دہلی واپس آیا ہوں۔'' میں نے اعتراف کر لیا کہ اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

''کیا تم نے اس سفر میں سلطان معظم کے خلاف کسی سے کوئی بات کی تھی؟'' جیسے ہی اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔

میں اپنی اس کمزوری سے پوری طرح واقف ہوں کہ میرے اندر اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جو کچھ دل میں ہوتا ہے، اسے بے دھڑک زبان پر لے آتا ہوں۔ ایک بار میں نے حضرت امیر خسروؒ سے سلطان علاء الدین خلجی کے خلاف باتیں کی تھیں۔ اگرچہ امیرؒ ایک نہایت صالح انسان تھے اور ان ہی کے طفیل مجھے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا تھا لیکن گھبراہٹ اور پریشانی میں خیال گزرا کہ کہیں امیرؒ نے نادانستگی میں سلطان کے سامنے میرا ذکر نہ کر دیا ہو۔

’’کیا تم سے حضرت امیر خسروؒ نے یہ بات کہی ہے؟‘‘ میں نے علاء الملک کے نائب سے پوچھا۔

’’نہیں!‘‘ اس نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ’’ہماری معلومات کا ذریعہ کوئی اور ہے۔ تم صرف اتنا بتاؤ کہ تم نے ایسا کیا ہے؟‘‘

میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ ’’مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، انسان گفتگو کرتے وقت کبھی کبھی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میری زبان سے کبھی ایسی کوئی بات نکل گئی ہو جس میں سلطان معظم کا ذکر موجود ہو۔‘‘

ابھی یہ سوال و جواب جاری تھے کہ خواجہ سیّد محمدؒ، خواجہ سیّد موسیٰؒ اور مولانا احمد نیشاپوریؒ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ ان تمام حضرات نے میری پریشانی کو پوری شدت سے محسوس کیا۔

علاء الملک کا نائب مزید کوئی سوال کرنا چاہتا تھا کہ مولانا احمد نیشاپوریؒ نے اس سے ترکی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ میں بھی تھوڑی بہت ترکی سمجھتا تھا۔ مولانا احمدؒ نے اس سے کہا۔

’’یہ ہمارا مہمان ہے۔ تمہیں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے۔‘‘

’’بے شک! یہ ہمارا مہمان ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟‘‘ علاء الملک کے نائب نے ان بزرگوں کی موجودگی کو بھی نظر انداز کر دیا تھا جن کے احترام میں باشندگانِ دہلی کی گردنیں ہمیشہ خم رہتی تھیں۔

’’یہ حکومت کا ذمی ہے اور دیوگڑھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔‘‘ مولانا احمد نیشاپوریؒ نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

’’اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے شیخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مرید ہے۔ تمہیں تحقیقات کے وقت ان سب باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ تم اسے کوتوال کے پاس نہ لے جاؤ اور علاء الملک سے کہو کہ وہ خود اس کے بارے میں حضرت سلطان المشائخؒ سے بات کر لے۔‘‘

مولانا احمد نیشاپوریؒ نہایت معقول اور مصالحانہ گفتگو کر رہے تھے مگر اس شخص نے ان کی ایک بھی نہیں سنی۔

’’تم اسے نہیں جانتے۔ یہ حکومت کا باغی ہے۔‘‘ علاء الملک کے نائب کے لہجے سے نفرت و غضب کی آگ برس رہی تھی۔ ’’اس نے کئی مقامات پر ہندوؤں سے ملاقاتیں کی ہیں اور یہ کہا ہے کہ علاء الدین نے میرے راجہ رام دیو کو لوٹا ہے۔ اس لئے ہندوستان

کے تمام ہندوؤں کو سلطان سے انتظام لینا چاہئے۔ قانون اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ایسے سنگین جرم کی سزا صرف موت ہے۔‘‘

میں ترکی زبان سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس شخص کا مطلب سمجھ لیا اور موت اپنا خونی دہن کھولے ہوئے میری طرف بڑھنے لگی۔

ابھی یہ گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خادم خاص خواجہ اقبالؒ وہاں تشریف لائے اور علاء الملک کے نائب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

’’ہمارے پیر و مرشد نے فرمایا ہے کہ ہم ہردیو کو کہیں جانے نہیں دیں گے۔ علاء الملک کو چاہئے کہ وہ ہمارے پاس آئے اور یہ بتائے کہ مہندر ہردیو نے کیا جرم کیا ہے؟‘‘

علاء الملک کے نائب نے حضرت خواجہ اقبالؒ کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ پھر اسی تند و تیز لہجے میں بولا۔ ’’تمہارے شیخؒ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں ہردیو کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟ میں نے یہاں آنے سے پہلے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔‘‘

’’تمہیں کیا معلوم کہ ہمارے شیخ کیا ہیں اور اللہ نے انہیں کیسی روحانی طاقت بخشی ہے۔‘‘ حضرت خواجہ اقبالؒ نے جواباً فرمایا۔

’’میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔‘‘ کوتوال کے نائب کا لہجہ گستاخانہ بھی تھا اور غضب ناک بھی۔ ’’تمہارے حضرت درویش ہوں یا صاحبِ کمال ہوں، میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کوتوال کے پیر ہوں، وزیر کے پیر ہوں یا کچھ بھی ہوں۔ میں ان باتوں سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ میں شاہی مجرم کو لینے آیا ہوں اور ہر حال میں لے کر جاؤں گا۔ اگر تم لوگ میرے کام میں مداخلت کرو گے تو میں اس کا سر لے کر جاؤں گا۔‘‘

حضرت خواجہ اقبالؒ ایک نرم دل انسان تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ وہ انتہائی کوشش کے باوجود نائب کوتوال کی سخت کلامی کا جواب نہ دے سکے۔ مجھے اپنی موت چند قدم کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ اچانک حضرت خواجہ سیّد محمدؒ آگے بڑھے اور نہایت جرأت کے ساتھ فرمانے لگے۔

’’کس کی مجال جو ہمارے مہمان کو حضرتؒ کی اجازت کے بغیر یہاں سے لے جائے؟‘‘

یہ سنتے ہی اس شخص نے اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی۔ اس سے پہلے کہ میری گردن شمشیر کی زد پر آتی، حضرت خواجہ سیّد موسیٰؒ نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر نائب کوتوال کا ہاتھ پکڑ لیا اور

دوسرے ہاتھ سے بازو مروڑ کر تلوار چھین لی۔ مولانا احمد نیشاپوریؒ نے خواجہ سیّد موسیٰؒ کی مدد کی اور پھر اس گستاخ انسان کے دونوں ہاتھ باندھ کر بٹھا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں شیر کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے کف اُبل کر داڑھی پر ٹپک رہا تھا اور اس کی زبان سے مسلسل گستاخانہ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

میں نے چین کا سانس لیا مگر ابھی میرے سر سے آفت ٹلی نہیں تھی۔ ایک شخص بے دست و پا ہو گیا تھا مگر دوسرا بھی میرے تعاقب میں آ سکتا تھا کیونکہ مجھے حکومت کا باغی قرار دیا جا چکا تھا۔ ابھی میں اسی خوف و ہراس میں مبتلا تھا کہ خود کوتوال علاء الملک وہاں پہنچ گیا۔ شاید حضرت شیخؒ نے خواجہ اقبالؒ کو میرے پاس بھیجنے کے بعد کسی دوسرے شخص کو علاء الملک کے پاس بھی بھیجا ہوگا۔ کوتوال کے ساتھ دس بارہ مسلح آدمی تھے۔

علاء الملک نے آتے ہی حضرت خواجہ سیّد محمدؒ کے آگے سر جھکا دیا اور نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے نائب کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور دو آدمیوں نے اسے پکڑ رکھا ہے۔ اپنے آدمی کی یہ حالت دیکھ کر کوتوال کے چہرے پر غصے کے آثار اُبھر آئے۔

حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے علاء الملک کی برہمی دیکھ کر فرمایا۔ ’’یہ شخص اسی سلوک کے لائق تھا۔ اس نے حضرت شیخؒ کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں۔‘‘

’’تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم میرے پیر و مرشد کے حوالے سے بے ادبی کا مظاہرہ کرو۔‘‘ علاء الملک انتہائی سخت لہجے میں اپنے نائب سے مخاطب ہوا۔ ’’اس سلسلے میں پہلے بھی کسی نے تمہاری شکایت کی تھی۔ میں تمہیں آخری بار تنبیہہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے آئندہ ایسی نازیبا حرکت کی تو تمہیں اس عہدے سے معزول کر دیا جائے گا۔‘‘

علاء الملک کے آدمی اس کے نائب کو لے کر چلے گئے اور کوتوال وہیں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے نہایت نرم لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’تم نے اجمیر، ملتان اور لاہور کے فلاں فلاں ہندوؤں سے سلطان معظم کے خلاف باتیں کیں یا نہیں؟‘‘

’’ملتان کے سوا کسی دوسرے مقام پر میں کسی ہندو سے نہیں ملا۔‘‘ میں نے علاء الملک کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ’’بلکہ ان ہندوؤں نے خود مجھ سے ملاقات کی تھی۔ وہ میرے ہم وطن تھے، اس لئے ان لوگوں نے مجھ سے باتوں باتوں میں سلطان معظم کے اس حملے کا ذکر کیا تھا جو انہوں نے بادشاہ ہونے سے پہلے دیوگڑھ پر کیا تھا۔ میں نے جواب میں ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے سلطان کی مخالفت کا پہلو نکلتا ہو۔ پھر جب

وہ لوگ زیادہ جذباتی ہو گئے تو میں نے انہیں قائل کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقتدار کی جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ کیا ہمارے ہندو راجہ دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے؟‘‘

’’تم سچے معلوم ہوتے ہو۔‘‘ میرا جواب سن کر علاء الملک نے کہا۔ ’’ہمارے پاس ملتان ہی سے اطلاع آئی ہے اور وہ ہندو بھی گرفتار ہو کر دہلی آ گئے ہیں جنہوں نے تم سے ملاقات کی تھی۔‘‘

’’میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘ ہندوؤں کی گرفتاری نے مجھے نئی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

’’مگر اس طرح بات صاف نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ تم حالات کی سنگینی کو سمجھ نہیں رہے ہو۔‘‘

علاء الملک کا لہجہ نرم تھا مگر اسے ابھی تک میری بے گناہی کا یقین نہیں آیا تھا۔

’’پھر میرا معاملہ کس طرح صاف ہوگا؟‘‘ میں نے کوتوال علاء الملک سے پوچھا۔

ایک بار پھر مجھ پر خوف کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

’’جن ہندوؤں کو ملتان سے گرفتار کر کے دہلی لایا گیا ہے ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ راجہ رام دیو کے جاسوس ہیں۔ یہ ان ہی لوگوں کا بیان ہے کہ تم بھی اسی کام کے لئے رام دیو کے بیٹے سنگل دیو کی طرف سے دہلی بھیجے گئے ہو۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ چیتل دیو اور سیتل دیو بھی سنگل دیو کے آدمی ہیں اور اسی کے اشارے پر مخبری کرنے یہاں آئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ان دونوں نے حضرت شیخؒ سے وہ موتی حاصل کئے ہیں جو سلطان نے نذر کے طور پر بھیجے تھے۔ اب چیتل دیو اور سیتل دیو انہی موتیوں کو فروخت کر کے دہلی میں کپڑے کی تجارت کر رہے ہیں مگر دراصل وہ رام دیو کے جاسوس ہیں اور اسی سازش کے مجرم ہیں۔‘‘

علاء الملک کی باتیں سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے میرے چہرے سے میری حالت کا اندازہ کر لیا اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔ ’’تم میرے پیر بھائی ہو، پھر کیوں گھبراتے ہو؟ اور چونکہ تم پر حضرت شیخؒ کی خاص نظر ہے اس لئے میں تمہیں ہر حال میں بچا لوں گا۔ مگر ایک شرط ہے۔‘‘

’’کیسی شرط؟‘‘ میری آواز شدتِ خوف سے لرز رہی تھی۔

’’اگر تم میرے سامنے حقیقت بیان کر دو گے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچے گا۔‘‘

مرہٹہ ہونے کے باوجود مجھ پر ان واقعات کی ایسی ہیبت طاری ہوئی تھی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے علاء الملک سے کہا۔ ''میں نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا ہے اور تمام صورتِ حال پوری سچائی کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ میں حضرت خواجہ حسن علا سجزیؒ کے ہمراہ دیوگڑھ سے دہلی آیا تھا۔ آپ خواجہ صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ ان کے کہنے پر یہ طویل سفر اختیار کیا تھا۔ مجھے کسی نے کسی کام کے لئے دہلی نہیں بھیجا ہے۔''

میری بات سن کر کوتوال علاء الملک کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر کہنے لگا۔ ''اچھا! میرے ساتھ حضرت شیخؒ کے پاس چلو۔ پیر و مرشد جو کچھ فرمائیں گے، اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔''

جب علاء الملک مجھے اپنے ساتھ لے کر چلا تو حضرت خواجہ سیّد محمدؒ، حضرت خواجہ سیّد موسیٰؒ اور ان کے استاد مولانا احمد نیشاپوریؒ بھی ہمارے ہمراہ ہو گئے۔ علاء الملک نے ان تینوں حضرات کو دیکھ کر کہا۔

''اس وقت آپ لوگوں کا ساتھ رہنا ہردیو کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔''

یہ سن کر باقی افراد وہیں ٹھہر گئے مگر خواجہ اقبالؒ ساتھ رہے۔ اس وقت حضرت محبوب الٰہیؒ حجرے میں تشریف فرما تھے۔ خواجہ اقبالؒ نے اطلاع دی تو پیر و مرشد نے ہم دونوں کو اندر بلا لیا۔ اس وقت حضرت شیخؒ کے چہرے پر اس قدر جلال تھا کہ نہ علاء الملک کچھ عرض کر سکا اور نہ میری زبان کھل سکی۔

حضرت شیخؒ نے خود ہی فرمایا۔ ''علاء الملک! سلطان سے کہو کہ وہ ہمارے آدمیوں کو نہ ستائے۔ ہردیو پاک دل ہے اور پاک عمل ہے۔''

علاء الملک نے دست بستہ عرض کی۔ ''حضرت نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، میں سلطان کے گوش گزار کر دوں گا مگر وہ ہردیو کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''جاؤ! اسے لے جاؤ۔ وہ اسے دیکھ لے اور ہم اسے دیکھتے رہیں گے۔''

حضرت شیخؒ کے اس ارشاد میں اس قدر ناراضگی کا اثر تھا کہ ہم دونوں کانپنے لگے اور الٹے قدموں چلتے ہوئے باہر آ گئے۔

ہم باہر آئے تو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ علاء الملک اور اس کے مسلح ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ کوتوال کے حکم پر مجھے بھی گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ یہ مختصر سا سفر میرے لئے قیامت کا سفر بن گیا تھا۔ ہر لمحہ موت کا نقیب تھا اور ہر ساعت نا قابل بیان خوف میں

ڈوبی ہوئی تھی۔ اگر نظام الدین اولیاءؒ کی نوازشوں اور مہربانیوں کا احساس نہ ہوتا تو خوف کی شدت سے میرا دل نکل چکا ہوتا۔

جب ہم لوگ قصر ہزار ستون کے قریب پہنچے تو کوتوال علاء الملک گھوڑے سے اتر گیا۔ اس کی تقلید میں مجھے اور دوسرے لوگوں کو بھی نیچے آنا پڑا۔ پھر علاء الملک نے اپنے ایک ساتھی کی تلوار لے کر میرے گلے میں ڈال دی۔ میں یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد کوتوال نے میری پگڑی اتار کر میری گردن میں لپیٹ دی۔ میں علاء الملک کے اس طرزِ عمل کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ شاید کسی ملزم کو دربارِ سلطانی میں پیش کرنے کی یہی رسم تھی۔ الغرض اس حالت میں مجھے فرمانروائے ہند سلطان علاء الدین کے سامنے لے جایا گیا۔

میں نے بڑی مشکل سے نظریں اُٹھائیں اور والیٔ ہندوستان کی طرف دیکھا۔ سلطان علاء الدین ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کا محبوب غلام ملک کافور پیچھے کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ سلطان کے چہرے پر غیظ و غضب کی کیفیت طاری تھی۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اگر حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا خیال میرا ہم دم و دم ساز نہ ہوتا تو میرے کانپتے قدم ساتھ نہ دیتے اور میں وہیں فرش پر گر جاتا۔

اچانک میری سماعت میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ گونج اُٹھے۔ ''علاء الملک! اسے لے جاؤ۔ سلطان، ہردیو کو دیکھ لے گا اور ہم سلطان کو دیکھتے رہیں گے۔''

حضرت شیخؒ کے الفاظ کیا تھے، بس یوں محسوس ہوا جیسے میرے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی ہو۔

''سلطان عالی قدر! یہی ہردیو ہے۔'' علاء الملک نے کہا اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے ہونے والی تمام گفتگو والیٔ ہندوستان کے گوش گزار کر دی۔

میں نے دیکھا کہ اچانک سلطان علاء الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غیظ و غضب کی بجائے اس کی صورت سے نرمی جھلکنے لگی تھی۔

''ہردیو نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔'' کوتوال علاء الملک نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جن ہندوؤں نے ہردیو کی شکایت کی ہے وہ جھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور اصل میں وہی جاسوس ہیں۔ ہردیو نے ان سے بس اتنا کہا تھا کہ اقتدار کی جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ کیا ایک ہندو راجہ دوسرے ہندو راجہ کے علاقے پر حملہ نہیں کرتا؟

ان فتنہ پردازوں نے ہردیو کی حقیقت بیانی کو غلط رنگ دے کر ایک خوفناک سازش کی ہے۔"

جب علاء الملک تمام صورتِ حال بیان کر رہا تھا، اس وقت میں ہاتھ باندھے اور نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔

فرمانروائے ہندوستان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے ترکی زبان میں علاء الملک سے کہا۔ "اس کا چہرہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کا دل پاک بیان کیا گیا ہے۔ مجھے حضرت سلطان المشائخؒ کی بات کا پورا یقین ہے اس لئے میں نے ہردیو کو بے گناہ قرار دیا ہے۔ اسے خلعت کے ساتھ کوئی اچھی نوکری بھی دو۔"

موت مجھ سے دور جا چکی تھی اور اب میں زندگی کی نئی نعمتوں سے نوازا جا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اب کیوں روتا ہے؟" سلطان علاء الدین نے مجھ سے پوچھا۔

"حضرت شیخؒ کی کرم نوازی پر روتا ہوں کہ اس کے طفیل سلطان معظم نے میری بات سنی اور مجھے بےقصور قرار دیا۔"

"ہاں! یہ حضرت شیخؒ ہی کا صدقہ ہے۔" سلطان علاء الدین کے چہرے اور لہجے سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے بے پناہ عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اگر حضرت شیخؒ درمیان میں نہ ہوتے تو پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ تیرا کیا حشر ہوتا؟" یہ واقعہ بھی ہے کہ سلطان علاء الدین نے ہردیو کو محض اس لئے معاف کر دیا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ درمیان میں تھے........ورنہ علاء الدین کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتا تھا۔ چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔

مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد سلطان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تجھے دہلی میں رہنے کی پوری آزادی ہے مگر تُو ابھی دیوگڑھ نہیں جا سکتا۔"

"سرکار! میرے ماں باپ میری جدائی میں بہت پریشان ہوں گے۔"

سلطان نے درخواست کا براہِ راست جواب دینے کی بجائے کوتوال علاء الملک سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہردیو کے ماں باپ کو دکن سے دہلی بلا لو۔"

کچھ دیر بعد فرمانروائے ہندوستان کے خدمت گار ایک قیمتی خلعت لائے اور مجھے وہ لباس سلطان کے سامنے پہنایا گیا۔ پھر خدام نے ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی مجھے پیش کی۔

"یہ تمہارا انعام ہے۔"

سلطان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف اپنے مصاحبین خاص کے حلقے میں بے تکلفی کا اظہار کرتا تھا مگر میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ علاء الملک سے مخاطب ہوا۔ "وزیر خطیر الدین سے کہو کہ ہردیو کو کوئی مناسب ملازمت دی جائے تا کہ وہ آسودہ زندگی بسر کر سکے۔"

اور جب میں الٹے قدموں بارگاہِ سلطانی سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ملک کافور مسکرا رہا ہے۔ پھر اس نے جھک کر بادشاہ کے کان میں کچھ کہا جس کے جواب میں بادشاہ بھی مسکرا دیا۔

میں کوتوال علاء الملک کے ساتھ باہر آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ مجھے سلطان سے اپنے نائب کے بارے میں بات کرنا ہے۔ حضرت شیخؒ کی شان میں اس کی گستاخیاں مسلسل بڑھتی جا رہی ہیں۔" یہ کہہ کر علاء الملک واپس چلا گیا۔

پھر کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر سخت غصے کے آثار تھے۔ اس نے انتہائی تند و تیز لہجے میں اپنے آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرے نائب کو بھی انہی ہندو جاسوسوں کے ساتھ بند کر دیا جائے۔ حکمِ سلطانی ہے کہ وہ بھی ان جاسوسوں کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔"

اس کے بعد علاء الملک مجھے لے کر حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت سلطان المشائخ آرام فرما رہے تھے۔ علاء الملک نے خواجہ اقبالؒ کے ذریعے اطلاع کرائی۔ فوراً ہی ہم دونوں کو خلوت میں طلب کر لیا گیا۔ پھر جیسے ہی ہم دونوں دست بستہ ہو کر بیٹھے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے دہلی کے کوتوال کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"علاء الملک! تم اسی وقت سلطان کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اللہ تیری حفاظت کرے گا اور تجھے ہر شریر کی شرارت سے بچایا جائے گا ہندو جاسوسوں کو بھی معاف کر دے اور تمہارے نائب کو بھی۔ اگر قدرت چاہے گی تو ان سے خود انتقام لے لے گی۔ ان لوگوں کے لئے یہی کافی ہے کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔"

حضرت شیخؒ کا ارشاد سن کر مجھے اور علاء الملک کو شدید حیرت ہوئی۔ یہ باتیں سلطان علاء الدین اور کوتوال کے درمیان ہوئی تھیں۔ پھر حضرت شیخؒ کو اس رازدارانہ گفتگو کی خبر کس طرح ہو گئی تھی؟ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی قوتِ کشف کے کئی مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میری حیرت چند لمحوں میں دور ہو گئی۔ مگر علاء الملک کے چہرے پر کرب کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

"سیّدی! وہ آپ کی شان میں بہت گستاخیاں کرتا ہے۔" علاء الملک کے لہجے سے شدید اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ایسے بے ادب کی سزا صرف موت ہے۔ سلطان نے اس کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا ہے۔"

"سلطان کون ہوتا ہے اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا؟" علاء الملک کی بات سن کر نظام الدین اولیاءؒ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ "یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ آخر اس نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ اسے موت کی سزا دی جائے۔ وہ مجھے سو بار برا کہے گا اور میں اسے ہزار بار معاف کر دوں گا۔"

علاء الملک نے سر جھکا دیا۔ پھر اٹھا اور عرض کرنے لگا۔ "میں ابھی محل پہنچ کر حضور کا حکم سلطان کے گوش گزار کئے دیتا ہوں اور جو کچھ جواب ہوگا، شام تک خدمتِ عالیہ میں پیش کر دوں گا۔"

"ہم جواب نہیں چاہتے۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "ہم نے جو کچھ کہا ہے، انشاء اللہ ایسا ہوگا۔ جاؤ اور اس پر عمل کرو۔"

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ "ہم نے تمہیں دیوگڑھ جانے کی اجازت دے دی تھی مگر سلطان چاہتا ہے کہ تم دہلی میں مقیم رہو۔ یہ تمہارے لئے بھی بہتر ہے اور سلطان کے لئے بھی۔ ابھی تم سیّد محمدؒ کے مہمان رہو۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "مجھے سلطان نے یہ قیمتی خلعت بخشی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اشرفیاں بھی عنایت کی ہیں۔" میں نے سونے کے سکوں سے بھری ہوئی وہ تھیلی حضور کے قدموں میں ڈال دی۔ "اس عطیۂ سلطانی کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟"

"یہ تمہارا حق ہے اور تمہارے پاس ہی رہنا چاہئے۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔

"تم یہ اشرفیاں اپنے ماں باپ کو بھیج دو تاکہ وہ دیوگڑھ سے دہلی آ جائیں۔"

اس کے بعد علاء الملک اور میں خانقاہ سے باہر آئے۔ کوتوالِ شہر، دربارِ سلطان کی طرف چلا گیا اور میں حضرت خواجہ سیّد محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں عجیب سوگواری فضا میں طاری تھی۔ ہر شخص اُداس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خواجہ سیّد محمدؒ اس طرح آگے بڑھے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز تختۂ دار سے اُتر آیا ہو۔ خواجہ سیّد محمدؒ کے چہرے سے ناقابلِ بیان خوشی جھلک رہی تھی۔ بڑے والہانہ انداز میں مجھ سے گلے ملے اور صحیح و سلامت واپس آنے پر مبارک باد دی۔ پھر حضرت خواجہ سیّد موسیٰؒ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ ان مردانِ پاکباز کے جسموں سے خلوص اور وفا کی ایسی خوشبو آ رہی

تھی کہ میری روح تک معطر ہو گئی۔ وہاں موجود باقی افراد بھی اسی انداز سے ملے۔ میں نے خواجہ سیّد محمدؒ، خواجہ سیّد موسیٰؒ اور مولانا احمد نیشاپوری کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اس مشکل گھڑی میں جس طرح آپ پریشان و مضطرب تھے، یہی حالت میرے ماں باپ کی بھی ہوئی حالانکہ آپ لوگوں سے میرا خونی رشتہ نہیں تھا۔"

"ہمارے اور تمہارے درمیان بھی ایک ایسا ہی مضبوط رشتہ ہے جسے اہلِ دنیا توڑ نہیں سکتے۔" حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے فرمایا۔

"یہ بڑی سنگین ساعت تھی۔" میں نے عرض کیا۔ "جس طرح آپ حضرات نے میری خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈال دی تھیں، اس طرح تو شاید ماں باپ میرا ساتھ نہیں دیتے۔" یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "موت کو سامنے دیکھ کر بڑے بڑے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔"

"رفاقت و محبت کا جذبہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔" حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے فرمایا۔ "توفیق الٰہی کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔"

میں نے حضرت خواجہ سیّد موسیٰؒ کی طرف دیکھا جو میری واپسی پر نہایت خوش نظر آ رہے تھے۔ "سیّد! آپ نے نائب کوتوال کی تلوار چھین لی۔ اگر خدانخواستہ وہ آپ پر وار کر دیتا تو کیا ہوتا؟ میں تو اس خیال ہی سے لرز اُٹھتا ہوں، اگر وہ ظالم شخص اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو آپ اس وقت کہاں ہوتے؟"

میرے سوال کے جواب میں حضرت سیّد موسیٰؒ مسکرانے لگے۔ "اگر نائب کوتوال کا وار مجھ پر چل جاتا تو میں شہید کربلاؑ کے پاس ہوتا......اور کہاں ہوتا؟"

میں نے ایک بار پھر اپنے کرم فرماؤں کی بے مثال محبت کا شکریہ ادا کیا۔

حضرت خواجہ سیّد محمدؒ اور مولانا احمد نیشاپوریؒ نے بیک زبان فرمایا۔ "تم ہمارے بھائی اور مہمان ہو۔ اس لئے شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میزبان پر مہمان کی تواضع لازم ہوتی ہے، تو ہم نے حسبِ مقدور یہ رسم ادا کی۔ بے شک! تم پر ایک بڑی آفت نازل ہوئی تھی مگر حضرت شیخؒ کی دعاؤں کے صدقے میں وہ بلا ٹل گئی۔ اب تم ان تکلیف دہ واقعات کو ذہن سے فراموش کر دو اور کھانا کھاؤ کہ تمہارے انتظار میں سب لوگ بھوکے بیٹھے ہیں۔"

"آپ حضرات نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں اپنے میزبانوں سے دریافت کیا۔

"تمہاری جان پر بنی ہوئی تھی اور ہم لوگ کھانا کھا لیتے؟ یہ کیسے ممکن تھا؟" حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے فرمایا۔

خلوص و محبت کے اس مظاہرے نے مجھے بہت دیر تک رُلایا۔ پھر جب ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

"ہردیو! اب تم اپنے وطن واپس نہیں جاؤ گے۔"

"حضرت شیخؒ کا بھی یہی حکم ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "میں حضور کے حکم کی تعمیل میں یہاں رہوں گا مگر ان حالات نے میرا دل اچاٹ کر دیا ہے۔ اب وہ پہلی جیسی اُمنگ باقی نہیں ہے۔"

"ہردیو! تم خوفزدہ ہو گئے ہو؟" حضرت خواجہ سیّد محمدؒ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "انشاء اللہ ایک دن تمہاری یہ کیفیت زائل ہو جائے گی اور تم دہلی میں خوش و خرم رہو گے۔"

ایک سال کے بعد میرے والدین دیوگڑھ سے دہلی آ کر نہ صرف مسلمان ہو گئے بلکہ حضور نے انہیں بھی بیعت کا شرف بخش دیا۔ حضرت شیخؒ نے مجھے خانقاہ کے قریب ایک مکان عطا کر دیا تھا جس میں میرے ماں باپ رہا کرتے تھے۔ سلطان علاء الدین نے مجھے ملازمت دینے کا جو خیال ظاہر کیا تھا وہ سیاسی ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد میں نے سنا کہ ملک کافور نے میرے وطن پر حملہ کر دیا۔ پھر خبر آئی کہ میرے راجہ رام دیو کا انتقال ہو گیا۔ پھر اس کے بیٹے سنگل دیو اور ملک کافور کے درمیان ایک خونریز لڑائی ہوئی۔ سنگل دیو کو شکست ہوئی اور ملک کافور پورے علاقے پر قابض ہو گیا۔

یہ ہے شاہی خاندان کے ایک ہندو کی سرگزشت جسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بے حد عقیدت تھی۔

سلطان علاء الدین کی موت اور قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کے بعد ہندو زادہ خسرو خان برسرِ اقتدار آ گیا تھا اور اسی کے خوف سے مہندر ہردیو اپنے ماں باپ کو لے کر دوبارہ دیوگڑھ چلا گیا تھا۔

اسی زمانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی نگاہِ کیمیا تاثیر نے کیسے کیسے لوگوں کی دنیا بدل ڈالی۔ مولانا شہاب الدین روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا برہان الدین غریبؒ

اور دوسرے مریدانِ خاص بھی آپؒ کے ہمراہ تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ "حوضِ شمسی" پر تشریف لائے تاکہ ان بزرگوں کے مزارات پر بھی فاتحہ پڑھ سکیں جو حوض کے کنارے مدفون ہیں۔

اتفاق سے اسی روز مشہور شاعر خواجہ حسن علائیؒ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس پُرفضا مقام کی سیر کرنے کے لئے آئے ہوئے تھا۔ بڑا عجیب تضاد تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور آپؒ کے ساتھی، بزرگانِ دین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے......... اور دوسری طرف چند گز کے فاصلے پر خواجہ حسن علائیؒ اور ان کے احباب شغلِ جام کر رہے تھے۔ خواجہ حسنؒ ایک خالص دنیا پرست انسان تھے۔ پوری زندگی لہو و لعب میں گزاری تھی۔ کیف و نشاط میں ڈوبی ہوئی شاعری کرتے تھے اور علی الاعلان سرِعام شراب پیتے تھے۔ خواجہ حسنؒ کو اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ جہاں بیٹھ کر وہ اور ان کے دوست بادہ و ساغر سے دل بہلاتے تھے، اس مقام سے کچھ فاصلے پر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے بزرگ محوِ خواب تھے۔ دراصل "حوضِ شمسی" پوری دہلی میں سب سے زیادہ پُرفضا جگہ تھی۔ یہاں دہلی کے اکثر باشندے سیر و تفریح کے لئے آیا کرتے تھے......... مگر خواجہ حسن علائیؒ کا انداز سب سے جداگانہ تھا۔ پہلے مجلس شعر و فن آراستہ ہوتی، پھر لذیذ کھانوں کے ساتھ شراب کا دور چلتا......... اور جب خواجہ حسن علائیؒ اور ان کے ساتھی بدمست ہو جاتے تو جھومتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے یا پھر رات بھر وہیں پڑے رہتے۔ شراب و شعر کی یہ ہنگامہ آرائیاں برسوں سے جاری تھیں۔

اس روز جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ فاتحہ خوانی کے بعد واپس تشریف لائے تو اس دوران خواجہ حسن علائیؒ کی محفل "شعر و شراب" سجائی جا چکی تھی۔ خواجہ حسنؒ بادۂ ناب کے گھونٹ لے رہے تھے اور جھوم جھوم کر شعر پڑھ رہے تھے۔ کئی بار ایسی صورتِ حال پیش آئی تھی مگر حضرت محبوب الٰہیؒ ہر مرتبہ ان بادہ نوشوں کو دیکھے بغیر تیزی سے گزر جاتے تھے۔ اس دن واپسی پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ خلافِ معمول کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے اور خواجہ حسن علائیؒ کو غور سے دیکھنے لگے۔

اس وقت خواجہ حسنؒ کی پشت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف تھی مگر دوستوں نے دیکھ لیا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہیں۔ "حسن! خاموش ہو جا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ تیرے پیچھے کھڑے ہیں۔"

خواجہ حسن علائیؒ لہرا لہرا کر شعر پڑھ رہے تھے۔ دوستوں کے متوجہ کرنے پر مڑے اور خمار آلود آنکھوں سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ وہی خواجہ حسن علائیؒ تھے جن سے بدایوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ آج تقریباً پچاس سال بعد آمنا سامنا ہوا تو عجیب صورتِ حال تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہیؒ ہو چکے تھے.......اور خواجہ حسن علائیؒ کی بے راہ روی کا یہ عالم تھا کہ ان کے دل سے صوفیائے کرام کا احترام تک رخصت ہو چکا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے بچپن کے ساتھی کو فسق و فجور میں مبتلا دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ مگر آپؒ نے سکوت اختیار کیا اور زبان مبارک سے کچھ نہیں فرمایا۔

کیف و بے خودی کے باوجود خواجہ حسنؒ بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پہچان گئے تھے۔ نظریں چار ہوتے ہی خواجہ حسنؒ نے پوچھا۔ ''مولانا! کیسے ہو؟'' خواجہ حسنؒ کے لہجے سے تضحیک کا رنگ نمایاں تھا۔

بچپن کے ساتھی کی اس طنز آمیز گفتگو پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تبسم فرمایا۔

''میں تو بفضل خدا ٹھیک ہوں.......مگر تمہارا کیا حال ہے حسن؟''

''میرا کیا حال پوچھتے ہو مولانا؟'' خواجہ حسنؒ کے استہزائیہ انداز میں کچھ اور شدت آ گئی تھی۔ ''میں تم سے بہتر حال میں ہوں۔'' یہ کہہ کر خواجہ حسن علائیؒ نے ازراہِ تمسخر بلند آواز میں یہ دو شعر پڑھے۔ (ترجمہ)

''کئی سال ہم ایک دوسرے کی محبت میں رہے۔ مشہور ہے کہ صحبت اپنا اثر رکھتی ہے مگر وہ اثر کہاں ہے؟''

''تیری پرہیزگاری میرے دل میں پیدا ہونے والے جذبۂ گناہ کو کم نہ کر سکی۔ اس لئے میری معصیت تیرے زہد و تقویٰ سے بہتر ہے۔''

یہ شعر سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ قریب آئے اور نہایت پُرجلال لہجے میں خواجہ حسن علائیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حسن! میری طرف دیکھو۔ صحبت میں بہت اثر ہے۔ تمہارے اندازے سے کہیں زیادہ۔''

جیسے ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، خواجہ حسن علائیؒ نے ایک زوردار چیخ ماری اور اپنی دستار اتار کر زمین پر پھینک دی۔ پھر دیوانہ وار آگے بڑھے۔

''بے شک! ایک مردِ خدا کی صحبت میں بہت اثر ہوتا ہے۔'' خواجہ حسن علائیؒ گریہ و زاری کرتے ہوئے حضرت محبوب الٰہیؒ کی روحانی قوت کا اعتراف کر رہے تھے۔ ''آج

اس مردِ باصفا نے میری دنیا بدل ڈالی۔ اے دنیا کی رنگینیو! اے میرے گناہو! عمر بھر کے ساتھیو! آج میں تم سے اس طرح رخصت ہوتا ہوں کہ پھر کبھی تمہاری طرف لوٹ کر نہیں آؤں گا۔''

اس کے بعد خواجہ حسن علائیؒ نے اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے حضرت محبوب الٰہیؒ سے درخواست کی کہ انہیں غلامی کے اعزاز سے شرف یاب کیا جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت خواجہ حسنؒ پر انتہائی شفقت فرمائی اور انہیں حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔ اس روحانی انقلاب کے وقت خواجہ حسن علائیؒ کی عمر 73 سال تھی۔

کہنے والے کہا کرتے تھے۔ ''حسن! اس بڑھاپے میں توبہ سے کیا حاصل ہوگا؟''

''میں اپنی عمر کا حساب نہیں رکھتا، بس شیخؒ کے دروازے پر آ پڑا ہوں۔'' خواجہ حسن علائیؒ روتے ہوئے فرماتے۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ خواجہ حسنؒ کی دنیا ہی بدل گئی۔ جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے حسنؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو برسوں کا سفر لمحوں میں طے کرا دیا۔ خواجہ حسن علائی سنجریؒ کا شمار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب مریدوں میں ہوتا ہے۔ یہ وہی خواجہ حسنؒ ہیں جنہوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات جمع کئے اور پیر و مرشد کے اقوال مبارکہ کو ''فوائد الفواد'' کا نام دیا۔

''فوائد الفواد'' تصوف کے موضوع پر عظیم الشان تصنیف ہے جو ہر زمانے میں اہلِ دل کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔ اسی کتاب کے بارے میں حضرت امیر خسروؒ فرمایا کرتے تھے۔

''کاش! میں اپنی تمام تصانیف خواجہ حسنؒ کے نام کر دیتا.......اور اس کے بدلے میں ''فوائد الفواد'' کی محبوبیت مجھ سے منسوب ہو جاتی۔

خواجہ حسن علائیؒ کو جوانی کی کج روی کا اس قدر احساس تھا کہ آخری سانس تک اپنا یہ شعر پڑھ کر روتے رہتے تھے۔

''اے حسن! تُو نے اس وقت توبہ کی جب تجھ میں گناہ کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔''

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدوں سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ ان کی اس قدر خبر گیری کرتے کہ شاید وہ خود بھی اپنے بارے میں اتنے متفکر اور پریشان نہیں رہتے ہوں گے۔ خواجہ منہاجؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نہایت خوش اعتقاد مریدوں میں سے تھے۔ ایک بار انہوں نے محفلِ سماع منعقد کی اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے شرکت کی

درخواست کرتے ہوئے عرض کیا۔

"سیّدی! اگر آپ چند لمحوں کے لئے بھی تشریف لے آئیں گے تو اس غلام کی عزت افزائی ہو جائے گی۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے عذر پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ "خواجہ! تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ ایک نہایت ضروری معروضیت کے سبب ہم خود تو شریک مجلس نہیں ہو سکیں گے لیکن اہلِ دل لطف خاص حاصل کریں گے۔"

پیر و مرشد کے شریک نہ ہونے کے باعث خواجہ منہاجؒ کے دل میں ایک خلش سی تھی مگر حضرت شیخؒ نے محفل سماع کی کامیابی کے لئے دعا فرمائی تھی، اس لئے مطمئن ہو کر چلے گئے۔ پھر انہوں نے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے پوتوں اور مریدوں کو مجلس سماع میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ حضرات غیاث پور میں مقیم تھے۔

خلافِ معمول سرِ شام ہی لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ خواجہ منہاجؒ پورے اطمینان کے ساتھ مجلس کے انتظام میں مصروف تھے۔ حسبِ دستور عشاء کے قریب کھانے کی دیگیں چڑھا دی گئیں۔ خواجہ منہاجؒ کا خیال تھا کہ نماز کے بعد کھانا تیار ہو جائے گا۔ اسی دوران مہمان بھی آ جائیں گے اور پھر طعام سے فارغ ہوتے ہی سماع کا آغاز کر دیا جائے گا۔ الغرض عشاء کی نماز ادا کی گئی۔ اس وقت تک مقامی حاضرین کی ایک بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی اور قوال بھی مقررہ وقت سے پہلے مجلس میں پہنچ چکے تھے۔

خواجہ منہاجؒ نے مجلس کا جائزہ لیا تو حضرت بابا فریدؒ کے پوتے، مرید اور دوسرے اکابر صوفیاء ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ کھانا تیار ہونے میں دیر تھی مگر مجلس میں موجود دوسرے حاضرین اصرار کرنے لگے کہ سماع کا آغاز کیا جائے۔ خواجہ منہاجؒ نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ابھی مہمانانِ گرامی تشریف نہیں لائے ہیں، اس لئے بزرگوں کی غیر موجودگی میں سماع شروع کرنا مناسب نہیں۔ مجلس بے کیف ہو کر رہ جائے گی۔"

حاضرین کی اکثریت نے خواجہ منہاجؒ کے اس عذر کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ زیادہ تر لوگ اپنے گھروں کو جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ خواجہ منہاجؒ سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ اہلِ مجلس نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ اگر سماع بلا تاخیر شروع نہیں کیا گیا تو وہ لوگ چلے جائیں گے۔ حاضرین کا یہ مطالبہ نہایت نامناسب تھا مگر خواجہ منہاجؒ آدابِ مجلس سے مجبور ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے رسمِ خانقاہ کے خلاف بازار سے کھانا منگوا کر مہمانوں کو کھلایا اور صوفیائے کرام کی شرکت کے بغیر ہی سماع شروع کر دیا۔

خواجہ منہاجؒ کا بیان ہے۔ "قوال بھی وہی تھے اور کلامِ معرفت بھی وہی تھا لیکن مجلس بہت بے رونق نظر آ رہی تھی۔ اور حاضرین کو سماع میں کسی کیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔" محفل کی یہ بے رنگی دیکھ کر صاحبِ مجلس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ خواجہ منہاجؒ اسی تکلیف وہ حالت میں بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر جب اچانک ان کی نظر اُٹھی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ "حوض خانے" کے دروازے پر خاموش کھڑے تھے۔ خواجہ منہاجؒ پیر و مرشد کا استقبال کرنے کے لئے اپنی نشست سے اٹھے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے وہیں بیٹھ کر سماع سننے کا حکم دیا۔ خواجہ منہاجؒ دوبارہ بیٹھ گئے۔ ایک نظر پیر و مرشد کی طرف دیکھا تو ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر خواجہ منہاجؒ کو ہوش آیا تو محفل کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ شہر سے آنے والے تمام صوفیاء بھی شریکِ مجلس ہو چکے تھے اور سماع کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص وارفتہ نظر آ رہا تھا۔

خواجہ منہاجؒ نے گھبرا کر محفل پر نظر ڈالی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ وہاں موجود نہیں تھے۔ خواجہ منہاجؒ نے حوض خانے کے دروازے کی طرف دیکھا، حضرت محبوب الٰہیؒ وہاں بھی موجود نہیں تھے۔ خواجہ منہاجؒ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ آخر سماع ختم ہوا۔ حاضرین خواجہ منہاجؒ کو مبارک باد دے کر رخصت ہونے لگے۔

"خواجہ صاحب! آج تو آپ کی محفل میں لطف آ گیا۔ آپ کے یہاں ہونے والی کسی محفل میں ہم پر ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔"

بعض افراد نے یہاں تک کہا۔ "خواجہ صاحب! آپ کی یہ محفل بہت سی محفلوں پر بھاری تھی۔"

خواجہ منہاجؒ بے حد مسرور تھے۔ پھر جب عام شرکاء چلے گئے تو خواجہ صاحبؒ نے حضرت بابا فریدؒ کے پوتوں اور دوسرے صوفیاء سے کہا۔ "یہ سب پیر و مرشد کی آمد کا اثر تھا کہ محفل میں عجیب رنگ پیدا ہو گیا۔"

"حضرت شیخؒ کب تشریف لائے تھے؟" صوفیاء نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ حضرات سے پیر و مرشد کی ملاقات نہیں ہوئی؟" خواجہ منہاجؒ نے بڑے تعجب سے کہا۔

"شاید حضرت شیخؒ ہمارے آنے سے پہلے واپس تشریف لے جا چکے ہوں گے۔" درویشوں نے جواب دیا۔

خواجہ منہاجؒ نے اس سلسلے میں پھر کوئی سوال نہیں کیا اور معزز مہمانوں کو بڑے ادب

واحترام سے رخصت کرتے رہے۔ پھر جب دہلی کے صوفیائے کرام تشریف لے گئے تو خواجہ منہاجؒ شدید حیرت کے عالم میں سوچنے لگے۔

''جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا، وہ دوسرے لوگوں کو نظر کیوں نہیں آیا؟...... یہ میرا حسنِ تصور تھا یا واقعتاً حضرت شیخؒ میری محفل میں تشریف لائے تھے؟''

یہ سوچتے سوچتے پوری رات گزر گئی۔

پھر نماز فجر ادا کرتے ہی خواجہ منہاجؒ خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے بھر ان کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھر رہا تھا۔ ''کل رات میں نے کوئی خواب دیکھا تھا یا وہ زندہ حقیقت تھی؟''

آخر فاصلے ختم ہوئے اور خواجہ منہاجؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''سیّدی! کل رات آپ کی دعاؤں سے اس بے سروساماں کی شرم رہ گئی۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے نہایت شفقت ومحبت سے اپنے مرید کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خواجہ! یہ سوچ کر اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ وہ خواب تھا یا حقیقت۔ یہ دیکھو کہ تمہاری محفل کا رنگ کیسا رہا۔''

''محفل کا رنگ تو ایسا تھا کہ پیاسوں کی روحیں تک سیراب ہو گئیں۔'' خواجہ منہاجؒ شدتِ جذبات میں رونے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔ ''خواجہ! جس جگہ میرے مرید ومعتقد جمع ہوں۔ اہل مجلس کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں یہ فقیر بھی موجود ہے۔''

یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا روحانی تصرف تھا جس کا ادراک خواجہ منہاجؒ کو بہت دیر بعد ہوا۔ بقول علامہ اقبالؒ

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

''سیر الاولیاء'' سیّد امیر خوردؒ کی روایت کے مطابق ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ مولانا رشید الدین فخری سے ملاقات کر کے اپنی خانقاہ کی طرف واپس آ رہے تھے۔ مولانا فخریؒ کے مکان کے قریب ہی ایک طویل گلی تھی۔ جب حضرت محبوب الٰہیؒ گلی کے درمیان میں پہنچے تو سامنے سے ایک مجذوب آتا ہوا دکھائی دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس مدہوش شخص کو دیکھ کر سوچا کہ کہیں وہ بے خودی کی حالت میں آپؒ سے ٹکرا نہ جائے، اس لئے گلی کے دوسرے کنارے پر چلنے لگے۔ مجذوب نے ایک نظر حضرت

محبوب الٰہیؒ کی طرف دیکھا اور پھر اس نے بھی اپنا راستہ بدل دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ مجذوب سے بچنے کے لئے جلد از جلد اس مقام سے گزر جانا چاہتے تھے مگر مجذوب نے آپؒ کا راستہ روک لیا اور قریب پہنچ کر بلند آواز میں سلام کیا۔ ہرچند حضرت محبوب الٰہیؒ اس مجہول الحال شخص کو نظر انداز کر دینا چاہتے تھے مگر جب اس نے سلام کیا تو آپؒ کو بھی سلام کا جواب دینا پڑا۔ پھر مجذوب نے معانقے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بھی اسلامی رسم کی ادائیگی میں کسی تامل سے کام نہیں لیا۔ معانقے کے بعد وہ مجذوب حضرت محبوب الٰہیؒ سے بغل گیر ہو گیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ مجذوب کی اسی قربت سے بچنا چاہتے تھے مگر اس نے آپؒ کو اتنی مہلت نہیں دی۔ پھر جیسے ہی وہ شخص گلے ملا، حضرت محبوب الٰہیؒ کو محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں آگ بھری ہوئی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فوراً ہی اپنے پیر ومرشد حضرت بابا فریدؒ کا تصور کیا اور اس آگ کو برداشت کرتے رہے۔

مجذوب کچھ دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا اور حضرت محبوب الٰہیؒ دل ہی دل میں دعا کرتے رہے کہ وہ شخص جلد سے جلد آپؒ کا پیچھا چھوڑ دے۔ واضح رہے کہ تصوف میں دو راستے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک وہ راستہ جس پر چلنے کے بعد انسان ''سالک'' بن جاتا ہے۔ سالک ہمیشہ اپنے ہوش وحواس میں رہتا ہے اور شریعت کے تمام اصولوں پر سختی کے ساتھ عمل کرتا ہے...... اور دوسرا راستہ وہ ہے جس پر چلنے والے جاں سوختہ کہلاتے ہیں اور اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں اور انہی لوگوں کو عرفِ عام میں مجذوب کہا جاتا ہے۔ مجذوبوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پہلے تو کسی کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ اور اگر اتفاق سے کسی پر نظر پڑ جائے تو اسے بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اسی بات سے خائف تھے مگر یہ حضرت بابا فریدؒ کا فیضانِ نظر تھا کہ وہ مجذوب آپؒ پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

پھر یکایک وہ مجذوب جھکا اور اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سینۂ مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ ابھی مسلمانوں میں ایسا سینہ موجود ہے۔'' یہ کہہ کر مجذوب حضرت محبوب الٰہی سے الگ ہوا اور تیز رفتاری کے ساتھ چلا گیا۔

اسی انداز کا ایک اور واقعہ بھی مشہور ہے جسے معتبر تاریخوں نے اپنے اوراق میں محفوظ رکھا ہے۔ اس واقعے کے راوی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت سیّد نصیر الدین محمود چراغ دہلی ہیں۔ ایک مجلس خاص میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''ایک روز میں دروازہ پل کے قریب تھا اور مجھ پر انتہائی مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ ''نظام! تم کہاں اور محبت الٰہی کہاں؟''

پھر میں اسی عالم میں حضرت شیخ رساںؒ کے روضۂ مبارک میں داخل ہوا اور چلّہ کشی شروع کردی۔ بالآخر جب چلّہ ختم ہوا تو میں نے حضرت شیخ رساںؒ کے مزار کے احاطے میں اس درخت کو دیکھا جو کچھ دن پہلے خشک ہو گیا تھا........ مگر اب بہت زیادہ سرسبز و شاداب نظر آ رہا تھا۔ مجھے درخت کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر شدید حیرت ہوئی تھی۔ میں نے حضرت شیخؒ کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا۔

''شیخ! اس عرصے میں تو یہ سوکھا ہوا پیڑ بھی ہرا ہو گیا مگر میں ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ چالیس دن گزرنے کے بعد بھی میرے دل کی حالت نہیں بدلی۔'' یہ کہہ کر میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اچانک راستے میں میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ مجھے فوراً خیال گزرا کہ یہ آدمی نشے کی حالت میں ہے، اس سے بچ کر چلنا چاہئے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنا راستہ بدل دیا مگر یہ بڑی حیرت ناک بات تھی کہ جو شخص بظاہر کیف و مستی میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا، اس نے بھی وہی راہ اختیار کی۔ میں اس سے بچنے کے لئے دوسری طرف چلا گیا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میرے ساتھ ہی اس شخص نے بھی اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا۔ پھر وہ میرے قریب آیا، سلام کیا اور اپنے دونوں ہاتھ معانقے کے لئے بڑھا دیئے۔ میں نے آدابِ اسلامی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس شخص کے سلام کا جواب دیا اور مصافحہ کیا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ عطر کی تیز خوشبو نے فضا کو معطر کر دیا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ مسحور کن خوشبو اس اجنبی شخص کے منہ اور جسم سے آ رہی تھی۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ وہ شخص ظاہر میں کیا نظر آ رہا تھا اور اس کی اندرونی کیفیت کیا ہے؟ ابھی میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''صوفی! تجھے میرے جسم سے اُبھرنے والی خوشبو پر تعجب ہو رہا ہے مگر تُو اپنے دل کی طرف نہیں دیکھتا کہ تیرے سینے سے حق تعالیٰ کے عشق کی خوشبو آ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ شخص غائب ہو گیا۔

بعض روایتوں میں درج ہے کہ وہ اجنبی شخص ''رجال الغیب'' میں سے تھا اور بحکم خدا اس لئے آیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تالیفِ قلب کر سکے۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

قافلۂ روز و شب اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہا جو ازل میں اس کے لئے مقرر کر دی گئی تھی۔ اہلِ ہوس خوش تھے کہ خسرو خان نے ان کے لئے اس قدر سامانِ نشاط پیدا کر دیا تھا کہ ہوش و خرد کی تمام طاقتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ شراب کی بدمستیوں اور رقص و سرود کی ہنگامہ آرائیوں نے امراء کی بڑی تعداد کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز سن سکیں۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی میراث خاک میں مل رہی تھی اور بڑے بڑے جانباز سپہ سالار، ہندوزادے خسرو خان کے سامنے زمین پر سر رکھ کر رسمِ تعظیم ادا کر رہے تھے۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر بعض اہل دل کہا کرتے تھے۔

''اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔ اگر اس نے اپنے بندوں کی دستگیری نہیں کی تو شاید ہندوستان سے اسلامی اقتدار ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گا۔''

اس کے برعکس اہلِ ہنود جوشِ مسرت میں دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ برہمن اپنے ماننے والوں کو نوید سنا رہے تھے۔ ''بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ ''بت شکنوں'' کی اولادوں کے لئے اس زمین پر کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ ''رام راج'' کو آنا ہے اور وہ آ کر رہے گا۔''

برہمنوں کی یہ پیش گوئی کسی مفروضے یا قیاس آرائی کی بنیاد پر نہیں تھی۔ بت پرستوں کی اسی جماعت نے پہلے ملک کافور اور پھر خسرو خان کو منصب اقتدار تک پہنچایا تھا۔ ملک کافور نے خلجی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم کیا اور پھر خسرو خان منافقت کا لبادہ پہن کر ''سلطان ناصر الدین'' بن گیا۔ اس نے بڑی تیزی اور بے رحمی کے ساتھ ان طاقتور امیروں اور سپہ سالاروں کو موت کی نیند سلا دیا جو دوبارہ اسلامی اقتدار کی بنیادیں استوار کر سکتے تھے۔ بس ایک دیپال پور کا حاکم غازی ملک باقی رہ گیا تھا جو خسرو خان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ آخر خسرو خان اور غازی ملک کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی اور خسرو خان گرفتار ہوا۔ پھر اسے اور اس کے چھوٹے بھائی ''جاہریہ'' کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مسلمان امراء بھی ہلاک کر دیئے گئے جنہوں نے خلجی خاندان سے نمک حرامی کی تھی۔

سلطنت ہند کے دو بدکردار حکمران تھے جو اپنے سامنے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا جھکا ہوا سر دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر جب ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تو انہوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے سر کی قیمت لگائی........ مگر اللہ جسے سربلند کرے اسے کون سرنگوں کر سکتا ہے؟ خسرو خان نے قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کیا........ پھر پانچ ماہ بعد ایک مرد جانباز غازی ملک نے خسرو خان کو تہہ تیغ کر ڈالا......

اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا نہ صرف سر باقی رہا بلکہ اس کی بلندیاں اوجِ ثریا سے بھی گزر گئیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اس دن اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔'' (ترجمہ)

❁ ...... ✪ ✪ ...... ❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ سیاست کی ہنگامہ خیزیوں، دشمنوں کی دشمنی اور حاسدوں کے حسد سے بے نیاز رشد و ہدایت کے کاموں میں مصروف رہے۔ ایک دن ایک شخص آپؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوا اور پھر اس نے سوال کیا۔

''شیخ! ایک شخص اپنے گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے اور دوسرا مسجد میں۔ آپ کے نزدیک ان دونوں میں کس کا طریقہ مستحسن ہے؟''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''اپنے گھر میں ایک پارہ پڑھنا، مسجد کے اندر ختم قرآن سے زیادہ بہتر اور باعثِ ثواب ہے۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''ایک شخص دمشق کا رہنے والا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح وہ ''شیخ الاسلام'' کے منصب پر فائز ہو جائے۔ اس نے کئی سال تک دوڑ دھوپ کی، تعلقات استعمال کیے مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اس نے ایک نیا منصوبہ تراشا اور دمشق کی جامع مسجد میں معتکف ہو گیا اور دن رات اوراد و وظائف میں مشغول رہنے لگا۔ پھر یہ بات مشہور ہو گئی کہ وہ ایک شب بیدار شخص ہے جو ہمہ وقت عبادت اور ذکر الٰہی میں غرق رہتا ہے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت محبوب الٰہیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''پہلے انسان کو حصولِ عزت و جاہ اور نام و نمود کی آگ کو سرد کرنا چاہئے۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ''دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے نیک اعمال کو دنیا والوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور یہ بہت مشکل کام ہے۔ مگر درحقیقت اسی کو نفس کشی کہتے ہیں۔ اور نفس کشی بہرحال رنگ لاتی ہے۔'' اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''اور میں ایک ایسے بقال کے بارے میں جانتا ہوں جس نے مسلسل 23 سال تک روزے رکھے مگر کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ اہلِ خانہ بھی اس کے اس عمل سے بے خبر رہے۔ وہ

شخص جب گھر پر موجود ہوتا تو گھر والوں پر یہ ظاہر کرتا کہ وہ دکان سے کھانا کھا کر آیا ہے....... اور جب دکان پر ہوتا تو اپنے گاہکوں اور دوسرے لوگوں کو یہ تاثر دیتا کہ اس نے گھر پر کھانا کھا لیا ہے۔''

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''سب سے پہلے انسان کی نیت کا خالص ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مخلوق کی نگاہ انسانی عمل پر ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ نیت کو دیکھتے ہیں۔ جب نیت اچھی ہو گی تو تھوڑے عمل کا ثواب بھی زیادہ ہو جائے گا۔''

اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آمدنی کے اعتبار سے دمشق میں اوقاف کا محکمہ بہت زیادہ وسیع ہے۔ اسی وجہ سے جامع مسجد دمشق کا متولی نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ گویا وہ دوسرا بادشاہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بادشاہ کو رقم کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ متولی جامع مسجد سے قرض لیتا ہے۔ اسی مالی استحکام کے سبب بہت سے لوگ متولی ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ الغرض ایک شخص کے دل میں تولیت حاصل کرنے کی طمع جاگی۔ پھر وہ شخص جامع مسجد دمشق میں فرد کش ہو گیا۔ نمازی جب بھی مسجد میں داخل ہوتے، اس شخص کو ذکرِ الٰہی میں مشغول پاتے۔ وہ رات رات بھر جاگتا یہاں تک کہ پورے دمشق میں اس کی ریاضت اور مجاہدات کے تذکرے ہونے لگے۔ عام لوگ مسجد میں آتے اور اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ بظاہر اس کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا مگر ابھی تک خلیفۂ وقت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ آخر اسی کشمکش میں کئی سال گزر گئے۔ اس کی شہرت گھر گھر پہنچ گئی تھی لیکن حکومت کے کسی ذمہ دار شخص نے جامع مسجد کی تولیت کے بارے میں اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

ایک رات وہ اسی سوچ میں غرق تھا کہ اچانک اسے ایک آواز سنائی دی۔ ''تُو شہرت چاہتا تھا، سو مل گئی....... مگر تیرا مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ آخر تُو کب تک ریاکاری کی عبادت کرے گا؟''

اس شخص نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ نصف شب کے سناٹے میں مسجد خالی تھی اور دور دور تک کسی متنفس کا وجود نہیں تھا۔ آخر اسے ادراک ہو گیا کہ یہ اشارۂ غیبی ہے اور اس کے اندر کی آواز ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر وہ اپنے رب کے حضور گریہ و زاری کرنے لگا۔

''اے دلوں کا حال جاننے والے! یہ تُو خوب جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور تیرے

گھر میں بیٹھ کر کیا کر رہا ہوں؟ میرا جینا مرنا اور میری عبادت تیرے لئے نہیں ہے بلکہ میں تو تیرے نام پر سوداگری کر رہا ہوں۔ مجھے معاف فرما دے۔ آئندہ میں صرف تیرے ہی لئے عبادت کروں گا۔''

توبہ کے بعد وہ شخص خالص نیت کے ساتھ اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابھی مشکل سے تین چار ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ محکمۂ اوقاف کے تمام نمائندے اس کے پاس آئے اور درخواست کرنے لگے۔

''اگر آپ جامع مسجد دمشق کی تولیت قبول فرما لیں تو یہ ہم لوگوں کے لئے اعزاز ہوگا۔''

وہ شخص اوقاف کے نمائندوں کی بات سن کر مسکرا دیا۔

''آپ نے ہماری درخواست کا جواب نہیں دیا؟'' اس شخص کی خاموشی اور مسکراہٹ پر اوقاف کے نمائندے حیران تھے۔

''کیا جواب دوں؟'' وہ شخص بدستور مسکرا رہا تھا۔ ''تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں نے گزشتہ تین سال میں کیسی کیسی ریاضتیں کی ہیں اور کیسی کیسی مشقتیں برداشت کی ہیں؟''

''کچھ مناظر تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔'' اوقاف کے نمائندوں نے کہا۔

''ویسے دمشق کے لوگوں کی زبانوں پر بھی آپ کی کثرتِ عبادت اور پرہیزگاری کے قصے عام ہیں۔''

''مگر تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میرا تمام زہد و تقویٰ ایک خاص مقصد کے لئے تھا۔'' اس شخص نے انتہائی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی عبادت کے ذریعے لوگوں کو متاثر کرکے جامع مسجد کی تولیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔''

''اللہ نے آپ کی وہ خواہش تو پوری کر دی۔'' اوقاف کے نمائندوں نے کہا۔

''آپ حضرات نے میرے پاس آنے میں بہت دیر کر دی۔'' اس شخص کا لہجہ بے نیازانہ تھا۔ ''جب میں متولی ہونے کا آرزومند تھا، اس وقت کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی اور جب میں اس عہدے سے بیزار ہوں تو آپ لوگ میری خوشامد کر رہے ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔''

اوقاف کے نمائندے اس شخص کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے اس لئے مسجد کی تولیت قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے۔

''یہ منصب کسی ضرورت مند کو دے دو۔ مجھے اللہ نے اپنی محبت بخش دی ہے اور یہ میرے لئے کافی ہے۔'' یہ کہہ کر اس شخص نے منہ پھیر لیا اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔

پھر وہ آخری سانس تک اسی روش پر قائم رہا۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ ''لوگ اطاعتِ خداوندی کی لذت سے واقف نہیں۔ اگر کوئی ایک بار اس مزے کو چکھ لے تو سیم و زر کے انبار اور تاج و تخت کو ٹھکرا دے۔''

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

قطب الدین مبارک شاہ اور خسرو خان جیسے بدکردار حکمرانوں کا زمانہ گزر چکا تھا اور اب زمامِ اقتدار غازی ملک کے ہاتھوں میں تھی۔ غازی ملک نے سلطان غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا اور تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز ہوا۔

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ کی روایت کے مطابق سلطان غیاث الدین تغلق ایک خدا ترس اور پرہیزگار حکمران تھا۔ سنجیدگی، انکسار اور بردباری اس کے کردار کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ ذہین بھی تھا اور مدبر بھی۔ مذہبی قوانین کی پابندی کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا اور امورِ سلطنت میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ دیوانِ عام میں بیٹھ کر رعایا کے حالات سنتا اور ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا۔ اکثر مؤرخین کی رائے میں سلطان غیاث الدین تغلق دوسرے بادشاہوں کی طرح مسند نشینی کا قائل نہیں تھا۔ وہ برسرِ مجلس کہا کرتا تھا۔

''میں شہنشاہ نہیں، رعایا کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔''

مختصراً یہ کہ اگر غیاث الدین تغلق جیسا مردِ جانباز سیاسی اُفق پر نمودار نہ ہوتا تو اللہ ہی جانتا ہے کہ خسرو خان جیسا منافق بساطِ اقتدار پر کیا گل کھلاتا؟ اور سرزمینِ ہند پر مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا؟

تمام ہنگاموں پر قابو پانے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق شاہی خزانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ خسرو خان نے اپنے پانچ ماہ کے اقتدار میں بے دریغ دولت لٹائی تھی اور بڑی بڑی جاگیریں ہندوؤں کے نام کر دی تھیں۔ تغلق نے وہ ساری دولت اور جاگیریں نمک حرام اُمراء سے چھین لیں۔ فرمانروائے ہند اس کام سے فارغ ہوا تو سلطانی کارندوں نے ایک اور فہرست پیش کی۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے بڑی حیرت سے اس فہرست کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''غالباً یہ تو دہلی کے درویشوں کے نام ہیں۔''

''خسرو خان نے ان حضرات کو بھی کثیر رقمیں دی تھیں۔ آپ اس فہرست کو ملاحظہ کر

لیجئے۔'' سلطانی کارندے نے عرض کیا۔ ''یہ دستاویز خسرو خان نے خود تیار کی تھی۔ ہر درویش کے نام کے آگے دی جانے والی رقم بھی درج ہے۔''

سلطان غیاث الدین تغلق بہت دیر تک اس دستاویز کو دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''خسرو خان نے کس بے دردی سے شاہی خزانے کو لٹایا ہے۔ بے شک! یہ درویش حضرات ہماری توجہ اور امداد کے مستحق ہیں مگر اس قدر بھی نہیں کہ ایک ایک درویش کو پانچ پانچ لاکھ تنکے دے دیئے جائیں۔ تم اسی وقت فرمانِ شاہی جاری کرو کہ یہ تمام حضرات دربارِ سلطانی میں حاضر ہو کر اس رقم کا حساب پیش کریں۔''

حکم سلطانی کے مطابق دہلی کے تین بزرگ حضرت سیّد علاء الدین چنوریؒ، حضرت بابا فریدؒ کے خلیفہ شیخ وحید الدینؒ اور حضرت رکن الدین ابوالفتح ملتانیؒ کے خلیفہ شیخ عثمان سیاحؒ، غیاث الدین تغلق کے دربار میں پہنچے اور خسرو خان کی دی ہوئی رقم واپس کر دی۔ ان تینوں بزرگوں کے نام کے آگے پانچ پانچ لاکھ تنکے درج تھے۔

پھر جب یہ تینوں بزرگ دربارِ سلطانی سے واپس تشریف لے گئے تو غیاث الدین تغلق نے اپنے کارندے سے پوچھا۔ ''شیخ نظام الدین اولیاءؒ نہیں آئے؟''

''حضرت شیخؒ ایک مردِ آزاد ہیں اور وہ دربارِ شاہی میں آنا پسند نہیں کرتے۔'' سلطانی کارندے کے لہجے سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے خاص عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

اپنے کارندے کا یہ جواب سن کر سلطان غیاث الدین تغلق کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا رنگ اُبھر آیا۔ ''جب شیخ نظام الدین اولیاءؒ دربارِ سلطانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تو کیا وہ کسی اور ملک میں رہتے ہیں؟''

''میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟'' سلطانی کارندے نے عرض کیا۔ ''مرحوم و مغفور سلطان علاء الدین اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے بھی بہت کوششیں کیں مگر حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ ایک بار بھی دربار میں تشریف نہیں لائے۔ یہاں تک کہ آپؒ نے دونوں فرمانرواؤں سے ملاقات بھی نہیں کی۔''

''کیا شیخ نظام الدینؒ اس قدر آزاد ہیں کہ اپنے حاکموں کو بھی لائق التفات نہیں سمجھتے؟'' سلطان غیاث الدین کی ناگواری کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

سلطانی کارندے نے والئ ہندوستان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

''مگر انہیں شاہی رقم کا حساب تو دینا ہے۔'' مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ ''خسرو خان نے شیخ نظام الدینؒ کے نام

کے آگے بھی پانچ لاکھ تنکوں کا اندراج کیا ہے۔''

''سلطان معظم جو حکم فرمائیں۔'' سلطانی کارندے نے نظر اٹھا کر اپنے فرمانروا کی طرف دیکھا۔

''تم اسی وقت جاؤ اور شیخ نظام الدینؒ سے پانچ لاکھ تنکے لے کر شاہی خزانے میں جمع کرا دو۔''

سلطانی کارندہ اسی وقت دربارِ سلطانی سے نکل کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؒ اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خادم خاص خواجہ اقبالؒ نے سرکاری کارندے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس وقت پیر و مرشد ذکر الٰہی میں مشغول ہیں۔ جب فارغ ہو جائیں گے تو تمہیں شرفِ باریابی حاصل ہو سکے گا۔''

سلطانی کارندہ خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ آخر بہت دیر بعد اسے حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت ملی۔ وہ لرزتے قدموں کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حجرۂ خاص میں داخل ہوا اور سلام و نیاز کے بعد اس نے پورا واقعہ حضرت شیخؒ کے گوش گزار کر دیا۔

''میں کس چیز کا حساب پیش کروں؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''وہ ساری رقم بیت المال کا حصہ تھی جو حق داروں کو پہنچ گئی۔ میں نے اس میں سے ایک تنکہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ اگر میں ایسا کرتا تو یقیناً سلطان کو اس رقم کا حساب پیش کر دیتا۔''

سلطان غیاث الدین تغلق کا کارندہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دست بوسی سے سرفراز ہوا اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ پھر اس نے فرمانروائے ہندوستان کی خدمت میں پہنچ کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا جواب بڑی حیرت سے سنا۔ پھر اپنے کارندے سے مخاطب ہوا۔ ''کہیں یہ بات تُو نے اپنی طرف سے تو نہیں کہہ دی؟''

''میں حکمِ سلطانی کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' کارندے نے نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

''میں نے تو یہی محسوس کیا کہ یہ تیری خوش عقیدگی بول رہی ہے۔'' سلطان غیاث

الدین تغلق کے لہجے سے جلالِ شاہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''تُو پہلے ہی شیخ نظام الدینؒ کی شان میں بہت قصیدے پڑھ چکا ہے۔ کہیں یہ تیری ذہنی اختراع تو نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک درویش کھڑے کھڑے پانچ لاکھ تنکے دوسروں پر لٹا دے؟ آخر باقی درویشوں نے وہ رقم کس لئے محفوظ رکھی اور مطالبے کے وقت کیوں لوٹا دی؟''

''سلطان عالی قدر!'' کارندے نے نصف قد تک جھکتے ہوئے عرض کیا۔ ''میں دوسرے درویشوں کے بارے میں تو نہیں جانتا کہ ان کا مزاج کیا ہے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذاتِ گرامی سے ضرور واقف ہوں کہ آپؒ کی سخاوت کا یہی انداز ہے۔''

سلطان غیاث الدین تغلق خاموش ہو گیا اور پھر اس نے اپنے معتمد لوگوں کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بارے میں تحقیقات کرائی۔ پھر بڑی مشکل سے اسے اس بات پر یقین آیا کہ ہندوستان میں ایک درویش ایسا بھی ہے جو روحانی فتوحات کے باوجود مسلسل روزے رکھتا ہے اور نمک کے پانی اور جو کی روٹی سے افطار کرتا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اندازِ قلندری پر تو اعتبار آ گیا تھا مگر اسے حضرت محبوب الٰہیؒ کی شانِ بے نیازی پسند نہیں آئی تھی۔ فرمانروائے ہند کا خیال تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دربار میں حاضر نہ ہو کر سلطانِ وقت کی توہین کی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب حضرت محبوب الٰہی کی طرف سے غیاث الدین تغلق کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تغلق نے حضرت محبوب الٰہی کی طرف سے دل میں بغض رکھا اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی ایک اور لرزہ خیز واقعہ پیش آیا جسے تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ رکھا ہے۔ اس واقعے کا راوی مشہور مؤرخ یحیٰی احمد بن سرہندی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خدمت گاروں میں عبید نامی ایک شاعر بھی تھا۔ عبید عیاری کی حد تک ذہین انسان تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ خانقاہ کے خدمت گاروں اور دوسرے عقیدت مندوں پر ذومعنی فقرے چست کیا کرتا تھا۔ بعض لوگ جو زیادہ پڑھے لکھے اور ہوش مند تھے، وہ عبید کے طنز و استہزاء کو سمجھ لیتے تھے مگر اس خیال سے کوئی جواب نہیں دیتے تھے کہ ان کے نزدیک حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں آنے والا ہر شخص محترم تھا۔ مگر خادموں اور عقیدت مندوں کی اکثریت اتنی ہوشیار نہیں تھی کہ وہ ایک عیار شخص کی گفتگو کو سمجھ سکتی۔ بعض ذمہ دار افراد نے بڑے رازدارانہ انداز میں عبید کو سمجھانے کی بھی کوشش کی مگر اس نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔ وہ طبعاً ایک کینہ

پرور، سازشی اور حاسد انسان تھا۔

عبید کی اس بے راہ روی کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسروؒ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ اور اس شاعرِ شیریں سخن کو بارگاہِ شیخؒ میں ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ عبید چونکہ خود بھی شاعر تھا، اس لئے اُسے کسی دوسرے شاعر کی برتری تسلیم نہیں تھی۔ وہ اکثر مجلسوں میں کہا کرتا تھا۔

''خسرو میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ حضرت شیخؒ کو ان کے سوا کوئی دوسرا سخن ور نظر ہی نہیں آتا۔ خسروؒ مجھ سے چھوٹے شاعر ہیں۔ پھر شیخؒ میرا کلام کیوں نہیں سنتے؟'' عبید اسی طرح گھنٹوں اپنی تعریفیں کرتا رہتا مگر حاضرین مجلس اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔

اگر ہم کچھ دیر کے لئے حضرت امیر خسروؒ کے عارفانہ مقام کو زیر بحث نہ لائیں، تب بھی خسروؒ اتنے بڑے شاعر تھے کہ عبید ان کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں تھا۔ مرزا غالب جیسا بد دماغ شاعر بھی حضرت امیر خسروؒ کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

اس بحث سے قطع نظر، امیر خسروؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب ترین مرید تھے۔ اسی لئے عبید کی خباثت نفسی پیر و مرشد کے اس التفات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجتاً وہ حضرت امیر خسروؒ سے اس حد تک جلنے لگا کہ یہ بات حضرت محبوب الٰہیؒ کی نظروں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ شروع میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا خیال تھا کہ عبید کا یہ جذبۂ حسد عارضی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپؒ کی تربیت اور خانقاہ کا ماحول اس کے دل کی کدورتیں دھو ڈالے گا...... مگر عبید نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس اعلیٰ ظرفی اور چشم پوشی کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ روز بروز اس کی عادتیں پختہ ہوتی گئیں اور وہ ہر کام میں حضرت امیر خسروؒ کی مخالفت کرنے لگا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ عبید کی اس ذہنی اور قلبی حالت پر بہت افسوس فرماتے تھے۔ آپؒ نے کئی بار وعظ اور نصیحت کے ذریعے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بغض و حسد انسان کے کردار کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں...... مگر وہ ہمیشہ سنی ان سنی کر جاتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ طریق کار نہیں تھا کہ آپؒ بھری مجلس میں اسے براہِ راست مخاطب کرتے۔ اس طرح وہ دوسروں کی نظر سے گر جاتا اور حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے اعلیٰ ظرف انسان کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں تھی۔

اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس فتنہ پرور شاعر کو اپنی بارگاہِ معرفت سے اُٹھا دیتے اور اس پر خانقاہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتے۔ مگر صوفیائے کرام کا یہ مزاج نہیں ہوتا کہ وہ انسانی لغزشوں پر برہم ہو کر ترکِ تعلق کر لیں اور خطا کاروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ صوفیاءؒ کی زندگی کا تو پہلا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ گناہ گاروں کے درمیان رہ کر ان کی اصلاح کریں۔ اپنے اسی منصب خاص کے پیشِ نظر حضرت محبوب الٰہیؒ اس مفسد شاعر کو بھی برداشت کرتے رہے۔

تمام نصیحتیں رائیگاں گئیں۔ عبید کو نہ بدلنا تھا اور نہ وہ بدلا۔ حضرت امیر خسروؒ سے اختلاف اس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ پھر وہ منزل بھی آئی جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے باصفا انسان کا دل بھی عبید کی طرف سے مکدر رہنے لگا۔ اس موقع پر حضرت محبوب الٰہیؒ کے بعض مریدوں نے عبید کو سمجھانا چاہا کہ پیر و مرشد اس سے خفا رہنے لگے ہیں اور وہ حضرت شیخؒ کی دل آزاری سے باز آ جائے۔ اگر اس موقع پر گناہ گار سے گناہ گار انسان بھی ہوتا تو لرز کر رہ جاتا مگر عبید کا دل تو حسد کی آگ میں جل کر اس قدر سیاہ ہو چکا تھا کہ وہاں روشنی کی کوئی کرن باقی نہیں رہی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب عبید، حضرت امیر خسروؒ کو شاعری کے میدان میں شکست نہ دے سکا تو اس نے دنیا کے عظیم شاعر کو ہدفِ تنقید بنانے کے لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں آنا جانا شروع کیا۔ پھر حضرت محبوب الٰہیؒ کے خدمت گزاروں میں شامل ہو کر اپنے اس غیر انسانی مقصد کی تکمیل کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ ان لوگوں کی رائے کے مطابق اگر عبید کے سینے میں حسد و نفاق نہ ہوتا تو پھر وہ اس شخص کی تحقیر کیوں کرتا جسے اس کے مخدومؒ محبوب رکھتے تھے۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی سہی لیکن یہ درست ہے کہ وہ بے کردار شاعر اپنے نفس کی اصلاح کے لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ فساد انگیزی اور فتنہ پروری اس کی زندگی کے عزیز ترین مشغلے تھے اور وہ اپنے ان ہی سفلی جذبات کی تسکین کے لئے حضرت محبوب الٰہیؒ کے نام نہاد خدمت گاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روشن ضمیری پر روزِ اوّل ہی سے عبید کی بدخواہ فطرت آشکار تھی مگر آپؒ کی کریم النفسی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک بھٹکے ہوئے انسان کو سنبھلنے کا موقع فراہم نہ کرتے۔ اب یہ عبید کی بدنصیبی تھی کہ جس انسان کی قربت کے ایک لمحے کو بڑے بڑے شاہانِ وقت ترستے تھے، وہ اس مردِ عامل سے عظیم تر مفادات حاصل کرنے کی بجائے انتہائی خسارے کا سودا کرنے لگا۔ پھر اسی کجی نے عبید کے دامن حیات کو دونوں جہان کی لعنتوں سے بھر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس کی طرف سے مسلسل آزردہ خاطر رہنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن عبید نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قسمت پر کبھی نہ مٹنے والی سیاہی پھیر دی۔ واقعہ یوں ہوا کہ اسی دوران ایک ہندو نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ بڑی توجہ سے اس نومسلم کی تربیت فرما رہے تھے۔ ایک دن حضرت شیخؒ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے دو مسواکیں عطا کیں۔ نومسلم نے مسواکیں لے کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے اس نومسلم کی نشست عبید شاعر کے قریب تھی۔ پھر جب حضرت محبوب الٰہیؒ مجلس عام سے اٹھ کر اپنے حجرۂ خاص میں تشریف لے گئے تو نو مسلم نے عبید سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں حضرت شیخؒ سے دو مسواکیں عطا کرنے کا سبب دریافت کر سکتا۔ کیا ایک مسواک کافی نہیں تھی؟''

احترام و ادب کے اس نازک ترین مقام پر بھی عبید اپنی شرارت سے باز نہ آیا۔ اس نے نومسلم کو دو مسواکوں کے استعمال کا طریقہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''ایک مسواک دانتوں کی صفائی کے لئے ہے اور دوسری ناپاکی کو دور کرنے کے لئے۔''

وہ سادہ لوح شخص عبید کا جواب سن کر مطمئن ہو گیا اور دونوں مسواکوں کو اس فتنہ انگیز شاعر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق استعمال کرنے لگا۔ کچھ دن بعد اس نومسلم نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

''یا شیخ! ایک مسواک جس سے میں دانت صاف کرتا ہوں، اس کی ظاہری حالت بہت بہتر ہے مگر دوسری جس سے ناپاکی دور کرتا ہوں اس کی حالت نہایت بری ہے اور میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ فرمائیے کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟''

اس قدر بے ہودہ بات سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپؒ نے خلافِ عادت تلخ لہجے میں اُس نومسلم سے دریافت فرمایا۔ ''تجھ سے ایسا کرنے کے لئے کس نے کہا ہے؟''

''عبید شاعر نے۔'' نومسلم نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔

اس وقت وہ فتنہ پرداز شاعر بھی مجلس میں موجود تھا اور اپنی اس شرارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

نومسلم کا جواب سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ برافروختہ ہو گئے اور آپؒ نے اس مفسد شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''عبید! تُو لکڑی سے کھیل رہا ہے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان مبارک سے یہ سخت الفاظ سن کر تمام حاضرین مجلس لرز گئے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ عنقریب اس گستاخ و بے ادب شاعر کو تختہ دار پر کھینچ دیا جائے گا۔ مگر خود عبید کا یہ حال تھا کہ اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تنبیہہ کا احساس تک نہیں کیا۔ اسے اپنے اس شرم ناک فعل پر کوئی ندامت محسوس ہوئی اور نہ وہ اپنے مخدوم کی دل آزاری پر معافی کا خواستگار ہوا۔ بس انتہائی بے حسی کے ساتھ بیٹھا مسکراتا رہا اور پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد سلطان غیاث الدین تغلق نے تلنگانہ کی تسخیر کے لئے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد تغلق کو ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ شہزادہ محمد تغلق پورے جاہ و جلال کے ساتھ آگے بڑھا۔ راستے میں چندیری، بدایوں، اودھ اور کڑہ کے لشکر بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ پھر ان تمام فوجوں نے ارنگل کا محاصرہ کر لیا جو سات سو سال سے رائے کرن مہادیو اور اس کے آباؤ اجداد کا پایۂ تخت چلا آ رہا تھا۔ محمد تغلق کے جاں باز سپاہیوں کا ہجوم دیکھ کر رائے کرن مہادیو نے قلعے کے دروازے بند کر لئے اور اپنے لشکر کے ساتھ محصور ہو گیا۔ محمد تغلق نے اپنے جاں نثاروں کو حکم دیا کہ وہ قلعے کی فصیلوں کو توڑ دیں اور اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک انہیں مکمل فتح حاصل نہ ہو جائے۔ نتیجتاً گھمسان کا رن پڑا اور دونوں طرف خون کے دریا بہنے لگے۔ شہزادہ محمد تغلق کے سپاہی بھی سربکف ہو کر لڑ رہے تھے اور رائے کرن مہادیو کی فوجیں بھی اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا رہی تھیں۔

ابھی اس معرکے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ اتفاقاً دہلی اور ارنگل کے درمیان سفارتی رابطہ منقطع ہو گیا۔ شہزادہ محمد تغلق بڑی بے چینی سے اپنے باپ کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا مگر راستے ویران پڑے تھے اور کسی قاصد کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ یہ ایک فکر انگیز صورتِ حال تھی جس سے عبید شاعر نے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کی اور یہ افواہ اُڑا دی کہ دہلی میں سلطان غیاث الدین تغلق کا انتقال ہو گیا ہے۔ ملک تکین اور دوسرے سرداروں نے اس افواہ کو بڑی حیرت سے سنا۔

"تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ سلطان اب اس دنیا میں نہیں رہے؟" ملک تکین نے عبید سے پوچھا۔

"اگر زندہ ہوتے تو اس خوفناک جنگی مہم کے دوران ہرگز خاموش نہ رہتے۔" عبید نے اپنی فطری ذہانت سے کام لیتے ہوئے منطقی دلیل پیش کی۔ "دہلی کا سکوت ظاہر کر رہا ہے کہ فرشتۂ اجل نے سلطان کی سانسیں غصب کر لی ہیں ورنہ اس عرصے میں کوئی نہ کوئی

شاہی حکم ضرور جاری ہوتا۔"

ملک تکین اور دوسرے امراء جو خود بھی سازشی ذہنیت رکھتے تھے، عبید کی دلیل سے مطمئن نظر آنے لگے۔

سلطان کے وفادار امراء کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے بعد عبید نے اپنی خباثت نفسی کا کھل کر مظاہرہ کیا۔ "قدرت ایسے مواقع بار بار فراہم نہیں کرتی۔ طالع آزمائی کے لئے اس سے بہتر ساعت پھر کبھی نہیں آئے گی۔ سلطان اپنے انجام کو پہنچ چکا۔ اب شہزادہ محمد تغلق تنہا ہے۔ اسے بھی آسانی سے قتل کیا جا سکتا ہے۔ عام رعایا کو گمان بھی نہ ہو گا کہ شہزادہ محمد تغلق غیر فطری موت کا شکار ہوا ہے۔ اگر کسی قسم کی شورش پیدا ہوئی بھی تو اسے یہ کہہ کر دبایا جا سکتا ہے کہ شہزادہ محاذِ جنگ پر موجود تھا۔ کسی دشمن سپاہی کا تیر اس کے حلق میں پیوست ہو گیا اور ولی عہد سلطنت نے اہل ہنود سے جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر لیا۔"

شاعر عبید نے بڑا فتنہ انگیز منصوبہ پیش کیا تھا۔ ہوسِ اقتدار نے ملک تکین اور دوسرے سرداروں کو اندھا کر دیا۔ پھر وہ لوگ اپنے آقا زادے کو قتل کرنے پر دل سے آمادہ ہو گئے۔ اب یہ اس باغی گروہ کی بدنصیبی تھی کہ انہی کے درمیان خاندانِ تغلق کا ایک حقیقی نمک خوار بھی موجود تھا۔ اس نے بڑی احتیاط اور رازداری کے ساتھ شہزادہ محمد تغلق کے سامنے اس سازش کو بے نقاب کر دیا۔ شہزادہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر، اپنے پچاس جاں نثاروں کے ساتھ اس علاقے سے نکل گیا اور بڑی تیز رفتاری سے منزلیں طے کرتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔ پھر جب اس نے سلطان غیاث الدین تغلق کے روبرو سارا ماجرا بیان کیا تو والئ ہندوستان اس قدر مشتعل ہو گیا کہ اس نے تمام غدار امراء کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ ملک تکین اور دوسرے سرداروں کو اس وقت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جب وہ جنگلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔

باغی سرداروں کے قتل کے بعد بھی سلطان غیاث الدین کا غصہ کم نہیں ہوا۔ اس نے دوسرا حکم جاری کیا کہ ملک تکین کے تمام افرادِ خاندان کو گرفتار کر کے اس کے حضور پیش کیا جائے۔ شاہی حکم کی تعمیل کے لئے ملک حسام الدین اودھ پہنچا اور ملک تکین کے تمام قریبی رشتہ داروں کو پابہ زنجیر کر کے سلطان غیاث الدین تغلق کے سامنے پیش کیا۔ اس سے پہلے ملک تکین کا داماد ملک تاج الدین فرار ہو گیا تھا مگر سلطان کے سپاہیوں نے تعاقب کر کے اسے سرجوندی کے کنارے قتل کر دیا تھا۔

وہ منظر بڑا لرزہ خیز تھا جب ملک تکین کے افرادِ خاندان کو دیکھ کر سلطان غیاث الدین

تغلق غصے سے بے قابو ہو گیا اور اس نے انتہائی ظالمانہ حکم جاری کر دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انسانی ہجوم کے سامنے ملک تکین کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مردوں کے ساتھ تمام عورتوں اور بچوں کو بھی مست ہاتھیوں نے روند ڈالا۔

اس کے بعد اس خبیث فطرت شاعر کو پیش کیا گیا جو اس سازش کا بانی تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے بڑی نفرت کے ساتھ عبید کی طرف دیکھا اور حکم دیا کہ اسے تختۂ دار پر کھینچ دو۔

عبید کو سلطان کے سامنے پھانسی دی گئی۔ جب اس کی جان نکل گئی تو غیاث الدین تغلق نے دوسرا حکم دیتے ہوئے کہا کہ اس کی لاش کو دوسروں کی عبرت کے لئے اُلٹا لٹکا دو اور جب یہ غلیظ جسم بدبو دینے لگے تو اسے اتار کر کسی گڑھے میں دبا دو۔

عبید کی لاش کئی دن تک تختۂ دار پر لٹکی رہی اور اہلِ شہر کی سماعتوں میں ایک طویل عرصے تک حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہ الفاظ گونجتے رہے۔

''عبید! تُو لکڑی سے کھیل رہا ہے۔''

یہ چند تاریخی واقعات محض اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ مادہ پرستوں کو خدائے ذوالجلال کی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہو جائے۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

دوسرے بادشاہوں کی طرح سلطان غیاث الدین تغلق کی بھی یہ خواہش تھی کہ دوسرے درویشوں اور صوفیوں کی طرح حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی دربارِ سلطانی میں تشریف لائیں۔ مگر جب اسے اندازہ ہو گیا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کسی بھی حال میں سلاطین اور امراء کی صحبت کو پسند نہیں کرتے تو پندارِ شاہی کو شدید ٹھیس پہنچی۔ اگرچہ تاریخ نویسوں نے تغلق کو ایک پرہیزگار بادشاہ قرار دیا ہے لیکن وہ اپنے سینے سے جذبۂ خود پرستی کو دور نہیں کر سکا تھا، اس لئے اس دن کا انتظار کرنے لگا جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس کے سامنے آنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ آخر دنیا پرست علماء نے سلطان غیاث الدین تغلق کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ ایک دن علماء کی ایک جماعت سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف شکایات کا دفتر کھول دیا۔

''ایک شخص جو اپنے آپ کو درویش کہتا ہے اور جس کا نام نظام الدین محمد بدایونیؒ ہے، اسے سماع سننے کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں۔'' علماء کا لہجہ نہایت گستاخانہ تھا۔ ''اگر اس نام نہاد درویش کی گرفت نہ کی گئی تو مسلمانانِ ہند میں یہ بدعت رائج ہو جائے گی اور پورا اسلامی معاشرہ گمراہی کے راستے پر چل پڑے گا۔''

سلطان غیاث الدین تغلق اسی دن کے انتظار میں تھا۔ اس نے علماء سے کہا کہ پہلے محضر تیار کرائیں۔ پھر وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا احتساب کرے گا۔ علماء بھی آتشِ حسد میں جل رہے تھے۔ نتیجتاً چند ہی روز میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف محضر تیار ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق اس محضر پر سینکڑوں علماء کے دستخط تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے فوراً ہی حکم جاری کر دیا۔

''شیخ! نظام الدین محمد بدایونیؒ پر لازم ہے کہ وہ دربار میں حاضر ہو کر سماع کا شرعی جواز پیش کریں ورنہ اپنے اس معمول کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے جواباً تحریر کیا۔ ''سلطان پر بھی لازم ہے کہ وہ ان تمام علماء کو جمع کر لیں جو سماع کی مخالفت کرتے ہیں۔ انشاء اللہ میں تن تنہا آؤں گا اور فرمانروائے ہند پر ثابت کر دوں گا کہ سماع مجھ جیسے شخص کے لئے جائز ہے۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ خانقاہ سے نکل کر دربارِ سلطانی کی طرف روانہ ہوئے۔ دوسرے مریدوں میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ پیر و مرشد کے ہمراہ چلنے کی اجازت طلب کرتے۔ مگر مولانا فخر الدین زرادیؒ اور قاضی محی الدین کاشانیؒ ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک نظر اپنے دونوں خلفاء کو دیکھا۔ مولانا زرادیؒ اور قاضی کاشانیؒ نے سوچا کہ حضرت شیخؒ انہیں اپنے ساتھ جانے سے منع فرما دیں گے لیکن حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایسا نہیں کیا۔ پیر و مرشد کی رضامندی پا کر دونوں بزرگوں کے چہروں پر ناقابلِ بیان خوشی کا عکس اُبھر آیا۔

اس تاریخی مناظرے کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے ہم مولانا فخر الدین زرادیؒ کا مختصر تعارف پیش کریں گے۔ پھر قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ غلامی میں کم فہم لوگ نہیں، یگانۂ روزگار عالم اور مجتہدینِ عصر شامل تھے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے ایک مرید مولانا کمال الدین سامانیؒ تحریر کرتے ہیں۔

''میں اور حضرت فخر الدین زرادیؒ ایک ہی مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب مولانا فخر الدین علم و فضل میں درجۂ اجتہاد تک پہنچ گئے مگر انہیں صوفیوں اور درویشوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ تمام لوگوں کے سامنے برملا کہا کرتے تھے۔

''خرقہ پہن کر ایک گوشے میں بیٹھ جانے والے یہ درویش جاہل اور مفت خور ہوتے ہیں۔ اپنے جھوٹ کو کرامت سے منسوب کرتے ہیں تاکہ انہیں اچھی غذائیں کھانے کو ملتی رہیں۔''

مولانا کمال الدین سامانیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے، اس لئے انہیں

مولانا فخر الدین زرادیؒ کی یہ باتیں بہت گراں گزرتی تھیں۔ مولانا کمال الدینؒ نے فخر الدین زرادیؒ کو کئی بار سمجھایا بھی کہ وہ درویشوں کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیں مگر فخر الدین زرادیؒ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور صوفیوں کے اس گروہ کو اپنی سخت ترین تنقید کا ہدف بناتے رہے۔ یہاں تک کہ مولانا کمال الدین سامانیؒ نے ان سے اس موضوع پر گفتگو ترک کر دی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

مولانا فخر الدین زرادیؒ کچھ دن خاموش رہے اور پھر اچانک ان کے رویے میں مزید سختی آ گئی۔ مولانا کی نظر میں تمام درویش اس قابل نہیں تھے کہ کوئی مسلمان ان کی صورت دیکھنے کا بھی روادار ہو سکے۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ نے درویشوں کو اسلامی معاشرے ہی سے خارج قرار دے دیا تھا۔ اب مولانا کمال الدین سامانیؒ کے لئے اپنے عالم و فاضل دوست کا نظریہ نا قابل برداشت ہو گیا تھا۔ ایک دن مولانا سامانیؒ نے فخر الدین زرادیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مولانا! آپ کے علم و فضل نے تو دنیا کے ہر درویش کو معتوب ٹھہرا دیا ہے مگر اس میں کیا حرج ہے کہ آپ کسی دن ہمارے شیخ سے ملاقات کر لیں۔''

یہ سن کر مولانا فخر الدین زرادیؒ برہم ہو گئے اور اپنے بچپن کے دوست کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا۔ ''کمال الدین! تم اپنے شیخ کا کیا ذکر کرتے ہو؟ میری نظر میں تو وہ بھی ملاقات کے قابل نہیں ہیں۔''

اگرچہ مولانا زرادیؒ کے الفاظ بہت سخت تھے لیکن مولانا سامانیؒ نے اپنی جانب سے کسی تلخی یا اشتعال کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ مسلسل کئی روز تک اصرار کرتے رہے کہ صرف ایک بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ملاقات کر لیں۔ اس طرح شاید درویشوں کے بارے میں ان کی رائے بدل جائے۔

مولانا زرادیؒ نے اپنے دوست کے پیہم اصرار کو بھی جھٹلا دیا۔ ''کمال الدین! آخر تم بھی ناکارہ انسانوں کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو، اس لئے زور و شور سے وکالت کر رہے ہو۔ مگر مجھ پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ میں نے پوری تحقیق اور مکمل مشاہدے کے بعد درویشوں کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔''

مولانا کمال الدین سامانیؒ نے بڑے تحمل سے اپنے دوست کے غیظ و غضب کا سامنا کیا اور ایک ہی بات کہتے رہے۔ ''ایک بار وہاں جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ ملاقات برائے ملاقات ہی سہی۔ آپ وہاں چل کر تو دیکھیں۔''

بالآخر مولانا زرادیؒ نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیا۔ ''میں صرف تمہاری دلجوئی کی خاطر وہاں جانے کے لئے تیار ہوں ورنہ اس کام میں میری نیت اور ارادے کو کوئی دخل نہیں۔'' یہ گویا مولانا کمال الدین سامانیؒ کی ذات پر احسانِ عظیم تھا۔

''میری خاطر ہی سہی۔'' مولانا سامانیؒ نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا اور ایسی تلخ فضا میں بھی مسکراتے رہے۔ پھر طے پا گیا کہ مولانا فخر الدین زرادیؒ نمازِ جمعہ کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں حاضری دیں گے اور اس گوشہ نشیں درویش سے ملاقات کریں گے جسے مولانا کے خیال میں ہندوستان کے جاہل لوگوں نے ولی کامل کا درجہ دے دیا ہے۔ اتفاقاً اس روز مولانا فخر الدین زرادیؒ کو کوئی ضروری کام پیش آ گیا، اس لئے دوسرے دن یہ ملاقات ممکن ہو سکی۔ مولانا زرادیؒ اپنے ظاہری علم کے نشے سے سرشار، خانقاہ میں داخل ہوئے اور بڑی بے دلی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کسی خاص موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔

تقریر ختم ہوئی تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک نظر مولانا فخر الدین زرادیؒ کی طرف دیکھا مگر زبان مبارک سے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ مولانا زرادیؒ خانقاہ سے اٹھے اور اپنے دوست کے ہمراہ باہر نکل آئے۔ راستے میں مولانا کمال الدین سامانیؒ نے پوچھا۔ ''ہمارے شیخ سے آپ کی ملاقات کیسی رہی؟''

مولانا فخر الدین زرادیؒ کچھ دور تک خاموشی سے چلتے رہے۔ ان کے چہرے سے کچھ عجیب سے تاثرات ظاہر ہو رہے تھے مگر ہونٹوں پر سکوت کی مہر لگی ہوئی تھی۔

پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، مولانا زرادیؒ کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ دن میں کئی کئی بار کہتے۔ ''کمال الدین! مجھے اپنے شیخ کے پاس لے چلو۔ اب فراق کی یہ خلش برداشت نہیں ہوتی۔''

بالآخر ایک روز مولانا کمال الدین سامانیؒ اس شخص کو اپنے ہمراہ خانقاہ لے کر پہنچے جو درویشوں کو فریب کار اور مفت خور کہتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے فخر الدین زرادیؒ کو انتہائی محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور مشفقانہ تبسم کے ساتھ فرمایا۔

''مولانا! کیسے ہو؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لہجے میں وہ اپنائیت تھی کہ فخر الدین زرادیؒ بے قرار ہو اُٹھے۔ آنکھوں سے اشک جاری تھے اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے۔

''شیخ! آپ ہی کا غلام ہوں۔ اب اہلِ دنیا کے سامنے مجھے اپنی غلامی کی سند عطا کر دیجئے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے مولانا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا۔ ''مولانا! تم تو پہلے دن ہی سے ہمارے تھے۔ کسی غیر کے کب تھے؟ انشاء اللہ آخری سانس تک ہمارے ہی رہو گے اور حشر میں بھی ہمارے ہی کہلاؤ گے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس محبت کو دیکھ کر مولانا فخر االدین زرادیؒ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی اور پورا دامن بھیگ گیا۔ پھر وہ منظر بھی بڑا عجیب تھا کہ اہلِ شہر نے مولانا زرادیؒ کا منڈھا ہوا سر دیکھ کر کہا۔

''مولانا! یہ کیا ہوگیا؟ آپ نے یہ کیسا حلیہ بنالیا ہے؟''

مولانا فخر الدین زرادیؒ جذب و مستی کے عالم میں جواب دیتے۔ ''میں نے اپنے علم کا وہ لبادہ اُتار دیا اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی غلامی کا لباس پہن لیا۔ اب یہی میری قبا ہے اور یہی میرا کفن۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہونے سے پہلے مولانا فخر الدین زرادیؒ کی والدہ محترمہ نے اپنے بھائی کی لڑکی سے ان کی شادی طے کر دی تھی۔ مولانا زرادیؒ شہر سامانہ کے رہنے والے تھے۔ اتفاق سے وہ اپنے کسی ذاتی کام سے دہلی آئے ہوئے تھے، اسی دوران یہ واقعہ پیش آ گیا اور مولانا فخر الدینؒ نے اپنے علم کا شاہانہ لباس اتار کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی غلامی کا طوق پہن لیا۔ نئی زندگی اختیار کرنے کا فوری ردِعمل یہ ہوا کہ مولانا زرادیؒ نے شادی کا ارادہ بدل دیا۔

یہی وہ مولانا فخر الدین زرادیؒ تھے جو سماع کے موضوع پر ہونے والی بحث میں اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ دربارِ سلطانی میں تشریف لے گئے تھے۔

شیخ زادہ حسام الدین فرجام نہایت غربت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ازراہِ ہمدردی اسے اپنی خانقاہ میں پناہ دی اور نہایت شفقت و محبت سے اس کی پرورش کرنے لگے پھر جب وہ جوان ہوا تو اس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی بے پناہ شہرت و مقبولیت کے مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ شیخ زادہ فرجام کو بھی شوق ہوا کہ وہ پیر و مرشد کی طرح مقبولِ خلائق ہو۔ یہ سوچ کر اس نے دن رات مجاہدات کئے مگر دل میں ذوق نمائش کا جذبہ موجزن تھا۔ اس لئے اوراد و وظائف میں اسے کوئی لذت حاصل نہیں ہوئی سینہ سوزِ عشق سے خالی تھا، سو خالی ہی رہا۔ پھر وہ خوف ناک منزل بھی آئی، جب شیخ زادہ فرجام اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محبوبیت سے حسد کرنے لگا۔ پھر یہی حسد اسے قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے دربار تک لے گیا۔ مبارک شاہ کی موت کے بعد شیخ زادہ فرجام نے سلطان غیاث الدین تغلق کو ورغلایا کہ وہ

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سماع پر پابندی لگا کر عام مسلمانوں کو گمراہی سے بچائے۔ پھر تحریک زور پکڑ گئی اور شیخ زادہ فرجام کی قیادت میں سینکڑوں علماء حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف صف آراء ہو گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ دربارِ سلطانی میں تشریف لے گئے تو بادشاہ کی طرف سے ایک محضر پیش کیا گیا جس پر سینکڑوں علماء کے دستخط موجود تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے بہت غور سے محضر کی عبارت پڑھی اور علمائے کرام کے ناموں کا مشاہدہ کیا۔ اس وقت 653 علماء ''سماع'' کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے تغلق کے دربار میں موجود تھے۔

ابھی بحث کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ مولانا فخر الدین زرادیؒ اپنی نشست پر کھڑے ہوئے اور سلطان غیاث الدین تغلق کو مخاطب کر کے کہا۔ ''آپ نے جن علماء کو دربار میں جمع کیا ہے، ان میں سے دس ایسے افراد کا انتخاب کر لیں جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے دوسرے بزرگوں پر فوقیت رکھتے ہو۔ پھر وہی منتخب علماء اس مسئلے پر ہم سے بحث کا آغاز کریں۔''

مولانا زرادیؒ کی تجویز کے جواب میں سلطان غیاث الدین تغلق نے قاضی جلال الدین دلوالجی کی طرف دیکھا جو اس وقت درجۂ قضا پر فائز تھے۔ سیّد امیر خوردؒ کی روایت ہے کہ قاضی جلال الدین دلوالجی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مخالفین میں سرِفہرست تھے اور اکثر گفتگو کرتے وقت شائستگی کی حدود سے بھی گزر جاتے تھے۔

سلطان غیاث الدین تغلق کا اشارہ پاتے ہی قاضی صاحب نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے نصیحت آمیز گفتگو شروع کر دی۔

''تم خود کو مسلمانوں کا پیشوا کہتے ہو مگر ساتھ ہی ایسا عمل بھی کرتے ہو جس کا شرع سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا میں رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر انسان کو کسی شے کا ادراک نہ ہو تو ان لوگوں سے دریافت کرے جو زیادہ علم رکھتے ہیں۔'' قاضی جلال الدین دلوالجی کے ایک ایک لفظ سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے علم کی نفی ہو رہی تھی۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ ایک خود پرست قاضی کے طعن و تشنیع کو بڑے حوصلے سے برداشت کر رہے تھے۔ حاضرین مجلس نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ حرفِ گرم سننے کے بعد بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہونٹوں پر تبسم دلنواز موجود تھا۔

قاضی دلوالجی نے مختصر سے سکوت کے بعد پھر کہا۔ ''مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود بھی باشرع ہو اور شریعت کا مکمل علم بھی رکھتا ہو۔''

قاضی صاحب کی یہ تحقیر آمیز گفتگو سن کر قاضی محی الدین کاشانیؒ اور مولانا فخر الدین

زرادیؒ کو شدید اذیت پہنچی۔ مولانا زرادیؒ نے سرگوشی میں پیر و مرشد سے عرض کیا۔

''سیّدی! خادم کو اجازت دیجئے۔ آپ کا یہ غلام قاضی ولوالجی کو ابھی سمجھائے دیتا ہے کہ شریعت کسے کہتے ہیں اور باشرع مسلمان کیا ہوتا ہے؟'' مولانا زرادیؒ کو اس قدر تکلیف پہنچی تھی کہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا تھا۔

''مولانا! آپ خاموش رہیں اور اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خلیفہ کو صبر و ضبط کی تلقین کی اور پھر قاضی جلال الدین ولوالجی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''قاضی صاحب! آپ ہی مجھے شرع کے اسرار و رموز سمجھا دیجئے۔ میں آپ کے معیار کے مطابق مسلمان بننے کی کوشش کروں گا۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ حُسنِ عمل اور انکسار کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر قاضی جلال الدین کو منصب قضا نے انتہائی خودسر بنا دیا تھا۔ نتیجتاً انہوں نے برسرِ مجلس اپنے اختیارات کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''شیخ نظام الدین! میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے ایک تنبیہہ کافی ہونی چاہئے۔ اگر آج کے بعد تم سماع سنو گے یا دوسرے لوگوں کو سماع کی دعوت دو گے تو میں حاکم شرع کی حیثیت سے تمہیں سخت سزا دوں گا۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ بہت دیر تک اس تلخ گفتار قاضی کے توہین آمیز سلوک کو برداشت کر رہے تھے مگر جب سلطان کے حاشیہ بردار عالم نے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کیا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو جلال آ گیا۔ آپؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔ ''قاضی صاحب! آپ سزا تو اس وقت دیں گے جب اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کے جلالِ روحانی کا یہ اثر تھا کہ سلطان غیاث الدین تغلق اور حاضرین مجلس کو سکتہ سا ہوگیا۔

پھر اس سکوت کو خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے توڑا۔ ''آخر مجھے اس مجلس میں کس لئے بلایا گیا تھا؟'' حضرت محبوب الٰہیؒ نے قاضی جلال الدین ولوالجی سے پوچھا۔

قاضی صاحب پر حضرت شیخؒ کی گفتگو کا اس قدر رعب قائم ہوگیا تھا کہ وہ کچھ دیر تک لب کشائی کی ہمت نہ کر سکے۔ مگر شیخ زادہ فرجام، سلطان غیاث الدین تغلق کی قربت کے باعث قاضی صاحب سے بھی زیادہ مغرور تھا۔ انتہائی گستاخانہ لہجے میں بولا۔

''قاضی صاحب کو چھوڑیئے۔ میرے سوال کا جواب دیجئے کہ کیا آپ کی خانقاہ میں محفل سماع منعقد ہوتی ہے؟ حاضرین رقص کرتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں اور نعرے

لگاتے ہیں؟'' شیخ زادہ فرجام نے اور بھی بہت سی بے سروپا باتیں کیں جن سے گستاخی اور بے ادبی کا رنگ جھلکتا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے شیخ زادہ فرجام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اتنا جوش و خروش مت دکھاؤ! زیادہ اور فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری مجلس کا ذکر تو بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ سماع کے کیا معنی ہیں؟''

حضرت محبوب الٰہیؒ کا سوال سن کر شیخ زادہ فرجام کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ پھر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی اور بات بناتے ہوئے بولا۔ ''میں سماع کے معنی نہیں جانتا مگر بڑے بڑے علماء کہتے ہیں کہ سماع حرام ہے۔''

''جب ایک شخص سماع کے معنی ہی نہیں جانتا تو پھر اس سے اس موضوع پر کیا گفتگو ہوسکتی ہے؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

شیخ زادہ فرجام ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف محضر تیار کرنے میں پیش پیش تھا۔ جواب دینے سے عاجز رہا تو شرم و ندامت کے پسینے میں نہا گیا۔

جب علمائے دہلی نے اپنے قائد کا یہ حال دیکھا تو زور زور سے بحث کرنے لگے۔ کبھی کبھی مخالف علماء کی آوازیں اتنی بلند ہو جاتیں کہ ان پر شور و غل کا گمان ہونے لگتا۔ اگرچہ مخالفین کا یہ طرزِ عمل آدابِ مجلس کے خلاف تھا مگر سلطان غیاث الدین تغلق کی حمایت حاصل ہونے کے سبب بیشتر شرکاء بحث کرنے کی بجائے ایک گوشہ نشین درویش سے جنگ کر رہے تھے۔ جب شور و غل بہت زیادہ بڑھ جاتا تو والیٔ ہندوستان کو درمیان میں مداخلت کرنی پڑتی۔

''خاموش ہو جاؤ! اور غور سے سنو کہ شیخ کیا فرماتے ہیں؟''

سیّد امیر خوردؒ کی روایت ہے کہ اس مجلس میں مولانا حمید الدینؒ اور مولانا شہاب الدین ملتانیؒ بھی موجود تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو خوش کرنے کے لئے تمام علماء بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی کو غیر مناسب تنقید کا ہدف بنا رہے تھے......... مگر یہ دونوں حضرت خاموش تھے۔ پھر جب شور و غل کچھ کم ہوا تو مولانا حمید الدینؒ نے فرمانروائے ہند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''جس طرح مخالفین حضرت سلطان المشائخؒ کی مجلس کا ذکر کر رہے ہیں، دراصل معاملہ یہ نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟'' سلطان غیاث الدین تغلق نے پوچھا۔

"معاملہ اس کے برعکس ہے۔" مولانا حمید الدینؒ نے فرمایا۔ "میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ میں خود حضرت والا کی خانقاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ سماع میں شامل ہونے والے تمام پیروں اور درویشوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ سب کے سب ہوش مند اور سلیقے کے لوگ ہیں۔"

سلطان غیاث الدین تغلق پر مولانا حمید الدینؒ کی باتوں کا اثر ہوا۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہی قاضی جلال الدین دلوالجی درمیان میں بول اٹھے۔ "حضرت امام ابو حنیفہؒ کی روایت کے مطابق سماع حرام ہے اور رقص فسق ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے جواباً فرمایا۔ "قاضی صاحب! آپ کو علم نہیں، یہ روایت مشروط ہے اور اس میں امتناعی حکم موجود نہیں۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدینؒ تشریف لے آئے۔ سلطان غیاث الدین تغلق ان کا بے حد احترام کرتا تھا، فوراً ہی مولانا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم دانشمند بھی ہو اور مسافر بھی۔ اس وقت سماع کا موضوع زیر بحث ہے۔ میں اس سلسلے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں کہ سماع حرام ہے یا حلال؟"

مولانا علم الدینؒ نے فرمایا۔ "میں نے اس سے متعلق ایک رسالہ "مقصدہ" تحریر کیا ہے اور اس میں تمام دلائل جمع کر دیئے ہیں۔ جو لوگ سماع کو دل سے سنتے ہیں ان کے لئے مباح ہے اور جو لذتِ نفس کی خاطر سنتے ہیں، ان پر حرام ہے۔"

سلطان غیاث الدین تغلق نے مولانا علم الدینؒ سے دوسرا سوال کیا۔ "تم نے بغداد، شام اور روم کا سفر کیا ہے، ان ممالک کے مشائخ سماع سنتے ہیں یا نہیں؟ اور کوئی اس کام میں مزاحمت کرتا ہے یا نہیں؟"

مولانا علم الدینؒ نے تمام مصلحتوں اور نزاکتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرمایا۔ "ان تمام علاقوں کے مشائخ پورے ذوق و شوق کے ساتھ سماع سنتے ہیں...... اور بعض حضرات دف اور شبانہ (شہنائی) کے ساتھ بھی سنتے ہیں۔ یہ روایت حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت ابوبکر شبلیؒ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔"

مولانا علم الدینؒ کی گفتگو سن کر سلطان غیاث الدین تغلق خاموش ہو گیا۔

قاضی جلال الدین دلوالجی کو اپنی شکست صاف نظر آ رہی تھی، اس لئے گھبرا کر بول اٹھے۔ "سلطان معظم پر لازم ہے کہ سماع کے حرام ہونے کا حکم جاری فرمائیں اور اس سلسلے میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو پیش نظر رکھا جائے۔"

سلطان غیاث الدین تغلق خاموش رہا۔

صورتِ حال کو اپنے حق میں ناسازگار پا کر قاضی جلال الدین حضرت محبوب الٰہیؒ سے مخاطب ہوئے۔

"شیخ نظام الدین! کوئی کچھ بھی کہے مگر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تم اپنے مریدوں کے ساتھ اکثر "سماع و جذب" میں غرق رہتے ہو۔ کیا تم اپنی اس غلط روش کے سلسلے میں بزرگانِ سلف کے حوالے سے کوئی معتبر روایت پیش کر سکتے ہو؟"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بیان فرمائی۔

قاضی جلال الدین نے عالمانہ وقار و سنجیدگی کو برقرار نہیں رکھا اور وہ سرِ مجلس برہم ہو گئے۔ "تم مجتہد یا محدث نہیں ہو کہ قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے دعوے کی دلیل پیش کرو۔ تم محض ایک مقلد ہو۔ اس لئے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی کوئی روایت بیان کرو تا کہ تمہاری بات سنی جا سکے۔" قاضی جلال الدین کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔

تمام علمائے ہند اس حقیقت سے باخبر تھے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ روایت حدیث میں درجۂ اعتبار رکھتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ان مشائخ کرام سے حدیث کا درس لیا تھا جن کی علمی فضیلت کے دوست اور دشمن سبھی قائل تھے...... اور پھر ان ہی فقہائے عظام نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ خود قاضی جلال الدین بھی جانتے تھے کہ علم حدیث میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا کیا درجہ ہے؟ مگر جذبۂ حسد اور دل کی کدورت نے انہیں سب کچھ بھلا دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے صبر و تحمل سے قاضی جلال الدین کا اعتراض سنا اور پھر فرمانے لگے۔ "سبحان اللہ! کیا عجب بات ہے کہ قولِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ مجھ سے قول ابو حنیفہؒ طلب کرتے ہیں۔"

قاضی جلال الدین مزید بحث کرنا چاہتے تھے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ مجلس سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سلطان غیاث الدین تغلق سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ سماع پر پابندی عائد نہ کریں۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جلالِ روحانی کا یہ اثر تھا کہ فرمانروائے ہندوستان ایک لفظ تک نہیں کہہ سکا۔ پھر حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرین کو سلام کیا اور مجلس سے تشریف لے گئے۔

مخالفین کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تشریف لے جانے کے بعد شیخ زادہ فرجام، قاضی جلال الدین دلوالجی اور دوسرے علماء نے بہت شور و غل کیا، والئ ہندوستان پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا مگر سلطان غیاث الدین تغلق نے سماع کی مجالس پر پابندی عائد نہیں کی۔ یہ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے مخالفین کی بڑی شکست تھی۔

اس مناظرے کے گیارہ دن بعد سلطان تغلق کسی بات پر جلال الدین دلوالجی سے ناراض ہو گیا اور اس نے قاضی صاحب کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ شرکائے مجلس نے جب حکم سلطانی سنا تو ان کی سماعتوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے الفاظ گونجنے لگے۔

''قاضی صاحب! آپ اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے تو کسی کو سزا دیں گے۔''

پھر کچھ دن بعد قاضی جلال الدین یہ حسرت دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کو سماع سننے سے روک دیں گے۔

❀ ...... ✿ ✿ ...... ❀

حضرت خواجہ حسن سنجریؒ کی شہرہ آفاق تالیف ''فوائد الفواد'' میں سماع کا بار بار ذکر آیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بعض مواقع پر سماع کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

''سماع ایک موزوں صورت ہے۔ اس لئے اپنی فطرت میں حرام نہیں۔ سماع سے قلب میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ تحریک یادِ الٰہی کے لئے ہے تو مستحب ہے......
اور اگر فساد کی طرف مائل ہو تو حرام ہے۔ فساد سے مراد لذتِ نفس کا حصول ہے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے سماع کے لئے پانچ شرائط لازمی قرار دی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی ساقط ہو جائے تو مجلس سماع کیفِ مطرب میں بدل جائے گی اور سماع کا مقصد فنا ہو جائے گا۔

وہ سماع جس سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ رغبت رکھتے تھے، اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کلام پیش کیا جائے وہ عارفانہ ہو (حمد و نعت پر مشتمل ہو) یا انسانی جذبات کو اعلیٰ اخلاق کی طرف اُبھارنے والا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ کلام سنانے والا خود بھی پرہیزگار ہو۔ فاسق و فاجر نہ ہو۔ پختہ عمر رکھتا ہو۔ کوئی لڑکا اس حلقے میں شامل نہیں ہو سکتا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ سماع سنتے وقت انسان کی نیت درست ہو۔ اگر وہ اپنے سینے میں عشقِ خداوندی کا گداز پیدا کرنے کے لئے سماع سن رہا ہے تو جائز ہے......اور اگر

سماع کا مقصد حصولِ تفریح و نشاط ہے تو سامع کا یہ فعل قطعاً حرام ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ محفل سماع میں آلاتِ موسیقی یعنی چنگ و رباب اور دوسرے مزامیر سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ مجلس سماع میں خواتین کی شرکت تو درکنار، اس مقام پر عورتوں کا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہئے۔

جس مردِ جلیل نے اس قدر احتیاط کے ساتھ اپنی محفل سماع کو آراستہ کیا ہو، اس پر لہو و لعب کا الزام عائد کرنا تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں۔ جن علمائے وقت نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس عمل کو بنیاد بنا کر ہنگامہ آرائی کی تھی، وہ دراصل حضرت محبوب الٰہیؒ کی بے پناہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت سے جلتے تھے۔ یہاں اس حقیقت کا انکشاف بڑا تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے کہ علماء نے ''سماع'' کی آڑ لے کر اس شخص کو مجرم ثابت کرنے میں اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں صرف کر دیں جو اللہ کے بیمار بندوں کا مسیحا تھا......اور جو لوگ علی الاعلان گناہ گارانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ امراء شراب پیتے تھے، وزراء دن رات فسق و فجور میں مبتلا رہتے تھے، رقص کی محفلوں میں مجبور عورتوں کو نچایا جاتا تھا، معاشی ناہمواریاں اور ظلم و تشدد عام تھا۔ اصولی طور پر یہ وہ محاذ تھے جہاں علمائے کرام کو طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا چاہئے تھا......مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ علم کی جماعت دربارِ شاہی میں نشست حاصل کرنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ منصبِ قضا تک پہنچنا ایک بڑا اعزاز تھا......اور اس اعزاز کے حصول کی خاطر علماء میں کبھی کبھی ایسی کشمکش نظر آتی تھی جیسے دو سیاسی گروہ آپس میں متصادم ہوں۔ اس صورتِ حال سے قطع نظر علماء کو جن سماجی خرابیوں کی اصلاح کرنی چاہئے تھی، وہ بدستور موجود تھیں......اور ساری قوتیں صرف ایک مسئلے پر صرف ہو رہی تھیں کہ سماع حرام ہے یا حلال؟ اہلِ علم کی اسی تنگ نظری نے ہندوستان کی اسلامی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ بالفرض اگر علمائے ظاہر کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دوسرے درویشوں سے کچھ شرعی اختلافات تھے بھی تو ان کے اظہار کا یہ طریقہ مناسب نہیں تھا۔ بت پرستوں کی زمین پر اسلام کی ابتدائی بارشیں ہوئی تھیں۔ یہاں کی سیاہ مٹی ایمان کے شفاف پانی کی تاثیر کو محسوس کر رہی تھی۔ فاران کی جانفزا ہوائیں ہمالیہ کی سرد اور بے جان فضاؤں میں نئی روح پھونک رہی تھیں۔ ابھی تو انقلاب کا آغاز ہوا تھا۔ ابھی فصل تیار ہی کب ہوئی تھی کہ آنے والے کسانوں نے اپنے کھیتوں کی طرف سے منہ موڑ لیا اور آفاتِ ارضی کا مقابلہ کرنے کی بجائے آپس میں اُلجھ پڑے۔ درویشوں کا تو یہ

اصول تھا کہ وہ بنجر زمینوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ جس دل میں ایمان کی ذرا بھی گنجائش نظر آئی اسے اسلام کا پیغام دے دیا۔ آنکھوں کا جس قدر پانی تھا جلتے ہوئے پتھروں پر چھڑک دیا........ اور اگر کبھی قوتِ نمو پیدا کرنے کے لئے خون کی ضرورت پیش آئی تو وہ بھی نچوڑ دیا۔ یہ درویشوں کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی ہی تھی جو اہلِ ہنود کی روحوں میں اُتر گئی اور جس نے دلوں کے اندر پوشیدہ صنم خانے بھی ڈھا دیئے۔ اگر تبلیغ کا یہ کام علمائے ظاہر پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ ساری زندگی علمی موشگافیوں میں اُلجھے رہتے اور مخلوقِ خدا چشمۂ ہدایت پر پہنچ کر بھی تشنہ لب ہی لوٹ جاتی۔

یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دوسرے درویشوں کی جماعت ہی تھی جس نے بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی اپنے سینے سے لگایا اور گم کردہ راہ لوگوں کو یقین دلایا کہ اللہ ان کے اندازوں سے کہیں زیادہ مہربان، رحیم اور بخشنے والا ہے۔ ''آؤ بھلائی کی طرف''......

اور جب لوگ بھلائی کے راستے پر آ جاتے تھے تو درویشوں کا دوسرا پیغام ہوتا تھا۔

''آؤ نماز کی طرف........ آؤ نماز کی طرف۔''

پھر جس انسان کے نفس میں جتنی استطاعت ہوتی تھی، اسی کے مطابق اس کو ذمہ داریاں سونپتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دوسرے درویشوں نے علمائے ظاہر کی ذات پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی۔ حالانکہ حضرت محبوب الٰہیؒ سب سے زیادہ اس بات کے اہل تھے کہ علاء الدین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دربار سے فیض یاب ہونے والے علماء پر اعتراض کرتے مگر آپؒ نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ کسی کے عیوب بیان نہیں کئے اور کسی کے در پردہ حالات جاننے کی جستجو میں نہیں رہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی افضل ترین سنتیں ہیں جن پر حضرت محبوب الٰہیؒ آخری سانس تک عمل پیرا رہے۔

۞ ...... ۞ ۞ ...... ۞

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی سماع کے سلسلے میں ہونے والے اس مناظرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ ظہر کے وقت اس مجلس مباحثہ سے گھر تشریف لائے تو آپؒ نے مولانا محی الدین کاشانیؒ اور حضرت امیر خسروؒ کو طلب فرمایا۔ جب یہ دونوں حضرات دست بوسی کی سعادت حاصل کر چکے تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے خادمانِ خاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''دہلی کے دانشمند میری عداوت اور حسد سے بھرے ہوئے تھے۔ مخالفت کے میدان

کو وسیع پا کر انہوں نے خوب خوب میری مخالفت کی........ مگر آج ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی۔ وہ لوگ دلیل کے طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث کو بھی نہیں سنتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ ہمارے شہر میں فقہ کی روایات پر عمل کرنا مقدم ہے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا لہجہ بہت اُداس ہو گیا تھا۔ ''یہ باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن کا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث پر اعتقاد نہیں ہوتا۔ جب بھی ان کے سامنے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحیح حدیث پیش کی جاتی تو وہ اسے قبول نہیں کرتے اور بے باکی کے ساتھ کہتے کہ یہ حدیث تو حضرت امام شافعیؒ کی بیان کردہ ہے جو ہمارے علماء کے دشمن ہیں۔ اس لئے ہم اس حدیث کو نہیں سنتے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے؟ جس شہر میں اپنی بڑائی کے مظاہرے کئے جاتے ہوں وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے۔ عجب نہیں کہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ میں نے آج تک کسی ایسے عالم کو نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ اس کے سامنے احادیث مبارکہ بیان کی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا۔'' یہ کہتے کہتے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرۂ مبارک پر رنگِ جلال اُبھر آیا۔ پھر آپؒ نے فرمایا۔ ''جب عام لوگ قاضی شہر اور علماء کی زبانی یہ بات سنیں گے کہ اس شہر میں احادیث پر عمل نہیں ہوتا تو پھر کس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اقوالِ مقدسہ پر ان کا عقیدہ راسخ ہوگا۔ آج میں نے اس شہر کے علماء میں جو بدعقیدگی دیکھی ہے، اس سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس جرم کی سزا میں دہلی کے در و دیوار پر جلاوطنی، قحط اور وبائیں نازل ہوں گی۔''

اگرچہ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے خالقِ حقیقی کے پاس تشریف لے جا چکے تھے لیکن اہلِ شہر کی سماعتوں میں آپؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی۔ سلطان غیاث الدین تغلق کا انتقال 725ھ میں ہوا۔ اس کے دو سال بعد 727ھ میں سلطان محمد تغلق نے دارالحکومت دیوگیر (دکن) منتقل کر دیا۔ دہلی ویران ہو گئی۔ وہ تمام مخالف علماء جو مجلس مناظرہ میں شریک تھے، جلاوطن کئے گئے اور ان میں سے اکثر نے دیوگیر ہی میں وفات پائی۔ مہلک قحط پڑے اور سخت وبائیں پھیلیں۔ یہ اس مردِ حق کی پیش بینی تھی جس کی آنکھوں پر قدرت نے اپنے بہت سے راز ظاہر کر دیئے تھے۔

۞ ...... ۞ ۞ ...... ۞

اچانک حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ بظاہر سلطان غیاث الدین تغلق، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دلائل سے مطمئن ہو گیا تھا اور اس نے سماع کے انعقاد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی مگر در پردہ وہ حضرت محبوب الٰہیؒ سے خوش نہیں تھا۔ اس ناخوشی کے

دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ دربارِ سلطانی میں تشریف نہیں لاتے تھے۔ مؤرخین لاکھ تحریر کریں کہ غیاث الدین تغلق ایک باکردار حکمران تھا لیکن اس کے دماغ میں بوئے سلطانی پوری شدت کے ساتھ موجود تھی۔ اس لئے اسے ایک مردِ آزاد کی ادائے بے نیازی سخت گراں گزرتی تھی۔ دوسرے یہ کہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی طرح سلطان غیاث الدین تغلق کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کہیں حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ مقبولیت اس کے اقتدار کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ نتیجتاً فرمانروائے ہند نے یہ فیصلہ کرلیا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دارالحکومت سے دور کر دیا جائے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب سلطان غیاث الدین تغلق نے لکھنوتی (بنگال) پر لشکر کشی کا ارادہ کیا۔ تغلق آباد (دہلی) سے کوچ کرنے سے قبل سلطان نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے نام ایک قہر نامہ تحریر کیا۔

"نظام الدین! اب تمہارا وجود میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میری سلطنت کی حدود سے بلا تاخیر نکل جاؤ۔ میں دشمنوں کی سرکوبی کے لئے لکھنوتی جا رہا ہوں۔ میری یہ جنگی مہم دو ماہ میں سر ہو جائے گی۔ میں تمہیں بس اتنی ہی مہلت دے سکتا ہوں کہ جب میرے قدم تغلق آباد کی زمین پر پڑیں تو خدام مجھ سے کہیں کہ حکم شاہی کی تعمیل میں نظام الدین اپنے فاقہ مست درویشوں کو لے کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔"

تمام گستاخانہ انداز اختیار کرنے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو تنبیہہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"جو لوگ مجھے جانتے ہیں، انہیں خوب اندازہ ہے کہ میں اپنے احکام کی تعمیل کے سلسلے میں کس قدر سخت گیر ہوں۔ میرے کسی حکم کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اگر میرے دہلی پہنچنے تک تم نے اور تمہارے عقیدت مندوں نے یہ علاقہ خالی نہیں کیا تو میں تم سب کو عبرت ناک سزا دوں گا جسے اہلِ دنیا قیامت تک یاد رکھیں گے۔"

جب خواجہ اقبالؒ فرمانروائے ہند کا قہر نامہ پڑھ چکے تو حاضرینِ مجلس میں شدید وحشت و اضطراب میں مبتلا ہو گئے۔

"آخر یہ کون سی عجیب بات ہے جس نے تمہارے ہوش و حواس اور چہرے کی رونقیں چھین لی ہیں۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "ماضی میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا

رہے گا۔ حکمرانِ وقت اپنی روش نہیں بدلیں گے اور یہ بندہ عاجز بھی اپنی عادت ترک نہیں کرے گا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو اپنا کام کرنے دو اور بقول اس کے مجھے سماع میں مشغول رہنے دو۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا اندازِ بے نیازی وہی تھا جس کا مظاہرہ آپؒ نے سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی تنبیہہ کے جواب میں کیا تھا۔

حضرت امیر خسروؒ سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار سے وابستہ تھے۔ جب حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے خدمت گاروں کو اس جابرانہ حکم کا جواب دے چکے تو امیر خسروؒ نے دست بستہ عرض کیا۔

"سیّدی! وہ ایک سخت گیر حکمراں ہے۔ اس کی ذات ہمارے لئے بہت ضرر رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ سلطان واپس آئے، ہمیں کوئی مناسب قدم اٹھا لینا چاہئے۔" شدتِ جذبات سے حضرت امیر خسروؒ کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو خسرو! کہ ہم غیاث پور چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں چلے جائیں یا پھر حکم سلطانی کے مطابق اس کی حدودِ سلطنت ہی سے نکل جائیں۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔ "ہم نے علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت میں سوچا تھا کہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے اللہ کی وسیع و عریض زمین کے کسی گمنام گوشے کو اپنی اقامت گاہ بنا لیں مگر علاء الدین تو دنیا سے رخصت ہو گیا اور پھر اس نے دوبارہ ضد بھی نہیں کی۔ اس لئے ہم نے بھی غیاث پور چھوڑنے کا ارادہ تبدیل کر دیا تھا۔"

حضرت امیر خسروؒ، سلطان غیاث الدین تغلق کی کینہ پروری سے واقف تھے کہ اگر اس کے دل میں کسی شخص کی طرف سے کوئی گرہ پڑ جاتی تھی تو پھر اسے امن و سلامتی کے ساتھ نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ اس لئے ایک بار پھر آپؒ نے حضورِ شیخ درخواست پیش کی کہ سلطان کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی احتیاطی تدبیر کرنا لازمی ہے۔

جواب میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "خسرو! ہمارے پاس نہ تخت ہے نہ کلاہ، نہ دولت ہے نہ سپاہ....... پھر ایک حکمراں کی مفسدانہ یورش سے کس طرح تحفظ حاصل کیا جا سکتا ہے؟"

"غلام کو کیا خبر؟ سلطان المشائخ ہی جانیں کہ ایک ناشکرے اور ظالم انسان کو کس طرح راہ پر لایا جا سکتا ہے۔" حضرت امیر خسروؒ نے عرض کیا۔

"خسرو! اب تغلق کو راہِ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔ وہ غرورِ اقتدار اور ہوسِ دنیا کی گرد میں گم ہو چکا ہے، سماعتیں بند ہو چکی ہیں اور آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت چھن چکی ہے۔" یہ کہہ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خواجہ اقبالؒ کے ہاتھ سے تغلق کا حکم

نامہ لے لیا۔ اس گستاخانہ تحریر پر ایک نظر کی اور پھر خواجہ اقبالؒ سے فرمایا۔ ''میرا قلم دوات لاؤ۔''

یہ بڑا عجیب حکم تھا۔ اہلِ مجلس سکتے کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی میں لب کشائی کی ہمت نہیں تھی۔ خواجہ اقبالؒ نے قلم اور دوات پیش کئے۔ اگرچہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ معمول تھا کہ جب کسی کے خط کا جواب دینا ہوتا تو آپؒ خواجہ اقبالؒ یا کسی دوسرے مرید کو حکم دیتے اور وہ آپؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے کلمات کاغذ پر منتقل کر دیتا...... مگر اب کی بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ آپؒ نے حکم سلطانی کو زمین پر رکھا۔ چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے اور پھر تغلق کے قہرنامے کی پیشانی پر یہ مختصر الفاظ تحریر فرما دیئے۔

''ہنوز دلی دور است۔'' (ابھی دلی دور ہے)

واضح رہے کہ اس زمانے کے دستور کے مطابق شہنشاہ کے حکم نامے کی پیشانی پر جواب تحریر کرنا انتہائی گستاخی اور ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ پھر جب شاہی قاصد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا جواب لے کر سلطان غیاث الدین تغلق کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانروائے ہند چند لمحوں کے لئے حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک درویشِ بے سروساماں، والئ ہندوستان کے حکم کو اس طرح نظرانداز کر دے گا۔ پھر اس نے شدید عالم غضب میں اپنے امراء کو مخاطب کر کے کہا۔

''شیخ نظام الدین اب میرے قہر سے نہیں بچ سکیں گے۔ میں انہیں عنقریب بتاؤں گا کہ دلی مجھ سے دُور نہیں، ہمیشہ میرے قدموں کے نیچے رہتی ہے۔''

غیاث الدین تغلق دہلی کی حدود سے نکلا اور تیز رفتاری کے ساتھ یلغار کرتا ہوا لکھنوتی پہنچا۔ غیاث الدین بلبن کا بیٹا ناصر الدین اس علاقے کا حاکم تھا۔ وہ ایک صلح پسند اور گوشہ نشیں انسان تھا۔ ناصر الدین جنگ و جدل میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اس نے قیمتی تحائف دے کر اپنی جان بچائی۔ غیاث الدین تغلق نے اپنے منہ بولے بیٹے تاتار خان کو سنار گاؤں کا حاکم مقرر کیا۔ یہاں کا پرانا حاکم اور جاگیردار بہادر شاہ ہمیشہ غیاث الدین تغلق سے برسرِ پیکار رہتا تھا۔ اس بار تغلق نے اسے شکست دی اور گرفتار کر کے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں ترہٹ کا قلعہ پڑتا تھا۔ یہاں کے راجہ نے سلطان کی آمد کی خبر سنی تو وہ فرمانروائے ہند کے خوف سے گھنے جنگلوں میں جا چھپا۔ غیاث الدین تغلق کے حکم پر اس کے سپاہیوں نے درختوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا جنگل ایک چٹیل

میدان بن گیا۔ انجام کار تین دن کی شدید محنت کے بعد سلطان حصار ترہٹ تک پہنچا۔ وہاں قلعے کے چاروں طرف سات خندقیں پانی سے لبریز تھیں۔ تغلق نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور بڑی ذہانت و شجاعت سے اس دشوار گزار راستے کو عبور کیا اور راجہ کو شکستِ فاش دے کر اپنا قیدی بنا لیا۔ ترہٹ کی حکومت ملک تیغہ کے بیٹے احمد خان کے سپرد کی اور خود نہایت تیز رفتاری کے ساتھ دارالحکومت کی طرف بڑھا۔

اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ لکھتا ہے:

''سلطان غیاث الدین تغلق کا دامن کئی فتوحات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تسخیرات کا نشہ اور سیم و زر کا انبار لے کر برق رفتاری کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سلطان کی موت اسے دہلی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ جب ولی عہد سلطنت شہزادہ محمد تغلق نے باپ کی آمد کی خبر سنی تو وہ دہلی کی حدود سے باہر نکلا اور اس نے انوکھے انداز سے استقبال کرنے کے لئے افغان پور کے قریب ایک نیا محل تعمیر کرایا۔ اس محل کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے تین دن کے مختصر ترین عرصے میں بنایا گیا۔ شہزادہ محمد تغلق چاہتا تھا کہ اس کا باپ اسی نوتعمیر شدہ محل میں رات گزارے...... اور اس وقت جبکہ سلطان کی آمد کی خوشی میں ہر طرف آئینہ بندی ہو جائے اور طرح طرح کے سامانِ نشاط فراہم کر دیئے جائیں تب فاتح سلطان مثالی شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہو۔''

پھر جب غیاث الدین تغلق افغان پور کے نزدیک پہنچا اور اس نے اپنے بیٹے سے نئی عمارت بنوانے کا سبب پوچھا تو شہزادہ محمد تغلق نے انتہائی پُرجوش لہجے میں اپنے جذبات بیان کر دیئے۔ سلطان بیٹے کی اس گرمجوش محبت سے بہت خوش ہوا اور اس کا دل رکھنے کے لئے والئ ہندوستان نے محل میں شب بسری کا ارادہ کر لیا۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جب رات آئی تو سلطان غیاث الدین تغلق نے کھانا طلب کیا۔ شہزادہ محمد تغلق بھی اپنے امراء کے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی شہزادہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ محل سے باہر نکل آیا۔ محمد تغلق اور اس کے ساتھیوں نے ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے۔ شہزادے کے باہر آتے ہی محل کی چھت گر گئی اور سلطان غیاث الدین تغلق اپنے پانچ چھ خدمت گاروں کے ساتھ ملبے میں دب کر ہلاک ہو گیا۔

بعض مؤرخین نے اس المناک واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہزادہ محمد تغلق کا بنوایا ہوا کوشک (محل) صرف تین دن کی مختصر مدت میں تعمیر ہوا تھا۔ محل

کی بنیادیں ابھی گیلی تھیں کہ ولی عہد سلطنت نے فیل بانوں کو حکم دیا کہ وہ ہاتھیوں کا ایک دستہ محل کی چھت پر لائیں تاکہ یہ قوی ہیکل جانور اپنے فاتح سلطان کو سلامی پیش کر سکیں۔ نتیجتاً ہاتھیوں کے بھاری قدموں کی دھمک سے کوشک کی بنیادیں ہل گئیں اور تین روزہ محل زمین پر آ رہا۔

بعض مؤرخین نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ شہزادہ محمد تغلق نے باپ کے خلاف سازش کی تھی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ شہزادہ محمد تغلق نے اپنے باپ کو پُراسرار طریقے سے قتل کرنے کے لئے تین دن کے مختصر ترین عرصے میں یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ فن تعمیر کے اعتبار سے یہ نو ساختہ عمارت بالکل ناقص تھی اور اس میں سلطان غیاث الدین تغلق جیسی اہم شخصیت کے ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

قاسم فرشتہ مؤرخین کی اس جماعت سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جو لوگ محمد تغلق کو سلطان کی موت کا باعث سمجھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں کیونکہ شہزادہ خود باپ کے ساتھ دستر خوان پر موجود تھا، پھر اس میں یہ کرامت کہاں سے آ گئی کہ اس کے باہر آتے ہی چھت گر پڑی اور بادشاہ کی موت واقع ہو گئی۔''

دوسرے مشہور مؤرخ صدر جہاں گجراتی نے اپنی تاریخ میں کچھ اور ہی انکشاف کیا ہے۔ گجراتی کے بقول شہزادہ محمد تغلق نے یہ محل جادو کے زور سے بنوایا تھا۔ اگر اس محل میں طلسمی اثرات شامل نہ ہوتے تو شہزادہ محمد تغلق کے باہر آتے ہی محل کیوں منہدم ہو جاتا؟

بیشتر مؤرخین نے صدر جہاں گجراتی کی روایت کو عقل و ہوش سے بعید تر قرار دیا ہے۔

ایک اور مؤرخ حاجی محمد قندھاری کا بیان ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کھانے سے فارغ ہو کر ابھی ہاتھ ہی دھو رہا تھا کہ آسمان سے بجلی گری اور محل کی چھت کو توڑتی ہوئی بادشاہ کے سر پر آ رہی۔ ضیاء الدین برنی نے بھی آسمانی بجلی گرنے کا ذکر کیا ہے۔

ہم نے پوری تحقیق کے ساتھ معتبر حوالے جمع کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ غیاث الدین تغلق کی موت کے ظاہری اور مادی اسباب کا سراغ مل سکے۔ اب ہم ایک اور تاریخی روایت پیش کریں گے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تنہا بھی ہے اور منفرد بھی۔ یہ روایت تاریخ ''مبارک شاہی'' سے اخذ کی گئی ہے جس کا مصنف یحیٰی بن احمد سرہندی ہے۔ یحیٰی سرہندی لکھتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کا سبب شیخ الاقطاب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دل آزاری تھی۔ حضرت شیخؒ نے سلطان کی روانگی کے وقت فرمایا تھا کہ ابھی مجھ سے دلی بہت دور ہے۔ پھر جب غیاث الدین تغلق ایک فاتح کی حیثیت سے دہلی کے قریب پہنچا تو اس نے استقبال کرنے والے لوگوں سے انتہائی فخریہ

انداز میں کہا۔

''میں دشمن کے سینے پر پاؤں رکھ کر بخیر و عافیت واپس آ گیا۔''

جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو سلطان کے اس دعوے کی خبر دی گئی تو آپؒ نے دوبارہ فرمایا۔ ''ہنوز دلی دُور است۔''

پھر اس کے بعد محل کے گرنے اور سلطان کے ہلاک ہونے کا واقعہ پیش آیا۔ جب غیاث الدین تغلق کی روح نے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑا تو وہ دہلی سے چار پانچ میل دور تھا۔

اب تک جس قدر تفصیلات پیش کی گئیں، وہ مختلف تاریخ نویسوں کا تجزیہ تھا۔ بیشتر مؤرخین نے سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کا ظاہری سبب بیان کرتے ہوئے سلطان کی مرگِ ناگہانی کو یا تو اتفاقی حادثہ سمجھا یا پھر اس کو شہزادہ محمد تغلق کی سازش قرار دے دیا۔ مؤرخین کی اس جماعت میں صرف یحیٰی بن احمد سرہندی ہے جو سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کے پس منظر میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روحانی قوت کا ذکر کرتا ہے۔

سلطان غیاث الدین تغلق حضرت محبوب الٰہیؒ کو دہلی چھوڑ دینے اور حکم سلطانی کی عدم تعمیل کے نتیجے میں دردناک سزا کی دھمکی دے کر لکھنوتی چلا گیا۔ حضرت امیر خسروؒ اس سفر میں سلطان کے ہمراہ تشریف نہیں لے گئے تھے۔ جب غیاث الدین تغلق لکھنوتی کی طرف کوچ کر گیا تو حضرت امیر خسروؒ نے پیر و مرشد کے حضور عرض کیا۔ ''سیّدی! سلطان اپنے ناپسندیدہ افراد کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

''خسرو! اس کے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے جواباً فرمایا۔ ''کیا وہ اس زمین کا مالک ہے کہ جس سے چاہے قیام کا حق چھین لے.......اور جسے چاہے سکونت کی اجازت دیدے۔ وہ تو خود ایک مسافر ہے۔ دنیا کی سرائے پر اسے اس سے زیادہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ خاموشی سے رات گزار کر چلا جائے۔''

حضرت امیر خسروؒ، پیر و مرشد کے ادب کے باعث خاموش ہو گئے لیکن آپؒ کے چہرے سے شدید اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ چند روز بعد آپؒ نے پیر و مرشد کی جناب میں دوبارہ عرض کیا۔ ''سیّدی! میں نے روانگی کے وقت غیاث الدین تغلق کے چہرے پر بڑے سفاک جذبات کا عکس دیکھا ہے۔ غلام نہیں چاہتا کہ اس کے آقا کو معمولی سی بھی تکلیف پہنچے۔''

''خسرو! تم نے ابھی تک اس واقعے کو فراموش نہیں کیا ہے؟'' اپنے مرید خاص کی بے چینی دیکھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے تبسم فرمایا۔

''سیّدی! یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے کہ خادم اسے فراموش کر دے۔'' حضرت امیر خسروؒ کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

''نہیں خسرو! تم اپنے ذہن کو غبار آلود نہ کرو۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مرید کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔ ''ہنوز دلی دور است۔'' (ابھی دلی دور ہے)

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے اپنی زبان مبارک سے وہی الفاظ ادا فرمائے جو آپؒ نے سلطان غیاث الدین تغلق کے حکم نامے کی پیشانی پر تحریر فرماتے تھے۔

وقت بہت تیزی سے گزرتا رہا۔ اس دوران غیاث الدین تغلق لکھنوتی (بنگال) سے دہلی کی جانب کوچ کر چکا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ دربارِ سلطانی میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، اس لئے آپؒ کو لمحے لمحے کی خبریں مل رہی تھیں۔ جب امیر خسروؒ کو یہ معلوم ہوا کہ شہزادہ محمد تغلق اپنے باپ کے والہانہ استقبال کے لئے دہلی سے افغان پور کی طرف روانہ ہو چکا ہے تو آپؒ نے پیر و مرشد کے حضور گریہ وزاری کے ساتھ عرض کیا۔

''سیّدی! اب تو غیاث الدین تغلق اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت امیر خسروؒ کے شدید اضطراب کو محسوس کیا مگر زبان مبارک سے وہی الفاظ ادا فرمائے۔ ''ہنوز دلی دور است۔''

اس وقت سلطان غیاث الدین تغلق دارالحکومت دہلی سے تقریباً چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور شہزادہ محمد تغلق کے بنوائے ہوئے نئے محل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ دربارِ شاہی کے ایک معزز رکن ہونے کے باعث یہ بھی جانتے تھے کہ سلطان تغلق افغان پور کے نوتعمیر کردہ کوشک میں صرف ایک رات بسر کرے گا اور علی الصباح روانہ ہو کر دوپہر تک دہلی پہنچ جائے گا۔ اس طرح تغلق کے دہلی پہنچنے میں صرف چوبیس گھنٹے کا وقفہ حائل تھا اور اگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو فرمانروائے ہندوستان دہلی کے مضافات میں داخل ہو چکا تھا...... مگر حضرت محبوب الٰہیؒ مسلسل یہی فرما رہے تھے۔

''ہنوز دلی دور است۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ اطمینانِ قلب آپؒ کی شانِ قلندری کا مظہر تھا مگر مریدین اور خدام اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھے اور ان کی آنکھیں پس پردہ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم تھیں۔ اس لئے ان کا پریشان ہونا انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

حضرت امیر خسروؒ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور پھر پیر و مرشد کے ہاتھ پکڑ کر

رونے لگے۔ ''سیّدی! یہ غلام فرمودۂ شیخ پر لب کشائی کی جرأت نہیں رکھتا مگر اب دلی زیادہ دور نہیں ہے۔ جب تک آپؒ تغلق کا کوئی انتظام نہیں فرمائیں گے، یہ خادم یونہی روتا رہے گا۔'' اہلِ مجلس نے دیکھا کہ حضرت امیر خسروؒ زار و قطار رو رہے تھے۔

خانقاہ کے در و دیوار پر ایک اذیت ناک سکوت طاری تھا۔ تمام خدام کے چہرے اُداس تھے اور آنکھیں ناقابلِ بیان اضطراب کو ظاہر کر رہی تھیں۔

آخر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''اچھا خسرو! تم یوں نہیں مانو گے۔ یقیناً نہیں مانو گے...... مگر تم بھی کیا کر سکتے ہو کہ لوحِ محفوظ پر یہی رقم ہو چکا ہے۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خادم خاص خواجہ اقبالؒ کو ایک تربوز لانے کا حکم دیا۔ جب خواجہ اقبالؒ تربوز لے آئے تو حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ اسے ایک خوان میں رکھ کر سرخ کپڑے سے ڈھانپ دو۔

جب خوان تیار ہو گیا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت امیر خسروؒ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اسے سیّد احمد بہار کے پاس لے جاؤ۔ سلام پیش کرنے کے بعد عرض کرنا کہ یہ خوان نظام الدین نے آپ کے ملاحظے کے لئے بھیجا ہے۔''

حضرت امیر خسروؒ بڑی حیرت سے پیر و مرشد کے اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔ ''کچھ اور عرض کروں؟''

''نہیں! بس اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ سیّد خود سمجھ لیں گے۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا اور پھر اٹھ کر اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔

سیّد احمد بہارؒ ایک عجیب و غریب بزرگ گزرے ہیں۔ گردشِ ماہ و سال نے ان کے حالاتِ زندگی پر گہرا پردہ ڈال دیا ہے۔ اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ سیّد کہاں سے آئے تھے اور ان کا عارفانہ مقام کیا ہے؟ پھر بھی سیّد احمد بہار کے منصبِ ولایت کو سمجھنے کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سیّد احمد بہارؒ زندگی بھر ایک عجیب کام کرتے رہے جس کے رمز کو اللہ جانتا ہے یا اولیائے کرام۔ اہلِ دانش ان کے اس کام کی عقلی توجیہہ پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ مضافاتِ دہلی کے تمام لوگ جانتے تھے کہ سیّد احمد بہارؒ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے مٹی تیار کرتے تھے اور پھر دن بھر اس مٹی سے ایک دیوار بناتے تھے۔ مغرب کی اذان تک سیّد کا یہ عمل جاری رہتا اور پھر جیسے ہی نماز کا وقت آتا، سیّد اس دیوار کو ڈھا دیتے۔ صبح ہوتے ہی اس مٹی کو دوبارہ گوندھتے اور دیوار اُٹھانا شروع کر دیتے۔ شام ہوتی اور حسبِ معمول

وہ دیوار منہدم کر دی جاتی۔ برسوں سے سیّد احمد بہارؒ کا یہی عمل تھا۔

مشہور روایت ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو خلافت عطا کر رہے تھے اس وقت حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے خدام کو کھیر پکانے کا حکم دیا۔ پھر جب کھیر تیار ہو گئی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے دونوں مریدانِ خاص حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور حضرت امیر خسروؒ سے فرمایا۔

"یہ کھیر سیّد احمد بہارؒ کی خدمت میں لے جاؤ۔"

جب حضرت چراغ دہلیؒ اور حضرت امیر خسروؒ اس مرد بزرگ کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سیّد احمد بہارؒ کے ہاتھ مٹی سے آلودہ ہیں اور وہ دیوار بنا رہے ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے کمال ادب سے سلام عرض کیا اور کھیر کا طباق سیّد احمد بہارؒ کے سامنے پیش کر دیا۔

سیّد احمد بہارؒ نے انتہائی شفقت آمیز نظروں سے دونوں کو دیکھا اور پھر بڑے والہانہ انداز میں پوچھا۔ "محبوب الٰہیؒ کیسے ہیں؟"

حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد کی خیریت بیان کی مگر آپؒ بڑی حیرت سے سیّد احمد بہارؒ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خسروؒ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بزرگ کون ہیں اور پیر و مرشد ان سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟ ابھی حضرت امیر خسروؒ کی یہ ذہنی کشمکش جاری تھی کہ سیّد احمد بہارؒ نے اپنے آلودہ ہاتھ کھیر میں ڈال دیئے۔ مٹی کی آمیزش سے کھیر کا رنگ اس قدر تبدیل ہو گیا کہ وہ لذیذ غذا بھی مٹی ہی نظر آنے لگی۔ اس کے بعد سیّد احمد بہارؒ نے حضرت امیر خسروؒ سے فرمایا۔ "اسے کھا لو۔"

روایت ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کی نفاست نے اس خاک آلود کھیر کو قبول نہیں کیا تاہم سیّد احمد بہارؒ کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں اسے خانقاہ جا کر کھا لوں گا۔"

سیّد احمد بہارؒ نے ایک نظر امیر خسروؒ کی طرف دیکھا۔ اسی دوران حضرت سیّد نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ "اگر سیّد اجازت دیں تو یہ خادم......"

ابھی حضرت چراغ دہلیؒ کی گفتگو مکمل نہیں ہوئی تھی کہ سیّد احمد بہارؒ نے فرمایا۔ "ہاں، اسے تم کھا لو۔ یہ تمہارے ہی لئے ہے۔"

حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے انتہائی عقیدت کے ساتھ وہ خاک آلودہ کھیر کھائی اور جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے اس واقعے کا ذکر کیا تو پیر و مرشد نے فرمایا۔

"نصیرالدین! آج سیّد نے بھی تمہاری خلافت کی تصدیق کر دی۔ وہ مٹی نہیں، اکسیر

تھی جسے کھا کر تم سونا بن گئے ہو۔"

بعض صوفیاء کا کہنا ہے کہ اگر وہ خاک آلودہ کھیر حضرت امیر خسروؒ کھا لیتے تو پھر آپؒ ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلیفۂ اکبر ہوتے۔ ہمارے نزدیک یہ قیاس آرائی درست نہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہی ہوتے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ چاہتے تھے کہ امیر خسروؒ بھی اس سعادت سے محروم نہ رہیں۔ اور اس مٹی کا ذائقہ چکھ لیں جو تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر تھی۔

اور آج حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ان ہی سیّد احمد بہارؒ کے پاس حضرت امیر خسروؒ کو بھیجا تھا۔ خسروؒ وہاں شام کے وقت پہنچے تھے۔ سیّد احمد بہارؒ حسب معمول دیوار اٹھانے میں مصروف تھے۔ خسروؒ کو دیکھتے ہی آپؒ نے اپنا کام روک دیا اور بے اختیار فرمانے لگے۔ "خسرو! تمہارے شیخ کیسے ہیں؟"

حضرت امیر خسروؒ نے پیر و مرشد کی خیریت بیان کی اور وہ خوان پیش کر دیا جو سرخ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ سیّد احمد بہارؒ نے ایک نظر اس خوان کو دیکھا اور جیسے ہی سرخ کپڑے پر آپؒ کی نگاہ پڑی، چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ حضرت امیر خسروؒ نے اس تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا۔ سیّد احمد بہارؒ چند لمحوں کے لئے وحشت زدہ سے نظر آنے لگے تھے۔ پھر جب یہ رنگِ وحشت گزر گیا تو آپؒ پُرسکون ہو گئے اور ایک عجیب سے لہجے میں حضرت امیر خسروؒ کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

"تمہارے شیخ بھی خوب ہیں۔ جب کسی کو تاج پہناتے ہیں تو اپنے ہاتھ سے پہناتے ہیں۔ اور جب جنازہ اٹھانے کا وقت آتا ہے تو ہم سے کہتے ہیں...... مگر کیا کریں؟ ان کا حکم تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ محبوب الٰہیؒ ہیں۔"

اس کے بعد سیّد احمد بہارؒ نے مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز سے پہلے آپؒ دیوار کو ڈھا دیا کرتے تھے مگر آج خلافِ معمول سیّد نے اس کچی دیوار کو برقرار رہنے دیا۔ پھر بہت دیر تک خاموش بیٹھے کچھ پڑھتے رہے۔ حضرت امیر خسروؒ با ادب کھڑے تھے۔ یکایک خسروؒ نے دیکھا کہ سیّد احمد بہارؒ کے چہرے پر غیظ و جلال کا رنگ اُبھر آیا۔ پھر سیّد کھڑے ہوئے۔ سامنے رکھے ہوئے خوان کا کپڑا ہٹایا اور تربوز اٹھا لیا۔ سیّد کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت امیر خسروؒ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

پھر سیّد احمد بہار کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور آپؒ نے تربوز اٹھا کر دیوار پر مار دیا۔ حضرت امیر خسروؒ نے سنا۔ سیّد احمد بہارؒ انتہائی غضب کے عالم میں فرما رہے تھے۔ "برسرِ تغلق۔" (تغلق کے سر پر)

کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی وقت شہزادہ محمد تغلق کے تعمیر کردہ محل کی چھت سلطان کے سر پر گر پڑی اور وہ اس کے ملبے میں دب کر ہلاک ہو گیا۔

پھر جب غیاث الدین تغلق کی موت کا چرچا عام ہوا تو اراکینِ سلطنت اور اہلِ شہر خوف سے کانپ اُٹھے۔ یک بیک ان کی سماعت میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہ تاریخ ساز الفاظ گونجنے لگے۔

''ہنوز دلی دُور است۔''

سلطان غیاث الدین تغلق 725 ھ میں دنیا سے رخصت ہوا۔ سات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی جب کوئی شخص کسی مشکل کام کا ذکر کرتا ہے تو اسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ''ابھی دلی دُور ہے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ قول فارسی اور اُردو زبانوں میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ہم نے اپنی حد تک حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور سلطان غیاث الدین تغلق کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے سلسلے میں تمام معتبر روایات جمع کر دی ہیں مگر ایک روایت ایسی بھی ہے جس کا کسی مؤرخ نے ذکر نہیں کیا۔ قاسم فرشتہ نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے مگر تاریخی تجزیہ نگاروں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں عام لنگر تھا۔ اس دعوت میں شہزادہ محمد تغلق بھی شریک ہوا۔ پھر جب ولی عہد سلطنت کھانا کھا کر جانے لگا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔

''ایک بادشاہ جاتا ہے اور دوسرا بادشاہ حاضری کا منتظر ہے۔''

شہزادہ محمد تغلق کے مصاحبوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ارشادِ گرامی سن لیا اور پھر کسی ایک خدمت گار نے غیاث الدین تغلق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حضرت محبوب الٰہیؒ کے قولِ مبارک کو غلط رنگ دے کر سلطان کے گوش گزار کر دیا۔ ''شیخ نظام الدینؒ نے شہزادے کو بادشاہ ہند بننے کی نوید سنائی ہے۔''

اقتدار بڑی خوف ناک شے ہے۔ اکثر حکمراں اس کام میں اپنی اولاد کی شرکت بھی گوارہ نہیں کرتے۔ اگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے شہزادہ محمد تغلق کو فرمانروائے ہند بننے کی خوشخبری سنائی تھی تو اس میں کیا قباحت تھی؟ سلطان غیاث الدین تغلق کے بعد اصولی طور پر اس کے بیٹے محمد تغلق ہی کو سریر آرائے سلطنت ہونا تھا۔ یہ خبر سن کر غیاث الدین تغلق کو

خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تھا کہ اس کا اقتدار غیر کے ہاتھوں میں نہیں جائے گا۔ مگر حرص و ہوس نے اسے نئے انداز سے ورغلایا اور وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے فرمودات کو اپنے خلاف سازش سمجھنے لگا۔

تغلق کا خیال تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ، شہزادہ محمد تغلق کو بغاوت کے لئے اُکسا رہے ہیں۔ پھر اسی بدگمانی نے والیٔ ہند کو اس ذاتِ گرامی کا دشمن بنا دیا جن کا وجودِ مسعود ہندوستان کے باشندوں کے لئے مسیحا کا درجہ رکھتا تھا۔ الغرض اسی تنگ نظری کے باعث قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی طرح سلطان غیاث الدین تغلق اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا۔

اب ہم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف سے دی جانے والی دعوتِ عام کی طرف لوٹتے ہیں۔ جب شہزادہ محمد تغلق کھانا کھا کر چلا گیا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے ایک خدمت گار سے فرمایا۔

''خانقاہ کے دروازے پر ایک شخص کھڑا ہے جو نہایت شریف باطن ہے اور شکل و صورت سے بھی شرافت و نیکی کی تصویر ہے، اسے بلا کر لے آؤ۔''

دراصل واقعہ یہ تھا کہ 'سلطنتِ بہمنی'' کا بانی سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی حکومت کا خواہاں تھا اور بہت دنوں سے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جب وہ ہر طرح ناکام ہو گیا تو ایک سوالی کی حیثیت سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا۔ جب شہزادہ محمد تغلق کھانا کھا رہا تھا، اس وقت حسن گانگو بہمنی نہایت شکستہ حالت میں خانقاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خادم نے مطلوبہ شخص کو بہت تلاش کیا۔ پھر وہ ناکام ہو کر پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''مخدومؒ! وہاں تو بوسیدہ کپڑوں میں ایک پریشاں حال شخص کھڑا ہے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''ہاں! وہی شخص ہے جو بظاہر فقیر معلوم ہو رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک دن دکن کا تاجدار ہوگا۔''

خادم دوبارہ گیا اور حسن گانگو بہمنی سے کہنے لگا۔

''چلو! حضرت شیخؒ نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔''

حسن گانگو حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے والہانہ انداز میں عرض کرنے لگا۔ ''شیخ! یہ آپ کا حُسنِ کرم ہے کہ مجھ جیسے بھکاری کو شرفِ باریابی بخشا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بڑی محبت سے حسن گانگو کو اپنے قریب بٹھایا اور اس

کی مزاج پُرسی کی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ شفقت و مہربانی دیکھ کر حسن گانگو، رونے لگا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ''ایک سلطان کو زیب نہیں دیتا کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے۔''

کچھ دیر بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایک خدمت گار سے اپنے افطار کی روٹی منگوائی۔ عام لنگر کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے دستِ مبارک سے نوالہ بنا کر حسن گانگو کو دیا۔ پھر فرمایا۔ ''یہ دکن کی حکمرانی کا تاج ہے جو تجھے شدید کشمکش اور محنت کے بعد حاصل ہوگا۔''

حضرت محبوب الٰہی کی یہ پیش گوئی بائیس سال بعد پوری ہوئی۔ 747 ھ میں حسن گانگو کے سر پر دکن کی سلطنت کا تاج رکھا گیا اور وہ ہندوستان میں بہمنی سلطنت کا بانی قرار دیا۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

حضرت محبوب الٰہیؒ نے مخالفوں کے اسی ہجوم میں زیست بسر کی۔ کبھی ''تارکِ سنت'' کہلائے اور کبھی ''بدعتی''، کبھی آپؒ کے شب و روز پر بے خبری کا الزام عائد کیا گیا اور کبھی قرآن و سنت سے عدم آگہی کی تہمت تراشی گئی۔ ''مفتیانِ وقت'' اور ''قاضیانِ عصر'' کے اشاروں پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف ان لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی جنہیں انسانیت کے دائرے میں شمار کرنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ وہ کون سا ناشائستہ لفظ تھا جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ دہلی کے اوباش لوگ برسرِ مجلس چلے آتے تھے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ان بے ہودہ کلمات کے ساتھ پکارتے تھے جن کا استعمال کسی کافر کے لئے بھی جائز نہیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ ان تمام دشنام طرازیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے اور جب وہ لوگ اپنی خباثتِ نفسی کا مظاہرہ کر کے چلے جاتے تو آپؒ دستِ دعا بلند کر کے فرماتے۔

''اے اللہ! ان بے خبر لوگوں کو نظام الدین کے حق میں نہ پکڑنا۔ میں نے انہیں معاف کر دیا۔ تُو بھی اپنی شانِ عفو و درگزر سے کام لے۔''

یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ شہر دہلی بڑے بڑے عذابوں سے محفوظ رہا۔ اگر حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مخالفین اور شرپسندوں کو معاف نہ فرماتے تو اللہ کے ایک ولی کی یہ دل آزاریاں ممکن ہے بہت خوف ناک شکل اختیار کر لیتیں۔ اگر قارئین تاریخ اسلام کا جائزہ لیں تو ایسی بہت سی مثالیں سامنے آئیں گی کہ جب اولیاءؒ کا

مذاق اُڑانے والوں کی پوری پوری بستیاں تباہ کر دی گئیں اور آسمان سے ایسا قہر نازل ہوا جو دردناک بھی تھا اور باعثِ عبرت تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی اپنی زندگی کی اسی کڑی آزمائش سے گزرے اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیشہ معافی اور درگزر سے کام لیا۔ یہی آپؒ کی سب سے بڑی کرامت تھی، اگر لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

ایک دن ایک شخص حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے آپ کے ساتھ درویشوں اور خادموں کو دیکھا کہ نہایت غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آنے والا اس صورتِ حال سے بہت متاثر ہوا۔ پھر وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے عرض کرنے لگا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں آپ کو سونا بنانا سکھا دوں تا کہ یہ معاشی تنگی اور بدحالی دُور ہو جائے۔''

جواباً حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''رنگ آمیزی نصاریٰ (عیسائیوں) اور سونا بنانا یہودیوں کی صفت ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک سونا بنانا زرد روئی ہے (یعنی اپنے چہرے کو زرد کر لینا) نہ ہم مال کی طرف مائل ہیں اور نہ سونے کی طرف۔ نہ ہمیں دنیا کی حاجت ہے اور نہ ہم عقبیٰ (آخرت) کا سوال کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے خالق کو پکارتے ہیں اور اس کی رضا مانگتے ہیں۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس مختصر سے جواب میں ایک مسلمان کے لئے پوری زندگی کا لائحۂ عمل موجود ہے۔ سونے کا رنگ بھی زرد ہوتا ہے اور ایک مومن کے چہرے کا بھی۔ یہ زردی کسی بیماری کے سبب نہیں ہوتی۔ لذیذ غذاؤں سے دوری، عیش و آرام سے کنارہ کشی، مسلسل خوفِ خدا اور گریہ نیم شبی، ایک مسلمان کے چہرے کو زرد بنا دیتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

اور پھر اسی زرد رنگ پر مرض الموت کا رنگ غالب آنے لگا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کام ختم ہو چکا تھا اور آپؒ نے سفرِ آخرت کی تیاری شروع کر دی تھی۔

سیر الاولیاء کے مصنف سیّد امیر خوردؒ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کو عجیب مرض لاحق تھا۔ تمام طبیب تشخیص سے عاجز تھے اور ان کی حکمت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بیماری کے سلسلے میں ایک کارِ بے سود نظر آ رہی تھی۔ آپؒ دن میں کئی بار بے ہوش ہوتے اور پھر ہوش میں آ جاتے۔ اسی دوران حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین فتحؒ عیادت کے لئے تشریف لائے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ

چار پائی پر تشریف فرما تھے۔ آپؒ میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ نیچے اُتر سکتے۔ مصافحے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت شیخ رکن الدینؒ سے اپنی چار پائی پر بیٹھنے کے لئے کہا مگر پاسِ ادب کی وجہ سے حضرت شیخؒ چار پائی پر نہ بیٹھے۔ آخر حضرت محبوب الٰہیؒ کے حکم پر کرسی لائی گئی اور حضرت شیخ رکن الدینؒ اس کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔

''ابھی ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔'' حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ نے درخواست کے انداز میں فرمایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اپنی صحت کے بارے میں دعا فرمائیں گے تو حق تعالیٰ اسے رد نہیں کریں گے۔''

حضرت شیخ رکن الدینؒ کی محبت آمیز گفتگو سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ آبدیدہ ہو گئے اور نہایت پُرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔

''شیخ! میں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے کہ نظام! ہمیں تمہاری ملاقات کا بہت اشتیاق ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بات سن کر حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ اور دوسرے حاضرین رونے لگے۔ اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا وقتِ آخر قریب ہے۔ جس شخص سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملاقات کے خواہاں ہوں، وہ زندگی کو موت پر کیسے ترجیح دے سکتے تھے۔ یہ تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا شرفِ خاص تھا کہ آقا نے غلام کو یاد فرمایا تھا۔ اسی حکم کو سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے دنیا سے دل اٹھا لیا تھا اور آخرت کے تصور میں مکمل طور پر غرق رہنے لگے تھے۔

''سیر الاولیاء'' کی ایک روایت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی وفات سے چالیس دن پہلے کھانا ترک کر دیا تھا اور ہر وقت روتے رہتے تھے۔ دوسرے عقیدت مندوں اور خدمت گاروں کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی آنکھوں سے ہمہ وقت آنسوؤں کا سیلاب جاری رہتا تھا۔ اس زمانے میں ایک دن، ایک مرید رضی مبارک نے مچھلی کا شوربہ پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''کمزوری بہت ہو گئی ہے، اس لئے یہ ہلکی غذا استعمال فرما لیجئے۔''

رضی مبارک کے علاوہ دوسرے مریدوں اور خدمت گاروں نے بھی التجا کی مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے انکار فرمایا۔ ''اسے پانی میں بہا دو۔''

سیّد امیر خوردؒ کے چچا سیّد حسینؒ نے عرض کیا۔ ''مخدومؒ! آپ نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس طرح تو صحت جسمانی کو مزید ضرر پہنچے گا۔''

جواباً حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''جو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات

کی آرزو رکھتا ہو، وہ دنیاوی کھانا کیسے کھا سکتا ہے؟''

سیّد امیر خوردؒ بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کا دن تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ آپؒ نے نماز ادا کی اور اسی عالم تحیر میں آپؒ گھر کے اندر تشریف لے آئے۔ پھر آپؒ پر پہلے سے زیادہ رقت طاری ہو گئی۔ ہر روز کئی بار بے ہوش ہوتے اور پھر ہوش میں آ جاتے۔ بار بار زبان مبارک سے یہ مخصوص الفاظ ادا فرماتے۔

''آج جمعہ ہے اور دوست کو دوست کا وعدہ یاد ہے۔''

اس کے علاوہ بار بار ایک ہی سوال پوچھتے کہ کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے، اور کیا میں نے نماز ادا کر لی ہے؟

مریدین اور خدام عرض کرتے کہ آپ نماز ادا کر چکے ہیں۔

جواب میں حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے۔ ''میں دوبارہ نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔''

پھر آپؒ ہر نماز کو دو مرتبہ ادا فرماتے۔ چند روز، جب تک آپؒ اس دنیا میں رہے، ان ہی دو باتوں کو بار بار دہراتے تھے۔ یعنی کہ آج جمعہ ہے........اور میں نے نماز ادا کر لی ہے یا نہیں؟ اور کبھی کبھی یہ بھی فرماتے۔

''می رویم و می رویم و می رویم۔'' (ہم جا رہے ہیں، ہم جا رہے ہیں، ہم جا رہے ہیں)

آخری دنوں میں حضرت بابا فریدؒ کی بھی یہی کیفیت ہو گئی تھی۔

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

ایک دن اسی حالت میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے تمام اقربا خدام اور مریدین کو جو دہلی میں موجود تھے، طلب کیا۔ پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر اپنے خادم خاص خواجہ اقبالؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''تم لوگ اس بات کے گواہ رہنا کہ اگر اس نے گھر میں کوئی جنس بھی رکھی تو کل قیامت کے دن یہ خدا کے سامنے جواب دہ ہو گا۔''

پیر و مرشد کی بات سن کر خواجہ اقبالؒ رونے لگے۔ پھر لرزتے ہوئے جسم اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان کے ساتھ عرض کیا۔

''یہ غلام، خانقاہ میں کچھ بھی باقی نہیں رہنے دے گا۔ یہاں جس قدر بھی اشیاء موجود ہیں ان سب کو آپ کے نام پر صدقہ کر دے گا۔''

پھر خواجہ اقبالؒ نے ایسا ہی کیا۔ خانقاہ میں جتنا بھی سامان تھا، ضرورت مندوں میں

تقسیم کر دیا۔ سوائے اناج کے، جو درویشوں کی چند روز کی خوراک تھا۔

اس کے بعد سیّد امیر خوردؒ کے چچا سیّد حسنؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو اطلاع دیتے ہوئے عرض کیا۔

"خواجہ اقبالؒ نے غلّے کے سوا گھر میں جو کچھ موجود تھا، سب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسی وقت خواجہ اقبالؒ کو طلب کیا اور شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم نے اس مردار ریت کو کس لئے باقی رکھا ہے؟"

خواجہ اقبالؒ نے عرض کیا۔

"سوائے اناج کے گھر میں کچھ باقی نہیں ہے......اور غلّے کا یہ ذخیرہ بھی اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ چند ہزار بھوکے اپنے شکم کی آگ بجھا سکیں۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "مخلوقِ خدا کو بلاؤ۔"

تھوڑی ہی دیر میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"ان لوگوں سے کہو کہ انبار خانوں کے دروازے توڑ دیں۔ جس قدر غلّہ موجود ہے، بے خوف ہو کر لے جائیں اور وہاں جھاڑو دے دیں۔"

لوگوں نے اپنے غم خوار اور مسیحا کا حکم سنا۔ سب کے سب سر جھکائے کھڑے رہے۔ بہتے ہوئے آنسو ان کے بے قرار جذبوں کا اظہار کر رہے تھے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے دوبارہ فرمایا۔ "وقت بہت کم ہے، میں چاہتا ہوں کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے، سینے کے اس بوجھ کو کم کر دوں۔"

مسکینوں اور محتاجوں نے دوبارہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا حکم سنا اور انبار خانوں سے تمام اناج اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو لے گئے۔

اس واقعے کے بعد خدام نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا۔ "سیدی! آپ کے بعد ہم فقیروں کا کیا ہوگا؟"

جواباً حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔

"تم لوگ پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کیا تمہیں اپنے دینے والے کی رزاقی پر یقین نہیں رہا؟"

مریدوں اور خادموں نے شرمساری کی حالت میں سر جھکا دیئے۔ "اس کے سوا کون

دینے والا ہے؟"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"تم لوگ نذر و نیاز کے طور پر میرے روضے سے اس قدر پاؤ گے کہ وہ تمہارے لئے کافی ہوگا۔"

بعض خدمت گاروں نے عرض کیا۔ "ہمارے درمیان اس آمدنی کو تقسیم کون کرے گا؟"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ "وہ، جس کا اس آمدنی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔"

اسی بیماری کے دوران حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بعض مریدوں اور خدمت گاروں نے سیّد امیر خسروؒ کے نانا مولانا شمس الدین دامغانیؒ سے کہا۔ "آپ حضرت شیخؒ سے عرض کریں کہ ہم نے پیر و مرشد کے خطیرے کے قریب جو "خطیرہ القدس" ہے، بلند اور آراستہ مکان بنا رکھے ہیں تاکہ وصال کے بعد جسم مبارک کو وہاں منتقل کیا جا سکے۔ سلطان المشائخ سے دریافت کریں کہ وفات کے بعد کس مکان میں آرام فرمائیں گے؟"

مولانا شمس الدین دامغانیؒ نے مریدوں اور خدمت گاروں کی یہ درخواست حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں پیش کی تو آپؒ نے فرمایا۔ "مولانا! میں کسی عمارت میں دفن ہونا نہیں چاہتا۔ میری تو خواہش ہے کہ اس جسم خاکی کو کسی جنگل کے سنسان گوشے میں لے جا کر سپرد خاک کر دیا جائے۔"

❁ ...... ❁ ❁ ...... ❁

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے کپڑوں کا صندوق طلب کیا۔ یہ اس مرد درویش کا کل اسباب تھا جس نے نصف صدی تک ہندوستانی عوام کے دلوں پر حکومت کی۔ جس کی بارگاہِ جلالی میں سلاطینِ وقت مال و متاع کے انبار لے کر حاضر ہوتے تھے، آج اقلیم معرفت کا وہی تاجدار اپنا خزانہ لٹا رہا تھا۔ یہ خزانہ چند دستاروں، نماز کے مُصلّوں اور معمولی کپڑوں کی عباؤں پر مشتمل تھا۔

تمام مریدوں اور خدمت گاروں کی نظریں حضرت محبوب الٰہیؒ کے دستِ کرم پر مرکوز تھیں اور وہ سب کے سب اس بات کے منتظر تھے کہ بارگاہِ شیخ سے کس کو کیا عطا ہوتا ہے؟

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی ایک دستار، پیرہن خاص اور مصلّٰی حضرت مولانا

برہان الدین غریبؒ کو عطا کیا اور انہیں ارضِ دکن کی جانب روانہ ہونے کا حکم دیا۔ ایک دستار، پیرہن خاص اور مصلیٰ حضرت شیخ کمال الدین یعقوبؒ کو عطا کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ ہندوستانی صوبے گجرات جا کر سلسلۂ چشتیہ کے کارِ تبلیغ کو جاری رکھیں۔ اسی طرح ایک پیرہن، دستار اور مصلیٰ مولانا شمس الدین یحییٰؒ کو عطا کیا۔ شیخ موصوف کا مزار اسی چبوترے پر ہے جہاں حضرت محبوب الٰہیؒ کے اکثر مریدانِ خاص مدفون ہیں۔

الغرض اس صندوق میں جو کچھ بھی موجود تھا، سب تقسیم کر دیا گیا۔

حضرت سیّد نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ بھی اس وقت موجود تھے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہِ کرم سے آپؒ کو کوئی چیز عطا نہیں ہوئی۔ پیر و مرشد کے اس طرزِ عمل پر حاضرین کو سخت تعجب تھا۔ خانقاہ کے بعض خدام نے حضرت نصیر الدین محمودؒ سے اس واقعے کا ذکر بھی کیا مگر آپؒ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

''حضرت شیخؒ بہتر جانتے ہیں کہ کون کس چیز کا اہل ہے؟''

جب حضرت چراغ دہلیؒ یہ فرما رہے تھے، اس وقت ان کے چہرۂ مبارک پر شکایت کی بجائے سرشاری کا رنگ جھلک رہا تھا۔ یہ وہی منزل تھی، جب ایک مرید اپنے شیخ کی رضا کو زندگی کا حاصل سمجھ لیتا ہے اور محرومی کے عالم میں بھی یہی سمجھتا ہے کہ جیسے اُس نے سب کچھ پا لیا ہو۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مریدوں میں تبرکات تقسیم فرما رہے تھے تو حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ انتہائی مسرور و مطمئن نظر آ رہے تھے۔

پھر سہ شنبہ کے روز عصر کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت چراغ دہلی کو طلب کیا اور خرقہ، عصا، مصلیٰ، تسبیح، لکڑی کا پیالہ اور جو کچھ حضرت بابا فریدؒ سے ملا تھا، وہ سب حضرت نصیر الدین محمودؒ کو عطا کرتے ہوئے فرمایا۔

''تمہیں شہر دہلی میں رہ کر لوگوں کے ظلم و جور برداشت کرنے چاہئیں کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

❀ ...... ❀ ❀ ...... ❀

پھر وقتِ معلوم آ پہنچا جو اہل دل کے لئے قیامت سے کم نہیں تھا۔ جب مرض الموت نے شدت اختیار کی تو حضرت محبوب الٰہیؒ سے دوا پینے کی درخواست کی گئی۔ مگر آپؒ نے دوا پینا تو درکنار، اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ مریدین اور خدام بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہے تھے۔ جب بار بار دوا پینے کی التجا کی گئی تو آپؒ نے فرمایا۔

''درمند عشق را دارو بجز دیدار نیست۔'' (عشق کے مریضوں کے لئے دیدارِ دوست کے سوا کوئی دوا نہیں ہے)

جب سلطان محمد تغلق کو خبر ہوئی تو اس نے اپنا شاہی طبیب اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی۔ ''مجھے آپ کی عیادت کا بہت اشتیاق ہے۔ اگر اجازت ہو تو دست بوسی کے لئے حاضر ہو جاؤں۔''

جب سلطانی طبیب خانقاہ پہنچا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر غشی کی کیفیت طاری تھی۔ ہوش آیا تو دریافت فرمایا کہ میں نے نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ خدام نے عرض کیا کہ آپ نے نماز ادا کر لی ہے۔ یہ سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے بستر پر لیٹے لیٹے دوبارہ نماز ادا کی۔

شاہی طبیب حضرت شیخؒ کی چارپائی کے قریب آیا۔ اس وقت آپؒ کی آنکھیں بند تھیں اور آپؒ عالم سکوت میں تھے۔ طبیب شاہی نے نبض پر ہاتھ رکھا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک خادم نے جھک کر سرگوشی کی۔ ''سلطان نے آپ کے علاج کے لئے طبیب خاص بھیجا ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے شاہی معالج کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں فرمایا۔ ''دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کے ایک مرید مہندر ہردیو نے اپنے روزنامچے میں آپؒ کے آخری لمحات کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ساری رات حضرتؒ کی یہی حالت رہی۔ کچھ دیر کے لئے ہوش آتا تھا اور پھر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ ہوش کی حالت میں حضرتؒ زبان مبارک سے کچھ فرماتے تھے مگر آواز کی ناتوانی کے سبب ہم اسے سننے سے محروم رہ جاتے تھے۔ صبح کی نماز پڑھ کر ہم سب پھر حاضر خدمت ہو گئے۔ ہم نے سنا کہ حضرتؒ نے نماز فجر بھی کئی بار ادا کی ہے اور خواجہ سیّد محمد امامؒ کو بلا کر کان میں کچھ فرمایا ہے۔

مہندر ہردیو لکھتا ہے کہ اچانک حضرتؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ آپؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔ ''حضرت شیخ العالم (حضرت بابا فریدؒ) تشریف لائے ہیں۔ مجھے تعظیم کے لئے اُٹھاؤ۔''

حضرت شیخؒ کا حکم سن کر سب لوگ آگے بڑھے تاکہ آپؒ کو سہارا دے کر اٹھایا جائے۔ اچانک حضرتؒ پر سکوت طاری ہو گیا اور سانس کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ اس وقت ہم سب جان گئے کہ سورج غروب ہو چکا ہے...... حالانکہ چاشت کا وقت تھا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ چہار شنبہ کا دن تھا، ربیع الآخر کی اٹھارہ تاریخ تھی اور 725ھ کا سال تھا، جب آفتاب چشتیہ غروب ہوا اور سرزمینِ ہند پر غموں کا گہرا اندھیرا پھیل گیا۔

مہندر ہردیو اپنے روزنامچے میں مزید تحریر کرتا ہے کہ حضرت شیخؒ کی رخصت کا اندوہناک منظر دیکھ کر ہم سب لوگ سکتے کی حالت کا شکار ہو گئے تھے۔ جو شخص بھی کھڑا تھا، وہ اپنی جگہ اسی طرح دم بخود کھڑا رہا......اور جو بیٹھا تھا وہ کسی پتھر کے مجسّمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا۔ خواجہ اقبالؒ، مبشرؒ اور عبدالرحیمؒ کی بے قراری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ خواجہ سیّد محمد امامؒ، قاضی سیّد محی الدین کاشانیؒ، خواجہ سیّد موسیٰؒ اور سیّد حسین کرمانیؒ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہے تھے۔ تمام آنکھیں اشک بار تھیں۔ لوگوں کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ گریبان چاک کر ڈالیں اور ایسی گریہ و زاری کریں کہ دہلی کے گلی کوچے ماتم کدہ بن جائیں۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ کا ہر غلام آدابِ شریعت کا پابند تھا۔ اس لئے سب نے اشکوں سے اپنے دامن بھگو ڈالے مگر ہونٹوں کو فریاد و فغاں سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔

اچانک اطلاع ملی کہ سلطان محمد تغلق آیا ہے اور اس کے ساتھ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ بھی تشریف لائے ہیں۔ سلطان محمد تغلق اس حالت میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جسمِ مبارک کے قریب آیا کہ شدتِ غم سے اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ سلطان نے اپنے ہاتھوں سے چادر ہٹائی اور آخری بار حضرت محبوب الٰہیؒ کی زیارت کی۔ مہندر ہردیو کی روایت ہے کہ فرمانروائے ہندوستان اس قدر رویا کا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق کی موت پر بھی اتنا نہیں رویا تھا۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی سے وہ بے لوث محبت تھی جس نے والئ ہند کا صبر و قرار چھین لیا تھا۔

جب سلطان محمد تغلق لی طبیعت کسی قدر پُرسکون ہوئی تو اس نے خدام سے پوچھا۔

''حضرت شیخؒ کی تدفین کا انتظام کہاں ہوگا؟''

سیّد حسین کرمانیؒ نے آگے بڑھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی وصیت کا ذکر کیا اور تالاب کے اندر دفن کرنے کی تجویز بادشاہ کے گوش گزار کر دی۔

سلطان محمد تغلق نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اپنے وزیر احمد ایاز خواجہ کو حکم دیا کہ وہ فوراً مزدوروں کا انتظام کرے۔ حکم سلطانی کی بجا آوری کے لئے ایاز خواجہ اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوا اور شہر سے سینکڑوں مزدوروں کو لے آیا۔ مزدوروں نے تھوڑی سی دیر میں تالاب کو مٹی سے بھر دیا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی قبر تیار کر دی گئی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

نماز کے بعد حاضرین نے دیکھا کہ حضرت شیخ رکن الدینؒ ایک گوشے میں کھڑے رو رہے تھے۔ دوسرے درویشوں نے صبر کی تلقین کی تو آپؒ نے فرمایا۔

''سلطان المشائخؒ کا ہم سے بچھڑنا ایسا صدمہ نہیں جسے گردشِ ماہ و سال دُھندلا کر دے۔ مفارقت کا یہ داغ تو بے شمار سینوں پر ہمیشہ روشن رہے گا۔ میں تو شیخ کی اس محبت کو یاد کر کے روتا ہوں کہ مجھے آخری وقت میں فراموش نہیں کیا۔ جاتے جاتے بھی اپنے اس نیاز مند کو سعادتِ عظیم سے سرفراز کر گئے۔''

کچھ لوگوں نے حضرت شیخ رکن الدینؒ سے دریافت کیا۔ ''وہ کیا سعادت تھی؟''

جواب میں حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

''میں گزشتہ چار سال سے ملتان جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر حضرت محبوب الٰہیؒ یہی فرماتے تھے کہ ابھی جلدی کیا ہے؟ کچھ دن بعد چلے جانا۔ میں ادب و احترام کے سبب زیادہ اصرار نہیں کر سکتا تھا مگر اتنا ضرور سوچتا تھا کہ میرے قیام پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس دوران مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی مگر آج اندازہ ہوا کہ روکنے کا سبب کیا تھا؟ نماز جنازہ کی امامت سے تو مشرف کر دیا گیا مگر حضرت شیخؒ نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے بغیر ہمارے دلوں پر کیا گزرے گی؟''

حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ بہت دیر تک جنازے کے قریب کھڑے روتے رہے۔ پھر جب جنازہ اٹھا تو سلطان محمد تغلق نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی میت کو کاندھا دیا۔ بادشاہِ وقت کو خوش کرنے کے لئے وہ لوگ بھی جنازے میں شریک ہوئے تھے جو زندگی بھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مخالفت کرتے رہے تھے۔

بالآخر آفتابِ چشتیہ کو قبر میں اتار دیا گیا۔ حاسد دنیا نے سمجھا کہ سورج بجھ گیا مگر اہلِ دل نے دیکھا کہ سورج کی روشنی تا حدِ نظر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے کردار و عمل کی روشنی تھی اور اس روشنی کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ بے شک! قدرت کے آفاقی اصول کے تحت ایک موت حضرت محبوب الٰہیؒ پر وارد ہو چکی تھی مگر دوسری موت آپؒ کا مقدر نہیں تھی۔

ہرگز غیر و آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما!

(اسے ہرگز موت نہیں آتی جس کا دل عشق کی تاثیر سے زندہ ہو گیا۔ غور سے دیکھ کہ دنیا کے دفتر پر ہمارے زندہ جاوید ہونے کی مہر ثبت ہے)

اولیائے کرام کے زندہ جاوید ہونے کی روشن دلیل یہ ہے کہ جب تک وہ حیات

رہے، شاہانِ وقت ان کی بارگاہِ جلال میں دست بستہ سر جھکائے کھڑے رہے....... اور جب وہ نفوسِ قدسیہ دنیا سے رخصت ہو گئے تو ان کے مزاراتِ مبارکہ کے گرد اُڑنے والی خاک بھی اہلِ طلب کے لئے اکسیر بن گئی۔ مسلمانانِ پاک و ہند کے دلی جذبات تو سب پر ظاہر ہیں کہ وہ سات صدیوں سے اپنے روحانی پیشوا حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کو والہانہ خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے ہندوستانی وزیرِاعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کو بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہ میں خم دیکھا ہے۔

اب کوئی کج بحث مادہ پرست مانے یا نہ مانے مگر حجت تو پوری ہو چکی۔

ترے عشق کی کرامت یہ نہیں تو اور کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

❁ ...... ✿ ✿ ...... ❁

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی نے ظلمت کدوں کو روشن کیا۔ ہزاروں انسانوں نے آپؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور دین و دنیا کی کامرانیاں حاصل کیں۔ آپؒ کے اخلاقِ عالیہ نے لوگوں کی وہ بری عادتیں بدل ڈالیں جن میں وہ ایک عرصہ دراز سے مبتلا تھے۔

یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی درویشی ہی کا صدقہ تھا کہ لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہو گئی اور خیانت کا ارتکاب کرنے والے امانت کا مفہوم سمجھنے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دعاؤں کی برکت سے تاتاریوں کی یورشیں ختم ہو گئیں۔ منگولوں نے جب بھی ہندوستان کا رخ کیا تو وہ کسی ظاہری وجہ کے بغیر خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے یا پھر انہیں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے تصرفِ روحانی ہی کا اثر تھا کہ احکامِ شریعت پر سختی سے عمل ہونے لگا۔ تقریباً ایک صدی کی مطلق العنان حکومت نے عام رعایا کو بے راہ رو بنا دیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وجودِ مسعود سے اسلامی شعائر کو سربلندی نصیب ہوئی اور سلطان علاء الدین خلجی جیسے دنیا پرست حکمران نے شراب پر پابندی عائد کر دی اور عوامی سطح پر فسق و فجور اور بدعات کو روک دیا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بیعت کا عام دروازہ کھول دیا تھا۔ آپؒ گناہ گاروں سے توبہ کراتے، انہیں خرقہ پہناتے اور اپنے مریدوں میں شامل کر لیتے۔ حضرت نظام الدین

اولیاءؒ سے نسبت کی شرم لوگوں کو برائی سے روکے رکھتی۔ اسی وجہ سے عبادت کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہو گیا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، نوجوان، غلام اور نوکر سب نماز ادا کرتے تھے۔ نیک لوگوں نے شہر سے غیاث پور تک تفریحی مقامات پر چبوترے بنا دیئے تھے اور سائے کے لئے بانس کے سائبان ڈال دیئے تھے۔ کنوئیں کھدوائے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی مٹی کے لوٹوں اور گھڑوں کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کے ہر سائبان میں چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں اور ہر چبوترے پر دو چوکیدار مقرر تھے تاکہ لوگوں کو وضو کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ معتبر تاریخی روایات کے مطابق ایسے تمام چبوتروں اور سائبانوں میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا۔ اس طرح عام لوگوں میں ارتکابِ جرم کے واقعات بہت کم ہو گئے تھے۔ اکثر بندگانِ خدا چاشت، اشراق اور تہجد کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ کوئی محلہ ایسا نہیں تھا کہ جہاں مہینے میں ایک یا دو بار صالحین کا اجتماع اور صوفیوں کی محفلِ سماع منعقد نہ ہوتی ہو۔

بڑے بڑے گناہوں کو لوگ کفر سمجھتے تھے اور حتیٰ المقدور ان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ شراب اور سیاہ کاری کے اڈے تباہ کئے جا چکے تھے اور عام لوگ عیش پرستی سے تائب ہو کر سادگی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ کم تولنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ تصوف اور احکامِ شریعت کی کتابوں سے لوگوں کی رغبت زیادہ ہو گئی تھی۔

یہ ہے ان کرامات کا مختصر جائزہ جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ظاہر ہو گئیں اور جن کی تاثیر سے ہندوستانی معاشرے میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ بے شک! حضرت محبوب الٰہیؒ خانقاہ کے ایک گوشے میں مشغولِ ذکرِ خدا رہے مگر آپؒ کے کردار کی روشنی دیوار و در کی قید سے آزاد تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس انداز کے صوفی نہیں تھے جن کی ریاضت اور مجاہدات صرف ان کی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے گریۂ نیم شبی میں تنہا آپؒ ہی کا درد شامل نہیں تھا بلکہ اُمتِ مسلمہ کے رنج و الم اور زبوں حالی کا احساس بھی شامل تھا۔ آپؒ نے بارگاہِ حق سے اپنے لئے بھی مغفرت طلب کی اور عالم اسلام کے لئے عافیت کی بھیک مانگی۔ بلاشبہ حضرت محبوب الٰہیؒ ایک عظیم مصلح تھے۔ بقول اقبال۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے قائم ہیں
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں شانِ محبوبی!
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

علامہ اقبالؒ نے یہ نظم برطانیہ جانے سے پہلے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں میں کھڑے ہو کر پڑھی تھی۔

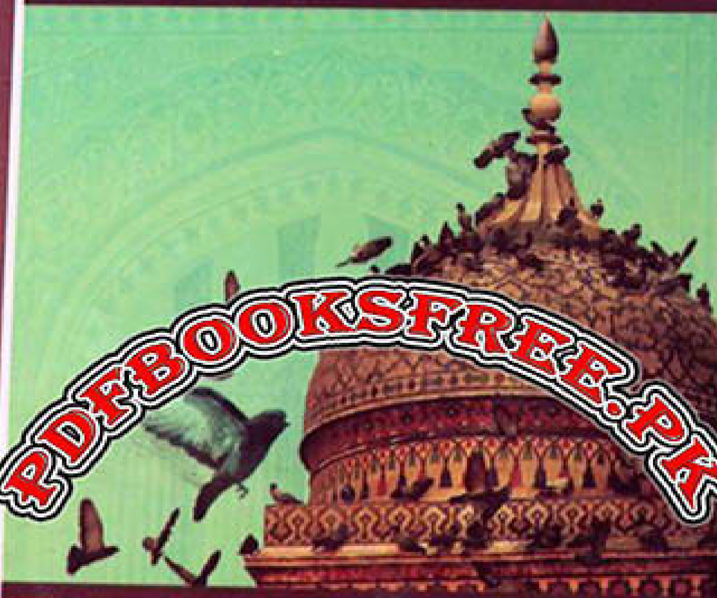
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

پھر سارے زمانے نے دیکھا کہ علامہ اقبال کی دعا کے ایک ایک حرف کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ایک اور بڑی کرامت ہے جسے مزار اقبال پر جانے والے کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

❁

(تمت بالخیر)

اللہ کے ولی



خان آصف

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار۔ لاہور۔ ۲ فون: 042-7668958
042-7652546
www.alquraish.com
email: info@alquraish.com